UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی

MAUL-202

Tarjuma Nigari Aur Ablaghiyat

(ایم –اے اردو ' سال دوم)

چھٹا پرچہ

ترجمہ نگاری اور ابلاغیات

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY,

HYDERABAD

MAUL-202

(ایم –اے اردو ' سال دوم)

چھٹا پرچہ

ترجمہ نگاری اور ابلاغیات

Uttarakhand Open University, Haldwani-263139 (Nainital)

Phone: 05946-261122, 261123 Tool free No. 1800 180 4025

Fax: 05946-264232, E-mail: info@ uou.ac.in,http://uou.ac.in

ایڈمنسٹریٹو و اکیڈمک انتظامیہ

پروفیسر سبھاش دھولیا

وائس چانسلر' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی 'ہلدوانی –

پروفیسر اچ –پی شکلا

ڈائرکٹر 'اسکول آف لینگویجز ' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی 'ہلدوانی –

پروفیسر گرجا پانڈے

رجسٹرار ' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی 'ہلدوانی –

ڈاکٹر اختر علی

کورس کوآرڈینیٹر و اکیڈمک ایسوسی ایٹ ' شعبہ اردو

اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی 'ہلدوانی –

اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے حاصل اجازت (ایم-او –یو)کے بعد رجسٹرار ' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی '
ہلدوانی کے ذریعہ ری پرنٹنگ کاپی کی شکل میں شائع کیا گیا– اشاعت- جولائ ۲۰۱۳

(BKID-099)

ایم۔ اے ' اُردو ' سال دوم

فاصلاتی تعلیم

چھٹا پرچہ

ترجمہ نگاری اور ابلاغیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی' حیدرآباد - 500032

زیر اہتمام : نظامت فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

وزیٹر

عزت مآب صدر جمہوریہ ہند بھارت رتن ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

چانسلر

پروفیسر عبید صدیقی

وائس چانسلر

پروفیسر اے ایم پٹھان

رجسٹرار

جناب فاروق احمد کے اے ایس

فینانس آفیسر

جناب وائی جینت راؤ آئی اے اینڈ اے ایس

کنٹرولر امتحانات

ڈاکٹر ایس اے وہاب قیصر

نظامت فاصلاتی تعلیم

EPABX : 040-23006612-15, Fax : 040-23006121

ڈائرکٹر

پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال احمد Ext : 305

پروفیسر

ڈاکٹر مظہرالدین فاروقی Ext : 304

ریڈر

ڈاکٹر پی۔ فضل رحمٰن Ext : 126

اسسٹنٹ ڈائرکٹرس

ڈاکٹر علی رضا موسوی Ext : 121

جناب شہید خان Ext : 123

لکچرر

ڈاکٹر نکہت جہاں Ext : 330

اسسٹنٹ رجسٹرار

جناب مہیش کمار ویراگی Ext : 125

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر کے۔ آر۔ اقبال احمد، ڈائرکٹر و صدر شعبۂ فاصلاتی نظام تعلیم

مدیر ترجمہ نگاری : ڈاکٹر ابوالکلام، اسسٹنٹ ڈائرکٹر

ابلاغیات : ڈاکٹر محمد ظفرالدین، ریڈر و صدر، شعبۂ ترجمہ

کورس کوآرڈی نیٹر : ڈاکٹر نکہت جہاں، لکچرر، شعبہ فاصلاتی تعلیم

نصابی کمیٹی برائے ایم اے اردو (فاصلاتی تعلیم) :

پروفیسر مغنی تبسم	پروفیسر غیاث متین
پروفیسر سیدہ جعفر	پروفیسر بیگ احساس
پروفیسر اشرف رفیع	ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
پروفیسر لئیق صلاح	ڈاکٹر عقیل ہاشمی
پروفیسر انورالدین	ڈاکٹر مجید بیدار

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

طبع 2011

طباعت EMESCO BOOKS, HYDERABAD – 29.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ کسی بھی انداز میں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

مزید معلومات کے لئے ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032 سے ربط پیدا کریں۔

مضمون نگار

ترجمہ نگاری :	پروفیسر قمر رئیس	دہلی یونیورسٹی، دہلی (ریٹائرڈ)	اکائی 1
	ڈاکٹر ابوالکلام	اسسٹنٹ ڈائرکٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 2,12,15
	ڈاکٹر خلیق انجم	جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	اکائی 3,11
	ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس	لکچرر، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 4
	ڈاکٹر مصطفیٰ علی خاں فاطمی	اسسٹنٹ لائبریرین، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (ریٹائرڈ)	اکائی 5
	پروفیسر نصیر احمد خاں	جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی	اکائی 6
	ڈاکٹر ارجمند آرا	لکچرر، دہلی یونیورسٹی، دہلی	اکائی 7
	ڈاکٹر ظہیر علی خاں	لکچرر، دہلی یونیورسٹی، دہلی	اکائی 8
	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	ڈپٹی چیف پروڈیوسر، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی (ریٹائرڈ)	اکائی 9
	پروفیسر رحمت یوسف زئی	حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد (ریٹائرڈ)	اکائی 10
	ڈاکٹر محمد خالد المبشر الظفر	لکچرر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 13
	جناب جمیل شیدائی	فری لانس رائٹر، حیدرآباد	اکائی 14
ابلاغیات :	پروفیسر شاہد حسین	جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی	اکائی 16
	جناب آفتاب عالم بیگ	لکچرر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 17
	پروفیسر محمد انور الدین	حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 18
	ڈاکٹر شاہد پرویز	ریجنل ڈائرکٹر دہلی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، نئی دہلی	اکائی 19
	جناب کبیر احمد	اسٹیشن ڈائرکٹر (ریٹائرڈ) آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد	اکائی 20
	جناب معین اعجاز	اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر (ریٹائرڈ) آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی	اکائی 21
	جناب انجم عثمانی	اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر، دوردرشن کیندر، نئی دہلی	اکائی 22
	ڈاکٹر رضوان الحق	دہلی یونیورسٹی، دہلی	اکائی 23
	ڈاکٹر وارث احمد خاں	ڈپٹی ڈائرکٹر، EMPC اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی	اکائی 24
	پروفیسر اسد نظام	مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 25
	پروفیسر یوسف کمال	سابق ڈائرکٹر A.V.R.C، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	اکائی 26
	پروفیسر شافع قدوائی	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	اکائی 27
	ڈاکٹر محمد ظفر الدین	ریڈر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدآباد	اکائی 28

فہرست

اکائی نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ نگاری		
اکائی 1	ترجمے کا فن اور اس کی قسمیں	7
اکائی 2	ترجمے کے بنیادی اصول ونظریات	13
اکائی 3	ترجمے کے بنیادی مسائل	29
اکائی 4	ترجمے کے تقاضے اور مترجم کی خصوصیات	44
اکائی 5	ترجمے کے دوران اصطلاح سازی کے مسائل	55
اکائی 6	ترجمے کی روایت واہمیت اور اصطلاحی ولسانیاتی مسئلے	67
اکائی 7	اردو میں ترجمے کی روایت واہمیت	80
اکائی 8	اردو میں ادبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	94
اکائی 9	نثری اور اور منظوم ترجمے میں فرق	108
اکائی 10	اردو میں علمی وفنی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	120
اکائی 11	اردو میں دفتری وقانونی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	130
اکائی 12	اردو صحافت میں ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل	139
اکائی 13	اردو میں سائنسی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	151
اکائی 14	اردو میں مذہبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	167
اکائی 15	انگریزی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ۔ چند مثالیں	181
ابلاغیات		
اکائی 16	ابلاغیات اور اس کی قسمیں	202
اکائی 17	اردو صحافت: اخبارات کا آغاز وارتقا	221
اکائی 18	اخبار نویسی کے اصول	234
اکائی 19	انٹرویو کی تکنیک	249
اکائی 20	ریڈیو: آغاز وارتقا	258
اکائی 21	ریڈیائی نشریات اور ان کی قسمیں	270
اکائی 22	ٹیلی ویژن: آغاز وارتقا اور نجی کاری	282
اکائی 23	ٹیلی ویژن کی مختلف نشریات	291
اکائی 24	ٹیلی ویژن اور اس کی اہمیت	305
اکائی 25	ہندستان میں تعلیمی ٹیلی ویژن	313
اکائی 26	اشتہارات	322
اکائی 27	نئی ترسیلی تکنالوجی	331
اکائی 28	تعلقاتِ عامہ	341

پیش لفظ

پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت جنوری 1998ء میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں اس یونیورسٹی کو روایتی اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے تعلیم وتدریس کی سہولتیں فراہم کرنے کا استحقاق بخشا گیا۔ اُردو ذریعہ تعلیم کی ملک کی واحد اور منفرد یونیورسٹی ہونے کے ناطے اُردو یونیورسٹی نے ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تمام تر اُردو آبادی کا احاطہ کرنے اور اس کے فیوض وبرکات سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستفید کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے یونیورسٹی میں فاصلاتی طریقہ تعلیم کو اولیت دی گئی اس لیے کہ اُردو والے ملک کی ہر ریاست میں آباد ہیں اور یونیورسٹی کے ثمرات اُن تک پہنچانے کے لیے فاصلاتی نظام سے زیادہ موثر اور کارگر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ اس نظام تعلیم کی اپنی خصوصیات اور امتیازات ہیں جن میں ایک اہم اور کلیدی نکتہ یہ ہے کہ اس میں ہر کورس کے تمام طالب علموں کو مکمل نصابی مواد فراہم کرنا لازمی ہے۔ گویا کسی کورس کے آغاز سے قبل نصابی کتب کی تصنیف و تالیف اور اشاعت کا کام انجام دینا ہوگا۔ اور جب تمام علوم ومضامین کا نصابی مواد اُردو میں مطلوب ہو تو یہ کام مزید دقت طلب اور دشوار گزار ہو جاتا ہے۔ شروع ہی سے یہ چیلنج اُردو یونیورسٹی کے پیش نظر رہا ہے جس سے نپٹنے کے لیے جولائی 1998ء میں ٹرانسلیشن ڈویژن کی داغ بیل ڈالی گئی۔ بظاہر یہ شعبہ ترجمے کی ذمہ داریوں تک محدود معلوم ہوتا ہے لیکن ٹرانسلیشن ڈویژن کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اپنے نام سے مترشح ہونے والے دائرہ کار سے کافی آگے بڑھ کر کام کرتا رہا ہے۔ بنیادی طور پر یہ شعبہ اُردو یونیورسٹی کے لیے درکار نصابی مواد کی تیاری اور اشاعت کا کام انجام دیتا رہا ہے۔ تعلیمی پروگرام کے فوری آغاز کے لیے ابتدا میں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کا بی اے اور بی ایس سی کا نصابی مواد مستعار لیا گیا اور جزوی ترمیمات کے بعد شائع کرلیا گیا۔ اس کے بعد تراجم پر توجہ کی گئی اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کی بی کام کی 54 کتابوں کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا گیا۔ اُردو میں پہلی بار کامرس میں گریجویشن سطح کی نصابی کتابیں تیار ہوسکیں۔ کمپیوٹنگ کورس کی 12 کتابیں بھی انگریزی سے ترجمے کے بعد شائع کی گئیں۔ اس کے علاوہ ٹرانسلیشن ڈویژن نے انگریزی اور ہندی کے ذریعے اہلیت اُردو کے دو سرٹی فکیٹ کورس، فنکشنل انگلش کے ایک سرٹی فکیٹ کورس اور ٹیچ انگلش کے ایک ڈپلومہ کورس کی کتابیں ماہرین کے مرتبہ نصاب کے مطابق تیار کیں۔ اسی طرح یونیورسٹی اب فاصلاتی تعلیم کے گریجویشن سطح کے نصاب کی تیاری میں بھی مصروف ہے تاکہ اس یونیورسٹی کے طلبہ کی ضروریات کے مطابق عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کتابیں تیار ہوسکیں۔

پوسٹ گریجویشن کی سطح پر فاصلاتی طرز پر اُردو یونیورسٹی میں سب سے پہلے ایم اے اُردو کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا جس کے لیے مختلف جامعات کے سنیئر اساتذہ نے نصاب تیار کیا۔ یہ نصاب سال اول اور سال دوم کے آٹھ پرچوں پر مشتمل ہے۔ نصابی کمیٹی کا خیال تھا کہ اُردو زبان پر عبور کے لیے فارسی زبان وادب سے کسی حد تک واقفیت ضروری ہے۔ نیز قومی یونیورسٹی کے طالب علموں کو قومی زبان سے بھی قریب تر رکھنے کی ضرورت ہے، چنانچہ ایم اے سال اول میں فارسی اور ہندی کا ایک مشترکہ پرچہ شامل کیا گیا ہے۔ اُردو زبان وادب کی تاریخ، دکنیات، کلاسیکی نثر ونظم، جدید ادب، فکشن، ادبی تحریکات و رجحانات سے متعلق مختلف اہم عنوانات پر ملک کی یونیورسٹیوں سے وابستہ قابل اساتذہ کرام سے اسباق لکھوائے گئے ہیں۔ طالب علموں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ فراہم کردہ نصابی کتابوں کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوسکے مشاورتی جماعتوں اور سفارش کردہ کتابوں سے بھی استفادہ کریں گے۔

اگر آپ زیر نظر کتاب میں کوئی غلطی یا کمی محسوس کریں تو ہمیں ضرور مطلع کریں تاکہ ماہرین سے مشورے کے بعد آئندہ اشاعت میں ترمیم کی جاسکے۔

ایم اے پٹھان

(پروفیسر اے ایم پٹھان)

وائس چانسلر

اکائی 1 : ترجمے کا فن اور اس کی قسمیں

ساخت

1.1 تمہید

1.2 فنِ ترجمہ نگاری

1.3 ترجمے کی قسمیں

1.3.1 تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کا ترجمہ

1.3.2 تخلیقی ادب کا ترجمہ

1.3.3 شاعری کا ترجمہ

1.3.4 نثری تخلیقات کا ترجمہ

1.4 علمی اور معلوماتی کتابوں کا ترجمہ

1.5 خلاصہ

1.6 نمونۂ امتحانی سوالات

1.7 فرہنگ

1.8 سفارش کردہ کتابیں

1.1 تمہید

ترجمے کے لغوی معنی ہیں دوسری زبان میں بدلنا یا ایک زبان سے دوسری زبان میں مطلب ادا کرنا۔ ایک اصطلاح کے طور پر بھی ترجمے کا مطلب اس سے مختلف نہیں ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر اب تک دنیا میں علوم کی ترقی اور اشاعت میں ترجموں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ زمانۂ قبل مسیح میں افلاطون اور ارسطو جیسے فلسفیوں نے جو کچھ قدیم یونانی زبان میں لکھا وہ ترجموں کے ذریعے ہی دوسری زبانوں تک پہنچا۔ اسی طرح اسلام کے عروج کے دور میں بوعلی ابن سینا، موسیٰ الخوارزمی اور البیرونی نے عربی زبان میں جو علمی کتابیں لکھیں وہ پہلے لاطینی اور پھر دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر ساری دنیا میں پھیلیں۔ آج بھی دنیا کی مختلف زبانوں میں اعلیٰ معیار کی جو علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی جا رہی ہیں وہ ترجمے کے ذریعے ہی دنیا کے دوسرے ملکوں میں پہنچ رہی ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں ترجمے کا بہت اہم حصہ رہا ہے۔

1.2 فنِ ترجمہ نگاری

ترجمہ ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر آدمی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کر سکتا۔ اس کام میں طبیعت کا میلان اور شوق ہونا ضروری ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں صرف لفظی مفہوم بیان کر دینے کو مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں۔ ترجمے میں مترجم کی سوجھ بوجھ، خوش ذوقی اور دونوں زبانوں کے الفاظ کی معنوی اور صوتی خوبیوں کا علم بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر ترجمہ کامیاب نہیں کہا جائے گا۔

بے شک ترجمے کا فن ایک مشکل فن ہے۔اس کے لیے ایک خاص صلاحیت' خاص ڈسپلن (Descipline) اور کچھ خاص اور مستند معلومات درکار ہوتی ہیں۔اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ کامیاب ترجمے کے لیے مترجم کو درج ذیل شرطیں پوری کرنی چاہئیں۔

الف

مترجم کو دونوں زبانوں پر قدرت ہونی چاہیے۔ ہر زبان کی اپنی باریکیاں' خوبیاں اور نفاستیں ہوتی ہیں۔ان کی پوری سمجھ ہونی چاہیے۔یہی نہیں بلکہ ترجمہ کرتے ہوئے ایک زبان کی خوبیوں کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔

ب

ہر زبان میں محاوروں' کہاوتوں اور روزمروں کا اپنا سرمایہ ہوتا ہے۔ ہر ادیب اور عالم اپنی مادری زبان میں لکھتے ہوئے ان کا استعمال کرتا ہے اور ان کے وسیلے سے اپنی تحریر کو رواں اور دلکش بناتا ہے۔مترجم کو اصل تخلیق / مقالے کی زبان اور ترجمے والی زبان کے محاوروں اور کہاوتوں پر یکساں قدرت ہونی چاہیے۔

ج

ہر قوم کی زبان میں اس کی تہذیب کی لطافت اور نزاکت چھپی ہوتی ہے۔اس کو اہل زبان ہی جانتے ہیں۔خاص طور سے تخلیقی ادب یعنی شاعری' افسانہ وغیرہ میں تہذیبی عناصر زیادہ جگہ پاتے ہیں۔مترجم اپنی مادری زبان کے تہذیبی پہلوؤں سے یقیناً واقف ہوتا ہے لیکن جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اس کی تہذیبی فضا سے بھی اس کی واقفیت جس حد تک ممکن ہو ضروری ہے۔

د

اگر ترجمہ کسی غیر تخلیقی تحریر' یعنی علم و فن کی کسی تصنیف کا ہو رہا ہے تو اس کے لیے اس علم یا فن کی اصطلاحات کا علم بھی ضروری ہے اور یہ علم اصل زبان اور ترجمے والی زبان دونوں کا ہونا چاہیے۔ورنہ ترجمہ ناقص رہے گا اور اس کا مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔فن ترجمہ نگاری کے ایک ماہر گوپال شرمانے ''ترجمہ اور تکنیکی اصطلاحات'' کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "Technical terms should be so mover into the texture of translation that the genius of language is not distorted."
>
> یعنی تکنیکی اصطلاحات کو ترجمے کے تار و پود میں اس طرح سمویا جانا چاہیے کہ زبان کی فطری روح مسخ نہ ہو۔''

اس کام میں بڑی دشواری اس وقت پیش آتی ہے' جب ترجمے والی زبان میں اس علم یا فن کی اصطلاحات موجود نہ ہوں۔اس صورت میں موزوں و مناسب اصطلاحات کی تلاش کی جاتی ہے اور اگر موزوں اصطلاحات نہ ملیں تو ان کو وضع کیا جاتا ہے اور اصطلاحات بنانے یا وضع کرنے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فن ترجمہ نگاری کی تعریف بیان کیجیے۔
2. فن ترجمہ نگاری میں کامیاب ترجمے کے لیے کیا شرائط ہونی چاہئیں؟

1.3 ترجمے کی قسمیں

انگریزی میں ترجمے کے فن پر تھیوڈر ساوری نے ایک کتاب شائع کی ہے۔اس نے لکھا ہے کہ ترجمے کے فن' اصولوں اور اس کے طریق کار پر عالموں اور مترجموں نے مختلف طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔تھیوڈر نے ان کا خلاصہ اس طرح کیا ہے۔

1- ترجمے میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔
2- ترجمہ اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہو۔
3- ترجمہ بالکل اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
4- ترجمے کو ترجمے ہی کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
5- ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔
6- ترجمے میں اصل متن سے حذف و اضافہ ممکن نہیں۔
7- نظم کا ترجمہ منظوم یا نثر میں ہوسکتا ہے۔

تھیوڈر ساوری کا خیال ہے کہ درحقیقت ترجمے کی دو قسمیں ہی ہوتی ہیں۔

(الف) آزاد ترجمہ

(ب) لفظی ترجمہ

وہ آزاد ترجمے کی خصوصیات گناتے ہوئے کہتا ہے کہ آزاد ترجمہ بالکل اصل کی طرح ہو۔ اسے پڑھتے ہوئے یہ بھی محسوس نہ ہو کہ وہ کس زبان سے کیا گیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مترجم اصل متن سے کچھ انحراف بھی کرسکتا ہے۔ آزاد ترجمہ کرتے وقت ایک طرح سے مترجم اصل مصنف کا فرض ادا کرتا ہے یعنی اصل مصنف کی تخلیق کے تاثر کو ترجمے میں پیش کرتے ہوئے اسے بددیانتی نہیں کرنی چاہیے۔

اس کے برعکس لفظی ترجمے میں مترجم اصل متن سے ذرا بھی انحراف نہیں کرسکتا۔ وہ متن کا پابند اور وفادار ہوتا ہے۔ دیانت داری برتنے کے باوجود اُسے ترجمے کی افادیت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ ترجمہ دلچسپی اور آسانی سے پڑھا جائے۔ اس میں پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ مترجم اپنی زبان کے محاورات اور اظہارات پر پورا عبور رکھتا ہو۔

موضوع، طریقِ کار اور تکنیک کے لحاظ سے ترجمے کی دوسری کئی قسمیں بھی کی جاسکتی ہیں۔ ترجمے تو قدیم زمانے سے ہوتے آئے ہیں لیکن ترجمے کے اصولوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ہر مترجم اپنے ڈھنگ سے ترجمہ کرنے لگتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے شروع میں مغرب میں ترجمے کا فن، اس کی اقسام اور دوسرے مسائل پر سنجیدگی سے غور و خوض شروع ہوا۔ جب کہ مشرق خصوصاً ہندوستان کی زبانوں میں بیسویں صدی میں مغرب کے زیر اثر ترجمے کے اصول وضع کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ خاص طور سے دارالترجمہ حیدرآباد میں نصابی ضرورتوں کے لیے علمی کتابوں کے ترجمے اور وضع اصطلاحات کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ ورنہ اس کے پہلے اخذ و ترجمے میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا اور فارسی یا دوسری زبانوں کی کتابوں کو اخذ و ترجمہ کرکے انہیں طبع زاد کتابوں میں شامل کرلیا جاتا تھا۔

1.3.1 تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کا ترجمہ

نثر اور نظم کی تحریروں اور کتابوں کو بالعموم دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(الف) تخلیقی ادب جیسے شاعری، ڈرامہ، افسانہ، ناول وغیرہ۔

(ب) غیر تخلیقی یا معلوماتی ادب، جس میں ہر طرح کے علوم و فنون، سائنس اور ٹکنالوجی پر لکھی ہوئی تحریریں اور کتابیں شامل ہیں۔ چوں کہ دونوں طرح کی تحریروں کے ترجمے کا طریق کار کافی مختلف یا الگ ہوتا ہے، اس لیے ان پر علاحدہ غور کیا جانا مناسب ہوگا۔

1.3.2 تخلیقی ادب کا ترجمہ

تخلیقی ادب کے ترجمے کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) شاعری کا ترجمہ

(ب) افسانوی ادب، ڈرامہ اور دوسری نثری تحریروں کا ترجمہ

1.3.3 شاعری کا ترجمہ

عام طور پر شاعری کا ترجمہ سب سے مشکل مانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ شاعری کی اصناف میں فن کی نازک خوبیاں بہت ہوتی ہیں، جن کے ترجمے میں دشواری پیش آتی ہے۔ پھر یہ کہ اکثر زبانوں کی شاعری میں اصناف الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان کے موضوعات اور فنی تقاضے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کو ترجمے میں قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً اردو زبان میں غزل، مرثیہ اور ریختی جیسی اصناف ہیں۔ انگریزی یا جرمن زبان میں ان کا وجود نہیں۔ اس لیے ان زبانوں میں ان اصناف کا کامیاب ترجمہ کرنا بہت مشکل ہوگا۔ اصناف کے فرق کے علاوہ اس مشکل کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر زبان کی شاعری میں زبان کی باریکیوں اور اس کی تہذیب کی نزاکتوں کا گہرا اثر ہوتا ہے اور ان کا استعمال ہوتا ہے، جو استعاروں، کنایوں، تلمیحات اور شعری صفتوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ان کے وسیلے سے ہی شاعر اپنے کلام میں شعریت، معنویت اور تاثیر پیدا کرتا ہے۔ اپنے تخیل اور تخلیقی ہنر سے وہ شاعری میں ایسا تانا بانا (Texture) پیدا کرتا ہے جو قاری کے جذبہ و احساس میں ارتعاش پیدا کر کے حسین معنی کی نئی دنیا سامنے لاتا ہے۔ اس لیے شاعری کے فن پاروں کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام بہت صبر آزما ہوتا ہے۔

اس مشکل پر قابو پانے کے لیے شاعری کے ترجمے میں بالعموم دو طریقے برتے جاتے ہیں۔

1- شعری تخلیق کی ہر سطر کا لفظی ترجمہ کر کے اس کے مفہوم یا شاعر کے تجربے کی کیفیت کو ادا کرنا۔

2- شعری تخلیق یا نظم کے مطالعے سے مترجم کے ذہن میں جو تاثر پیدا ہو، معنوی اور جمالیاتی طور پر شاعر کے جس تجربے کی ترسیل ہو، مترجم اپنے الفاظ میں اس کی بازآفرینی کر کے یعنی اس نظم کے خیال یا تجربے کو دوبارہ اس طرح جنم دے کہ وہ اپنے آپ میں ایک تخلیق کا درجہ اختیار کر لے۔

اس بات کو مشہور فرانسیسی شاعر پال ولیری نے اس طرح کہا ہے:

> "To translate is to reconstitute as nearly as possible, the effect of a certain cause (The Original) by means of another cause (The translation).

ترجمہ: ''ترجمہ کرنا کسی علت (اصل تخلیق) کے معلول کی ایک دوسری علت (ترجمہ) کے توسط سے امکانی قربت (صحت) کے ساتھ تشکیل نو کرنا ہے''۔

یعنی ولیری کے مطابق مترجم کی وفاداری اصل شاعر یا اس کی تخلیق سے نہیں بلکہ اُس تاثر سے ہوگی جو وہ تخلیق مترجم کے اندر پیدا کرے گی۔ اس تاثر کی بازآفرینی ہی کامیاب ترجمہ ہوگی۔ اور اس ترجمے کے عمل میں مترجم کم و بیش اسی تخلیقی عمل سے گزرے گا، جس سے کہ اصل شاعر گزرا ہوگا۔

شاعری کے تخلیقی ترجمے کا یہ بہت مثالی تصور ہے۔ اس میں اگر کسی کو کامیابی حاصل ہوئی ہے تو فارسی کے شاعر عمر خیام کی رباعیوں کے اُس ترجمے کو حاصل ہوئی جو انگریزی زبان میں فٹز جیرالڈ نے کیا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایرانی یا مشرق کے لوگ اسے ترجمہ نہیں مانتے۔ اس سلسلے میں یہ مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے کہ اگر اصل شاعر کی نظم وزن کی پابند ہے تو ترجمہ بھی پابند ہو یا آزاد ہو؟ اگر مترجم پابند نظم کا ترجمہ پابند فارم میں کرے گا تو اس کی مشکلات اور ذمے داریوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ نظم کے خیال کی ترسیل کے لیے اُسے اسی پابند فارم یا ہیئت میں ترجمہ کرنا ہوگا، جو نظم کے تاثر کو زیادہ سے زیادہ حد تک، ترجمے میں منتقل کر سکے۔

1.3.4 نثری تخلیقات کا ترجمہ

شاعری کے مقابلے میں نثری تخلیقات کا ترجمہ نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ نثری ادب میں ناول، افسانہ، ڈرامہ اور انشائیہ وغیرہ شامل ہیں۔ ڈرامے کے

فارم سے قطع نظر یہ تمام نثری تخلیقات عموماً بیانیہ نثر کا نمونہ ہوتی ہیں۔ اپنی تخلیق میں تخلیق کار عموماً بیانیہ نثر میں کچھ واقعات بیان کرتا ہے اور کچھ کرداروں کی داخلی یا خارجی زندگی کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کی نثر میں بھی تخلیقی اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ تمثیل یا تشبیہہ و استعارے سے کام لیتا ہے۔ انسانی رشتوں کی پیچیدگی پر سے بھی وہ پردہ اٹھاتا ہے۔ لیکن تخلیقی عناصر کے باوجود ان تخلیقات کے بیانیہ کا ترجمہ آسانی اور کامیابی سے ممکن ہے۔ اُردو میں دنیا کی مختلف زبانوں کے بعض عظیم افسانہ نگاروں مثلاً ٹالسٹائی، چیخوف، موپاساں اور او۔ ہنری کی تخلیقات کے بڑے کامیاب ترجمے ہوئے ہیں۔ اسی طرح کالیداس، ٹیگور، مولیر اور برنارڈ شا کے ڈراموں کے معیاری ترجمے بھی ملتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کے فن اور اصولوں کے تعلق سے تھیورڈ ساوری کا نظریہ کیا ہے؟
2. نثری ترجمے کی تعریف بیان کیجیے۔

1.4 علمی اور معلوماتی کتابوں کا ترجمہ

آج کی دنیا میں نئے خیالات اور نئی تحقیقات کی ترویج و اشاعت کے لیے علمی کتابیں کثرت سے لکھی جا رہی ہیں اور اسی نسبت سے ان کے ترجمے بھی ہو رہے ہیں۔ نئے علوم و فنون مثلاً طیرانیات (Aeronautics) یا جینیات (Genetics) بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ترقی یافتہ زبانوں میں ان سے متعلق نئے خیالات کو ادا کرنے کے لیے نئی اصطلاحات بھی وضع کی جا رہی ہیں۔ دراصل علمی کتابوں کے ترجمے میں سب سے اہم اور مشکل مسئلہ اصطلاحات کا ہے۔ اس لیے کہ علمی کتابوں کے ترجمے میں شاعری کے ترجمے کی طرح آزادی نہیں برتی جا سکتی نہ ہی اس کے مضمون یا خیال کی باز آفرینی کو ترجمے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ علمی کتابوں کا ترجمہ بالکل اصل کے مطابق ہونا چاہیے۔ آل احمد سرور نے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

> ''علمی کتابوں کے ترجمہ میں آزاد ترجمے یا اصل خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں صرف لفظی ترجمہ یا مطابق اصل ترجمہ یعنی (Literal and Faithful) پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ لفظی ترجمہ میں لسانیات کے رو سے ایک متنی اظہار کو دوسرے متبادل متنی اظہار میں منتقل کرنا ہوتا ہے''۔
>
> (ترجمہ کا فن اور روایت۔ ص 54)

مغرب کی زبانوں میں مختلف علوم کے لیے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اصطلاحات بنائی گئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں مشرقی زبانوں مثلاً اردو میں علمی اصطلاحات کا سرمایہ بہت کم ہے۔ اس لیے بڑا مسئلہ اصطلاحات وضع کرنے یا انھیں دوسری زبانوں سے لینے کا ہے۔ اس سلسلے میں وحید الدین سلیم اور دارالترجمہ حیدرآباد کے مترجمین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ عام اتفاق رائے یہ ہے:

1. اردو ہند آریائی زبان ہے لیکن علمی اور ادبی سطح پر اس نے عربی اور فارسی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس لیے اردو میں نئی اصطلاحات گڑھنے میں فارسی، عربی اور سنسکرت تینوں زبانوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔
2. انگریزی زبان سے بھی اہل اردو مانوس رہے ہیں اور آج بھی تعلیمی نظام میں اس کا اثر ہے۔ اس لیے انگریزی زبان میں رائج ایسی اصطلاحات اردو میں لے لی جائیں، جو صوتی اعتبار سے اردو سے قریب ہیں۔ کچھ انگریزی اصطلاحوں کو اردو کی خراد پر چڑھا کر شامل کیا جا سکتا ہے۔
3. مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والی بے شمار اصطلاحیں، جو عوام میں رائج ہیں ان کو بھی اردو کی اصطلاحات کے ذخیرے میں شامل کر لینا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. علمی اور معلوماتی ترجمے کے بارے میں آل احمد سرور اور وحید الدین سلیم کے کیا تاثرات ہیں؟

1.5 خلاصہ

کسی بھی ملک کی تہذیبی اور علمی ترقی کے لیے ترجمہ بہت ضروری ہے۔ خصوصاً آج کی دنیا میں جب علم کا دھماکہ (Explosion of Knowledge) ہر طرف سنائی دے رہا ہے۔ ترجمہ تخلیقی ادب کا بھی ضروری ہے اور علمی کتابوں کا بھی۔ ترجمے میں اس بات پر زور ہونا چاہیے کہ وہ اصل زبان کی تخلیق یا اس کے متن سے قریب اور اس کا وفادار ہو۔ اصطلاح سازی کے کام میں اعتدال برتا جائے۔ یعنی اصطلاحات مشکل اور نامانوس نہ ہوں۔ اور اردو زبان کے مزاج سے میل کھاتی ہوں۔

1.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کی اقسام پر تفصیل سے بحث کیجیے۔
2. ترجمہ نگاری کے فن پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. کامیاب ترجمے کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
2. شاعری کے ترجمے کی مشکلات بیان کیجیے۔
3. علمی کتابوں کے طریقۂ کار اور اصطلاح سازی کے اصولوں سے بحث کیجیے۔

1.7 فرہنگ

لغوی = لغت سے منسوب
اصطلاح = کسی علم وفن یا حرفے کا تشریح طلب خاص لفظ
تاروپود = تانا بانا
مسخ کرنا = صورت خراب کرنا
متن = کتاب کی اصل عبارت
حذف = کم کرنا، نکالنا، دور کرنا
انحراف = پھر جانا، راستے سے ہٹنا
ارتعاش = رعشہ، کانپنا، تھرتھراہٹ
علت = وجہ، سبب
معلوم = وہ شئے جس کا کوئی سبب ہو، نتیجہ، حاصل
بازآفرینی = پھر پیدا کرنا، کسی تجربے، مشاہدے یا تخلیق کو دوبارہ پیش کرنا۔

1.8 سفارش کردہ کتابیں

-1 پروفیسر قمر رئیس — مرتبہ : ترجمہ کا فن اور روایت
-2 ڈاکٹر خلیق انجم — مرتبہ : فن ترجمہ نگاری
-2 وحیدالدین سلیم — اصول وضع اصطلاحات

اکائی: 2 ترجمے کے بنیادی اصول ونظریات

ساخت

2.1 تمہید

2.2 ترجمہ کیا ہے؟

2.3 تھیورڈ ساوری کے تالیف کردہ اصول ونظریات

2.4 لفظ، محاورے، عبارت اور اسلوب کا ترجمہ

2.5 اصول اصطلاح سازی

2.6 مترجم کے بنیادی فرائض

2.7 ترجمے کے تین اہم میدان

5.8 خلاصہ

5.9 نمونۂ امتحانی سوالات

5.10 فرہنگ

5.11 سفارش کردہ کتابیں

2.1 تمہید

ترجمے کا فن اتنا قدیم ہے جتنا کہ انسان کی سماجی زندگی ہے۔ جب انسان نے ایک سماجی گروہ کے طور پر رہنا شروع کیا تو اسے اپنے آس پاس کے رہنے والوں سے سماجی رشتے قائم کرنے کی ضرورت پڑی۔ سماجی گروہوں میں سماجی اور علاقائی دوریوں کے باعث ان گروہوں کی زبانیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی تھیں یا پھر ان میں اتنا فرق ہوتا تھا کہ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے لوگوں کی زبان پوری طرح نہ سمجھ پاتا تھا۔ انسانی متنوع خواہشات کا مجسمہ ہے۔ یہی خواہشات ضروریات میں بدلتی ہیں اور ضروریات مختلف قوموں اور لسانی گروہوں میں لین دین کے عمل کو جنم دیتی ہیں اور مختلف لسانی گروہوں میں لین دین کی خواہش وضرورت کی باقاعدہ تکمیل کے لیے ترجمے کا فن اور اصول جنم لیتے ہیں۔ ترجمے کے ذریعے اس لین دین کے فن میں باقاعدگی لانے کے لیے باقاعدہ اصول وضوابط بنائے جاتے ہیں تاہم ابھی تک مبسوط اور قبول عام اصول مرتب نہیں کیے گئے ہیں۔ اس اکائی میں انہیں ترجمے کے بنیادی اصول ونظریات سے متعلق مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی۔ بقول ظ انصاری:

> ''علوم مثلاً لغت سازی، صرف ونحو، معانی وبیان، اصطلاح سازی وغیرہ پر ہر زمانے میں توجہ دی گئی ہے لیکن ترجمے کے مسائل پر صرف بحث کی گئی۔ اس کے باقاعدہ اصول مرتب نہیں کیے گئے۔''

ترجمے کے بغیر دنیا کے بیشتر کام نہیں چل سکتے۔ قدیم زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک دنیا میں ہونے والی علمی، فنی، سائنسی اور ٹیکنیکل معلومات ہمیں ترجموں کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں فنی اور تکنیکی دریافتیں، انکشافات اور معلومات بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور یہ دریافتیں اور معلومات ہر ملک کے لیے ضروری ہیں۔ ملک ترقی یافتہ ہو، ترقی پذیر ہو یا پس ماندہ ہو، یہ مقصد صرف ترجمے کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔

دنیا کے تمام ترقی پذیر اور پس ماندہ ملکوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ علمی آگہی، نئی نئی دریافتوں اور عالمی بصیرتوں کو بڑے پیمانے پر کم سے کم وقت میں حاصل کریں کیوں کہ یہ اُن کی موت اور زندگی کا سوال ہے۔

2.2 ترجمہ کیا ہے؟

گوئٹے کا قول ہے کہ ''جملہ امورِ عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ بھی شامل ہے'' لیکن گوئٹے کے مدنظر عالمی ادب کا ایک عظیم الشان نصب العین تھا اور جیسا کہ اقبال نے پیام مشرق کے دیباچے میں لکھا ہے اس کے لیے مغرب و مشرق کا ادب انسانیت کا مشترکہ سرمایہ تھا۔

ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ''پار لے جانا''۔ اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے کہ نہیں، یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کر نقل معانی تک پھیلا ہوا ہے، اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ عربی زبان سے آیا ہے۔ اہلِ لغت اس کے کم سے کم چار معنی درج کرتے ہیں۔ ایک سے دوسری زبان میں نقلِ کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کے احوال کا بیان۔ اور یہ سب معانی باہم مربوط ہیں۔ ترجمہ ایک ایسا پیچیدہ اور مشکل عمل ہے جس کے ذریعے کسی تصنیف کو اس کی جملہ خصوصیات کے ساتھ اصل زبان سے کسی دوسری زبان میں کچھ اس طرح منتقل کیا جائے، جس کے باوصف ترجمے کی زبان میں اصل تصنیف دوبارہ اپنی پرانی شکل میں زندہ جاوید ہو جائے۔

''عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔'' یہ خیال تقابلی ادبیات کے فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر البرٹ گیرارڈ نے اپنی عمدہ تصنیف ''مقدمہ ادب عالم'' میں ظاہر کیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ بڑی دردمندی سے یہ ٹھوس حقیقت بھی تسلیم کی تھی کہ ''ترجمہ نام ہے ایک سعی نامشکور کا جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے۔''

ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں لیکن جدید عہد میں یہ ایک ضرورت بھی ہے، جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنے، اسے گلوبل علم سے واقف کرانے اور جدید ٹکنالوجی کا ساتھ دینے کے لیے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔

ترجمے کے ذریعے صرف زبان کی سطح پر ہی انسانی علوم میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ ذہنی کشادگی کے ذریعے بعض اوقات معاشرے کے بنیادی مزاج اور رہن سہن میں بھی ایک تغیر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ترجمے کا دائرہ صرف ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام انسانی علوم اور دریافتیں اس میں شامل ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ علم یا دریافت کسی قوم کی میراث نہیں ہوتی بلکہ پوری نسل انسانی اس سے استفادہ کرتی ہے تو دراصل اس کا وسیلہ ترجمہ ہی ہوتا ہے، جس کے ذریعے قومیں عالمی تناظر میں نہ صرف ایک دوسرے کے جذبات و احساسات میں شریک ہوتی ہیں بلکہ ایک دوسرے کے علمی اور تحقیقی کاموں سے بھی فیض حاصل کرتی ہیں۔

یہ المیہ ہے کہ تیسری دنیا میں، جہاں اس کی سخت ضرورت ہے، ترجمے کو اب تک حقارت کی نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہی حقیر کام کم سے کم مغرب میں ایسے لوگوں نے بھی انجام دیا ہے، جو اپنی اپنی زبانوں کی آبرو رہے ہیں۔ اردو میں سجاد حیدر یلدرم، منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور حسن عسکری اور شاعری میں اقبال سے لے کر شان الحق حقی نے تراجم کیے ہیں۔ اردو دنیا میں اور فرانسیسی میں بودلیر سے لے کر آندرے ژید تک کتنے بڑے فنکاروں نے خود کو مترجم کہلانے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کی۔ بلکہ آندرے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر ادیب کے لیے لازم ہے کہ عالمی ادب کا کم سے کم ایک شاہکار اپنی زبان میں منتقل کرے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تخلیق کے مقابلے میں ترجمے کا کام نفی خودی کا مظہر ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ پھر یہ کام اثبات خودی کے پیغمبر حضرت علامہ نے کیوں انجام دیا۔ شاید اس لیے کہ اسرارِ خودی سے ہی نہیں رموز بے خودی سے بھی ان کا رشتہ اتنا ہی گہرا تھا۔ ترجمہ کرنے کی صلاحیت کا احساس مانند اسرارِ خودی ہے جب کہ مصنف اور تصنیف میں ضم ہو کر کامیاب ترجمہ کرنا مثل رموز بے خودی ہے۔

ترجمہ ایک نہایت مشقت طلب کام ہے اور جو طبیعتیں اس کے برخلاف تعصب اور مزاحمت سے کام لیتی ہیں، درحقیقت محنت سے جان چراتی ہیں۔ ترجمہ ایک فن ہے اور جملہ فنون کی طرح اس فن میں بھی کمال اور بے کمالی کے ہزاروں مدارج موجود ہیں۔ ترجمے کی بہت سی اقسام ہیں اور یہ کام

بازار سے لے کر اقوام متحدہ تک اور اخبار سے لے کر وی۔ سی۔ آر تک کسی نہ کسی شکل میں چلتا ہی ہے۔ عام زندگی میں بھی ترجمے کا معیار قدرے بہتر ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو فن کے طور پر نہ سہی' ایک روزمرہ ہنر کی طرح سے ہی سیکھنے سکھانے کا ماحول پیدا کیا جا سکے نیز فن ترجمہ جملہ فنون کی طرح لامتناہی عمل پیہم اور ریاض کا متقاضی ہے اور جس قدر لگن و محنت کے ساتھ مترجم' ترجمہ کرتا جائے گا اس کے فن میں نکھار آتا جائے گا۔ فن کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ محض تعلیم و تعلم سے نہیں آتا' گرچہ اس میں بھی ایک عنصر ہنر کا ضرور ہوتا ہے جو ماہرانہ تربیت سے نکھر سکتا ہے۔ لیکن ترجمے کا ہنر اس لحاظ سے خاصا پیچیدہ ہے کہ اس میں دہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ متن کی زبان اور اپنی زبان پر خیر عبور ہونا ہی چاہیے۔ اس موضوع سے بھی طبعی مناسبت درکار ہے جو متن میں موجود ہے۔ مصنف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے اور اس صنف ادب سے بھی لگاؤ ضروری ہے جس میں متن پیوست ہے۔

علمی اور تکنیکی ترجمے کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کی تاریخ' طرز فکر اور طریقۂ کار کو بھی اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے معاشرے میں عمومی آگہی اور ذہنی میلان پیدا ہوگا اور جب تک اجتماعی سطح پر کوئی علمی سرچشمہ وجود میں نہیں آتا' تب تک ٹکنالوجی کے خریدار خریدار ہی رہتے ہیں۔ اس کے تولید کار نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو نظام تعلیم تحقیقی ترقیاتی اہلیت رکھنے والے افراد پیدا نہیں کر سکتا۔ محض رسمی تعلیم اور رسمی نصاب کے ذریعے چاہے وہ کسی زبان میں ہو دور رس نتائج حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے اشد ضروری ہے کہ طرز فکر اور طریقۂ کار کی منتقلی کو بھی ترجمے کے ذریعے یقینی بنایا جائے۔

ترجمے کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک تو مشینی ترجمہ ہے اور دوسرا تخلیقی ترجمہ۔ مشینی ترجمے کا مقصد ہے انسانی زبانوں میں باہمی ترجمے کے عمل کو کمپیوٹر کی مدد سے آسان بنانا' تاکہ تعلیمی' تکنیکی' معلوماتی اور تبلیغاتی مسالہ کم سے کم وقت میں تیار ہو سکے۔ تقریباً نصف صدی پہلے جب ایک ''خودکار مترجم'' تیار کرنے کے لیے ابتدائی تحقیق شروع ہوئی تھی' تو یہ توقع پورے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی تھی کہ جلد ہی ایک ایسا آلہ ایجاد ہو جائے گا' جس کے ایک طرف زیراکس مشین کی طرح کسی زبان کے متن کو داخل کیا جائے تو دوسری طرف سے مطلوبہ زبان کا ترجمہ کھٹ سے باہر نکل آئے گا۔ اس دوران میں جدید زبان شناسی کے ماہرین نے مختلف زبانوں کے اجزائے ترکیبی کا تقابلی مطالعہ کر کے واضح کر دیا ہے کہ مشینی ترجمہ بھی آسان کام نہیں۔ چنانچہ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ کمپیوٹر میں لسانیاتی پروگرام بھرنے کے بعد بھی لسانی ماہرین مترجمین اور ترجمے کے مدیروں کی ضرورت برقرار رہے گی۔ نتیجتاً مشینی ترجمے کے باعث خدشہ ہے کہ مترجمین اور ترجمے کے مدیروں کی قلت مزید بڑھے گی۔

وقت اور سرمائے کی بچت شاید پھر بھی نہ ہو سکے۔ تاہم دنیا کے کئی ملکوں میں مزید تحقیق جاری ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ پوری طرح خودکار نہ سہی مشینی ترجمہ کسی قدر آسان ضرور ہو جائے گا۔ تاہم اس کا دائرہ کار ایسی زبان تک محدود رہے جس میں زبان کو تہہ در تہہ معنویت کے ساتھ استعمال نہ کیا گیا ہو۔ ان تمام کے باوجود مدیر کی ضرورت پڑے گی اور جب تک مدیر خود اچھا مترجم نہ ہو یا نہ رہا ہو تب تک ترجمے کا اچھا مدیر نہیں بن سکتا۔ مشینی ترجمے کی روایت کے عام ہونے کی صورت میں مترجمین کی کمی کا احساس مزید ہوگا نتیجتاً مدیروں کی بھی قلت ہوگی تو ایسی صورت میں مشینی ترجمے کی تصحیح کون کرے گا؟

اس کے برعکس تخلیقی ترجمہ تو ہوتا ہی ایسی تخلیقات کا ہے' جو تہہ در تہہ معنویت کی حامل ہوں اور یہ ترجمے کی سب سے مشکل بلکہ تقریباً ناممکن قسم ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ ادب میں متعدد تخلیقی فن کاروں نے اسے کلیتہً خارج از امکان قرار دے دیا ہے۔ اس کے باوجود شیلی کے تراجم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی شاعر کسی ایسے متن کو منتخب کرے جو اس کی طبیعت سے ہم آہنگ ہو تو فن ترجمہ کتنی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ تخلیقی ترجمہ ایک ایسے اتفاقی حادثے کا نام ہے' جس کی پیش بینی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ مختلف زبانوں میں ایسی لفظ بلفظ مماثلت نہیں ملتی جو بامعنی ہو اور درست بھی تاہم تخلیقی ترجمے کرنے والوں نے ایسی مماثلتیں دریافت کی ہیں' جہاں نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے تخیل سے پیدا کر کے دکھایا ہے' چنانچہ ترجمے کی یہ قسم آزادی اور پابندی کے درمیان ایک جدلیاتی کشمکش کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور جب یہ تضاد اعلیٰ سطح پر موزوں و متناسب موافقت اور مطابقت کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو فن ترجمہ کو معراج نصیب ہوتی ہے۔

لیکن عام قسم کا لفظ بلفظ ترجمہ جس میں اصل زبان کی زندگی مفقود ہو یا ایسا رواں دواں اور آزاد ترجمہ جس میں اصل کی تہہ در تہہ معنویت قربان ہو جائے' اردو میں محمد حسن عسکری اس قسم کے رواں ترجمے کو جس میں اصل متن کے اسلوب بیان کو کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا ہو اور اس کی جگہ مماثل اور متوازی اثر پیدا کرنے کی کوشش بھی نہ کی گئی ہو' لایعنی قرار دیتے ہیں اور ایسے ترجموں سے عالمی ادب کی یا اپنی زبان کی کوئی خدمت نہیں ہوتی۔ اصولی طور پر ایسے

ترجموں کو تلخیص یا تسلی کی ایک مشق تو سمجھا جا سکتا ہے کوئی تخلیقی کمال نہیں سمجھا جا سکتا۔ دراصل تخلیقی سطح کا ہر ترجمہ اپنے ساتھ ایک نیا مسئلہ لے کر آتا ہے کیوں کہ اس کا رابطہ ایک ایسے متن سے ہوتا ہے جو اپنی زبان میں ایک مثالی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

تخلیقی ترجمے سے ایک دوسری مراد ادبی اور تخلیقی تحریروں کے تراجم ہیں اور انہیں پر سب سے زیادہ اختلافی باتیں ہوتی ہیں' کیوں کہ سائنسی یا علمی موضوعات کا ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاحوں پر تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مفہوم کی ترسیل میں فرق نہیں ہوتا لیکن ادبی ترجموں میں اصل جھگڑا اس وقت پیدا ہوتا ہے' جب یہ اعتراض کیا جائے کہ لکھنے والے کا اصل مفہوم یا تحریر کا مزاج تو ترجمے میں آیا ہی نہیں۔ پھر اصناف کی باریک بینیاں بھی اکثر ترجمے میں حائل ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر نظم کے برعکس غزل کا ترجمہ کہیں مشکل ہے' کیوں کہ غزل کے خیال کو تو آسانی سے دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی مزاجی کیفیت اور ہیئتی دبازت کا ترجمہ آسان نہیں۔

ہر زبان و ادب کا ارتقا کسی مخصوص سماجی اور تہذیبی پس منظر میں ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر تخلیقی فن پارے کا اپنا ایک تہذیبی سانچہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ترجمے کا تعلق تہذیبی سانچے سے ہوتا ہے۔ دراصل ترجمے کا فن انسانیت کی تاریخ میں ایک بین الاقوامی نقطۂ نظر کی پیداوار بھی ہے اور ایک بین الاقوامی اندازِ نظر پیدا کرنے کا وسیلہ بھی۔ یہ دو تہذیبوں اور دو زبانوں کے درمیان اتحاد کا ایک عمل ہے اور یہ اتحاد یک طرفہ نہیں ہو سکتا۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ زبان کی سرحدوں کو پار کر کے باہم مفاہمت کی فضا پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ترجمے کی عربی تعریف کے مطابق ترجمہ 'نقل کلام' کو کہتے ہیں۔ نقل مطالب یا نقل معانی کو نہیں کہتے اور نقل کلام کا تقاضا یہی ہے کہ جس زبان میں نقل ہو جائے اس میں تقریباً ویسا ہی اثر پیدا ہو جیسا اصل زبان میں پیدا ہوا تھا اور یہ بھی لازمی ہے کہ کلام سے مکالمے کی صورت پیدا ہو ورنہ ترجمے کا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. گوئٹے نے ترجمے کے بارے میں کیا کہا ہے؟
2. دنیا کے علوم تک انسان کی رسائی کا وسیلہ کیا ہے؟
3. ترجمے کی دو بڑی قسمیں کون سی ہیں نیز تخلیقی ترجمے سے کیا مراد ہے؟

2.3 تھیوڈر ساوری کے تالیف کردہ اصول و نظریات

تھیوڈر وساوری نے 'آزاد اور لفظی ترجمہ' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جسے آصفہ جمیل نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس اردو ترجمے کو پروفیسر قمر رئیس نے اپنی مرتبہ کتاب 'ترجمے کا فن اور روایت' میں شامل کیا ہے۔ تھیوڈر کا کہنا ہے کہ ترجمہ کرنے والوں کو ہمیشہ ترجمے کے فن کے بارے میں ہر ممکن معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ مترجم کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہر فن میں تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو آپ کو ہدایت دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو آپ کی اصلاح کرتے ہیں اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو خود کو بہتر ثابت کرنے کے لیے بغیر کچھ جانے آپ پر تنقید یا نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان تینوں میں سب سے اہم وہ لوگ ہیں جو آپ کو ہدایت دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے متعلقہ فن کے بارے میں ممکنہ معلومات حاصل کی ہیں اور ان کی دلیلوں کی بنیاد اصولوں اور نظریات پر ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترجمے کے اصول کیا ہونے چاہئیں۔ ترجمے کے اصول مختصر طور پر بیان کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر ہم چاہیں کہ ترجمے کے اصولوں کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کریں تو یہ کام بہت مشکل ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں ترجمے کا کام بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے، لیکن ترجمے کے ایسے اصول ابھی تک وضع نہیں کیے گئے جنھیں دنیا کے تمام مترجم تسلیم کرتے ہوں۔ تمام فنون میں ایسے ماہرین کی تعداد خاصی ہوتی ہے جو متعلقہ فن کے اصول اور نظریات مرتب کرتے ہیں لیکن یہ ترجمے کے فن کی بدنصیبی ہے کہ اس کے لیے باقاعدہ اصول ابھی تک مرتب نہیں کیے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ترجمے کے فن کو ایسے لوگ نہیں ملے جو باقاعدہ اصول مرتب کرتے۔ جن لوگوں نے ترجمے کے تھوڑے بہت اصول بنائے ہیں یا جن لوگوں کو ترجمے کا عملی تجربہ ہوتا ہے ان کا آپس میں بہت اختلاف ہوتا ہے۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی مشہور مترجم نے روانی میں ترجمے کا کوئی اصول وضع کر دیا۔ بعض مترجم اسے تسلیم کرتے ہیں اور بعض اس سے اختلاف۔ مختلف مترجموں کے بیانات

کا اگر ہم جائزہ لیں تو اُنھوں نے جو اصول مرتب کیے ہیں ان میں اتنے اختلافات ہیں کہ کوئی مترجم جب ان اصولوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس اصول کو مانے یا کس اصول کو نہ مانے۔

تھیوڈر نے ترجمہ نگاری کے درج ذیل مختلف اصول ونظریات کی فہرست دی ہے:

1- ترجمہ میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔

2- ترجمہ اصل متن کے معانی ومفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔

3- ترجمہ اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

4- ترجمہ کو ترجمہ کی ہی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

5- ترجمہ میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔

6- ترجمہ کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہیے۔

7- ترجمہ اصل متن کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

8- ترجمہ کو مترجم کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

9- ترجمہ میں اصل تصنیف سے حذف واضافہ کیا جاسکتا ہے۔

10- ترجمہ میں اصل متن سے حذف واضافہ کبھی ممکن نہیں۔

11- نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔

12- نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہیے۔

تھیوڈر نے مختلف اصولوں کی جو فہرست دی ہے، اس میں اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔

یہاں میں شاہ ولی اللہ کے صاحب زادے شاہ محمد رفیع الدین کے قرآن شریف کے ترجمے کا ذکر کروں گا۔

یہ ترجمہ 1776ء میں کیا گیا تھا۔ اُس زمانے تک اردو نثر خاصی صاف، سادہ اور رواں ہو چکی تھی۔ لیکن چوں کہ شاہ محمد رفیع الدین کو یہ خیال تھا کہ قرآن شریف کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ ترجمے میں ایسی کمی وبیشی نہ رہ جائے جس سے قرآن شریف کا مفہوم بدل جائے۔ اس لیے اُنھوں نے یہ اہتمام کیا کہ قرآن شریف کے ہر لفظ کا ترجمہ عربی عبارت کے مطابق کیا۔ شاہ محمد رفیع الدین نے قرآن شریف کے ہر لفظ کے نیچے اردو کا مناسب ترین لفظ لکھ دیا اور عبارت کی وضاحت نہیں کی۔ اس اہتمام سے قرآن شریف کی عبارت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن ترجمے کا بیشتر حصّہ اردو محاورے کے خلاف ہو گیا اور بعض مقامات پر اصل عبارت کی انتہائی پابندی کرنے کی وجہ سے عبارت گنجلک ہو گئی۔ چوں کہ اصل عبارت کی وضاحت کے الفاظ نہیں بڑھائے گئے۔ اس لیے معنی ومفہوم واضح نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ناقابلِ فہم ہو گیا۔ عربی میں فاعل اور مفعول سے پہلے فعل آتا ہے۔ شاہ محمد رفیع الدین نے ترجمے میں الفاظ کی یہی ترتیب رکھی، جو اردو کے قواعد اور صرف ونحو کے اصولوں کے خلاف ہے۔ شاہ محمد رفیع الدین کے اُس ترجمے کی یہ تاریخی اہمیت ہے کہ اردو میں قرآن کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ نقشِ اوّل میں جو کمی رہ جاتی ہے، وہ اس ترجمے میں ہے۔ شاہ محمد رفیع الدین کے بھائی شاہ عبدالقادر نے جب شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی کوتاہیاں دیکھیں تو انھیں اندازہ ہوا کہ یہ ترجمہ بہت زیادہ لفظی ہونے کی وجہ سے خلافِ محاورہ اور بیشتر مقامات پر ناقابلِ فہم ہو گیا ہے۔ 1790ء میں اُنھوں نے 'موضح القرآن' کے نام سے خود قرآن شریف کا ترجمہ شائع کیا۔

شاہ عبدالقادر نے لفظی ترجمے پر آزاد ترجمے کو ترجیح دی۔ یہ آزاد ترجمہ بس اس حد تک آزاد ہے کہ اُنھوں نے یہ خیال رکھا کہ قرآن شریف کا ترجمہ پڑھنے والا قرآن کو آسانی سے سمجھ سکے، اس لیے اُنھوں نے کوشش کی کہ قرآن شریف کا مفہوم ایسی اردو میں بیان ہو جائے کہ پڑھنے والا اسے آسانی سے سمجھ سکے۔ اُنھوں نے عربی الفاظ کے لیے ایسے اردو الفاظ منتخب کیے اور ایسے اردو الفاظ کا التزام کیا جو عوام میں رائج ہو۔

شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کا اردو میں جو ترجمہ کیا ہے، اس سے پہلی بار اردو میں ترجمے کے یہ تین اصول مرتب ہوئے:

1- یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ مترجم اصل متن کے ہر لفظ کے نیچے اس کا ہم معنی لفظ لکھ دے۔ اس طرح کے ترجمے سے عبارت گنجلک ہو جاتی ہے، بیشتر مفاہیم ناقابلِ فہم ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اصل متن کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

2- دوسرا اصول یہ مرتب ہوا کہ مترجم یہ خیال رکھے کہ وہ کن لوگوں کے لیے کتاب کا ترجمہ کر رہا ہے۔ اگر وہ ایسے لوگوں کے لیے ترجمہ کر رہا ہے جو فارسی اور عربی سے واقف ہیں تو اس کو یہ آزادی ہے کہ ترجمے میں عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کرے، جو اس کے پڑھنے والوں کی سمجھ میں آسکیں۔ مترجم اگر ان زبانوں یعنی عربی اور فارسی کے اجنبی الفاظ کا استعمال کرے گا تو ترجمہ مشکل ہوگا اور اجنبی الفاظ کی وجہ سے اس میں رکاوٹ سی پیدا ہو جائے گی اور عبارت میں روانی نہیں رہے گی۔

3- تیسرا اصول یہ مرتب ہوتا ہے کہ اگر ترجمہ عام لوگوں کے لیے کیا جا رہا ہے تو ترجمے کی زبان، آسان اور قابلِ فہم ہو۔ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جنھیں کم پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھ سکیں۔ عربی اور فارسی الفاظ سے بوجھل ترجمے کی ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس کے قارئین کا حلقہ بہت پڑھے لکھے لوگوں تک محدود ہو جاتا، اگر زبان آسان اور عام فہم ہو تو ہر طبقے کے لوگ ترجمے کو شوق سے پڑھیں گے۔

ترجمے کے بارے میں جو مختلف نظریات ہیں۔ اب ہم ان کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

ترجمے کے بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ترجمہ ایسا صاف، رواں، سلیس اور شستہ ہونا چاہیے کہ وہ تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔ ایسا ترجمہ کرنا ہرگز ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی ایسی دو زبانیں نہیں ہیں، جن میں ایک زبان کے تمام الفاظ کے مترادفات اس زبان میں ہوں جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اگر مترجم یہ کوشش کرے گا کہ وہ اصل عبارت سے قریب تر رہے اور لفظی ترجمہ کرے تو ترجمے میں یقیناً اصل تصنیف کی روانی نہیں ہوگی۔ اس بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ترجمہ، اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔ یہ صرف سائنسی، ٹیکنیکل اور ریاضی کی کتابوں میں تو کافی حد تک ممکن ہے لیکن ادبی کتابوں میں اس لیے ممکن نہیں کہ ہر زبان کا مصنف اپنی عبارت میں ایسے الفاظ، محاورے، کہاوتیں اور روزمرّہ استعمال کرتا ہے، جن کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔

ترجمے کے بارے میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ یہ نظریہ کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر مترجم کوشش کرے کہ اس کے ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک نظر آئے تو مترجم پر دوہری پابندی عائد ہو جائے گی۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسا ترجمہ کرے جو منشائے مصنف کے مطابق ہو، یعنی ترجمہ اصل تصنیف سے قریب ترین ہو۔ اس پابندی پر مترجم کے لیے ایسے الفاظ کی تلاش ضروری ہو جاتی ہے، جس سے ترجمہ اصل تصنیف سے قریب ہو جائے اور پھر اگر 'اسلوب کی جھلک' کی پابندی عائد کر دی جائے تو مترجم اس ذمے داری سے ہرگز عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ہر زبان میں تمام مصنفوں کا اسلوب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مصنف اپنی ہی زبان کے دوسرے مصنف کے اسلوب کی پیروی کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ اردو میں کئی مصنفین نے غالبؔ کے اردو خطوط کے اسلوب کی نقل کرنے کی کوشش کی، لیکن کسی ایک کو بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ترجمے میں مصنف اور مترجم کی زبانیں بھی مختلف ہوتی ہیں، اس لیے کوئی بھی مترجم مصنف کے اسلوب کی پیروی میں کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر مترجم مصنف کے اسلوب کی پیروی کی کوشش کرے گا تو اس سے ترجمے کی خوبی متاثر ہوگی، اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ مترجم اگر صاحبِ طرز مصنف ہے اور وہ اپنی طرز اور اسلوب میں ترجمہ کرے، تب بھی ترجمہ اچھا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ترجمے پر مترجم کی شخصیت چھا جائے گی۔ اس لیے مترجم کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ ترجمے کو اپنے منفرد اسلوب کے سانچے میں ڈھالے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ترجمہ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ مترجم کے ہم عصر کی عبارت معلوم ہو۔ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کیوں کہ ہر تصنیف میں اس کے زمانے کی تہذیبی اور سماجی زندگی کے حوالے ہوتے ہیں۔ ترجمے کو مترجم کے عہد کی عبارت کی کوشش میں اصل تصنیف کے بہت سے تاریخی اور تہذیبی حوالوں کو ترک کرنا پڑے گا اور یہ ترجمے کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔

ترجمے کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہر تصنیف میں مصنف کی شخصیت اور اس کے عہد کے بہت سے حوالے ہوتے ہیں۔ کیا ہم انھیں حذف کر دیں۔ مصنف کی تحریر میں کچھ مقامات ایسے ہوتے ہیں جو مترجم کے لیے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں یا مترجم تو ان مقامات کو بخوبی سمجھ لیتا ہے' لیکن وہ سوچتا ہے کہ مصنف کی تحریر میں بعض مقامات ایسے ہیں جو بہت سے پڑھنے والوں کے لیے ناقابلِ فہم ہوں گے یا ان کا مطالعہ مفید نہیں ہوگا یا مصنف نے کچھ باتیں ایسی کہی ہیں جو مترجم کے ذاتی عقائد و نظریات سے مختلف ہیں تو کیا مترجم کو یہ حق ہے کہ وہ متعلقہ عبارت حذف کر دے۔ اسی طرح ایسی کچھ مثالیں ہیں کہ مترجم کو کسی متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنا ہے یا اس کا ترجمہ کرنا ہے وہ تنقیدی اڈیشن کی تیاری میں یا ترجمے کے دوران متن میں اپنے عقائد اور نظریات سے متعلق کچھ عبارت کا اضافہ کر دیتا ہے۔ اضافہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو مترجم اپنے عقائد اور نظریات کی تبلیغ کے لیے متن میں عبارت کا اضافہ کر دیتا ہے، جس کی اسے ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی۔ دوسرے اصل تصنیف میں کچھ ایسے مقامات ہوتے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔ مترجم کو یہ حق ہے کہ وضاحت کے لیے کچھ عبارت کا اضافہ کر دے۔ لیکن یہ وضاحتی عبارت مختصر ہو اور صرف اتنی ہو جس سے تصنیف کے ناقابلِ فہم حصّے پڑھنے والے کی سمجھ میں آ جائیں۔ یہ وضاحت اتنی طویل نہیں ہونی چاہیے کہ ترجمہ اصل تصنیف کی تفسیر بن جائے۔

نظم کے ترجمے کے بارے میں ایک نظریہ یہ ہے کہ نظم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ نثر میں کیا جائے۔ اوّل تو بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ بہت دشوار کام ہے اور بعض اوقات ناممکن کی حد تک دشوار ہے۔ انگریزی کے مشہور نقاد جانسن کا قول ہے کہ 'نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔' اگر نظم کا ترجمہ نثر میں کیا جائے تو کچھ حد تک قابلِ برداشت ہوتا ہے اگر نظم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے تو اصل نظم کے ساتھ سخت ناانصافی ہے' کیوں کہ اس طرح کے ترجموں میں اصل متن میں شاعر کچھ کہتا ہے اور مترجم کچھ اور ترجمہ کرتا ہے۔ نظم میں عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اپنے خیال کو شعر کے سانچے میں اس طرح ڈھالتا ہے کہ شعر کے ایک سے زیادہ مفہوم ہو جاتے ہیں، اس لیے شاعروں کے کلام کی شرح لکھی جاتی ہے۔ غالبؔ کے اردو کلام کی کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور ان شرحوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اشعار کو اپنی فکر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے ایک ایک شعر کے کئی کئی مفاہیم رائج ہو جاتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مترجم کیا سبھی مفاہیم کا ترجمہ کرے یا صرف ایک کا۔ سبھی مفاہیم کے ترجمے سے ترجمہ نہیں، دوسری زبان میں ایک اور شرح ہو جائے گی اور اگر مترجم صرف ایک مفہوم کا ترجمہ کرے تو کس مفہوم کو ترجیح دے اور یہ ضروری نہیں کہ مترجم نے جس مفہوم کو ترجمے کے لیے ترجیح دی ہے، وہ صحیح یا زیادہ لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اگر نظم کا ترجمہ کرنا ہی ضروری ہے تو نثر میں ترجمہ کرنا بہتر ہوگا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے سے متعلق تھیورڈ کے تالیف کردہ 12 اصول کیا ہیں؟
2. 1776ء میں قرآن شریف کا لفظی ترجمہ کس نے کیا تھا؟
3. اسلوب کی جھلک اور تہذیبی اشارے سے کیا مراد ہے؟

2.4 لفظ' محاورے' عبارت اور اسلوب کا ترجمہ

لوگ شکایتاً کہتے ہیں کہ اردو کی لفظیات بہت محدود ہیں لیکن اردو کی تہی دامانی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس میں امکانی قوتوں کا بھی فقدان ہے یا یہ کہ اس میں ترقی کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسا سمجھنا بالکل خلاف واقعہ ہوگا۔ اردو کے بڑے ماخذ تین ہیں۔ عربی' فارسی اور ہندی اور ان تینوں میں کم و بیش ایسی خصوصیات ہیں جو ترجمے کے کام میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔ عربی کی قواعد کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک ہی لفظ کے بہت سے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ فارسی زبان اپنی لطافت' شیرینی اور شعریت کی وجہ سے ترجمے میں چار چاند لگا دیتی ہے اور بعض اوقات ہندی سے بھی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو اپنی قوتِ گویائی کے لحاظ سے لاجواب ہوتے ہیں۔

ترجمے کے کام میں انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ سینکڑوں انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہو کر اس طرح گھل مل

گئے ہیں کہ ان کا ترجمہ تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ بلاتکلف اردو کے الفاظ کی طرح استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ ایسے الفاظ کی دو قسمیں ہیں اول وہ جو ہو بہو یا اردو لب و لہجے کے مطابق خفیف ترمیم کے ساتھ اپنائے جاسکتے ہیں۔

پہلی قسم		دوسری قسم	
اسکول	School	تکنیک	Technique
کالج	College	رومان	Romance
یونیورسٹی	University	سانیت	Sonnet
بس	Bus	استودیو	Studio
ٹریکٹر	Tractor	استنزا	Stanza
اسکوٹر	Scooter	میکانکی	Mechanical
ٹیچر	Teacher	رپٹ	Report
پوزیشن	Position	لالٹین	Lantern
پروپیگنڈہ	Propaganda	قندیل	Candle
پروفیسر	Professor	ماچس	Match Box
لکچرر	Lecturer	بکس	Box
ڈائرکٹر	Director	الماری	Almirah
ٹرین	Train	اسپتال	Hospital

الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے علاحدہ علاحدہ اصول ہیں۔ الفاظ کا ترجمہ کرنے میں درج ذیل اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(1) ترجمہ صحیح ہونا چاہیے۔ (2) حتی الامکان عام فہم ہونا چاہیے (3) سبک اور خوبصورت ہونا چاہیے۔

1) ترجمے کا صحیح ہونا ہر حال ضروری ہے کیوں کہ جو تصور اصل میں ہے وہ اگر نقل میں ادا نہیں ہوتا یا اصل کی سی شدت کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو ایسا ترجمہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہوسکتا۔

2) ترجمے کا حتی الامکان عام فہم ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ عوام کو ان تصورات سے روشناس کرایا جائے جو اصل میں موجود ہیں۔ اگر ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کے معنی معمولی تعلیم یافتہ طبقہ نہ جانتا ہو تو وہ ان تصورات کو کیا سمجھے گا۔

3) ترجمے کے سبک اور خوبصورت ہونے کی شرط زیادہ جمالیات کے نقطہ نگاہ سے ہے لیکن اس کا عملی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ بھدا یا بھاری بھرکم لفظ استعمال کرنے سے بیان میں الجھاؤ اور گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور مطالب کے اظہار اور تفہیم دونوں میں دشواری ہوتی ہے۔ لہٰذا ترجمے کا مقصد جیسا چاہیے پورا نہیں ہوتا۔

ان تینوں شرطوں پر برابر توجہ دینا مشکل ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کا ترجمہ سبھی شرطوں پر پورا اترے۔

عربی کے مقابلے میں فارسی الفاظ اردو دانوں کے لیے زیادہ عام فہم ہوتے ہیں اور سبک اور خوبصورت بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں

فارسی	عربی	انگریزی
تپش پیما	مقیاس الحرارت	Thermometer
آتش کش	قاطع النار	Fire-extinguisher
پرواز	طیران	Flight
تراشہ	قطعہ	Cutting

لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض اوقات عربی ترجمے بھی نہایت سُبک اور حسین ہوتے ہیں۔

معجّل	Urgent	قاصد	Messenger
تقدیم، ترجیح	Priority	عکاسی	Photography

کبھی کبھی عربی اور فارسی کی آمیزش سے بہت خوبصورت ترجمہ ہوسکتا ہے۔

طیارہ بان	Pilot	خیراندیش	Good will

یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کا لفظی ترجمہ کردیا جائے۔ اصل عبارت میں اکثر الفاظ ایسے ملتے ہیں جو ایک خاص ماحول رکھتے ہیں اور ایک خاص تلازمۂ خیال پیش کرتے ہیں۔ اگر ترجمے میں آنکھ بند کرکے ان کے مترادف الفاظ رکھ دیے جائیں تو نتیجہ اکثر مضحکہ خیز ہوگا۔

ہر زبان کے الفاظ میں ایک وزن اضافی ہوتا ہے۔ بظاہر اکثر الفاظ ہم معنی نظر آتے ہیں اور ایک ہی لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں لیکن گہری نظر ڈالنے سے ان الفاظ یا معانی میں نازک امتیازات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ اکثر یہ امتیازات پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے الفاظ اردو میں بظاہر ہم معنی ہیں۔

عریاں، برہنہ، ننگا، لیکن ان کے محلِ استعمال پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بہت فرق ہے۔ لفظ ''برہنہ'' میں حقیقت اتنی بے لباس نہیں ہے، جتنی کہ لفظ ''ننگا'' میں ہے۔ اور لفظ عریاں میں اس سے بھی کم ہے۔ مطلق لفظ کا ترجمہ ہو یا عبارت کا اس وزن اضافی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

الفاظ کا ترجمہ کرنا پھر بھی نسبتاً آسان ہے لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں دو متضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو، اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ اور فقرہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ہر زبان میں مخصوص اسالیب ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی ایسا اسلوبِ اظہار یا محاورہ تلاش کرنا پڑتا ہے جو اصل کا لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو، یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ترجمے میں جملے کی ساخت حسب ضرورت تبدیل کرنی پڑتی ہے اور یا الفاظ گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں۔ تاکہ مطلب حتی الامکان صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہوجائے۔ درج ذیل مثال ملاحظہ کیجیے:

> The common interests of mankind are numerous and weighty, but our existing politcal machinary obscures them through the scramble for power between different nations and different parties.
>
> انسان کے مشترک مفادات کثیر اور نہایت اہم ہیں لیکن ہماری موجودہ سیاسی مشینری مختلف قوموں اور جماعتوں کے درمیان اقتدار کی کشاکش کے ذریعے انہیں دھندلا کردیتی ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں کے جملے اکثر پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر اور عام فہم ہوچکے ہیں اور مطلب سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی لیکن اردو ابھی زیادہ پیچیدہ اور لمبے جملوں کی متحمل نہیں ہے۔ لہٰذا ترجمہ کرتے وقت ایسے جملوں کو اسلوب کے ساتھ ترجمہ کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، کیوں کہ اس سے ترجمے کی زبان میں اظہاری وسعت پیدا ہوتی ہے اور اگر بالکل ناممکن ہوجائے تو جملوں کے کم سے کم ٹکڑے سے کام چلانا چاہیے۔

مختصر یہ کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہونا چاہیے۔ اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ ترجمہ حتی الامکان زبان کے محاورے کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیوں کہ محاورے، غزل کے اشعار کے مانند ہوتے ہیں اور اصل زبان کے اسلوب کو منتقل کرنے میں مدد ملتی ہے اور مواد کی اثر انگیزی ترجمے کی زبان میں باقی رہتی ہے۔ اس کے لیے ترجمے کی زبان کے محاوروں کی روایت اور مبسوط اور معیاری لغت پیش نظر ہونی چاہیے۔ الفاظ کے وزن

اضافی کا خیال رکھنا چاہیے تا کہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں بھی باقی رہے۔ حتی الامکان ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جن کے مترادفات اردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ خواہ وہ مترادف نامانوس ہی کیوں نہ ہو' اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کا تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں جملے کو کم سے کم ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو لفظیات کے تین اہم ذرائع کون سے ہیں؟
2. زبان میں محاوروں کی کیا اہمیت ہے؟
3. لفظ کے وزن اضافی سے کیا مراد ہے؟

2.5 اصولِ اصطلاح سازی

بیسویں صدی کے آغاز میں جب جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ قائم ہوا تو وضعِ اصطلاحات کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس ادارے سے جن کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، اُن میں زیادہ تر کتابیں انگریزی کی تھیں۔ لہٰذا وضع اصطلاحات کا جو کام شروع کیا گیا تو عام طور سے انگریزی اصطلاحات کا مسئلہ سامنے رکھا گیا۔ دارالترجمہ میں جن علما کا تقرر کیا گیا تھا، اُنھیں عام طور سے عربی اور فارسی پر قدرت حاصل تھی، اس لیے فطری طور پر ان کا رجحان ان زبانوں کی طرف تھا، اس لیے دارالترجمہ کے معزز اراکین نے کثرتِ رائے سے یہ مسئلہ اس طرح طے کیا کہ فارسی زبان کی اصطلاحیں بجنسہٖ یا کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اردو میں اختیار کرنے کے بجائے خود اپنی اصطلاحات وضع کی جائیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ انگریزی اصطلاحات کو بجنسہٖ نہیں لیا گیا لیکن عربی اور فارسی الفاظ کی مدد سے اردو اصطلاحات وضع کرنے میں عربی اور فارسی الفاظ کی مدد لی گئی۔ دارالترجمہ سے جن کتابوں کے ترجمے حاصل ہوئے، اُن میں ان اصطلاحات کا استعمال کیا گیا' جن میں عربی اور فارسی کے اُن الفاظ کا استعمال کیا گیا جو اردو والوں کے لیے اجنبی تھے' یہ اصطلاحات چوں کہ مشکل تھیں۔ اس لیے یہ اصطلاحیں دارالترجمہ سے باہر مقبول نہیں ہوئیں اور پھر اُن افراد یا اداروں نے جو ترجمے کے کام میں مصروف تھے، انفرادی طور پر اپنی اصطلاحیں وضع کیں اور بیشتر اصطلاحیں اردو میں استعمال ہوتی ہیں، جن پر عام طور سے ادیبوں اور محققوں کو مجموعی طور پر اتفاق نہیں ہے۔ اصل میں اس میں اگر ایک اسکالر نے کوئی نئی اصطلاح وضع کی تو اُس کے ہم عصر اُس اصطلاح کا استعمال اس لیے نہیں کرتے کہ اس سے وہ چھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم ایسی اصطلاحات ہوں گی جن پر اکثر محققین اور ادیبوں کو اتفاق ہو۔ ورنہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہر مترجم اپنی اصطلاحات کا استعمال کرتا ہے۔ جس پر 'اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ' کی کہاوت صادق آتی ہے۔

یہاں مولانا وحیدالدین سلیم کی کتاب 'وضع اصطلاحات' کا ذکر ضروری ہے۔ مولانا نے یہ کتاب بیسویں صدی کے آغاز میں لکھی تھی اور انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کیا تھا۔ اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے، اس میں اصطلاحیں وضع کرنے کے اصول بیان کیے گئے تھے۔ اب حالات بدلنے کی وجہ سے ان اصولوں میں تبدیلی کرنی پڑی ہے کیوں کہ وہ زمانہ نہیں رہا جب دارالترجمہ نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس وقت عربی اور فارسی کے جاننے والوں کی تعداد اتنی کافی تھی کہ وہ دارالترجمہ کی وضع کی گئی اصطلاحات کو بہت حد تک سمجھ سکتے تھے۔ لیکن اب صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو عربی اور فارسی سے پوری طرح واقف ہیں اور ان اصطلاحات کا استعمال کریں جو عربی اور فارسی الفاظ کی مدد سے وضع کی گئیں۔ اب ہمیں وضعِ اصطلاحات کے درج ذیل اصولوں کو اپنانا ہوگا۔

1- فارسی اور دوسری زبانوں کی بنیادی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرنا ہے تو پہلے وہ الفاظ دیے جائیں جو اردو میں مستعمل ہوں۔ مثلاً Acid کے لیے تیزاب، Hospital کے لیے اسپتال، Kerosine Oil کے لیے مٹی کا تیل، glass کے لیے شیشہ Butter کے لیے مکھن، Wire کے لیے تار، Medicine کے لیے دوا، Aerodrome کے لیے ہوائی اڈہ وغیرہ۔

2- پھر ایسے الفاظ یا اصطلاحات لی جائیں جو بنیادی طور پر انگریزی الفاظ پر مشتمل ہوں لیکن ان کا تلفظ یا معنی بدل گئے ہوں۔ مثلاً Match Box کے لیے ماچس، Lantern کے لالٹین، Box کے لیے بکس۔

3- پھر یہ کوشش کی جانی چاہیے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہمارے مطلب کے جو ایسے الفاظ ہوں، جنھیں ہم اصطلاحات کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں، انھیں جوں کا توں لے لیا جائے۔

4- اس کے علاوہ انگریزی کے وہ الفاظ یا اصطلاحیں جو اردو میں اپنے اصل تلفظ کے ساتھ استعمال ہو رہی ہیں، اُن کو بھی جوں کا توں رکھا جائے۔ مثلاً ڈاکٹر، نرس، انجینئر، ٹیکسی، کار، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ۔

5- اور اگر ان میں سے اصول کے مطابق ہمیں اصطلاحیں نہیں ملتیں تو اُن کے لیے نئی اصطلاحات وضع کرنی چاہئیں، اس بات کی بھی کوشش ہونی چاہیے کہ اصطلاحات آسان ہوں اور ان میں انگریزی یا فارسی کے ایسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو جو عام طور سے اردو میں سمجھے جا سکتے ہیں۔

ترقی اردو بورڈ (موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) نے بڑے پیمانے پر مختلف علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا۔ اس کام کے لیے ضروری تھا کہ مختلف سائنسی، تکنیکی، علمی اور فنی مضامین کے ترجمے کے لیے اردو میں اصطلاحیں وضع کی جائیں۔ قومی اردو کونسل نے دیگر مضامین کی طرح لسانیات کی کتابوں کے ترجمے کے لیے بھی ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی ہے۔ کمیٹی نے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے اصطلاح سازی کے لیے جو اصول مرتب کیے وہ درج ذیل ہیں:

1- ایسی اصطلاحوں کو ترجیح دینا چاہیے جو مروج یا مقبول ہو چکی ہوں۔ چاہے ان میں کوئی لسانی یا معنوی سقم ہی کیوں نہ ہو۔

2- اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد معنوں میں مستعمل ہے تو ایسی صورت میں اس کے مختلف مفاہیم کو علاحدہ علاحدہ الفاظ/اصطلاح سے واضح کیا جانا چاہیے۔

3- اصطلاحوں اور عام الفاظ میں فرق کیا جانا چاہیے۔ عام الفاظ کو فرہنگ میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔

4- کون سا لفظ اصطلاح ہے اور کون سا محض ایک عام لفظ، اس کا فیصلہ مضمون کے ماہرین کی رائے اور حسبِ ضرورت معیاری انگریزی لغات کی مدد سے کیا جانا چاہیے۔ اگر ایسی لغت یا لغات میں کسی لفظ کے کوئی خاص معنی یہ کہہ کر دیے گئے ہیں کہ یہ معنی کسی فن یا کسی علم سے مخصوص ہیں تو اس فن یا علم کے مقاصد کے لیے اس لفظ کو اصطلاح تصوّر کیا جائے۔

5- جہاں تک ممکن ہو سکے، ایک اصطلاح کا ایک ہی اردو متبادل دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ اصول نمبر 2 کی ذیل میں نہ آتا ہو۔

6- جہاں تک ممکن ہو سکے، اصطلاح یک لفظی ہی ہونی چاہیے۔ ناگزیر صورتوں میں یہ دو لفظی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی اصطلاحیں کم سے کم وضع کی جائیں جو دو سے زائد الفاظ پر مشتمل ہوں۔

7- ہندی اصطلاح کے اختیار کرنے کو (اگر ایسی اصطلاحیں اردو میں بآسانی تلفظ اور تحریر کی جا سکتی ہوں) عربی اصطلاحوں کے اختیار کرنے پر مراجع سمجھا جائے۔

8- اگر کسی اصطلاح کو ایک سے زائد الفاظ کے ذریعے ادا کرنے کی ضرورت پیش آئے تو حسبِ ذیل ترکیبات کو نیچے دی ہوئی ترتیب کے اعتبار سے ترجیح دی جائے گی۔

ا۔ وہ ترکیبات جن میں اضافت یا حروف ربط و جار کی قسم کے الفاظ و علامات نہ ہوں۔

ب۔ وہ ترکیبات جن میں یائے نسبتی ہو۔

ج۔ وہ ترکیبات جن میں اضافت ہو (بشرطیکہ ان میں ایک سے زائد اضافتیں ہوں تو ان میں کم سے کم ایک کو کا، کی، کے سے بدل دیا جائے

د۔ وہ ترکیبات جن میں کا، کی، کے وغیرہ استعمال کیے گئے ہوں۔

9- اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد علم یا فن میں مشترک ہے اور اُن سب علوم وفنون میں ایک ہی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے تو اس کا اردو متبادل بھی ہر جگہ ایک ہی رکھا جائے گا۔

10- الفاظ کو وضع کرنے کے اصولوں میں اتنی کشادہ دلی ہونی چاہیے کہ ہندی، عربی، فارسی یا عرب فارسی یا فارس عربی اور پراکرت ترکیبات بھی قابلِ قبول ٹھہریں۔

11- اگر کوئی انگریزی اصطلاح مروّج ہو اور عام فہم ہو تو اُسے برقرار رکھا جائے۔ ایسی عام فہم اصطلاحوں کے لیے اردو متبادلات بنانے یا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

12- اعلام کو ایسا ہی لکھا جائے جیسے کہ وہ اردو میں مقبول ہو چکے ہیں۔ البتہ ایسے اعلام جو ابھی مقبول نہیں ہوئے ہیں، ان کو حروف تہجی کے حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے ممکن صحت کے ساتھ لکھا جانا چاہیے۔

13- اگر کوئی علم کسی اصطلاح کا حصّہ بن چکا ہے تو اس علم کا اصول نمبر 12 کی روشنی میں اردو میں ترجمہ کیا جانا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. لفظ اور اصطلاح میں کیا فرق ہے؟
2. وحیدالدین سلیم کی کتاب کا کیا نام ہے؟
3. اصطلاح سازی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے

2.6 مترجم کے بنیادی فرائض

ترجمہ کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک تخصیصی کام ہے۔ مترجم کو چاہیے کہ وہ وسیع المطالعہ ہو۔ فن پاروں اور ادبی تخلیقوں، صاحب طرز ادیبوں اور مصنفوں کی کتابوں کا مطالعہ کیے ہو۔ دونوں زبانوں کی قواعد، الفاظ، روزمرہ، استعارات و کنایات، تشبیہات، ضرب الامثال اور ان زبانوں سے واقفیت جن سے اردو کی تشکیل عمل میں آئی ہے، اس میں زبان کا مزاج، رنگ ڈھنگ اور پیرایۂ بیان بھی شامل ہے۔ مترجم اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر مکمل عبور رکھتا ہو اور اس عبور اور قدرت کا معیار یہ ہو کہ دونوں زبانوں کے فقروں، محاوروں اور تہذیبی پس منظر سے بخوبی واقف ہو۔ جس متن کا ترجمہ مطلوب ہے اسے پوری طرح سے مطالعہ کرے اور متن کے مضمون کے مبادیات سے بھی کما حقہٗ واقف ہو۔ اس کا طرز تحریر اور انداز بیان ایسا ہو کہ بات جو اصل مضمون میں بیان کی گئی ہے اسے اچھی طرح سمجھ کر اس کے مفہوم کو موزوں طریقے سے اپنی زبان میں کچھ اس طرح منتقل کرے کہ قاری ترجمہ شدہ مواد کا مطالعہ کرتے وقت کسی ابہام کا شکار نہ ہونے پائے اور جو بات اصل مضمون میں بیان کی گئی ہے اس تک قاری کے ذہن کی رسائی ہو جائے۔

کسی زبان کے مواد کو ہو بہو دوسری زبان میں منتقل کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیوں کہ ہر زبان کا اپنا تہذیبی پس منظر، آہنگ اور مزاج ہوتا ہے۔ ان پہلوؤں کا بحسن خوبی ترجمہ اسی وقت ممکن ہو پائے گا جب وہ نہ صرف دونوں زبانوں کی لغات پر قدرت رکھتا ہو بلکہ ان کے مزاج، تراکیب اور ماخذات سے بھی گہری واقفیت رکھتا ہو اور ترجمہ کرتے وقت اصل متن کو خوب اچھی طرح سمجھ کر اس کے مفہوم کو اپنی زبان میں اس کے مزاج اور آہنگ کے مطابق اس طرح سمو کر ایسے پیرایہ بیان میں منتقل کرے کہ زبان کی سلاست و روانی اور موضوع و مفہوم کے بیان میں کہیں بھی ابہام کا شبہہ تک نہ ہو سکے بلکہ جس قاری نے اصل کتاب نہ پڑھی ہو، اسے ترجمے کے اصل ہونے میں کچھ شک و شبہہ نہ ہو، اور جن قارئین نے کتاب کا مطالعہ کیا ہو، وہ بھی ترجمے کو پڑھتے وقت کسی مقام پر اٹکیں نہ بلکہ مترجم کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اس کے برعکس بعض ترجموں کے دوران ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اصل تصنیف کی زبان کا تہذیبی پس منظر ترجمے کی زبان کے تہذیبی پس منظر سے بالکل مختلف ہو اور مصنف کا مدعا مانندِ عنقا ہو تو مترجم کی تمام کوششوں کے باوجود اگر ترجمے میں مغائرت کی کیفیت پیدا ہو تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ ترجمے کی زبان میں زبان و بیان، مواد اور تہذیبی و فکری پس منظر کی سطح پر خوش آئند بہتری کا باعث ہوگا۔

مترجم کا مطالعہ جتنا وسیع ہوگا اس کے کام میں اتنی ہی عمدگی پیدا ہوگی۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ زبان و ادب، فلسفہ، نفسیات، سماجیات، تاریخ، سائنس، مذہب، اقتصادیات جیسے مضامین سے بخوبی واقف ہو۔ ہر طرح کے مضامین اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں واقفیت رکھنا صحافی مترجم کے لیے تو اشد ضروری ہے۔

اچھے ترجمے کے لیے موزوں الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ مترادفات کا انتخاب موزوں ترین ہونا چاہیے۔ لہٰذا اچھا مترجم وہی ہے جو موقع محل کی مناسبت سے موزوں ترین لفظ کا انتخاب کرے۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہو پاتا ہے جب مختلف لغات مترجم کے زیر مطالعہ رہیں تاکہ وہ حسب ضرورت اپنے مطلب کا لفظ چن سکے۔ مترجم اصطلاح کا ترجمہ اصطلاح میں اور محاورے کا ترجمہ محاورے میں کرے تو احسن ہوگا، اگر اصطلاح فنی ہو تو مسلمہ اصولوں کے مطابق نئی اصطلاح وضع کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے لغات پر عبور ہو جس کے لیے وسیع مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ مزید برآں مترجم کو چاہیے کہ وہ موزوں الفاظ اور اصطلاحات کو ایسے پیرائے میں بیان کرے کہ مطلب صاف اور واضح طور پر قاری کے ذہن پر نقش ہو جائے۔

مترجم کو اس بات کی آگہی ہونی چاہیے کہ ہر فن کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، کچھ شرائط اور قیود ہوتی ہیں اور کچھ پابندیوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ فنکار اپنے فن پارے کی تخلیق خونِ جگر سے کرتا ہے۔ موزوں الفاظ کے انتخاب میں کاوش کرتا ہے۔ صحیح لفظ کی تلاش کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور پھر اسے اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ جب وہ موزوں ہیئت، اسلوب اور پیرایہ بیان کے قالب میں ڈھل کر نکلتا ہے تو اپنے اندر ایک ندرت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ہر لفظ اپنے اندر ایک کائنات سمیٹے ہوئے اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ اخلاقی، سماجی، معاشی، علمی، سائنسی اور فنی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور مخصوص معنی سے قاری کے ذہن کے دریچے اس طرح کھول دیتا ہے کہ وہ ایک لفظ سے ایک مکمل آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم اخلاق، مذہب یا سائنس کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے سامنے غور و فکر کی ایک وسیع دنیا آ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ مترجم کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اگر اصطلاحیں نہ ہوں تو ہم علمی مطلب کے ادا کرنے میں طول لاطائل سے کسی طرح سے نہیں بچ سکتے۔ اصطلاحیں درحقیقت اشارے ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کر دیتی ہیں۔ لغت وہ ہے جس پر جمہور کا اتفاق ہو، اصطلاح وہ ہے جس پر خاص گروہ کا اتفاق ہو۔ لفظ تشریح طلب نہیں ہوتا جب کہ اصطلاح تشریح طلب ہوتی ہے۔ مختصراً ترجمے کے اصول درج ذیل طے پاتے ہیں۔

1) ہر انگریزی لفظ کے لیے ایک ہی اردو لفظ استعمال کیا جائے۔ بشرطیکہ خود اس انگریزی لفظ کے متعدد معنی نہ ہوں۔ مثلاً انگریزی لفظ ڈیفنس کے لیے اردو میں اگر ہم کہیں اس کا ترجمہ دفاع کریں، کہیں تحفظ اور کہیں حفاظت وغیرہ تو غلط ہوگا۔

2) کتاب کا ترجمہ کرنے سے پہلے مترجم کو چاہیے کہ وہ پہلے پوری کتاب کا باقاعدہ کئی بار مطالعہ کرے اور اصطلاحوں اور مشکل الفاظ کو نشان زد کرنے کے بعد ان کی فہرست تیار کر لے۔ ان کے لیے موزوں ترجمے تجویز کرے اور ہر جگہ وہی اصطلاح اختیار کرے۔ مناسب ہوگا اگر کتاب کے آخیر میں فہرست دینے کا اہتمام کرے۔

3) جہاں تک ممکن ہو کسی انگریزی لفظ کا اردو متبادل اس قسم کا لفظ منتخب کرنا چاہیے جس سے اس کے مشتقات وضع ہو سکیں۔ مثلاً ایڈمنسٹریشن کا ترجمہ انتظامیہ ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم انتظام، تنظیم، تنظیمی، منتظم، انتظامی وغیرہ الفاظ مشتق کر سکتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں ہوگی کہ انگریزی کے لفظ کا ترجمہ کچھ ہو اور اس کے مشتقات کا کچھ اور، جو اصل لفظ سے مشتق نہ کیا گیا ہو۔

4) انگریزی کی فنی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ اردو میں بھی وہ لفظ اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہو، نہ کہ تشریح کی۔ وحید الدین سلیم کے بقول ''اصطلاح ایک چھوٹی سی علامت ہوتی ہے جو بڑے مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بولنے والوں اور لکھنے والوں کو وقت ضائع کرنے سے بچاتی ہے۔''

5) اگر اردو میں کسی انگریزی لفظ کے لیے پہلے سے کوئی لفظ موجود ہے تو نیا لفظ نہ گڑھا جائے، بہتر ہے کہ اسی کو استعمال کیا جائے۔ مثلاً بل آف ایکسچینج کے لیے اردو میں پہلے سے ایک لفظ ''ہُنڈی'' موجود ہے۔

6) بہت سے انگریزی الفاظ اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔انہیں جوں کا توں رہنے دیا جائے' مثلاً رجسٹری' بل' ڈاک اور ٹکٹ وغیرہ۔

7) بہت سے انگریزی الفاظ اردو میں آ کر بگڑ گئے ہیں لیکن وہ اردو میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔انہیں جوں کا تو رہنے دیا جائے۔

8) اگر کوئی انگریزی لفظ یا اصطلاح اور اس کا اردو متبادل دونوں یکساں طور پر اردو میں مقبول ہوں تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں کو رہنے دیا جائے مثلاً کمیٹی اور مجلس وغیرہ۔

9) ایسے موزوں مقامی الفاظ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے جو خاصے مقبول ہو چکے ہوں۔ بجائے اس کے کہ کوئی مصنوعی اور بھونڈی اصطلاح وضع کی جائے۔ مختصرات کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ پورے لفظ' ترجمہ کیا جائے۔

10) جس موضوع کا ترجمہ کرنا مقصود ہو اس سے متعلق کتب وغیرہ کا باقاعدہ مطالعہ کرلیا جائے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. کیا مترجم کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے؟
2. کیا اصطلاح اور محاورے کا ترجمہ اصطلاح اور محاورے میں ہونا چاہیے؟
3. وحیدالدین سلیم نے اصطلاح کی کیا تعریف بیان کی ہے؟

2.7 ترجمے کے تین اہم میدان

ترجمے کے تین اہم میدان' جو درج ذیل ہیں:

1) علمی ترجمہ 2) ادبی ترجمہ 3) صحافتی ترجمہ

دراصل مذکورہ بالا تینوں قسمیں ترجمے کے تین اہم میدان ہیں۔جن پر ترجمے کی تینوں تکنیکوں یعنی (1) لفظی ترجمہ (2) بامحاورہ یا بین بین ترجمہ (3) آزاد ترجمہ کا اطلاق ہوتا ہے۔لیکن ایک چیز یہاں پر قابل غور یہ ہے کہ کسی تصنیف یا متن پر شروع سے آخر تک کسی ایک تکنیک کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ تینوں تکنیکوں کا استعمال کسی بھی فن پارے اور مواد پر ہوتا ہے۔آپ کو ایک ایک جملے کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کس تکنیک کے استعمال کے ذریعے معیاری ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ہاں یہ حقیقت ہے کہ مواد کی نوعیت کے پیش نظر کسی ایک تکنیک کا استعمال غالب ہوسکتا ہے۔مثال کے طور پر اگر مواد علمی نوعیت کا ہے تو لفظی ترجمے کی تکنیک غالب ہوگی اور اگر ادبی فن پارے کا ترجمہ کرنا مقصود ہے تو بامحاورہ یا بین بین ترجمے کا طریقہ غالب ہوگا اور اگر صحافتی نوعیت کا مواد ہے تو آزاد ترجمے کی تکنیک غالب ہوگی لیکن کسی ایک قسم کے مواد پر شروع سے آخر تک کسی ایک تکنیک کا استعمال کرنا غلط ہوگا۔اس مختصر سی بحث کے پس منظر میں مناسب ہوگا کہ متذکرہ بالا تینوں قسموں پر علاحدہ علاحدہ ذرا تفصیلی روشنی ڈال لیں۔

1) علمی ترجمہ :

علمی ترجمے کے تحت تمام سائنسی علوم وفنون کی کتابیں آتی ہیں جن میں جغرافیہ' تاریخ' ریاضیات' معاشیات' قانون' طبیعیات' سیاسیات' انجینئرنگ اور میکانیات وغیرہ کی کتابیں شامل ہوتی ہیں۔علمی ترجمے عام طور سے لفظی ترجمے کی ذیل میں آتے ہیں۔علوم وفنون میں مخصوص اور متعین لفظیات اور اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔اس لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا جائے ان کا انہیں معنوں میں ہر جگہ استعمال کیا جائے تاکہ ترجمے میں یکسانیت برقرار رہے اور قاری کا ذہن کہیں بھی الجھنے نہ پائے۔ان ترجموں میں سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحوں کے ترجموں کا ہوتا ہے۔ان اصطلاحوں کو وضع کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اصطلاحیں مسلمہ اصولوں کے مطابق وضع کی جائیں۔تمام شرائط کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ علمی وفنی کتابوں کا ترجمہ متعلقہ علم وفن کا ماہر ہی انجام دے۔

2) ادبی ترجمہ :

ادبی ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ یہ بامحاورہ کیا جائے اور ترجمے کی زبان کے روزمرہ' ضرب الامثال' تشبیہات' استعارات و کنایات' تلمیحات اور رموز و علامات سے کام لیا جائے تاکہ ترجمے میں ادبی رنگ آجائے اور ترجمہ تخلیقی نوعیت اختیار کرلے۔دراصل ادب کی ادبیت اور اثر انگیزی

مذکورہ صنعتوں میں مضمر ہوتی ہے اور انہیں کے باوصف وہ اپنے فن پارے کو تابدار بناتے ہیں۔ المختصر کہ تخلیق کار کی بات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی اصل حیثیت مسخ بھی نہ ہو اور ترجمہ بامحاورہ اسلوب کے ساتھ ہو جائے۔

3) صحافتی ترجمہ:

اسے کھلا ترجمہ بھی کہتے ہیں اور یہ مفہوم کے ترجمے کی ذیل میں آتا ہے۔ مفہوم کا ترجمہ کرنا سب سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ایسے ترجموں میں کسی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مترجم کے لیے یہ آسانی ہوتی ہے کہ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اپنے طریقے سے بیان کر دے۔ اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو تا کہ قارئین کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ترجمے کی زبان کا فقرہ ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ اگر صحافی مترجمین سادگی، سلاست اور اردو کے فقرے کی ساخت کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور قارئین کے ذہن پر بھی بار نہ پڑے۔ ان کو چاہیے کہ جہاں وہ انگریزی کے فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں آیا اصل مطلب ادا ہوا کہ نہیں صحافتی تحریروں کا مقصد صرف عوام کو آگاہ کرنا ہوتا ہے اور باخبر رکھنا ہی اولین مقصد ہوتا ہے اور یہ عمل دوطرفہ ہوتا ہے۔ ایک طرف حکومت وقت کے اچھے بُرے کاموں کے بارے میں عوام کو آگاہ کرنا ہوتا ہے تو دوسری طرف عوام کے حالات، امور، مصائب اور احساسات کے بارے میں حکومتِ وقت کو باخبر رکھنا ہوتا ہے۔ اسی لیے آسان سے آسان زبان و بیان استعمال کرنا صحافت کی سب سے بڑی ضرورت اور خوبی ہے۔ صحافت کی اہم ذمے داریوں کے پیش نظر ہی اسے جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ پہلا ستون مقننہ (Legislative)، دوسرا ستون انتظامیہ (Executive) اور تیسرا ستون عدلیہ (Judiciary) ہے۔ لغت مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہیے کیوں کہ ممکن ہے وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ دماغ میں نہ آئے اور لغت دیکھنے سے ایسا نفیس لفظ ہاتھ آ جائے جو فقرے میں جان ڈال دے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. علمی ترجمے میں اصطلاحوں کی کیا اہمیت ہے؟
2. کیا محاوروں اور صنعتوں کے بغیر ادبی ترجمہ ممکن ہے؟
3. کیا ترجمے کی تینوں تکنیکوں کا استعمال تینوں میدانوں پر ہوتا ہے؟

2.8 خلاصہ

انسانی معاشرہ سماجی گروہوں میں منقسم ہے اور مختلف علاقوں میں سکونت پذیر ہے۔ نتیجتاً مختلف زبانیں پائی جاتی ہیں۔ انسانی خواہشات ضروریات میں بدلتی ہیں اور ضروریات مختلف قوموں اور لسانی گروہوں میں لین دین کے عمل کو جنم دیتی ہیں اور مختلف لسانی گروہوں میں لین دین کی خواہش وضرورت کی باقاعدہ تکمیل کے لیے ترجمہ کا فن اور اصول جنم لیتے ہیں۔ اصول وضوابط دراصل کسی بھی عمل یا فن میں باقاعدگی لانے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

ترجمے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اعتراف گوئٹے جیسے شاعر و مفکر نے بھی کیا ہے۔ دنیا کے علوم تک انسان کی رسائی صرف اور صرف ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہو پاتی ہے۔ ترجمے کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک تخلیقی تو دوسری مشینی قسم ہے۔ تخلیقی ترجمے کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ تخلیقات کے ترجموں کو تخلیقی ترجمہ کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی ترجمہ تخلیقی نوعیت یا معیار کا ہوتا ہے تو ایسے ترجمے کو بھی تخلیقی ترجمہ کہتے ہیں۔

1776ء میں شاہ محمد رفیع الدین نے قرآن شریف کا لفظی ترجمہ کیا تھا، جس کی وجہ سے ترجمہ کافی گنجلک ہو گیا۔ اس کے باوجود ترجمے کی تاریخ میں اس کی ایک الگ اہمیت ہے۔ تھیوڈر ساوری نے ترجمے کی روایت سے ترجمے کے بارہ اصول اکٹھا کیے ہیں جن کا مترجمین جانے انجانے طور پر ترجمہ کرتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ تخلیقی ترجموں میں مصنف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔ نیز تخلیقی ترجمے میں تہذیبی سانچوں کی منتقلی بھی اہمیت کی حامل ہوتی

ہے۔اردو کی لفظیات کے تین اہم ماخذات ہیں یعنی عربی' فارسی اور ہندی۔اس لیے ترجمہ کرتے وقت مترجمین کو چاہیے کہ وہ مترادف الفاظ و اصطلاحیں مذکورہ تین ذریعوں سے اخذ کریں یا وضع کریں۔تخلیقی ترجموں میں صنعتوں اور محاوروں کی کافی اہمیت ہوتی ہے' کیوں کہ اشاروں کنایوں کی مدد سے بڑی بڑی باتیں بڑے مختصر اور موثر طریقے سے کہہ دی جاتی ہیں۔

ہر لفظ کا اپنا ایک تیور ہوتا ہے۔ترجمہ کرتے وقت ان باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔لفظ تشریح طلب نہیں ہوتا جبکہ اصطلاح تشریح طلب ہوتی ہے۔ اصطلاحوں کا ترجمہ اصطلاحوں میں ہونا چاہیے اور محاوروں کا ترجمہ' محاوروں میں ہونا چاہیے۔اس کے لیے مترجم کو فرہنگوں اور لغتوں پر عبور ہونا چاہیے۔مترجم کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے کیوں کہ آج کی دنیا میں تمام مضامین ایک دوسرے پر منحصر اور ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ترجمے کے تین اہم میدان ہیں یعنی علمی ترجمہ' ادبی ترجمہ اور صحافتی ترجمہ۔ان ہی تینوں میدانوں سے متعلق متون کے ترجمے کرتے وقت مترجمین ترجمے کی تین تکنیک یعنی لفظی ترجمہ' بامحاورہ ترجمہ اور آزاد ترجمہ کی تکنیکوں کا استعمال کرتے ہیں۔

2.9 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمہ کیا ہے؟ تفصیل سے بحث کیجیے۔
2. تھیوڈر ساوری کے تالیف کردہ اصولوں سے بحث کیجیے۔
3. اصطلاح سازی کے اصولوں پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. لفظ اور عبارت کے ترجمے پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. مترجم کے بنیادی فرائض کیا ہیں؟
3. ترجمے کے کسی ایک میدان پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

2.10 فرہنگ

تولید کار	=	پیدا کرنے والا	دبازت	=	موٹاپن' موٹائی' حجم
التزام	=	کسی بات کو لازم کر لینا' ضروری قرار دے لینا	حذف	=	گھٹانا' کم کرنا
کلیہ	=	جزئیہ کی ضد' عام قاعدہ' کالج' یونیورسٹی' ہمگی' تمام و کمال	مغائرت	=	غیریت' اجنبیت' بے گانگی
تلازمہ	=	مضمون کی رعایت سے الفاظ کا استعمال' رعایت لفظی	سُقم	=	خرابی' عیب' نقص' بیماری
مراجع	=	واپس بھرنے والا' رجوع کرنے والا	اعلام	=	خبر دینا' آگاہ کرنا' جتلانا
کماحقہ	=	بخوبی' ٹھیک ٹھاک' جیسا کہ اس کا حق ہے			
مشتق	=	نکلا ہوا' وہ لفظ جو کسی دوسرے لفظ سے بنایا گیا ہو			
عنقا	=	سیمرغ' ایک فرضی پرندہ' نایاب شئے			

2.11 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر قمر رئیس — ترجمہ کا فن اور روایت
2. ڈاکٹر خلیق انجم — فن ترجمہ نگاری
3. شارا حمد قریشی — ترجمہ: روایت و فن
4. اعجاز راہی — روداد: سیمینار اردو زبان میں ترجمے کے مسائل

اکائی 3 : ترجمے کے بنیادی مسائل

ساخت

3.1 تمہید

3.2 تراجم کے عمومی مسائل

3.3 سائنسی علوم کے تراجم کے مسائل

3.4 سماجی علوم کے تراجم کے مسائل

3.5 افسانوی ادب کے تراجم کے مسائل

3.6 شعری ادب کے تراجم کے مسائل

3.7 مترجم کی ذمے داریاں

3.8 مترجم کی صلاحیتیں

3.9 ترجمے کی اخلاقیات

3.10 خلاصہ

3.11 نمونۂ امتحانی سوالات

3.12 فرہنگ

3.13 سفارش کردہ کتابیں

3.1 تمہید

ترجمے کا فن اُس زمانے میں وجود میں آیا تھا جب دوسرے ملکوں اور قوموں کے حالات جاننے کی کوشش میں کسی ایک ملک کے لوگوں نے سیاحی کے شوق میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ وہ اس تلاش میں اپنے پڑوس کے ملکوں میں جاتے اور ہزاروں میل دور مقامات تک بھی پہنچ جاتے۔ وہ اس سفر میں زمین پر بھی سفر کرتے اور سمندروں میں بھی۔

جب یہ سیاح کسی دوسرے ملک میں پہنچتا تو اُس ملک کی زبان خود سیکھتا یا کسی ایسے آدمی کا سہارا لیتا جو اُس ملک کی زبان اور سیاح کی زبان دونوں سے واقف ہوتا۔ جب سیاح دوسرے ملکوں کے لوگوں سے بات کرتا تو وہ آدمی جسے ہم ترجمان کہتے ہیں' ایک شخص کی بات دوسرے شخص تک ترجمے کے ذریعے ہی پہنچاتا اور دوسرا شخص جو بھی جواب دیتا اُسے ترجمے کے ذریعے اُس شخص تک پہنچاتا۔

ترجمے کے فن کی ابتدا ہزاروں سال پہلے شروع ہوئی تھی اور جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ اس کا محرک دوسرے ملکوں کے حالات اور اُن کی علمی فتوحات کی تلاش تھی۔ جب بھی کوئی قوم علمی اور فنی دنیا میں قدم رکھتی تو عام طور سے اُس کی پہلی منزل تلاش ہوتی۔ یعنی وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ دوسری قوموں اور ملکوں نے علمی اور فنی میدانوں میں کیا کوشش کی ہے۔

ترجمہ ایک ایسی کھڑکی ہے جس سے جھانک کر ایک زبان کے لوگ دوسری زبانوں کے سماجی گروہوں یا قوموں کے حالات کی واقفیت حاصل

کرتے رہے ہیں۔ترجمے کے ذریعے علم وفن کے میدانوں میں انسانی فتوحات ہم تک پہنچی ہیں۔اگر انسان ترجمے کے فن کا استعمال نہیں کرتا تو ہماری علمی روایات ہزاروں سال پیچھے رہ جاتیں۔مترجموں نے اپنی جدوجہد سے ہر قدم پر انسانی علم میں اضافہ کیا ہے۔ترجمے کے ذریعے ہی ایک مخصوص ملک کسی بھی جغرافیائی علاقے اور کسی بھی خاص قوم کے حالات اور اُس کے علوم وفنون حاصل کر کے تمام دنیا تک پہنچاتا ہے۔بقول ڈاکٹر ظ۔انصاری، سقراط، وی متناطیس اور افلاطون کی دو ہزار سال پہلے کی کاوشیں روما اور یونان کے کھنڈرات میں دب کر ناپید ہو جاتیں۔یہ عربی زبان کے عالموں کا کارنامہ ہے، جنھوں نے ترجموں کے ذریعے انسانیت کے اس بیش بہا خزانے کو یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک پہنچا دیا۔اسی طرح بوعلی سینا، ابنِ رُشد اور ابونصر فارابی کے علمی اور فنی کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کی جغرافیائی حدوں تک ہی محدود رہ جاتے۔یہ لاطینی زبانیں ہی تھیں، جنھوں نے انسانیت کے اس بیش بہا خزانے کو آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا۔ مترجموں نے اپنی جدوجہد سے نہ صرف علمی خزانوں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا بلکہ ان خزانوں میں غیر معمولی اضافہ بھی کیا۔

اس اکائی میں تراجم کے عمومی مسائل سے تفصیلی بحث کی گئی ہے، جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ترجمہ کتنا مشکل کام ہے نیز ان مسائل کو دور کر کے ہی آپ معیاری ترجم کر سکتے ہیں۔اس کے بعد موضوعات مثلاً سائنسی علوم، سماجی علوم، انسانی ادب اور شعری ادب کے تراجم سے متعلق مسائل سے علاحدہ علاحدہ بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد مترجم کی ذمے داریوں اور اس کی صلاحیتوں سے متعلق پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔آخر میں ترجمے کی اخلاقیات یعنی ترجمے کے دوران مترجم سے کن اخلاقی قدروں کی پاسداری کی توقع کی جاتی ہے اس پر بھی مختصر تاہم جامع روشنی ڈالی گئی ہے۔بالکل آخر میں پوری اکائی کا نچوڑ خلاصے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور آپ کی سہولت کے لیے نمونہ امتحانی سوالات، فرہنگ اور سفارش کردہ کتابیں بھی دی گئی ہیں۔

3.2 ترجمے کے عمومی مسائل

لفظوں اور اصطلاحوں کے مناسب انتخاب کا مسئلہ سب سے بڑا ہے۔معاشرے کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔اس معاشرے کی اپنی ثقافت ہوتی ہے، اس کے اقدار ہوتے ہیں۔علاقائی اور جغرافیائی تقاضے ہوتے ہیں۔اور وہی تقاضے زبان و بیان اور لہجہ طے کرتے ہیں۔مترجم کو مذکورہ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔اگر کوئی چیز یا معاشرے کا کوئی پہلو ایسا ہے جس کے ترجمے کے لیے ترجمے کی زبان میں لفظ یا اصطلاح موجود نہ ہو تو اسے جوں کا توں استعمال کر لینا چاہیے۔اور حاشیے میں اس کی وضاحت کر دینی چاہیے۔مثلاً کشمیر میں گنا نہیں ہوتا۔اس کا ترجمے کے لیے بہتر تو یہ ہوگا اسے جوں کا توں لے لیا جانا چاہیے۔اور حاشیے میں اس کی وضاحت کر دینی چاہیے۔ایک اور اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو کافی پڑھا لکھا ہونا چاہیے تاکہ اس کے پاس گنے (Sugarcane) کے بارے میں پورا علم ہو تبھی کہیں وہ اس علاقہ مخصوص لفظ کی حاشیے میں وضاحت کر پائے گا۔

دوسرا اہم مسئلہ لفظ اور اصطلاح کے وضع کرنے کا ہے۔علمی تراجم کے دوران بالخصوص اصطلاحوں کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔اگر ترجمے کی زبان میں تصنیف کی زبان کی تمام اصطلاحوں کے متبادل موجود نہ ہوں تو ان کی متبادل اصطلاحیں وضع کی جائیں اور جہاں یہ ممکن نہیں یا وضع کردہ اصطلاحیں عام نہ ہو پائیں، وہاں دوسری زبان کی اصطلاحیں اپنی اصل شکل میں استعمال کی جائیں۔اور اس کے لیے ایک طریقہ کار تیار کیا جانا چاہیے۔اور چوں کہ علم کا سفر جاری و ساری رہے گا لہٰذا یہ منصوبہ عمل بھی جاری ساری رہنا چاہیے۔اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ ہر شعبۂ ترجمہ میں اس کا ایک خاص کلچر پیدا کیا جانا چاہیے اور ممکن ہو تو وضع اصطلاح کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کیا جائے جس میں متعدد مضامین کے ذولسان ماہرین کو اس کام کے لیے اچھی تنخواہوں پر رکھا جائے۔

تراجم کے دوران ایک مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ کیسے دونوں زبانوں کا فقرے اور محاورے کی سطح تک جانکار دستیاب ہو۔اور اگر دونوں زبانوں کو مذکورہ سطح تک جاننے والا دستیاب بھی ہو جائے تو موضوع سے کماحقہ واقفیت رکھنے والا ملنا مشکل ہے۔یعنی تینوں کا ایک ہی شخصیت میں یکجا ہونا اشد ضروری ہے ورنہ اچھا مترجم اور اچھا ترجمہ منظر عام پر آنا نہایت مشکل ہے۔عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بیشتر مترجم وہ ہوتے ہیں جو تین یعنی موضوع، تصنیف کی زبان اور ترجمے کی زبان میں سے صرف دو سے واقف ہوتے ہیں۔اور ان میں نسبتاً وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو تصنیف کی زبان اور ترجمے کی زبان میں فقرے اور محاورے کی سطح تک کی واقفیت رکھتے ہیں اور وقت ضرورت پر موضوع کے ماہر سے مشورہ کرتے ہیں۔

ہر ادبی فن پارہ اپنی تہذیب کے سائے میں سانس لیتا ہے۔ اگر ترجمے میں اس کا رشتہ اس کی تہذیب سے ٹوٹ جائے تو وہ بے جان نظر آنے لگتا ہے۔ تصنیف کے ساتھ مکمل وفاداری اور آمد کو آورد سے گزار کر آمد کی شکل و کیفیت عطا کرنا نہایت اہم بات ہے۔ اگر تصنیف کے مواد اور اس کی زبان وغیرہ سے مکمل اور سختی سے وفاداری نبھائی جائے تو ترجمے کی روانی اور سلاست وغیرہ متاثر ہو سکتی ہیں اور اگر حسن بیان کا خیال رکھا جائے تو ترجمہ وفاداری کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ ایک فرانسیسی ادیب نے اسی لیے کہا تھا کہ ترجمہ ایک عورت کی طرح ہے جو یا تو خوب صورت ہے یا وفادار دونوں نہیں۔ لیکن درحقیقت بعض ترجمے اسی طرح خوبصورت اور وفادار ہو سکتے ہیں جس طرح بعض عورتیں بذات خود خوبصورت اور اپنے شوہر کے تئیں وفادار ہو سکتی ہیں بشرطیکہ مترجم اپنے فن سے مکمل وابستگی کا مظاہرہ کرے اور اپنے فن کے تقاضوں کو بحسن و خوبی پورا کرے۔

تراجم کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ مترادفات کا انتخاب اور استعمال بھی ہے۔ اکثر ترجمے کی زبان میں ایسے مترادفات بہم نہیں ہوئے کہ اصل مفہوم کو پیش کیا جا سکے۔ اس میں کچھ زبان کے مزاج اور اس کے تہذیبی پس منظر کو بھی دخل ہوتا ہے کچھ اشیا و کوائف کی کسی زبان میں عدم موجودگی کو بھی۔ اس لیے مترجم کو مجبوراً قریب المعنی مترادفات کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ البتہ جہاں لفظوں کے معنوی شیڈ میں زیادہ فرق آ جائے وہاں فٹ نوٹ میں وضاحت کرنی پڑتی ہے۔

ترجمے کے دوران مترجم کو دو زبانوں اور دو تہذیبوں کا سفر کرنا پڑتا ہے اور یہ اکادمک سفر بہت دشوار طلب ہے کیوں کہ دونوں کے درمیان باریک فرق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہی قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ ایسا نہ کر پانے کی صورت میں مترجم اپنے ترجمہ سمیت ڈگر سے بھٹک سکتا ہے اور اس کی یہ کوششیں رائیگاں ہوں گی اور اگر کہیں مترجم ترجمے کا ترجمہ کر رہا ہوتا ہے تو اس کی مشکل میں ایک پرت کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں اسے تین زبانوں اور تہذیبوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

ترجمے کے دوران ایک اہم مسئلہ طویل جملوں کا ہوتا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے موزوں طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ ایسے طویل جملوں کو کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد چھوٹے چھوٹے جملوں میں توڑ دینا چاہیے۔ اور ان کی باقاعدہ تفہیم کے بعد اس طرح ترجمہ کیا جانا چاہیے کہ تصنیف کی زبان کے طویل جملے کی معنوی نوعیت و کیفیت ترجمے کی زبان میں بجنسہ برقرار رہے۔

ان تمام مشکلات کا حل ڈھونڈنے اور اس عرق ریزی سے کام کرنے کے باوجود ترجمے اور مترجم کی وہ حیثیت نہیں جو اصل تصنیف کی ہوتی ہے۔ ترجمہ اور مترجم کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ بعض ادارے اب بھی سرورق پر مترجم کا نام نہیں چھاپتے بلکہ اس کا نام دوسرے یعنی اندر کے صفحے پر آتا ہے۔

ترجمے کے کام کی اجرت بہت کم ملتی ہے اور مترجمین کی تنخواہیں بھی بہت قلیل ہوتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمے اور مترجم کو معاشرے میں کیا حیثیت حاصل ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی، سماجی، تہذیبی، لسانی اور ادبی نشاۃ الثانیہ میں ترجمے اور مترجم کا رول نہایت وقیع رہا ہے تاہم ان کی تاریخی کوششوں کو معاشرے نے بالخصوص ادبی حلقوں نے کبھی بھی اس طرح سے نہیں سراہا جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔

عام طور پر کسی ترجمے کو اچھا سمجھ کر جب اس کی تعریف کی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں بڑی روانی ہے، زبان بامحاورہ و سلیس ہے اور مضمون واضح ہے لیکن اگر اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ صرف روانی و سلاست ترجمے کے بنیادی اجزا نہیں ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ سنجیدہ و پیچیدہ تحریر کا ترجمہ صرف رواں و سلیس کیسے ہو سکتا ہے جب کہ زبان کا مزاج اور جملوں کی ساخت ترجمے کی زبان کے مزاج اور جملوں کی ساخت سے مختلف ہے۔ ایسی صورت میں مترجم کی ذمے داری یہ ہوتی ہے کہ ترجمے کی زبان کو اسی حد تک آسان کرے کہ تصنیف کے معنی کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔

اکثر ترجموں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اصل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو ہمارے ہاں افسانوں اور ناولوں کے آزاد ترجموں کی وجہ سے راہ پا گئی ہے۔ جب کسی فلسفیانہ پیچیدہ تحریر کا ترجمہ کیا جائے گا تو ظاہر ہے اس میں وہ روانی تو ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی جو خود اپنی زبان میں براہ راست لکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے میں مترجم کا فرض یہ ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا کا خیال رکھے۔ لفظوں کا ترجمہ قریب قریب معنی

ادا کرنے والے الفاظ سے نہ کرے اور ضرورت پڑنے پر نئے مرکبات بنائے، نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ وضع کرے۔ ایسے ترجمے سے آخر کیا فائدہ جو سلاست تو پیدا کر دے لیکن مصنف کی روح اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے۔

ترجمے کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اگر اپنی بات ہو تو آدمی جس طرح چاہے اس کا اظہار کر دے لیکن ترجمے میں آدمی بندھ کر رہ جاتا ہے۔ مصنف کے ہاتھ میں مترجم کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ اگر اس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو اصل سے دور ہو جاتا ہے اور اگر اس کے بالکل مطابق رہنے کی کوشش کی تو بیان میں اجنبیت آ جاتی ہے، جملوں کو توڑ کر اپنے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی تو اس کی زبان، بیان و اظہار کے نئے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسے میں مترجم کی ذمے داری یہ ہے کہ تصنیف کی زبان کو ترجمے کی زبان کے اظہار سے قریب تر لائے۔ اور مصنف کے لہجے اور طرز ادا سے اپنی زبان میں ایک نئے اسلوب کے لیے راہ ہموار کرے۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر ترجمے اردو کے روایتی و مروجہ طرز ادا کے ذریعے کیے گئے ہیں جس سے زبان اور قوت اظہار کو ترجموں سے وہ فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے جس کے امکانات ہمیشہ اچھے ترجموں میں ہوتے ہیں اور جن کی ہمیں زبان و بیان کی ترقی کے لیے شدت سے ضرورت ہے۔ ایسے ترجموں میں ممکن ہے آپ کو اجنبیت کا احساس ہو لیکن اس اجنبیت سے جب آپ مانوس ہو جائیں گے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اب زبان خیال و احساس کے بوجھ تلے دب کر نہیں رہ سکتی بلکہ اب اس میں اثر آفرینی کے ساتھ ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے ترجمے روا روی میں نہیں پڑھے جا سکتے اور نہ ان کا حسن و دلکشی ایک ہی نظر میں آپ کے دیدہ و دل تک پہنچ سکتی ہے بلکہ ایسے ترجموں کو آپ پلاٹ، کہانی یا موضوع کی دلچسپی اور افادیت کو زیادہ نئے فلسفیانہ انداز فکر، سنجیدہ تہذیبی رویوں، جملوں کی نئی ساخت، اظہار و انداز بیان کے نئے امکانات کے لیے پڑھیں گے۔

ترجمے دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں ہوئے ہیں جو لکھی اور بولی جاتی ہے مگر آج تک کوئی ایک ایسی مکمل کتاب سامنے نہیں آئی جس میں ترجمے کے بنیادی مسائل بحیثیت مجموعی زیر بحث آئے ہوں اور ان مسائل کے حل بتائے گئے ہوں جس سے ترجمہ کرنے والے کو آگے چل کر اپنی راہ ہموار کرنے میں مدد مل سکے اپنی حدوں اور ذمے داریوں کا علم ہو اور جسے وہ اپنی تربیت کے لیے استعمال کر سکے۔

لغت، صرف، نحو، معانی و بیان اور قواعد وغیرہ پر کافی وقت صرف کیا گیا ہے اور لسانیات کے ماہرین نے الفاظ و لغات کو ہر پہلو سے پرکھا ہے۔ انہیں زیادہ مکمل اور مفید بنانے کی کوشش کی مگر ترجموں پر صرف رائے زنی کر کے سوالوں اور اصولوں کو ترجمہ کرنے والے کے ضمیر اور اس کی صلاحیت پر چھوڑ دیا۔ اور جو اشخاص زبانوں اور ادبوں پر دست رس رکھتے ہیں وہ بھی محض اپنی کاوشوں کو نشان راہ کے طور پر چھوڑ کر چلے گئے۔

ترجمے کی دنیا میں قدم رکھنے کے لیے جس درجے کی ذہانت، سنجیدگی، علم، مشق اور ذہنی محنت و مشقت کی ضرورت پڑتی ہے وہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور المیہ یہ ہے کہ ترجمے کے معاملے میں ہر شخص بے لگام ہے۔ جب اور جس کے جی میں آتا ہے ترجمہ کر ڈالتا ہے۔ بعض اداروں اور لوگوں نے جو ترجمے کے بعض اصول مرتب کیے ہیں ان پر پہلی بات تو یہ ہے کہ اتفاق رائے نہیں ہے اور اگر کہیں کہیں پر اتفاق رائے ہے تو دوسری بات یہ ہے کہ ان کی پیروی بھی نہیں ہو رہی ہے۔

اس وقت ملک میں مختلف ادارے ترجمے کے کام میں مصروف ہیں اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ایسے تمام اداروں کے لیے ایسا معیار قائم کر دیا جائے جسے تمام ادارے خوشی سے اپنائیں تاکہ ترجمے کے معیار کو یکسانیت مل سکے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. زبان و بیان اور لہجے کے تعین میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں؟
2. سائنسی اور علمی ترجموں کے دوران سب سے بڑا مسئلہ کیا درپیش ہوتا ہے؟
3. ترجموں کے دوران کیا متن اور حسنِ بیان دونوں کے تئیں وفاداری ممکن ہے؟
4. کیا تاریخی، سماجی، تہذیبی، لسانی اور ادبی نشاۃ الثانیہ میں ترجموں کا رول وقیع ہے؟

3.3 سائنسی علوم کے تراجم کے مسائل

اپنی زبان کو سائنسی علوم سے مالا مال کرنے اور موثر ذریعۂ تعلیم بنانے کی خاطر سائنس کے موضوعات کو اردو میں ڈھالنے اور پیش کرنے کا کام تیزی سے انجام دینا ایک اہم فریضہ ہے۔ یہ کام اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ سائنس کے طلبا انگریزی میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ان پر دو طرح کا بوجھ ہے۔ ایک طرف تو انہیں انگریزی زبان سیکھنی ہے تو دوسری طرف سائنس کے مواد کو سمجھنا ہے۔ ان دونوں کے بوجھ تلے ان کی کارکردگی متاثر ہو رہی ہے۔ دنیا کے ماہرین تعلیم اس بات سے پوری طرح سے اتفاق کرتے ہیں کہ مادری زبان میں آدمی زیادہ اور جلدی سیکھتا ہے۔ مگر ایک بڑا مسئلہ جو درپیش ہے وہ یہ کہ سائنس کے علوم کا مواد اردو زبان میں نہ ہونے کے برابر ہے لہذا سائنس کے علوم کو اردو میں ڈھالنا اشد ضروری ہے۔ جب بھی ترقی یافتہ قوم سے علم کی شمع کو کسی اور قوم نے لیا تو اس میں پہلا مرحلہ کتب اور موضوعات کو اپنی زبان میں ڈھالنے کا کام ہوتا تھا۔ یونانی علم کو عرب سائنس دانوں نے عربی میں ڈھالنے کا کام کیا اور پھر موثر اور بھرپور انداز سے سائنس کے علوم کو عروج تک پہنچایا۔ اس طرح اہل یورپ نے مسلمان سائنس دانوں کے کام سے استفادہ کیا تو اپنی زبان میں علم کو سب سے پہلے ڈھالا اور پھر ترقی کی راہیں کھلتی گئیں۔ ہم اردو والوں کو بھی بالکل یہی کرنا ہے جو ابتدا ترجمے کے عمل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

سائنسی تراجم کے دوران سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ سائنسی اصطلاحات کا مسئلہ آسان نہیں۔ اس میں بڑی مشکلات آتی ہیں۔ لہذا توجہ اور سنجیدگی سے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ سائنسی علوم کو اردو میں ڈھالنے میں درج ذیل مسائل درپیش ہیں:

1. معیاری سائنس اصطلاحات کا فقدان ہے اردو میں کوئی ایسی معیاری لغت یا فرہنگ نہیں ہے جو ہر طرح سے مکمل ہو اور جسے معیار مانا جائے۔ بعض اصطلاحات جو لغات میں نظر آتی ہیں۔ الفاظ کی روح سے مناسبت نہیں رکھتیں۔
2. سائنسی علوم کو اردو میں ڈھالنے کا کوئی مربوط پروگرام نہ ہونے کے سبب دل جمعی سے کام کرنا ممکن نہیں۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ غیر منظم طریقے سے ہو رہا ہے۔ اسے منصوبہ بند طریقے سے کرنے کی ضرورت ہے۔
3. ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ انگریزی اصطلاحات کو ہر صورت میں ترجمہ کرنا ہے یا ویسے ہی استعمال کر لینا مناسب ہے۔ اس سلسلے میں اختلافات موجود ہیں اور دونوں نظریات رکھنے والی شخصیات پائی جاتی ہیں۔ جس سے مسئلہ الجھا ہوا ہے۔
4. سائنس کی اپنی کوئی زبان نہیں۔ بعض اصطلاحات اتنی عام فہم ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کو ڈھالا جا سکتا ہے۔ مگر بعض کا ترجمہ قطعی مناسب نہیں۔ مگر بعض مکتبہ فکر کے لوگ ہر لفظ کا ترجمہ چاہتے ہیں اور اس ترجمے کو رائج کرنا چاہتے ہیں، جس سے سائنس کی زبان اور اس کی لفظیات و اصطلاحات یکساں طور پر طے نہیں ہو پا رہی ہے جس سے سائنسی تراجم میں مشکلات آتی ہیں۔
5. سائنسی تراجم کے دوران حائل ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے سائنسی برادری پر مشتمل کوئی اعلیٰ کمیٹی نہیں ہے۔ سائنسی تراجم اور وضع اصطلاحات کے وقت سائنس کے ایسے ماہرین جو دونوں زبانوں پر کسی خاص معیار تک رسائی رکھتے ہوں اور ترجمے کا کام بھی کر چکے ہوں، سے کام لیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک مشاورتی کمیٹی بھی تشکیل دی جا سکتی ہے جو اس کام کی نگرانی کرے اور کام کو آگے بڑھانے کے طریقے وضع کرے۔
6. سائنس کے موضوع پر اردو میں لکھنے والوں اور سائنسی مواد کو ترجمہ کرنے والوں کا فقدان ہے اور یہ اس لیے ہے کہ انہیں معقول معاوضہ نہیں دیا جاتا اور اسی لیے اس میدان کی طرف زیادہ اہل علم رخ نہیں کرتے۔ مزید برآں یہ کام اتنا آسان نہیں ہے اور پھر اردو میں سائنسی مضامین پر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اپنی زبان کو سائنسی علوم سے مالا مال کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟
2. سائنسی علوم کے ترجمے میں سب سے بڑا مسئلہ کیا درپیش ہوتا ہے؟
3. کیا اردو میں سائنسی علوم کی منتقلی کے لیے منصوبہ بند طریقے سے کام ہو رہا ہے؟

3.4 سماجی علوم کے تراجم کے مسائل

ترجمے کی عموماً دو قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو سلیس، رواں اور آزاد ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جو لفظی ترجمہ ہوتا ہے۔ لوگ عموماً پہلی قسم کو پسند کرتے ہیں۔ دوسری قسم کو مشکل کہہ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ داستانوں، افسانوں، کہانیوں، مزاحیہ خاکوں اور ہلکی پھلکی نگارشات کے ترجمے کے لیے تو پہلی قسم بہت موزوں ہوتی ہے مگر علوم وفنون کے ترجمے کے لیے دوسری قسم کے ترجمے کے طریقے کو اپنایا جاتا ہے۔ یہاں اصل کے ہر لفظ کے معنی اور اس کی اہمیت ترجمے میں حتی الامکان پوری طرح سے منعکس ہونی چاہیے۔ ورنہ مصنف نے جو دلائل وشواہد پیش کر کے جو نتائج اخذ کیے ہیں اور ان کے اظہار و بیان کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ترجمہ ان کا آئینہ دار نہیں ہوگا۔ علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے والے مترجم پر بڑی اہم ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنی فکر کو اصل مصنف کے فکری قالب میں ڈھال کر ہی اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ علوم کا ترجمہ ہر صورت میں لفظی ہونا چاہیے۔

ترجمے کی طرح ہم علم کو بھی بڑے پیمانے پر دو قسموں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ سائنسی علوم اور سماجی علوم۔ دونوں کے ترجمے کا انحصار زیادہ تر اصطلاحات پر ہوتا ہے۔ اگر کسی سائنسی علم کی تمام اصطلاحات مترجم کی میز پر رکھی ہوں تو ترجمے میں زیادہ دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ آسان اور سادہ الفاظ کے ساتھ اصطلاحیں استعمال کر کے مطلب ادا کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس سماجی علوم کے لیے اصطلاحات کے علاوہ دونوں زبانوں میں عام مہارت بھی ضرور ہوتی ہے۔ اس پہلو پر اس لیے زور دیا جاتا ہے کہ ان علوم کا ترجمہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ مترجم تصنیف کی زبان کو اچھی طرح نہ سمجھتا ہو اور ترجمے کی زبان کے معنی خیز الفاظ کا وافر ذخیرہ اس کے ذہن میں محفوظ نہ ہو۔ سماجی علوم کا ترجمہ کرنے کے لیے اسے اپنی زبان میں بھی اظہار و بیان کی پوری قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ انگریزی کے الفاظ، محاوروں اور اسالیب بیان کو سمجھ لینے کے بعد انہیں اپنی زبان میں اسی وقت صحت کے ساتھ ڈھالا جاسکتا ہے جب مترجم کے پاس مناسب اور موزوں الفاظ کا وافر ذخیرہ موجود ہو۔ اصطلاحات اور مشکل الفاظ کے لیے فرہنگوں، قاموسوں اور لغات کو بار بار دیکھنا تو بہر حال پڑے گا مگر مترجم کا خود اپنا ذخیرہ الفاظ اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ اس کام پر حد سے زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑے اور ایک معقول رفتار کے ساتھ کام آگے بڑھے۔

ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ سماجی علوم کے لیے لسانی قابلیت، وسیع مطالعہ اور محنت تینوں چیزیں لازمی ہیں۔ جو بہت مشکل سے کسی مترجم میں یکجا ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر فلسفے کی کسی کتاب کے ترجمے کے لیے اصطلاحات کی دستیابی ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اصل کتاب کے پورے متن کو اردو میں منتقل کرتے وقت جابجا اصل زبان کی تعبیرات، توضیحات اور منطقی دلائل و براہین کی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے میں دقت پیش آتی ہے۔ ان تمام پہلوؤں پر محتاط نگاہ رکھنا اور انہیں برتنا ایک مترجم کے لیے مشکل کام ہوتا ہے۔

فلسفے کے علاوہ دوسرے سماجی علوم میں بھی پس منظر کے طور پر ایک قسم کا فلسفہ کارفرما ہوتا ہے۔ تاریخ، نفسیات، اخلاقیات، عمرانیات، معاشیات غرض جملہ انسانی علوم جو انسان کے ذہن اور اس کے اعمال سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مسائل کا تجزیہ کسی نہ کسی قسم کے فلسفہ کا ضرور حامل ہوتا ہے۔ اس لیے سماجی علوم کے ترجمے میں سائنسی علوم کی طرح صرف اصطلاحیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں بلکہ یہ عبارت کی مترادف عبارت ترجمے کی زبان میں پیش کرنے کے لیے ایک ایک لفظ کا مفہوم ادا کرنا ہوتا ہے۔ تراجم بالعموم اور سماجی علوم کے تراجم، بالخصوص اس لیے بھی مشکل ہوتے ہیں کہ اردو میں کوئی بہت معیاری اور مبسوط لغت دستیاب نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم کی لغت The Standard English Urdu Dictionary اپنے آپ میں اچھی لغت ہے تاہم ناکافی ہے۔ اسے عہدِ خاطر کے تقاضوں کے مطابق بنانے کی سخت ضرورت ہے، اگرچہ شان الحق حقی کی مرتبہ لغت اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری کافی جامع اور جدید ترین ہے اور جو ابھی جلد ہی شائع ہوئی ہے۔ لیکن بیش تر مترجمین اس لغت سے واقف نہیں ہیں۔

ترجمے کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کی لغت پر نظر ثانی کر کے اسے مترجمین کے لیے ایک جامع اور معیاری انگریزی اردو لغت تیار کرنا اشد ضروری ہے۔ اس لغت میں کم سے کم پندرہ ہزار نئے الفاظ اور محاوروں کا اضافہ فوری طور پر کیا جانا چاہیے۔ موجودہ الفاظ میں سے جن الفاظ کے ساتھ مشہور محاورے نہیں دیے گئے ہیں ان کے ساتھ ایسے محاورے دیے جائیں اور جدید الفاظ کے ساتھ بھی یہ التزام قائم رکھا جائے۔ مترجمین کو

ترجمے کے دوران جو اہم ضرورتیں پیش آتی ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس لغت میں انگریزی کی معیاری لغتوں کی طرح چند معلوماتی ضمیمے ضرور شامل کیے جائیں۔ مثلاً ایک ضمیمہ ان اہم شخصیتوں کے ناموں پر مشتمل ہونا چاہیے جن کا ذکر اکثر علمی کتابوں اور تاریخی تذکروں میں جا بجا آتا ہے۔ ہر انگریزی نام کے سامنے اس کا اردو املا عربی حروف میں اعراب کے ساتھ درج ہونا چاہیے تاکہ ان ناموں کا تلفظ متعین ہو سکے۔ دوسرا ضمیمہ اس طرح تمام دنیا کے مقامات کے ناموں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اگر ہماری جامع لغت میں اہم شخصیتوں اور مقامات کے نام صحیح تلفظ کے ساتھ مل جائیں تو پھر ان کو ترجمے میں بآسانی درج کیا جا سکے گا۔ ایک اور ضمیمہ مخففات اور مختصرات کا ہونا چاہیے۔ ایک ضمیمہ تلمیحات سے متعلق بھی ہونا چاہیے۔ انگریزی زبان کی علمی کتابوں میں بعض اوقات ایسی تلمیحات آ جاتی ہیں کہ ان کی گتھی کو سلجھائے بغیر سلسلہ آگے نہیں بڑھتا' ایسے موقعوں پر ہمارے مترجم کو کسی انسائیکلوپیڈیا کی تلاش اور اس کی سرگردانی سے بچانے کے لیے انگریزی اردو لغت میں ایسی تلمیحوں کا مختصر حوالہ مل جانا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. علوم فنون کے لیے ترجمے کا کون سا طریقہ اپنانا مناسب ہوتا ہے؟
2. سائنسی ترجموں کے برخلاف علمی ترجموں کے دوران اصطلاحوں کے علاوہ کون سے اور مسائل ہوتے ہیں؟
3. اردو میں انگریزی اردو لغت کی کیا صورت حال ہے؟ کیا آپ مطمئن ہیں؟
4. مترجمین کی آسانی کے لیے لغات میں کن کن باتوں کا مزید اہتمام ہونا چاہیے؟

3.5 افسانوی ادب کے تراجم کے مسائل

ترجموں کے سلسلے میں خواہ ترجمہ تخلیقی ادب کا ہو یا علوم کا سب سے اہم مسئلہ وہ ذہن و رویہ ہے جو ترجموں کو ذہنی اختراع کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دیتا ہے۔ یہ تصور کہ ترجموں کی بھی ایک تخلیقی اہمیت ہے فی الحال رواج نہیں پا سکا ہے۔ عام تصور اب بھی یہی ہے کہ ترجمے میں اختراع ذہن کا کوئی عمل نہیں ہوتا' اس لیے اس کی حیثیت تخلیقی فن پاروں کے برابر نہیں ہے۔

اقوام کے درمیان لین دین اور افہام و تفہیم محض معاشی و سیاسی سطح پر نہیں ہوتی بلکہ فکری اور تہذیبی سطح پر بھی ہوتی ہے۔ اس سطح پر دیکھا جائے تو ترجموں کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تاہم آج کے حالات میں جدید علوم کے حوالے سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ اہم بات اپنی کم مائیگی اور تہی دستی کے ازالے کی ہے۔

علوم کا ترجمہ کرتے وقت بھی تخیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ مترجم کو اتنی ذمے داری تو قبول کرنی چاہیے کہ قارئین تک صحیح مفہوم پہنچائے۔ علوم کے ترجمے کے لیے دو زبانوں پر قدرت اور علم کو سمجھنا ہی کافی ہے۔ وہاں مسئلہ صرف مواد کا ہوتا ہے۔ اسلوب کا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ زیادہ عقل چاہیے اور تخیل شخص اتنی کہ آپ کسی لفظ یا اصطلاحات کے مضمرات کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکیں۔

افسانوی ادب کے ترجمے کی بات اور ہے۔ ایسی صورت میں دو تہذیبیں ہی نہیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتی ہیں بلکہ ایک نثری روایت بھی کارفرما رہتی ہے۔ ایک تہذیبی اور نثری سانچے کو دوسرے تہذیبی و نثری سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ویسے تو ہر زبان کا ہر لفظ اپنی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ لفظوں کو آپس میں جوڑنے سے جملے کی ساخت بنتی ہے۔ یہ جملے کا ایک آہنگ ہوتا ہے۔ پھر جملے آپس میں مل کر اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں' پھر یہ بھی ہے کہ پورے افسانے یا ناول سے ایک فضا یا وحدت تاثر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا افسانوی ادب کے ترجموں میں ترجمہ محض لفظ کا نہیں ہوتا۔ جملوں کی ساخت اور آہنگ نیز اسلوبیاتی فضا یا تاثر کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے اور اسے بھی اپنی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ناول یا افسانے کی تہذیبی فضا کے پس منظر ایسی موزوں لفظیات سے کام لینا پڑتا ہے جو ترجمے میں پوری فضا کو منتقل کر سکیں۔

اعلیٰ ادب کے ترجموں سے فنکار کی اپنی زبان میں وہ ادبی و ذوقی فضا پیدا ہوتی ہے جسے خود فنکار قائم کرنا چاہتا ہے اور جس میں خود اس کی تخلیقی

صلاحیتیں نمو پاتی ہیں۔ظاہر ہے کہ بڑی تخلیقی کاوشیں بڑے تناظر میں پیدا ہوسکتی ہیں۔لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تخلیقی فنکار دوسری زبان کے لفظوں کے جادو کو اپنی زبان کی لفظیات میں جگانا چاہتا ہے۔فقروں کی ساخت اور اسلوب کے جوہر کو منتقل کرتے وقت وہ خود اپنی زبان کو نئے آہنگ، نئی معنوی وسعتوں، اظہار کی نئی صورتوں اور نئی افسانوی فضاؤں سے آشنا کراتا ہے۔اور اس کے ساتھ اپنی ذات کے تخلیقی حدود کو بھی وسعت دیتا ہے۔

عام سطح پر دیکھا جائے تو افسانوی ترجموں کے مسائل کم وبیش وہی ہیں جو کسی بھی غیر زبان کی تحریر کو اپنی زبان میں منتقل کرتے وقت پیدا ہوتے ہیں۔تاہم افسانوی ادب کے ترجمے مترجم میں خاص صلاحیت کا تقاضہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ زبان دانی کے ساتھ ساتھ اس میں تخلیقی فن کاروں کا سا تخیل بھی ہو۔بہ الفاظ دیگر ترجمہ کرتے وقت مترجم تصنیف کی زبان میں پوری طرح سے رچ بس جائے۔پھر جب ترجمہ کرنا شروع کرے تو ترجمے کی زبان میں واپس آجائے۔

ایک حیاتیاتی اصول یہ ہے کہ طاقت وحسن دونوں نسلی امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں اور یہی اصول زبان پر بھی منطبق ہوتا ہے اور یہی خاصیت مترجم کی ہونی چاہیے۔یعنی وہ دونوں زبانوں میں سوچ سکے۔تخلیقی صلاحیت مترجم کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ افسانوی ادب کا ترجمہ کرتے وقت اپنے تخیل کی مدد سے خود کو دونوں زبانوں میں اس طرح جذب کرسکے۔ظاہر ہے کہ یہاں روح سے مراد معنوی جہتیں اور جسم سے مراد اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔

زبان کی معنوی اور اظہاری جہتوں میں اضافہ ہوگا تو اس میں تنوع کے ساتھ اجنبیت بھی آئے گی اور اس طرح زبان کا چٹخارہ لینے والوں کو اس میں کچھ نہ کچھ کھردرا پن بھی محسوس ہوگا۔اسی لیے بعض لوگ تخلیقی ترجمے سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ترجمہ شدہ تحریر ترجمہ نہ معلوم ہو۔بہ الفاظ دیگر اس میں کوئی اجنبیت یا کھردرا پن نہ ہو۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ترجمہ کرتے وقت اپنی زبان کے محاوروں اور روزمرہ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔مگر دوسری زبان سے ترجمہ کرتے وقت اکثر اس زبان کے محاورے اور روزمرہ کے ترجمے بھی کرنے پڑتے ہیں۔جو نہ صرف مشکل مرحلہ ہوتا ہے بلکہ اس سے ترجمے کی زبان میں بھی کافی وسعت آتی ہے۔جس سے انگریزی کے متعدد محاورے اور الفاظ ہماری زبان میں داخل ہوگئے ہیں۔مختلف تہذیبوں کا روحانی تحرک، کرب و انبساط کی ساعتیں، فقروں کے مختلف آہنگ اور اسالیب کا تنوع یہ سب اردو کے پیکر میں ڈھل کر اردو افسانوی ادب کے حدود میں مزید وسعتوں کا سبب بنے ہیں۔

المختصر تخلیقی ادب کا ترجمہ بھی تخلیقی سطح کا ہونا چاہیے۔بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تخلیقی فنکار نہیں ہیں لیکن اپنے وسیع مطالعے کا اعلیٰ ذوق اور بلند تخیل کے باعث تخلیقی فنکاروں کے ساتھ قدم ملا کر چل سکتے ہیں۔اس طرح سے ایسے حضرات مترجم کی دیگر خصوصیات سے لیس افسانوی ادب یا تخلیقی ادب کا بہتر ترجمہ کرسکتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. افسانوی ادب کے ترجمے میں کیا دو تہذیبوں اور دو نثری روایتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟
2. طاقت اور حسن دو نسلوں کے امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔کیا اس اصول کا اطلاق ترجمے پر ہوسکتا ہے؟
3. کیا تخلیقی ادب کا ترجمہ تخلیقی قسم کا ہونا چاہیے؟

3.6 شعری ادب کے تراجم کے مسائل

ہر فن کے ترجمے کے مسائل الگ الگ ہوتے ہیں۔نظم کے مقابلے میں نثر کا ترجمہ نسبتاً آسان ہوتا ہے۔نثر میں افسانے، ناول وغیرہ کا ترجمہ ٹیکنیکل کتابوں کے مقابلے میں آسانی سے کیا جاسکتا ہے اور بولی جانے والی زبان کا ترجمہ اور بھی زیادہ آسان ہے۔سب سے زیادہ مشکل اور بعض اوقات تو ناممکن حد تک مشکل کام نظم کا ترجمہ ہے، جس کے لیے ڈاکٹر جانسن نے سیدھے سادے الفاظ میں کہا تھا کہ

"نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

اور وکٹر ہیوگو نے فیصلہ سنایا تھا کہ نظم کے ترجمے کا خیال ہی بے معنی اور ناممکن ہے۔لیکن اس کے باوجود دنیا میں نظم کے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں۔مغرب میں صفِ اول کے ادیبوں اور شاعروں نے ایسے بے معنی اور ناممکن فن کی طرف توجہ کی ہے۔مثلاً لوتھر،سیسرو، ہوریس،شیلی اور کالرج،پوپ،ڈرائی ڈن وغیرہ نے اہم ترجمے کیے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعری کا شاعری میں ترجمہ نہایت مشکل کام ہے۔تاہم تمام مشکلات کے باوجود شاعری کا ترجمہ شاعری ہی میں ہونا چاہیے ورنہ شاعری سے مخصوص جامعیت کے ساتھ اثر انگیزی اور کیف وانبساط پیدا کرنے کی خاصیت شاعری کے نثری ترجمے میں جاتی رہے گی کیوں کہ نثری ترجمہ اصل شعری متن کے مزاج کے ساتھ غالباً انصاف نہیں کرتا اور اس طرح نثری ترجمے کے باعث اصل شعری متن کی تاثیر ضائع ہو جاتی ہے۔مترجم کے سامنے یہ نکتہ ہمیشہ رہنا چاہیے کہ ترجمے اور اصل کا باہمی رشتہ برابر قائم رہے اور اصل متن کے ساتھ ان نئے لوگوں کے لیے برابر سود مند ہو جن کے لیے اصل شعری متن کے ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف ضروری اور ممکن ہے کہ کوئی بھی ترجمہ سو فیصد اصل متن کے مطابق نہیں ہوتا اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ خواہ گفتگو ہی کے جملوں کو دو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے تو جہاں زبانیں ایک ہی لسانی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں وہاں جملے کی ساخت تقریباً یکساں ہو سکتی ہے لیکن جہاں ایسے یکساں لسانی گھرانے نہ ہوں وہاں جملے کی ساخت میں بھی ردوبدل لازمی بات ہے ان دونوں باتوں کو ترجمے کے عمل کی بنیادی دشواری قرار دیا جا سکتا ہے۔تاہم ایسی دشواری ایک اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ترجمے کی صورت میں متن کی شکل ہر طور بدلتی ہے۔متن ترجمے کے عمل سے گزرتے ہوئے ایک نیا قالب اختیار کرتا ہے اور نئے لسانی پیکر میں نئے لفظوں کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ہر زبان کے الفاظ کی اپنی محاکاتی فضا ہوتی ہے۔یوں ترجمے کا عمل متن کو ایک نئی لسانی آب وہوا میں آباد کرتا ہے۔اس بات کو دوسرے اصول کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔اس لیے اگر دو اصولوں کی روشنی میں ترجمے کے عمل کو دیکھا جائے تو علم ہوگا کہ ترجمے کے ذریعے الفاظ اور جملوں کی ساخت بدلتی ہے لیکن متن کا مافیہ قائم رہتا ہے۔ان پہلوؤں سے متعلق مترجم کی فہم میں گیرائی و گہرائی پائی جائے۔

شعری ادب کے تراجم کے دوران سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ ایک زبان کا شعری فن پارہ کسی مخصوص صنف میں تخلیق پاتا ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ دوسری زبان میں بھی وہ صنف پائی جائے۔اس لیے شعری متن کا ترجمہ ایک بہت بڑی مشکل کھڑی کرتا ہے۔اسی سے متعلق ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا شعری متن کو مروجہ شعری صورت ہی فراہم کرنا ضروری ہے۔اس لیے کہ مختلف لسانی گھرانوں کے عروضی نظام عموماً مختلف ہوتے ہیں نظم وشاعری کی سب سے خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں صوتی توازن اور آہنگ پایا جاتا ہے اور ترجمے کے دوران انہیں منتقل کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔قدامت پسند ادیبوں کا خیال ہے کہ نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہوتی ہے۔ان دونوں صورتوں سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اگر انگریزی نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہے تو اس شعریت کے ضروری اجزا زیر و بم یا آہنگ اور صوتی توازن بھی ہیں۔لہٰذا انگریزی سے ترجمہ کرتے وقت ردھم (Rhythm) اور کیڈنس (Cadence) کو منتقل کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔اس لیے کسی انگریزی نظم کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو اپنی پسند اور انگریزی نظم سے مطابقت رکھتے ہوئے کسی عروض کا استعمال کرنا چاہیے۔

شعری ادب کے تراجم میں ایک مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ بعض شعرا کی زبان اور ان کا انداز بیان بیانیہ اور شفاف ہوتا ہے اور بعض شعرا کی زبان اور ان کا انداز بیان استعاراتی ہوتا ہے۔اور اسکی امیجری زبان کے بطن سے پھوٹتی ہے۔اس بات کو ملحوظ رکھا جائے تو استعارے کی شعری زبان کو ترجمہ کرنا نہایت غیر مناسب اور مشکل کام ہے بالخصوص اس وقت تک جب تک کہ استعارے کو خارج کرنے کا اصول طے اور تسلیم نہ کیا جائے۔کیوں کہ استعارہ شعری زبان کے لسانی پیکر میں ضم ہوتا ہے اور اسے ترجمہ کرتے وقت زبان کی محض ایک جہت کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے جو حقیقتاً شاعری کے مافیہ سے بے تعلق ہوتی ہے۔

شعری ادب کے تراجم کے لیے ان پابندیوں کو بروئے کار نہ لایا جائے جو عروض قافیے اور اضافتوں کی سکہ بند زبان سے تعلق رکھتی ہیں تو شعری ادب کے تراجم کے مسائل کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔لیکن ان پابندیوں کو نرم کرتے وقت شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی شرط کا عائد

کرنا لازمی ہے۔ اگر تراجم کی زبان، شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی اپنی صلاحیت کو بروئے کار لا سکتی ہے تو تراجم کی زبان کا ایک نیا شعری آہنگ ظاہر ہو کیوں کہ شاعری جب بھی کوئی قالب اختیار کرتی ہے تو شاعری ہی کو رونما کرتی ہے۔

انسان کے قلب و نظر کی گفتگو شاعری ہے اور اسے قلب و نظر کی گفتگو ہی میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ترجمے کے عمل کو قلب و نظر کی گفتگو بنا دینے سے اعلیٰ شعری ادب کے در و بام کھل سکتے ہیں۔

ہوتا یوں ہے کہ جب کسی مترجم کو کوئی نظم پسند آتی ہے اور وہ اس سے بہت متاثر ہوتا ہے تو اُس کا جی چاہتا ہے کہ اُس کے پڑھنے والے بھی اس نظم سے لطف اندوز ہوں۔ عام طور سے تو ترجمے کا محرک یہی جذبہ ہوتا ہے اور اس محرک جذبے کا تجزیہ یوں کیا جاتا ہے کہ مترجم کی حیثیت ایک ایسے شخص کی ہوتی ہے جو کسی نظم کو پڑھتے ہوئے کسی ایک مصنف کو تلاش کرتا ہے۔ جب وہ اس مصنف کو پا لیتا ہے تو اُس کے سہارے خود میں چھپے ہوئے مصنف کو بھی پا لیتا ہے۔ صاف اور سیدھے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ مترجم کو کوئی نظم پڑھتے ہوئے اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ جو خیالات، جذبات اور احساسات اس کے شعور اور لاشعور میں عرصے سے تھے اور جن کے اظہار کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے، اسے کسی اور شاعر نے وہ موثر الفاظ میں ادا کر دیا ہے۔ بقول غالبؔ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اگرچہ یہ دوسری زبان میں ہوتا ہے لیکن ایسی صورت میں ان خیالات کا اپنی زبان میں منتقل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

جب کوئی شاعر اپنا تجربہ بیان کرتا ہے تو اس تجربے میں حقیقت کے ساتھ شاعر کے اپنے احساس اور جذبے کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ پھر دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے۔ جو انسان کے احساسات اور تجربات کو مکمل طور پر الفاظ کے سانچوں میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جائے۔ بعض شاعروں کے کلام کی شرحیں لکھی جاتی ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شعر کی شرح میں مختلف شارحین کو آپس میں نہ صرف اختلاف ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات ان کی شرحیں متضاد ہوتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کو اپنے خیال و فکر کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملے (میں یہاں اس ابہام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو جان بوجھ کے پیدا کیا جاتا ہے) ہمارے یہاں اس کی مثال غالبؔ اور تھوڑے بہت مومنؔ ہیں۔ غالبؔ کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد زیادہ ہے جن میں فکر اور الفاظ ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ اس لیے جتنی کلامِ غالب کی شرحیں چھپی ہیں اتنی کسی اور شاعر کی نہیں چھپیں۔ بلکہ خود غالبؔ نے اپنے ایک خط میں نہ بیان کرتے تو آج اردو میں نہ جانے اس کا کیا مفہوم ہوتا۔ اگر شارحین کی شرح ہی میں تضاد ہو تو بے چارہ مترجم کیا کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی تحقیقی کام نہیں کر رہا ہے جو تمام شرحوں کا ترجمہ کر کے اپنے پڑھنے والوں کو بدمزہ کرے۔ مجبوراً وہ ان شرحوں میں سے کوئی ایک انتخاب کرے گا اور اس کا پورا پورا امکان ہے کہ وہ ایک ایسی شرح سے مدد لے جو ہرگز شاعر کا مطلب نہ ہو۔ غالبؔ کا ایک سادہ سا شعر ہے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

حالیؔ نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے..... اگر موت نہ آیا کرتی اور ابد تک زندہ رہنا ہوتا تو جینے میں کوئی مزا نہ آتا۔ اس کے برعکس طباطبائی نے اس شعر کی شرح یوں کی ہے۔ ''رقیب بوالہوس کو ہوس کی نشاطِ کار و لطفِ وصلِ نگار حاصل ہے۔ اب ہمارے جینے کا مزا کیا رہا۔

اگر حالیؔ کی علمیت اور قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تو طباطبائی کے فہم و ادراک پر بھی شبہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان دونوں نے مترجم کے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ وہ دونوں شرحوں میں سے کسے انتخاب کرے۔ بعض شعر تو ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق قطعی اور آخری فیصلہ کوئی شارح نہیں کر سکتا کہ شعر کا اصل مطلب کیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. کیا شاعری کی جامع اثر انگیزی اور کیف وانبساط کا نثر میں ترجمہ ممکن ہے؟
2. صوتی توازن وآہنگ اور غنائیت کس صنف کی خاصیت ہے؟
3. شاعری کے ترجمے کے لیے کیا مترجم کا موزوں طبع ہونا ضروری ہے؟
4. کس مغربی نقاد نے کہا تھا 'نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا'۔؟
5. نظم اور نثر میں کس کا ترجمہ آسان ہے؟
6. مغرب کے ممتاز مترجمین میں سے دو کے نام لکھیے۔

3.7 مترجم کی ذمّے داریاں

مترجم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس متن کا ترجمہ کر رہا ہے، اُسے ایک یا دو دفعہ شروع سے آخر تک پڑھے تا کہ متن کا سیاق وسباق اس پر پوری طرح روشن ہو جائے۔ ترجمے کے لیے محض زبان کا جاننا ضروری نہیں ہے۔

مترجم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس متن کا وہ ترجمہ کر رہا ہے وہ جس ملک میں لکھا گیا، اُس کی تاریخ وتہذیب اور جغرافیہ سے پوری واقفیت حاصل کرے۔

مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اگر وہ فکشن یا شاعری کا ترجمہ کر رہا ہے تو اصل زبان کے ملک کے رسم ورواج پر اُسے پوری قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ وہ اس ملک کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔

مترجم کو کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے جو کسی ایسے علم سے متعلق ہو جس سے مترجم واقف نہ ہو۔

ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ مترجم کسی ایک زبان کے مصنف کے شعر یا تقریر میں بیان کیے گئے خیالات ترجمے میں اس طرح بیان کرے کہ آسانی سے پڑھنے والوں کی سمجھ میں آجائے۔

لفظی ترجمہ کبھی کبھی مضحکہ خیز اور اکثر مقامات پر ناقابلِ فہم ہو جاتا ہے، اس لیے مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اصل زبان کے متن کے ترجمے کو ایسے الفاظ میں ڈھالے کہ ترجمے کا متن ترجمے کی زبان کے بنیادی میلانات کے مطابق ہو، جسے پڑھتے ہوئے قاری اجنبیت محسوس نہ کرے۔

اگر کوئی ترجمان دو ملکوں کی اہم سیاسی شخصیات کے درمیان ترجمانی کرتا ہے تو ترجمے کی معمولی غلطی کے دور رس نتائج ہو سکتے ہیں، اس لیے ان مواقع کے لیے حکومتیں کوشش کرتی ہیں کہ ایسے ترجمان کا انتخاب کریں جسے دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہو۔ یہ احتیاط صرف زبانی ترجمانی تک محدود نہیں ہے، مذہبی، علمی، سائنسی اور ادبی تحریروں میں بھی ضروری ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مترجم کو کس کتاب کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے؟
2. مترجم کو ترجمے کا کام شروع کرنے سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟
3. مترجم کو کسی متن کا ترجمہ کرنے کے لیے کس زبان پر قدرت حاصل ہونی چاہیے؟ اُس زبان پر جس سے وہ ترجمہ کر رہا ہے یا اُس زبان پر جس میں وہ ترجمہ کر رہا ہے؟ یا دونوں پر قدرت حاصل ہونی چاہیے۔

3.8 مترجم کی صلاحیتیں

ترجمے کا اصل مقصد ایک زبان میں بیان کیے گئے خیالات کا دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے۔ جس کے لیے اصل میں مندرجہ ذیل شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے:

1- اصل زبان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ترجمے کی زبان میں من وعن ادا ہو گیا ہو۔ اگر شاعری یا فکشن کا ترجمہ ہے اور مترجم نے ترجمے کی شرط سختی سے پوری نہ کی ہو تب بھی کوئی زیادہ حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر فنی اور تکنیکی کتاب ہے اور ترجمے میں غلطیاں ہو گئی ہوں تو یہ معاملہ خاصا سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

2- جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے، اُس کے الفاظ روزمرّہ اور زبان کے مزاج پر مترجم کو پوری قدرت حاصل ہونی ضروری ہے ورنہ مترجم سے غلطیاں سرزد ہونے کا اِمکان ہوتا ہے۔

3- جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس پر بھی مترجم کو پوری قدرت حاصل ہونی ضروری ہے۔

4- بعض مترجم اپنی زبان دانی کے زعم میں لغتوں کے استعمال کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بہت ضروری ہے اور مترجم کے پاس دونوں زبانوں کے مستند لغات ہوں اور اگر کسی مقام پر اسے ذرا بھی اُلجھن ہو تو وہ لغت میں ان الفاظ کا مطلب دیکھے اور پھر یہ ضروری نہیں کہ لغت میں لفظ کا جو مفہوم دیا گیا ہو وہ صد فی صد درست ہو اور اصل لفظ کے مفہوم کی مکمل نمائندگی کرتا ہو، اس لیے مترجم کو اگر ذرا بھی شبہ ہو تو اسے چاہیے کہ ایک سے زیادہ لغتیں دیکھے۔

5- یہ عین ممکن ہے کہ اصل متن میں عبارت کا کوئی حصّہ صاف نہ ہو اور مصنف کی قدرتِ بیان کی کمی کی وجہ سے اُلجھن پیدا ہو جائے اور مترجم کو یہ معلوم ہو جائے کہ متن کا کوئی حصّہ گنجلک ہے تو وہ اسے زیادہ وضاحت، سلاست اور صفائی کے ساتھ بیان کر دے۔ ترجمہ کرنے والے کی قابلیت اس میں ہے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے کچھ ایسے الفاظ کا اضافہ کرے، جس سے متعلقہ عبارت سُلجھ سکے اور بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔

جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے وہ اگر مترجم کی مادری زبان ہے تب بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان کے ہر لفظ کے مزاج سے پوری طرح واقف ہو۔ ترجمہ کرتے ہوئے بہت سی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ محض زبان پر قدرت حاصل رکھنا کافی نہیں ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو زبان پر اُن کی قدرت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اُنھوں نے یہ ترجمہ عام فہم، سلیس اور آسان زبان میں کیا ہے۔ اُن کی کوشش رہی ہے کہ ترجمہ دہلی کی ٹکسالی زبان میں ہو۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں ایک دو مقام پر ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ اُنھوں نے سورہ اسرٰی کے ترجمے میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ ایک رات آنحضرت کو مکّے سے مدینے کی ہجرت کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ''آنحضرتؐ راتوں رات سٹک گئے''۔ ترجمہ غلط نہیں ہے لیکن سٹک' کے لفظ سے آنحضرتؐ کے احترام میں فرق آتا ہے۔ اس لفظ کو آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی سمجھا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خلاف بڑے بڑے جلسے ہوئے، تجویزیں پاس کی گئیں اور احتجاج ہوئے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ڈپٹی نذیر احمد نے کون سا فقرہ لکھا تھا، جس سے آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی کا پہلو نکلتا تھا؟
2. ترجمے کا اصل مقصد کیا ہے؟
3. اگر مترجم کو کسی لفظ کا مطلب سمجھ میں نہ آئے تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟

3.9 ترجمے کی اخلاقیات

ترجمہ علم کا ایک بہت اہم شعبہ ہے۔ جس طرح تمام علوم کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہے اسی طرح ترجمے کی بھی اخلاقیات ہوتی ہے اور مترجم سے

ہماری یہ توقع غلط نہیں ہے کہ اس کا ترجمہ متن کے عین مطابق ہو۔ اگر مترجم نے لاپرواہی سے کام لیا ہے اور دماغ پر زور ڈالے اور محنت کیے بغیر متن کا غلط سلط ترجمہ کر دیا ہے تو یہ مصنف اور قاری کے ساتھ سخت ناانصافی بلکہ مجرمانہ ناانصافی ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اصل متن کی زبان اتنی مشکل اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ مترجم مختلف لغات دیکھنے کے بجائے اس عبارت کو مختصر کر دیتا ہے یا حذف کر دیتا ہے۔ یہ امر یقیناً غیر اخلاقی ہے۔

اس سے زیادہ غیر اخلاقی بات یہ ہے کہ اگر اصل متن میں مترجم کے عقیدے کے خلاف کچھ ہوتا ہے تو وہ اس عبارت کو حذف کر دیتا ہے یا اپنے عقیدے کے مطابق بدل دیتا ہے۔ ایسی بھی کئی مثالیں ہیں کہ مترجم نے اپنے عقائد کو ترجمے میں اس طرح داخل کر دیا ہے کہ یہ ہرگز پتا نہیں چلتا کہ وہ مصنف کے نہیں خود مترجم کے اپنے خیالات ہیں۔

غرض یہ کہ ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کی بہت اخلاقی ذمے داری ہوتی ہے۔ اسے قدم قدم پر یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ وہی ہونا چاہیے جو منشائے مصنف ہے۔

اسے یہ خیال بھی ہونا چاہیے کہ مترجم کو اصل متن میں ترمیم، حذف اور اضافے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ ہاں اگر اسے مصنف سے کسی معاملے میں اختلاف ہے یا مصنف نے جو کچھ کہا ہے، اس میں وہ اضافہ کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کا حق ہے لیکن اس طرح کہ وہ کتاب کے حواشی میں اپنے خیالات کا اظہار کر دے تاکہ قاری مصنف اور مترجم کے خیالات میں فرق کر سکے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمہ کس کے عین مطابق ہو؟
2. مترجم کو اصل متن میں کن چیزوں کی اجازت نہیں ہے؟

3.10 خلاصہ

ترجمے کے فن کی ابتدا ہزاروں سال پہلے اُس وقت ہوئی تھی، جب انسان نے اپنے تجسس کے باعث اپنے پڑوس اور دور دراز کے ملکوں کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ان علاقوں کے لوگوں سے گفتگو کا ذریعہ یقیناً کوئی نہ کوئی ترجمان ہوتا رہا ہوگا یعنی وہ شخص جو ایک شخص کی بات سنتا رہا ہوگا اور وہ بات دوسرے شخص کو اس کی زبان میں بتا دیتا رہا ہوگا۔ اس شخص کو ہم ترجمان کہتے ہیں۔ یہ دونوں گفتگو کرنے والے لوگوں کی زبان سے واقف ہوتا ہے۔

ترجمے کے میدان میں ہمارے بزرگوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ علم جسے انسانیت کا عظیم ورثہ کہا جاتا ہے، وہ ترجموں کے ذریعے ہی ہم تک پہنچا ہے۔ قدیم زبانوں مثلاً یونانی، سنسکرت، عربی، سریانی، پارسی، لاطینی اور انگریزی سے براہِ راست استفادہ کرنے والے گنتی ہی کے اسکالر ہوتے ہیں۔ انسانیت کا یہ بیش بہا علمی سرمایہ ترجموں کے ذریعے ہی پوری دنیا تک پہنچا ہے۔

لفظوں اور اصطلاحوں کے معقول انتخاب کا مسئلہ واقعی بہت پیچیدہ ہے۔ معاشرے کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اس معاشرے کی اپنی ثقافت ہوتی ہے، اس کے اقدار ہوتے ہیں، علاقائی اور جغرافیائی تقاضے ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی مذکورہ پہلو اس معاشرے کی زبان و بیان اور اس کا لہجہ طے کرتے ہیں۔

ترجموں کے دوران اصطلاحوں کا مسئلہ آتا ہے۔ اس کے حل کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ موضوع مخصوص کے ماہرین اور دونوں زبانوں کے ماہرین کی کمیٹی بنائی جانی چاہیے۔ وضع اصطلاحات میں یکسانیت رہے اس کے لیے کسی قومی ادارے کو یہ ذمے داری دی جانی چاہیے تاکہ لوگ اسے تسلیم کریں۔ اچھے مترجمین کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر عبور حاصل کریں اور متعلقہ موضوع کے رموز سے کماحقہ واقفیت رکھیں۔ تبھی جا کر کہیں وہ اچھے ترجمے کر پائیں گے۔

ترجمے کے دوران مترجم کو دو زبانوں اور دو تہذیبوں کا سفر کرنا پڑتا ہے اور یہ اکادمک سفر کافی مشکل ہوتا ہے کیوں کہ دونوں کے درمیان، باریک

فرق ہوتا ہے جسے ملحوظ رکھے بغیر اچھا ترجمہ معروض موجود میں نہیں آ سکتا۔ اچھا ترجمہ رواں، بامحاورہ اور سلیس ہوتا ہے تاہم معنی کے دامن سے کنارہ کشی کیے بغیر ہی یہ خاصیت لائق تحسین ہے۔ ترجمے میں اگر کچھ اجنبیت کا شائبہ ملتا ہے تو واجبی بات ہے کہ ہر زبان کا اپنا ایک علاحدہ لسانی نظام ہوتا ہے اور اس سے ترجمے کی زبان متمول ہوتی ہے۔

اردو میں انگریزی اردو لغات کا حال بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ لہٰذا بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انگریزی اردو لغت میں چند معلوماتی ضمیمے ضرور شامل کیے جائیں۔ مثلاً شخصیتوں کے ناموں پر مبنی ایک ضمیمہ ہونا چاہیے۔ مقامات پر مبنی ایک ضمیمہ ہونا چاہیے۔ مخففات اور مختصرات پر مبنی ضمیمہ بھی ہونا چاہیے۔ نیز تلمیحات پر مبنی ضمیمہ بھی شامل ہونا چاہیے۔

اپنی زبان کو سائنسی علوم و معلومات سے مالا مال کرنے کی ضرورت ہے۔ سائنسی علوم کے ترجمے میں سب سے بڑا مسئلہ وضع اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ اردو میں سائنسی علوم کی منتقلی کے لیے منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اقوام کے درمیان لین دین اور افہام و تفہیم محض معاشی و سیاسی سطح پر نہیں ہوتی بلکہ فکری اور تہذیبی سطح پر بھی ہوتی ہے۔ افسانوی ادب کے ترجمے کے دوران صرف دو تہذیبیں ہی ایک دوسرے سے باہم دگر نہیں ہوتیں بلکہ دو نثری روایتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں۔

شاعری کا ترجمہ شاعری میں نہایت مشکل کام ہے۔ تاہم تمام مشکلات کے باوجود شاعری کا ترجمہ شاعری میں ہونا چاہیے۔ ورنہ شاعری سے مخصوص جامعیت کے ساتھ اثر انگیزی اور کیف و انبساط پیدا کرنے کی خاصیت شاعری کے نثری ترجمے میں جاتی رہے گی کیوں کہ نثری ترجمہ اصل شعری متن کے مزاج کے ساتھ غالباً انصاف نہیں کرتا۔ شعری ادب کے تراجم کے لیے ان پابندیوں کو بروئے کار نہ لایا جائے جو عروض، قافیے اور اضافتوں کی سکہ بند زبان سے تعلق رکھتی ہے تو شعری ادب کے تراجم کے مسائل کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان پابندیوں کو نرم کرتے وقت شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی شرط کا عائد کرنا لازمی ہے۔

ترجمے کا اصل مقصد ایک زبان میں بیان کیے گئے خیالات کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے۔ اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اصل زبان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ترجمے کی زبان میں من و عن ادا کر دیا جائے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظی ترجمہ کیا جائے یا آزاد۔ اس کا انحصار دراصل اُس متن پر ہے جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ بیشتر متن ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کا لفظی ترجمہ ممکن ہوتا ہے لیکن بعض کا ممکن نہیں۔ جس کا ممکن نہیں ہوتا اُس میں مترجم کو تھوڑی سی آزادی لینی ہوتی ہے یعنی وہ اصل مفہوم کی **ادائگی** کے لیے الفاظ گھٹا بڑھا سکتا ہے اور کبھی کبھی مصنف کے خیالات کو اپنی زبان میں بیان کر دیتا ہے، اسے آزاد ترجمہ کہا جاتا ہے۔

ترجمے کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہے یعنی مترجم کو ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ وہ مصنف کے خیالات میں کوئی تبدیلی کرے یا متن میں اپنے عقیدوں کو داخل کر دے۔ نثر کا ترجمہ آسان ہوتا ہے جب کہ شاعری کا ترجمہ نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔ انگریزی کے ایک بہت بڑے نقاد ڈاکٹر جانسن نے شاعری کے ترجمے کے بارے میں لکھا ہے کہ ''نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔'' ڈاکٹر ہیوگو نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''نظم کے ترجمے کا خیال ہی بے معنی اور ناممکن ہے۔''

3.11 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. تراجم کے عمومی مسائل پر تفصیل سے لکھیے۔
2. سائنسی علوم کے تراجم کے مسائل سے بحث کیجیے۔
3. سماجی علوم کے تراجم کے مسائل پر روشنی ڈالیے۔

4. افسانوی ادب کے تراجم کے مسائل پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کا فن کیوں اور کس طرح وجود میں آیا؟
2. شعری ادب کے تراجم کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔
3. مترجم میں کن صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟
4. ترجمے کی اخلاقیات سے بحث کیجیے۔

3.12 فرہنگ

فقرہ = عبارت کا ٹکڑا' کلام' جملہ' ریڑھ کی ہڈی

محاورہ = باہمی گفتگو' اصطلاحاً وہ کلام جسے اہل زبان نے لغوی معنی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص مفہوم کے لیے مخصوص کر لیا ہو

آمد = آنا' تشریف لانا' خیال آنا' بلا تکلف مضمون ذہن میں آنا

آورد = تکلف اور بناوٹ' تکلف سے شعر کہنا' کوشش سے بات پیدا کرنا

عرق ریزی = سخت محنت

نشاۃ الثانیہ = کسی قوم یا ملک کا از سر نو ترقی کرنا

مرکبات = دو لفظوں کو ملا کر الفاظ بنانا

بندشیں = ترتیب الفاظ' عبارت کی ترکیب' الفاظ کا ربط' گرہ' بندھن

قالب = ڈھانچا

تعبیر = خواب کا نتیجہ نکالنا' بیان کرنا

براہین = دلائل

مضمر = پوشیدہ' مخفی

امتزاج = ملاوٹ' آمیزش' ہم آہنگی

منطبق = برابر' موافق' اوپر تلے ٹھیک آنے والا

پیکر = چہرہ' شکل صورت

محاکات = باہمی بات چیت' باہمی داستان گوئی' ایک دوسرے سے مشابہ ہونا

عروض = وہ علم جس سے نظم کے قواعد معلوم ہوتے ہیں

3.13 سفارش کردہ کتابیں

1. عطش درّانی — اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد، 1994ء
2. اعجاز راہی — روداد سمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اسلام آباد، 1994ء
3. محمد صدیق خاں — شبلی، سرکاری خط و کتابت، سرکاری مراسلات، اسلام آباد، اگست 1987ء
4. خلیق انجم، — فنِ ترجمہ نگاری، دہلی، 1995ء
5. محمد صدیق خاں شبلی — سرکاری خط و کتابت (جلد پنجم) غیر رسمی کیفیات، (طبع دوم)، اسلام آباد، نومبر 1991ء
6. ابو سلمان شاہجہاں پوری — اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد، 1984ء
7. قریشی، نثار احمد — ترجمہ: روایت اور فن، اسلام آباد، ستمبر 1985ء
8. سید مصطفیٰ کمال — حیدر آباد میں اردو کی ترقی [تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے]، حیدر آباد، دسمبر 1990ء
9. قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت، دہلی، جون 1976ء

اکائی 4 : ترجمے کے تقاضے اور مترجم کی خصوصیات

ساخت

4.1 تمہید

4.2 ترجمے کے تقاضے

4.3 ترجمے کے عمومی تقاضے

4.3.1 اصل زبان میں مہارت

4.3.2 ترجمے کی زبان میں مہارت

4.3.3 اصل زبان کے تہذیبی پس منظر سے واقفیت

4.4 ترجمے کے موضوعاتی تقاضے

4.4.1 علمی تراجم کے تقاضے

4.4.2 ادبی تراجم کے تقاضے

4.4.3 مذہبی تراجم کے تقاضے

4.4.4 قانونی تراجم کے تقاضے

4.4.5 صحافتی تراجم کے تقاضے

4.5 مترجم کی خصوصیات

4.6 خلاصہ

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

4.8 سفارش کردہ کتابیں

4.1 تمہید

گزشتہ اکائیوں میں آپ نے یہ معلومات حاصل کی کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں خیال، فہم، احساس، جذبے اور علم کو منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔ ترجمے کی مدد سے دوسری زبانوں کے ادب اور دوسری قوموں کے فکری رجحانات سے آشنائی ہوتی ہے۔ علم کی وسعت، سائنسی ایجادات اور علمی تحقیقات کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے اہم کردار انجام دیا ہے۔ اسی لیے بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعے علوم وفنون کے خزانے کھل جاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں دوسری زبانوں سے ترجمے نہ کیے گئے ہوں۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، طب، مذہب، سائنس اور دیگر بے شمار علوم کے ترجمے مختلف زبانوں میں کیے گئے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اردو زبان میں بھی ترجمے کی روایت نہایت قدیم ہے۔ اردو میں پہلے پہل عربی اور فارسی سے ترجمے ہوئے۔ بعد کے دور میں مغربی زبانوں بالخصوص انگریزی کی بے شمار کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

موجودہ زمانے میں ترجمے کو تخلیق کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ترجمے کو بازتخلیق (Recreation) بھی کہا جاتا ہے۔ گویا یہ بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ ترجمہ محض ایک زبان کے الفاظ کی جگہ دوسری زبان کے الفاظ رکھ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک زبان کے مطالب و خیالات کو ترتیب و تنظیم کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ترجمے میں اصل کی ساری خوبیاں پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم اس میں اصل کی بہت سی خوبیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

ترجمہ اپنی جگہ ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے نئے الفاظ، نئی اصطلاحیں، نئے محاورے اور کہاوتیں اختراع کی جاتی ہیں۔ ایسا ترجمہ تخلیق کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ دوسری طرف کسی متن کو اس کے حقیقی معنی و مفہوم اور مکمل سیاق و سباق کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کر دیا جائے تو ایسا ترجمہ کرافٹ کا کام کرتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اچھا ترجمہ آرٹ اور کرافٹ کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل بھی ہے اور ہنرمندی بھی۔ ترجمے کو جب فن کہا جاتا ہے تو ہر فن کی طرح اس کے بھی کچھ تقاضے ہیں جن کی تکمیل کے بغیر ترجمے میں حسن و خوبی اور فنی کمال پیدا نہیں ہوتا۔ اس اکائی میں ترجمے کے تقاضوں اور مترجم کی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

4.2 ترجمے کے تقاضے

ترجمے کے تقاضوں پر گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ کسی بھی فن کے تقاضے اس کے اصولوں کی روشنی میں متعین ہوتے ہیں۔ یعنی ہم کسی فن مثلاً شاعری کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر یہ طے کر سکتے ہیں کہ شاعری کے کیا تقاضے ہیں یا مصوری کے اصولوں کی روشنی میں مصوری کے تقاضوں کا تعین کیا جاسکتا ہے لیکن جب ہم ترجمے کے تقاضوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمے کے کوئی عالمی اصول متعین نہیں ہیں۔ یہ بات نہایت حیرت ناک ہے کہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمے کا عمل انجام دیا جارہا ہے لیکن اس کے باوجود ترجمے کے ایسے اصول وضع نہیں کیے جاسکے جن پر سب کا اتفاق ہو۔ تھیوڈر ساوری نے اپنے مضمون ''آزاد اور لفظی ترجمہ'' میں ترجمے کے متعلق ماہرین فن کے خیالات و نظریات کے اختلافات کی دلچسپ صورت حاصل پیش کی ہے۔ وہ رقم طراز ہے :

> ''یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ترجمے کے کوئی عالمی اصول تسلیم نہیں کیے گئے ہیں کیوں کہ ان اصولوں کی تشکیل کرنے والے حضرات خود آپس میں کبھی متفق نہیں ہو سکے اور ان کے خیالات میں بے انتہا مغائرت ہے، انہوں نے جو کچھ بھی ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ متشر خیالات کا ایک ایسا ابتر مجموعہ ہے جس کی ہمیں ادب کے دوسرے شعبوں میں مثال نہیں ملتی۔''

آگے اُس نے ترجمے کے بارے میں مختلف ماہرین کی متناقض آرا پیش کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1. ترجمے میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔
2. ترجمہ اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔
3. ترجمہ اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
4. ترجمے کو ترجمے ہی کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
5. ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔
6. ترجمے کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہیے۔
7. ترجمہ اصل متن کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
8. ترجمے کو مترجم کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

9. ترجمے میں اصل تصنیف سے حذف و اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

10. ترجمے میں اصل متن سے حذف و اضافہ کبھی ممکن نہیں۔

11. نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔

12. نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہیے۔''

(تھیورڈ ساوری، مضمون' آزاد اور لفظی ترجمہ' مترجمہ آصفہ جمیل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت۔ مرتبہ قمر رئیس۔ ص 166)

ترجمے کی ماہیت، مقصد اور تکنیک کے متعلق ماہرین کے مندرجہ بالا خیالات فنِ ترجمہ کے ایسے اصول پیش کرتے ہیں، جن میں ہر پہلا اصول دوسرے اصول کی نفی کرتا ہے۔ ظاہر ہے ان متخالف اور متناقض اصولوں کی روشنی میں ترجمے کے تقاضوں یا مترجم کی خصوصیات کے بارے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ تاہم اس اکائی میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اخلاقی نقاط نظر کی موجودگی میں کسی ایک نقطۂ نظر کو قبول کرنے اور دوسرے کو مکمل طور پر رد کرنے کے بجائے دونوں مکاتبِ فکر کے مفید اصولوں کو لیتے ہوئے بین بین چلا جائے تاکہ ترجمے کے تقاضوں اور مترجم کی خصوصیات کے بارے میں بنیادی امور کا ایک واضح خاکہ ہمارے ذہنوں میں موجود رہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. عام طور پر کسی فن کے تقاضوں کا تعین کس طرح کیا جاتا ہے؟

2. کیا عالمی پیمانے پر فنِ ترجمہ کے مسلمہ اصول موجود ہیں؟

3. فنِ ترجمہ کے تقاضوں کے تعین میں دشواری کیوں پیش آتی ہے؟

4.3 ترجمے کے عمومی تقاضے

ترجمے کے عمل میں زیرِ ترجمہ مواد کی نوعیت کے لحاظ سے ترجمے کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ادبی تراجم کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں اور علمی تراجم کے تقاضے کچھ اور۔ لہٰذا دونوں کے تقاضوں پر الگ الگ گفتگو کرنا ضروری ہے۔ لیکن پہلے کچھ ایسے تقاضوں پر روشنی ڈالی جائے گی جو ہر طرح کے تراجم میں مشترک ہیں۔

4.3.1 اصل زبان میں مہارت

ہر نوعیت کے ترجمے کا اولین تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ مترجم کو زیرِ ترجمہ متن کی زبان جسے اصطلاحاً اصل زبان (Source Language) کہا جاتا ہے اور ترجمے کی زبان جو (Target Language) کہلاتی ہے، دونوں میں مہارت حاصل ہو۔ دونوں زبانوں کی واقفیت کے بغیر ترجمے کا کام انجام نہیں پا سکتا۔ مترجم کو اصل زبان کی قواعد، اس کے محاوروں اور ضرب الامثال، صنائع و بدائع اور تاریخی و تہذیبی پس منظر سے اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے۔ اس ضمن میں ظ۔ انصاری لکھتے ہیں :

> ''جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس زبان کی لغت سے، اصطلاحات اور محاوروں سے، کسی قدر ادبیات سے اور تھوڑی بہت تاریخ سے واقفیت اور نکھرا ہوا ذوق ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر بھی ترجمہ کرنے والے کو ماہرانہ عبور حاصل ہو، یا وہ اصل عبارت یا اصل تصنیف والی زبان میں خود بھی اسی طرح بے تکلف اور بے تکان لکھ سکتا یا بول سکتا ہو۔ بلکہ اس زبان کا صرف کتابی علم کافی ہے۔ اگر کتابی علم بھی نہ ہو تو خیال کی نزاکتیں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ اصل عبارت کی نوک پلک پر ترجمہ کرنے والے کا دھیان نہیں جائے گا اور وہ اسے ترجمے میں منتقل کرنے کی طرف سے غافل رہے گا۔''

آگے وہ لکھتے ہیں کہ

''مترجم کو اصل زبان کا علم کم از کم اتنا ضرور ہو کہ وہ اصل عبارت کے سیاق وسباق کو سمجھ سکے یا پا سکے کہ فلاں قسم کا لفظ نظر انداز کر کے فلاں لفظ مصنف نے خاص اس مقصد سے رکھا ہے یہ مقصد اگر سمجھ میں آ جاتا ہے تو ترجمہ کرتے وقت اس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس مقصد کو کسی ہم پلہ لفظ سے پورا کیا جا سکے ورنہ نہیں۔''

(ظ۔انصاری مضمون۔ترجمے کے بنیادی مسائل۔مشمولہ ترجمہ: روایت اور فن ص۔114)

اصل زبان سے سرسری واقفیت کے باوجود کامیاب ترجمے کی سب سے عمدہ مثال ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ ''تعزیرات ہند'' ہے۔مولوی نذیر احمد انگریزی میں شدھ بدھ رکھتے تھے لیکن ترجمہ کرنے کا انہیں خاص ملکہ تھا وجہ یہ تھی کہ وہ کئی زبانوں جیسے عربی، فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے۔اگر ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوتا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیتے۔ان کے ترجمے کی خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔انہوں نے تعزیرات ہند (Indian Penal Code) کے ترجمے میں بھی لفظ پر وہی لفظ بٹھایا ہے جو معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔کمال یہ ہے کہ یہ شاندار کارنامہ انہوں نے سوا روپے کی رائل ڈکشنری کی مدد سے انجام دیا۔(بحوالہ مرزا فرحت اللہ بیگ، ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی : کچھ میری کچھ ان کی زبانی، مرتبہ رشید حسن خاں، ص 60) لیکن مولوی نذیر احمد کی مثال سے قطع نظر ہمیں یہ مان کر چلنا ہوگا کہ مترجم کو اصل تصنیف یا اصل عبارت کی زبان کا علم جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی اس کے ترجمے میں عمدگی پیدا ہوگی۔

4.3.2 ترجمے کی زبان میں مہارت

ترجمے کے تقاضوں میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو ترجمے کی زبان میں مہارتِ تام اور دستگاہِ کامل حاصل ہونی چاہیے بلکہ اُسے اصل زبان سے زیادہ ترجمے کی زبان پر قدرت وعبور ہونا چاہیے یہاں تک کہ اسے ترجمے کی زبان میں خود لکھنے کی پختہ مشق ہونی چاہیے۔شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ مترجم کو اپنی زبان میں محسوس کرنے اور سوچنے پر قدرت ہونی چاہیے۔(بحوالہ شمس الرحمٰن فاروق، مضمون، دریافت اور بازیافت، مشمولہ فن ترجمہ نگاری، مرتبہ خلیق انجم۔ص 133)۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ مترجم کو خود بھی اپنی زبان کا مصنف، ادیب یا شاعر ہونا چاہیے۔لیکن یہ کلیہ نہیں ہے۔البتہ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ غیر۔ ادیب یا شاعر مترجم کے مقابلے میں ادیب یا شاعر مترجم کا ترجمہ اعلیٰ ہوگا۔اردو میں مولانا ظفر علی خاں، نظم طباطبائی اور محمد حسن عسکری کے ترجمے اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔چوں کہ ادیب یا شاعر اپنی زبان پر حد درجہ عبور رکھتا ہے اور اپنی زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں کا رمز شناس ہوتا ہے۔اس لیے قدرتی طور پر اس کا ترجمہ بھی اعلیٰ ہوتا ہے۔لیکن عملاً یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اچھے شاعروں کے شعری ترجمے ناقص ثابت ہوئے۔جیسے پوپ انگریزی کا بڑا شاعر ہے لیکن اس نے ہومر کی الیڈ کا جو ترجمہ کیا اس پر کافی اعتراضات ہوئے۔اس کے برخلاف میکس ہیورڈ Max Hayward شاعر یا افسانہ نگار نہیں تھا لیکن اس نے روسی شاعری اور افسانوں کے بہترین تراجم پیش کیے۔اردو میں مولوی عنایت اللہ دہلوی سب سے کثیر التراجم مترجم گزرے ہیں لیکن وہ نہ شاعر تھے نہ ڈرامہ نگار۔

بہر حال مترجم کا بذات خود مصنف یا تخلیقی فن کار ہونا ترجمے کا اصل تقاضہ نہیں ہے۔اصل تقاضہ یہ ہے کہ مترجم کو ترجمے کی زبان کی گہری آگہی ہو۔اُسے اپنی زبان کے الفاظ کے ماخذ اور سرچشموں کا علم ہو۔ان کے لغوی اور اصطلاحی معنوں سے واقفیت ہو۔روزمرہ، محاورات اور ضرب الامثال کی اصلیت اور ان کے محلِ استعمال سے باخبر ہو اور سیاق وسباق کے اعتبار سے لفظ کے معنی میں ہونے والے بدلاؤ کا درک رکھتا ہو۔اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کے قدیم وجدید ادب پر نظر رکھے تاکہ وہ ترجمے کی زبان کے متنوع اسالیب سے واقف ہو اور اصل زبان کے اسلوب کے لیے ترجمے کی زبان میں مناسب متبادل اسلوب تلاش کر سکے۔اپنی زبان کے مختلف اسالیب سے واقفیت مترجم کے لیے کس طرح مددگار ثابت ہو سکتی ہے اس کی ایک اچھی مثال محمد حسن عسکری کا میلول کے ناول ''موبی ڈک'' کا ترجمہ ہے۔اصل ناول میں بے شمار اسالیب گھلے ملے ہیں۔عسکری نے بھی اپنے ترجمے میں اردو کے اتنے اسالیب گھلا ملا دیئے ہیں کہ ترجمہ اصل کے تاثر کی ہو بہو ترسیل کرتا ہے۔یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ محمد حسن عسکری اردو کے مختلف نثری اسالیب سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔

4.3.3 اصل زبان کے تہذیبی پس منظر سے واقفیت

زبان اور تہذیب میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ کسی زبان میں پیش کیے گئے متن کو سمجھنے کے لیے نہ صرف زبان سے واقفیت ضروری ہے بلکہ زبان کی تہذیب کا علم بھی ضروری ہے۔ ترجمہ دراصل کسی متن کو ایک تہذیبی فریم سے نکال کر دوسرے تہذیبی فریم میں پیش کرنے کا عمل ہے۔ اس میں ایک تہذیب کے تصورات کو دوسری تہذیب کے پیکر میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ مترجم کا کام ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا نہیں بلکہ ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں منتقل کرنا ہے۔ کوئی خاص لفظ اپنے تہذیبی پس منظر میں ایک منشور کی طرح ہوتا ہے جس سے تصورات کے کئی رنگ پھوٹتے ہیں لیکن دوسری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ اپنے تہذیبی سیاق میں تصورات کی اس ست رنگی چھوٹ سے عاری ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمے میں مکھی پہ مکھی بٹھانے سے کام نہیں چلتا۔ مترجم کو اصل متن کے تہذیبی تصورات کی ترجمے کی زبان میں باز آبادکاری کرنی پڑتی ہے۔ اسکے لیے مصنف کو زبان کے تہذیبی عناصر اور اس کے تہذیبی رچاؤ سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس اہم نکتے سے عدم واقفیت کے سبب ہمارے بعض مترجمین خصوصاً ابتدائی دور کے مترجمین نے غیر ملکی ماحول میں مقامی ماحول کو شامل کر دیا۔ چنانچہ ابتدا میں ہمارے ہاں جارج ولیم۔ ایم۔ اور رینالڈز کے جن ناولوں کے ترجمے ہوئے ان میں قارئین کی دلچسپی یا سہولت کے پیش نظر ہمارے مترجمین نے مرزا حامد بیگ کے بقول :

> ''لندن کے بازاروں میں جمن حلوائی اور لکھنؤ کے بانکوں کو جدی پشتی وہاں کا ثابت کر دیا۔ کرداروں کے نام اور جگہوں کے آثار تو تبدیل ہوئے ہی ان کے عادات و خصائل تک بدل گئے۔'' (مرزا حامد بیگ 'اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ' مشمولہ 'روداد سیمنار' اردو زبان میں ترجمے کے مسائل' مرتبہ اعجاز راہی۔ ص 81)

ظاہر ہے کہ اسی طرح کے تراجم پر ''خیانتِ مترجمانہ'' کا جرم عائد کیا جا سکتا ہے کیوں کہ مترجم کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی متن کے تہذیبی سیاق کو بدل ڈالے۔

سطور بالا میں ہم نے ترجمے کے کچھ خصوصی تقاضوں کا مطالعہ کیا۔ آج کل ترجمے سے ایک اور تقاضہ یہ بھی کیا جا رہا ہے کہ ترجمہ اصل زبان کے اسالیب اور طرزِ احساس کو ترجمے کی زبان میں اس طرح منتقل کرے کہ ترجمے کی زبان اس سے متاثر ہو۔ ایک زمانے میں ترجمے کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بالکل اصل معلوم ہو۔ لیکن موجودہ زمانے میں اسے ترجمے کی خوبی نہیں بلکہ خامی تصور کیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کسی متن کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس میں وہ روانی ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی جو خود اپنی زبان میں براہ راست لکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور جب ترجمے میں وہ روانی پیدا نہیں ہو سکتی تو کیسے معلوم ہوگا کہ ترجمہ اصل تخلیق ہے؟ مترجم کا فرض ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا کا خیال رکھے۔ اصل لفظ کی جگہ محض ہم معنی یا قریب المعنی لفظ رکھنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ضرورت پڑنے پر نئے مرکب بنائے۔ نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ وضع کرے۔ ایسے ترجمے سے حقیقت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جو سلاست و روانی تو پیدا کر دے لیکن مصنف کی روح' اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے اور ساتھ ساتھ جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو اس کے مزاج کو اسی طرح روایتی روش اور اظہار بیان پر قائم رکھے اور اس میں کسی اضافے' اسلوب کے نئے امکان یا بیان کے نئے تجربے کی کوشش نہ کرے۔ ایذرا پاونڈ نے اس قسم کے ترجمے کو ادب کے لیے سب سے کارآمد قرار دیا ہے جو اپنی زبان میں ایک ایسا طاقتور اسلوب پیدا کر دے جس کا اثر نہایت دور رس ہو۔ اردو کے مشہور نقاد محمد حسن عسکری بھی اچھا ترجمہ اس کو سمجھتے ہیں :

> جس میں چاہے اصل کتاب کی روح برقرار نہ رہے لیکن اس کے ذریعے جس بدولت تخلیقی جذبہ ملے اور جن کے ذریعے زبان کے اسالیب میں اضافہ یا تغیر واقع ہو۔ (محمد حسن عسکری۔ مضمون' گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے' مشمولہ ترجمہ : روایت اور فن۔ ص 145)

ترجمے کے عمومی تقاضوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب ہم ترجمے کے موضوعاتی تقاضوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کے عمومی تقاضوں سے کیا مراد ہے؟
2. اصل زبان میں مہارت کیوں ضروری ہے؟
3. ترجمے کی زبان پر عبور کیوں ہونا چاہیے؟
4. ترجمے میں تہذیبی پس منظر کی کیا اہمیت ہے؟

4.4 ترجمے کے موضوعاتی تقاضے

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے کہ ترجمہ ایک مشکل فن ہے اور اس کے تقاضے مخصوص اور متنوع ہیں۔ دنیا میں علوم وفنون کی بے شمار قسمیں ہیں جیسے شعروادب، سائنس، سماجی علوم اور مذہب وقانون وغیرہ۔ ذیل میں کچھ اہم علوم کے ترجمے کے مخصوص تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

4.4.1 علمی تراجم کے تقاضے

علمی تراجم میں تمام سائنسی اور عمرانی علوم جیسے تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، معاشیات، حیوانیات، نباتیات، طبیعیات، کیمیا، انجینئرنگ اور دیگر ٹکنالوجی کے علوم شامل ہیں۔ علمی تراجم کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ غیر تخلیقی ہوں۔ ان میں معلومات کی ترسیل اور نفس مضمون کے ابلاغ اور صحت مفہوم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ علمی تراجم میں اصل مسئلہ مواد کی منتقلی کا ہے اسلوب کا نہیں۔ اس لیے علمی تراجم میں اصل تصنیف کے خیال اور مفہوم کا صحیح ادراک اور اس کی ٹھیک ٹھیک ترسیل ضروری ہے۔ خیال کے ساتھ قوت استدلال کا اظہار لازمی ہے۔ طبیعی اور عمرانی علوم میں جذبہ واحساس کی بجائے معلومات وافکار اور تجزیے کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے لیے اصطلاحات کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ علمی تراجم کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ حتی الامکان اصل تصنیف کی اصطلاحات کا متبادل ترجمے کی زبان میں بھی وضع کیا جائے۔ ناگزیر صورتوں میں اصطلاح کے ترجمے کے بجائے اصل اصطلاح جوں کی توں قبول کی جاسکتی ہے۔

4.4.2 ادبی تراجم کے تقاضے

ادبی تراجم کو وسیع پیمانے پر دو حصوں یعنی منثور اور منظوم ترجمے میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ منثور یعنی نثری تراجم میں مصنف کے خیال کے علاوہ جذبات، احساسات، کیفیات، تاثرات اور اسلوب وغیرہ سبھی لوازمات کو ترجمے میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ ادبی تراجم میں فنی محاسن اور جمالیاتی قدروں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جمالیاتی انبساط ایک پیچیدہ عمل ہے اس کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی کوئی میکانکی فعل نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح سے بازتخلیق ہے۔ ادبی تراجم کا ایک اہم شعبہ منظوم ترجمہ کا ہے۔ منظوم ترجمے کا تقاضہ یہ ہے کہ اصل متن کے مرکزی خیال کے ساتھ ساتھ اصل کے آہنگ، موسیقی، فضا اور صوتی اثرات کی بھی ترسیل کرے۔ منظوم ترجمے کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ منظوم ترجمہ زبان کی دلکشی، صنائع وبدائع کے حسن، جمالیاتی کیفیت اور شعریت کے اوصاف سے متصف ہو۔

4.4.3 مذہبی تراجم کے تقاضے

مذہبی کتب تقدس کی حامل ہوتی ہیں۔ ان میں لفظ قطعی اور مستقل اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس لیے ان کے ترجمے میں لفظ یا ترکیب کے مطابق لفظ اور ترکیب کا ہونا ضروری ہے۔ مقدس کتابوں میں جو شان اور شکوہ وجلال ہوتا ہے ان کی ترسیل کے لیے ترجمے کی زبان میں بھی پرشکوہ اور عالی شان الفاظ و محاورات برتنے چاہئیں تاکہ اصل کے تقدس اور کیفیت کی بازآفرینی ہو۔

4.4.4 قانونی تراجم کے تقاضے

قانونی تراجم میں خصوصی احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ قانون کی زبان نہایت جامع اور محتاط ہوتی ہے۔ اس میں ایک لفظ کے اِدھر اُدھر ہونے سے مفہوم میں فرق آجاتا ہے۔ اس لیے قانونی تراجم کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ وہ اصل کے وفادار رہیں۔ ان ترجموں کی زبان میں صحت اور قطعیت کا ہونا ضروری ہے۔

4.4.5 صحافتی تراجم کے تقاضے

صحافتی مواد چوں کہ عوام الناس کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس کے تقاضے ادبی یا علمی تراجم سے مختلف ہوتے ہیں۔ صحافتی تراجم کو سادہ اور عام فہم ہونا چاہیے۔ صحافتی تراجم میں طویل، پیچیدہ اور مرکب جملے نہ ہوں۔ ترجمے میں عام بول چال کی زبان استعمال کی جائے۔ جملے مختصر ہوں اور کفایت لفظی کے ساتھ ابلاغ و ترسیل کا فعل انجام دیتے ہوں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کے موضوعاتی تقاضوں سے کیا مراد ہے؟
2. علمی تراجم کے اہم تقاضے کیا ہیں؟
3. صحافتی ترجمہ کیسا ہونا چاہیے؟

4.5 مترجم کی خصوصیات

ترجمہ ایک صبر آزما اور دقت طلب کام ہے۔ اس میں مہارت اور کمال پیدا کرنے کے لیے مترجم کو کچھ مخصوص خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ ایک اچھے مترجم کی خوبیوں اور خصوصیات کے بارے میں مختلف ماہرین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس طرح ترجمے کی مختلف اقسام کے ساتھ اس کے تقاضے بھی بدلتے جاتے ہیں اسی طرح مختلف علوم، مختلف موضوعات اور مختلف اصناف میں ترجمے کا کام انجام دینے والوں کی خصوصیات بھی الگ الگ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب مترجم میں پائی جانے والی خصوصیات کے بارے میں مختلف ماہرین کے خیالات درج ذیل خصوصیات ہیں :

شاہ پرتگال کنگ ڈیوراٹ (1391-1438) نے ''دی لائل کونسلر'' نامی کتاب میں مترجم کی پانچ خصوصیات بیان کی ہیں :

1. مترجم، اصل متن کے معانی کو سمجھے اور ترجمے میں انہیں کسی تبدیلی کے بغیر بہ تمام و کمال منتقل کرے۔
2. مترجم، ترجمے میں ترجمے کی زبان کا روزمرہ اور محاورہ استعمال کرے۔ اصل متن کی زبان سے مستعار نہ لے۔
3. مترجم، ترجمے کی زبان میں ایسے الفاظ استعمال کرے جو اصل زبان کے الفاظ کے راست اور مناسب متبادل ہوں۔
4. مترجم، درشت اور ناپسندیدہ الفاظ سے گریز کرے۔
5. مترجم، ان تمام اصولوں کی پابندی کرے جو عبارت نگاری کا لازمہ ہیں یعنی اس کی تحریر واضح، قابل فہم اور مفید ہو۔

اسی طرح (Etienne Dolet 1509-1546) اپنی کتاب "The best way translating from one language to another" میں لکھتا ہے کہ مترجم کو چاہیے کہ :

1. اصل معنی کو سمجھے۔
2. اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر عبور رکھے۔
3. لفظی ترجمے سے گریز کرے۔
4. ترجمے میں بامحاورہ زبان استعمال کرے۔
5. الفاظ کے انتخاب اور ترتیب میں احتیاط برتتے ہوئے جملوں میں مناسب آہنگ پیدا کرے۔

مذکور ماہرین فنِ ترجمہ نے مترجم کی جو خصوصیات بیان کی ہیں اُن میں انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ظاہر ہے آج کے

بدلے ہوئے تقاضوں میں ان کے خیالات سے صد فیصد اتفاق کرنا مشکل ہے' تاہم ان کی بیان کی ہوئی کئی باتیں آج بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

مذکورہ خصوصیات سے قطع نظر مترجم کو ترجمے کا ذوق وشوق بھی ہونا چاہیے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب اسے ترجمے کے کام سے فطری مناسبت ہو۔ اگر کسی کو ترجمے سے فطری مناسبت نہ ہو تو وہ ترجمے کا کام ٹھیک ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتا۔ فطری مناسبت کی بدولت مترجم ترجمے کا کام شوق وانہماک سے کرے گا اور اس کا ترجمہ اعلیٰ درجے کا ہوگا۔

لغات بالخصوص ذولسانی لغات مترجمین کے لیے مطالعے کے اہم ترین وسیلے ہیں۔ مترجم کا مطالعہ وسیع' عمیق اور متنوع ہونا چاہیے۔ ترجمے میں ذخیرۂ الفاظ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مترجم کا مطالعہ جس قدر وسیع اور ہمہ جہتی ہوگا اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ مختلف علوم کی لفظیات و اصطلاحات سے اسی قدر مالا مال ہوگا جس سے مترجم کو ترجمے میں بڑی مدد ملے گی۔ لہٰذا اُسے چاہیے کہ فنون لطیفہ فلسفہ' نفسیات' سائنس' مذہب' معاشیات' سیاسیات غرض یہ کہ ہر طرح کے مضامین اور زندگی کے ہر شعبے سے متعلق کتابوں کو مطالعہ میں رکھے۔

ترجمہ ایک فن ہے۔ دیگر فنون کی طرح اسے بھی باقاعدہ سیکھنے' اس کی تربیت حاصل کرنے وراس میں کمال پیدا کرنے کے لیے مستقل اور مسلسل مشق اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ مترجم کو چاہیے کہ ترجمے کے فن کا باضابطہ اکتساب کرے اور اس میں مشق بہم پہنچائے۔

ترجمہ خلوص' موضوع سے مکمل وابستگی اور ذہنی مشقت کا متقاضی ہوتا ہے۔ مترجم کو محنت کش اور متشکک مستقل مزاج ہونا چاہیے۔ مترجم کو عجلت پسند اور جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ جلدی بازی میں کیا گیا ترجمہ سہو وسقم سے پُر ہوتا ہے۔ مترجم کو لغت سے رجوع کرنے میں تن آسانی یا تساہل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اُسے یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ کوئی بھی شخص ہمہ دان نہیں ہوسکتا۔ مترجم خواہ کتنا ہی قابل ہو اور اس کا ذخیرۂ الفاظ خواہ کتنا ہی وسیع ہو ترجمے کے وقت بعض اوقات اسے لغت دیکھنے کی ضرورت ضرور محسوس ہوگی۔ لغت دیکھنے میں کاہلی سے کام لینا یا اسے کسر شان سمجھنا غلطی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں لکھتے ہیں :

> ''ایک مشہور مترجم سے میں نے اس کے ترجموں کی کامیابی کے بارے میں سوال کیا تو اس نے انکساری سے یہ کہا کہ لغت میں دیکھ لیتا ہوں۔ باقی لوگ اس کام میں سُبکی محسوس کرتے ہیں۔''
>
> (ڈاکٹر سہیل احمد خاں' مضمون : ترجمہ' تالیف' تلخیص اور اخذ کرنے کا فن' مشمولہ ترجمہ : روایت اور فن۔ ص۔ 78)

دورانِ ترجمہ' مترجم کو صرف ایک لغت سے نہیں بلکہ کئی لغات سے بار بار رجوع کرنا لازمی ہے۔ اسے نہ صرف اُن لغات کو دیکھنا پڑے گا' جن میں الفاظ کے معنی بیان کیے گئے ہیں بلکہ ان لغات پر بھی نظر ڈالنی ہوگی' جن میں اصطلاحوں کے ترجمے اصطلاحوں کی صورت میں دیے گئے ہیں۔ موضوع مخصوص فرہنگ اصطلاحات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ لغات سے بار بار رجوع کرنا ایک صبر آزما اور محنت طلب کام ہے لیکن اچھے مترجم کے لیے اس صبر اور محنت کا مظاہرہ ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ لغت کا کام ترجمے میں مدد دینا ہے اور لغت ترجمے میں کام دیتا ہے لیکن ایک حد تک جو چیز لغت سے زیادہ کارآمد ہے وہ ہے اس زبان کا وسیع اور عام مطالعہ جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے۔

مترجم کو زیر ترجمہ کتاب کے موضوع یا مضمون سے بھی گہرا شغف اور ذہنی لگاؤ ہونا چاہیے۔ کسی علمی مضمون یا کتاب کا ترجمہ وہی کرسکتا ہے' جسے اس کے موضوع سے دلچسپی ہو۔ جس مترجم کو کسی خاص موضوع کی کتاب یا مضمون سے دلچسپی اور انسیت نہ ہو' اسے صرف زباندانی کے بل پر اس علم یا مضمون کی کتاب کا ترجمہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ ہر علم کا ماہر اپنے علم کی کتاب کا ترجمہ جس بہتر طور پر کرسکتا ہے' دوسرے علوم کی کتابوں کا اس بہتر ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتا۔

ترجمہ اصل متن کو سمجھ کر دوسروں کو سمجھانے کا نام ہے۔ جو شخص کسی متن کو خود نہ سمجھتا ہو وہ دوسروں کو کیا سمجھا سکتا ہے۔ اس لیے مترجم پر لازم ہے کہ کسی تصنیف کا ترجمہ کرنے سے قبل اس علم کی ضروری کتب کا مطالعہ کرے تاکہ اس علم کے اہم مباحث اور دیگر مشمولات کو صاف اور واضح طور پر بیان کرسکے۔ جب تک اصل متن کے نکات اور مطالب مترجم کے لیے آئینہ نہ ہو جائیں وہ ترجمے کے آئینے میں اس کا صحیح عکس پیش نہیں کرسکتا۔

موضوع سے شغف اور اصل عبارت کے مکمل فہم کے ساتھ ساتھ مترجم میں یہ خاصیت بھی ہونی چاہیے کہ اگر وہ کسی صاحب طرز ادیب یا مخصوص

رجحان اور خاص ذہنیت کے مصنف کی تصنیف کا ترجمہ کر رہا ہو تو اس ادیب یا مصنف کے طرز بیان، رجحان اور ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہو۔ ماہرین کا خیال ہے کہ موثر ترجمے کے لیے مترجم کو اصل عبارت کے مصنف کے حالات زندگی، اس کے مزاج، فلسفۂ حیات اور اسلوب کا علم ہونا چاہیے۔ ان نکات سے لاعلمی کے سبب اصل تصنیف کے بعض اشارے، کنایے اور نزاکتیں مترجم کی گرفت میں آنے سے چھوٹ جاتی ہیں جن پر پوری تصنیف کے لطف یا اہمیت کا دارومدار ہوتا ہے۔ اچھے ترجمے کے لیے مصنف کی سوانح و شخصیت کے علاوہ اس کے لسانی رویے، مخصوص الفاظ، تراکیب، محاوروں اور استعاروں سے اس کے لگاؤ اور اس کی پسندیدہ تشبیہات وغیرہ سے گہری واقفیت ضروری ہے۔ علاوہ ازیں مترجم کو مصنف کے دور کے سیاسی و معاشی اور تہذیبی و ثقافتی پس منظر، اس کے عہد کے اقدار و روایات تحریکات و رجحانات اور دیگر زمانی و مکانی حوالوں کو بھی پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے۔

مترجم کو اپنے مترجم ہونے اور ذولسان ہونے پر فخر ہونا چاہیے اور کسی بھی طرح کہ احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ نیز اصل تخلیق کے تئیں مکمل طور پر وفادار ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ متن کے تئیں مکمل وفاداری کو قبول کیے بغیر اچھا ترجمہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اسی طرح مترجم میں خودنمائی کی خواہش بھی نہیں ہونی چاہیے۔ مترجم کا اصل مقصد اپنے آپ کو نمایاں کرنا نہیں بلکہ دوسری زبان کے شاہ کار کو اپنی زبان میں منتقل کرنا یا ادبی اسالیب میں تازگی پیدا کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں :

> ''ترجمہ کرنے والا اپنی شخصیت اور مزاج کو کھو کر دوسرے کی شخصیت اور مزاج میں انہیں تلاش کرتا ہے۔ کھو کر پانا اور پا کر کھونا اچھے ترجمے کے بنیادی عناصر ہیں۔ اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آ سکتا ہے، جب مترجم نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔ اپنی ذات کی نفی اور اپنی شخصیت سے انکار ایک اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے۔''
>
> (ڈاکٹر جمیل جالبی، ترجمے کے مسائل۔ مشمولہ ترجمہ۔ روایت اور فن مرتبہ نثار احمد قریشی۔ ص 156)

ترجمے کے دوران اپنی ذات کی نفی کے ساتھ ساتھ مترجم میں یہ صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ اصل مصنف کے باطن میں جھانک سکے۔ اس کے ذہنی و فکری میلانات اور جذباتی لہروں اور نفسیاتی کیفیات سے آشنائی پیدا کر سکے۔ مترجم کو چاہیے کہ اپنے وجود، خیال، جذبے اور قلم کو اصل مصنف کے حوالے کر دے یعنی یہ سوچے کہ فلاں خیال، جملے، محاورے یا عبارت کو مصنف اگر ترجمے کی زبان میں لکھتا تو کیسے لکھتا۔ اس سلسلے میں پروفیسر نصیر احمد خاں لکھتے ہیں

> ''دراصل صحت مند اور کامیاب ترجمہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب ہم لکھنے والے کے ذہن میں سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم ان کیفیات اور احساسات سے گزر سکتے ہیں۔ جو تصنیف کا باعث بنی ہیں۔ اس طرح ترجمہ ہونے والے فن پارے کی روح تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ترجمہ محض ایک جسم کو دوسرا لباس پہنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک جسم کے مقابلے میں بالکل ویسا ہی جسم تراش کر اسے دوسرے لباس میں اس طرح لے آنا ہے کہ دونوں قالبوں میں ایک ہی روح ہو۔ یہاں لباس، جسم اور روح سے مراد ترجمے کی زبان، اصل عبارت کا مرکزی خیال اور وہ تاثر ہے جو پڑھنے کے بعد دل و دماغ میں قائم ہوتا ہے۔''
>
> (ڈاکٹر نصیر احمد، مضمون، ترجمے کے مسائل اور مترجم۔ مشمولہ اردو لسانیات، دہلی 1990۔ ص 136)

مندرجہ بالا عمومی خصوصیات کے علاوہ ہر علم و فن کے ترجمے کے کچھ مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔ مترجم میں ان تقاضوں کی کما حقہ تکمیل کی خاصیت ہونی چاہیے۔

مترجم کے خصوصیات کے سلسلے میں آخری لیکن نہایت اہمیت کی حامل بات یہ ہے کہ مترجم کو ذہین اور فطین ہونا چاہیے۔ غبی اور بلید آدمی ماہر مترجم تو درکنار سرے سے مترجم ہی نہیں بن سکتا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مترجم میں بنیادی طور سے کن خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے؟

2. ترجمے میں لغت پر کس حد تک انحصار کیا جا سکتا ہے؟

3. مترجم کو کیوں اپنے فن پر فخر کرنا چاہیے اور احساسِ کمتری کا شکار ہوئے بغیر اپنے فن میں مہارت حاصل کرنے کی سعی جمیلہ کرنی چاہیے؟

4.6 خلاصہ

ترجمہ ایک خاص فن ہے جس کا تعلق ایک خاص ادبی اور تہذیبی سرگرمی سے ہے۔ ہر فن کی طرح ترجمے کے بھی خاص تقاضے ہیں۔ ترجمے کے تقاضوں کو ہم دو زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (1) عمومی تقاضے (2) موضوعاتی تقاضے

ترجمے کے عمومی تقاضے یہ ہیں :

اصل زبان میں مہارت : اصل زبان سے مراد زیرِ ترجمہ متن کی زبان ہے۔ ترجمے کی اصل زبان پر عبور و مہارت لازمی ہے جس کے بغیر متن کے مفاہیم اور مطالب کو سمجھنا ناممکن ہے۔

ترجمے کی زبان میں مہارت : اصل زبان کے ساتھ ساتھ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس میں بھی کامل مہارت ضروری ہے۔ بلکہ اصل زبان کے مقابلے میں ترجمے کی زبان پر کہیں زیادہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اصل زبان کے متن کو صرف سمجھنا ہوتا ہے جب کہ ترجمے کی زبان میں اس متن کو فنی، موضوعی اور لسانی نزاکتوں کے ساتھ بیان کرنا ہوتا ہے۔

اصل زبان کے تہذیبی پس منظر سے واقفیت : زبان اور تہذیب ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ زبان کے بغیر تہذیب اور تہذیب کے بغیر زبان کو سمجھنا ناممکن ہے۔

ترجمہ دراصل کسی متن کو ایک تہذیبی سیاق سے نکال کر دوسرے تہذیبی پیکر میں ڈھالنے کا کام ہے اس لیے اصل زبان کی تہذیبی روایات اور ثقافتی اقدار سے اچھی واقفیت ترجمے کے لیے ضروری ہے۔

ترجمے کے موضوعاتی تقاضوں کی تفصیل درج ذیل ہے :

علمی تراجم کے تقاضے : علمی تراجم میں سائنسی اور عمرانی علوم اور ٹکنالوجی کے مضامین کے ترجمے شامل ہیں۔ علمی ترجموں میں تین اہم تقاضے ہوتے ہیں۔ موضوع سے دلچسپی و شغف، معلومات کی صحیح ترسیل اور موزوں اصطلاحات کا استعمال۔

ادبی تراجم کے تقاضے : ادبی تراجم کا کام نہایت مشکل ہوتا ہے۔ ان میں مصنف کے خیال کے علاوہ جذبات و احساسات، کیفیات اور تاثرات کو سمجھنا اور انہیں ترجمے میں منتقل کرنا لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے جمالیاتی تقاضوں اور فنی قدروں کی پاسداری بھی کرنی پڑتی ہے۔

مذہبی تراجم کے تقاضے : مذہبی کتابیں تقدس اور جلال کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کے ترجمے میں زبان اور اسلوب کو جلال اور شکوہ سے پُر ہونا چاہیے۔

قانونی تراجم کے تقاضے : قانونی تراجم میں لفظ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کیوں کہ لفظ کے تغیر سے قانون کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ اس لیے قانونی تراجم لفظی ترجمے پر مبنی ہونے چاہئیں۔

صحافتی تراجم کے تقاضے : صحافتی تراجم میں ''ادبیت'' سے زیادہ مواد کی ترسیل کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے صحافتی تراجم کی زبان سادہ اور عام فہم اور اسلوب سلیس اور شفاف ہونا چاہیے۔

ترجمے کے مندرجہ بالا تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مترجم کو کچھ مخصوص خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے جو درج ذیل ہیں :

- مترجم کو ترجمے کا ذوق ہونا چاہیے۔ اسے ترجمے کے کام سے شغف اور فطری مناسبت ہونی چاہیے۔
- مترجم کو اصل تصنیف کی زبان اور ترجمے کی زبان پر کما حقہٗ عبور ہونا چاہیے۔
- مترجم کا مطالعہ وسیع اور عمیق ہونا چاہیے۔

- مترجم کو ذہین، محنتی، متشکک اور مستقل مزاج ہونا چاہیے۔
- مترجم کو زیرِ ترجمہ کتاب کے موضوع سے بھی دلچسپی اور اس میں مہارت ہونی چاہیے۔
- مترجم کے لیے کسی تصنیف کے ترجمے سے قبل اس علم کی ضروری کتب کا مطالعہ بھی لازمی ہے۔
- مترجم کو اصل عبارت کے مصنف کی حیات و فلسفۂ حیات، اس کی زبان و اسلوب اور اس کے عہد کے تاریخی و تہذیبی پس منظر کی واقفیت رکھنا ضروری ہے۔
- مترجم میں خود پسندی نہیں بلکہ اطاعت و انکسار کا جذبہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اصل متن کی پوری تقلید کر سکے اور اپنی ذات کو بالائے طاق رکھ کر اصل مصنف اور فن پارے کی روح تک پہنچ سکے۔

4.7 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے میں اصل زبان اور ترجمے کی زبان سے مترجم کی واقفیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
2. ترجمے کے موضوعاتی مسائل پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
3. مترجم کی خصوصیات سے بحث کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے میں اصل زبان کے تہذیبی پس منظر کی اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. قانونی تراجم کے تقاضوں پر مختصر اً روشنی ڈالیے۔
3. صحافتی تراجم کے تقاضوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

4.8 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت
2. ڈاکٹر خلیق انجم — فن ترجمہ نگاری
3. نثار احمد قریشی — ترجمہ: روایت اور فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
4. اعجاز راہی — روداد سیمنار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
5. ڈاکٹر حسن الدین احمد — انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

اکائی 5 : ترجمے کے دوران اصطلاح سازی کے مسائل

ساخت

5.1 تمہید

5.2 ترجمے کی مختصر تاریخ

5.2.1 اے گلاسری آف جوڈیشیل اینڈ ریونیو ٹرمز

5.3 ترجمے کی تعریف اور فن

5.3.1 ترجمہ کیا ہے؟

5.3.2 ترجمے کی تعریف

5.3.3 ترجمے کے اصول

5.3.4 مترجم کی ذمے داریاں

5.3.5 ترجمے کی قسمیں

5.4 تراجم اور اصطلاحات

5.4.1 اصطلاح کیا ہے؟

5.4.2 اصطلاح سازی کے عمومی اصول

5.5 ترجمے کے دوران اصطلاحات کے مسائل

5.5.1 مذہبی تراجم

5.5.2 علمی تراجم

5.5.3 ادبی تراجم (منظوم)

5.5.4 نثری تراجم

5.5.5 صحافتی تراجم

5.6 خلاصہ

5.7 نمونۂ امتحانی سوالات

5.8 فرہنگ

5.9 سفارش کردہ کتابیں

5.1 تمہید

کسی بھی زبان میں تبدیلیاں، سماج میں پائے جانے والے باہمی امتیازات سے جڑی ہوتی ہیں۔ یہ امتیازات ہمارے ظاہری و باطنی تجربات کے

ترجمان ہوتے ہیں۔ ہماری خواہشیں، آرزوئیں، احساسات، جذبات، خیالات وافکار، فیصلے وعقیدے، بیانی یا تحریری شکل اختیار کر لیتے ہیں تو درحقیقت یہ ہمارے دل ودماغ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کسی زبان میں محفوظ طبیعی وسماجی علوم وفنون، شعروادب کے ذخیرے جب کسی دوسری زبان میں بذریعہ تحریر منتقل کیے جاتے ہیں تو ہم انہیں ترجمہ کہتے ہیں اور بذریعہ تقریر ہو تو ترجمانی کہیں گے۔ ترجمے کے وسیلے سے علوم وفنون اور زبان وادب کی بتدریج ترقی ہوتی ہے۔ ابتدائی دور کے سپاٹ ترجموں کے بعد ان میں پختگی اور کمال پیدا ہوتا گیا جس میں بڑا دخل اصطلاحات کا ہے۔ ترجمے کے دوران اصطلاحات کے ہمہ جہت استعمال نے ترسیل و ابلاغ میں معنویت، اختصار اور حسن اظہار پیدا کر دیا ہے۔

5.2 ترجمے کی مختصر تاریخ

ہمارے یہاں اردو میں ترجمے اور اصطلاحات وضع کرنے کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ یہ ترجمے لاطینی، عربی، فارسی، سنسکرت، یونانی، فرانسیسی اور بہت بعد میں انگریزی سے اردو میں ہوتے رہے۔ تراجم کی یہ ابتدائی کوششیں انفرادی یا شخصی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ترجموں کے لیے باضابطہ اداروں، مدرسوں اور انجمنوں کی جانب سے کوششیں کی جانے لگیں۔ مدرسہ غازی الدین (1792)، فورٹ ولیم کالج (1800)، دہلی کالج (1825)، دارالترجمہ شمس الامراء حیدرآباد (1825)، محکمہ علوم وفنون، حیدرآباد دکن اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ (1917) نے مختلف علوم کے ترجموں اور اصطلاحوں کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ تراجم کے دوران اصطلاح سازی کا بڑا صبر آزما اور نازک مرحلہ آتا ہے۔ جس کی طرف بیسویں صدی میں خصوصی توجہ کی گئی۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم کو وضعِ اصطلاحات سے ہی نہیں بلکہ نئے نئے الفاظ بنانے سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم، شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے اولین صدر تھے۔ مولوی عبدالحق، محکمۂ دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ کے ناظم اور انجمن ترقی اردو کے معتمد تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ پروفیسر سلیم کو نئے الفاظ بنانے اور اصطلاح سازی میں کمال حاصل ہے۔ انہیں کی تحریک پر وحیدالدین سلیم نے اپنی گراں قدر تصنیف ''وضع اصطلاحات'' طبع کر کے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے شائع کی۔ مولوی عبدالحق ہی کی خواہش پر برکت علی چودھری نے ''طریق تسمیہ'' تصنیف کی۔ فن ترجمہ نگاری اور اصطلاحات سازی کے موضوع پر اردو میں کئی اور کتابیں، مضامین اور رسائل بھی منظر عام پر آنے لگے، جن سے ترجمے اور ترجمے سے متعلق موضوعات پر کام کرنے کے لیے سہولتیں پیدا ہوئیں۔ یہ تو بیسویں صدی کی تصانیف اور مضامین تھے، جو علوم وفنون اور زبان وادب کے بدلتے ہوئے رجحانات اور بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر منظر عام پر آئے۔ ان سے تقریباً پون صدی قبل یعنی 1855ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اس طرف توجہ کی تھی۔

5.2.1 اے گلاسری آف جوڈیشیل اینڈ ریونیو ٹرمز A Glossary of Judicial and Revenue Terms

انیسویں صدی کا نصف آخر اردو کی نہ صرف ثقافتی تاریخ کے لیے اہم رہا بلکہ زبان وادب نے عمودی اور افقی اعتبار سے بھی خوب ترقی کی۔ 1855ء میں ایچ۔ ایچ ولسن نے ایک بہت بڑا کام انجام دیا۔ ولسن نے دفتری، قانونی، عدالتی، مالگزاری اور انتظامیہ کے علاوہ عام ثقافتی ذخیرۂ الفاظ و اصطلاحات کی ایک لغت مرتب کی جس کا نام ''اے گلاسری آف جوڈیشیل اینڈ ریونیو ٹرمز'' ہے اس میں اردو، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، بنگالی، مراہٹی، گجراتی اور پنجابی میں موجود اصطلاحات اور الفاظ کا انگریزی مفہوم بیان کیا گیا ہے، جو برٹش انڈیا کی سرکاری دستاویزات میں مستعمل تھیں ان کی لسانی اور تہذیبی وعلمی ضرورت کے تحت 1940 میں کلکتے سے ایسٹرن ہاؤس نے شائع کی۔ 1985 میں ''اصطلاحاتِ عدلیہ و مالگزاری'' کے عنوان سے ایک فرہنگ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (پاکستان) نے بھی شائع کی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترجمہ اور ترجمانی میں کیا فرق ہے؟

2. انیسویں صدی کے بعض اداروں کے نام بتایئے جہاں تراجم کی باضابطہ کوششیں کی گئیں۔

3. ایچ۔ایچ ولسن نے کونسی فرہنگ (Glossary) مرتب کی؟

5.3 ترجمے کی تعریف اور فن

5.3.1 ترجمہ کیا ہے؟

ترجمہ عربی زبان کا لفظ ہے۔عرب تہذیب میں اگر کسی شخص کی سوانح لکھی جاتی ہے تو اس سوانح حیات یا حالاتِ زندگی کو ترجمہ کہتے ہیں۔یہی معنی زمانۂ قدیم میں اردو میں بھی رائج تھے لیکن بہت معروف نہیں تھے۔ترجمہ کا تلفظ بہر حال اول وسوم مفتوح کے ساتھ ہے۔کہیں کہیں مضموم بھی سنائی دیتی ہے۔شاید اس وجہ سے کہ اسم فاعل ترجمان' سوم مضموم کے ساتھ' بر وزنِ بدگمان بولا جاتا ہے۔اول وسوم مفتوح قابلِ ترجیح ہے۔ترجمے کو انگریزی میں Translation کہتے ہیں اور ترجمہ کرنے والے کو Translator یا مترجم کہتے ہیں اس کا تلفظ بر وزن مقابل ہے۔

5.3.2 ترجمے کی تعریف

ایک زبان سے دوسری زبان میں مطلوبہ مواد کی منتقلی کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔ترجمہ ترسیل علم کا کام انجام دیتا ہے۔یعنی اس کے ذریعے وہ علمی اور ادبی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں' جن کی کسی خاص زمانے میں ضرورت ہوتی ہے۔علم کی وسعت اور علمی سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں سے بڑی مدد ملتی ہے۔یعنی ترجمہ ''مفتاح العلوم'' ہے۔علم کی اس کنجی سے علوم وفنون کے خزانے دوسروں کے لیے بھی کھل جاتے ہیں۔

ترجمہ بڑا مشکل اور نازک کام ہے' جس کے لیے دونوں زبانوں پر قدرت رکھنا ضروری ہے۔نہ صرف زبانوں پر بلکہ موضوع پر اور دونوں زبانوں کی قواعد' نزاکتوں اور کلچر پر بھی ترجمہ نگار کو عبور حاصل کرنا چاہیے۔ترجمہ لفظی نہ ہو۔یہ مکھی پہ مکھی بٹھانے کا کام نہیں بلکہ معانی ومطالب' سیاق وسباق' مقصد و نقطۂ نظر کی منتقلی کا نام ترجمہ ہے۔مترجم میں اگر عقل سلیم نہ ہو' سمجھ بوجھ سے کام نہ لیتا ہو تو لفظی ترجمہ مضحکہ خیز معنی دیتا ہے اور اصل مفہوم ومطلب غائب ہو جاتا ہے جیسے Outstanding Scientists کا لفظی ترجمہ کسی نے ''باہر کھڑے ہوئے سائنس داں'' کیا ہے' جب کہ اس کا صحیح ترجمہ ''ممتاز سائنس داں'' ہوتا ہے۔اردو کا ایک مشہور محاورہ ہے ''میرا دل باغ باغ ہو گیا'' انگریزی میں اس کا لفظی ترجمہ مشہور ہے۔ "My heart became garden and garden" جو اردو محاورے کا مضحکہ خیز ترجمہ ہے۔

5.3.3 ترجمے کے اصول

اردو ادب کے ابتدائی دور میں بہت بڑی تعداد میں فارسی' عربی اور سنسکرت سے ترجمے کیے گئے۔یہ ترجمے مذہب' تصوف' شاعری' ہیئت' فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے تھے۔یہ ترجمے باقاعدہ ترجمے نہیں بلکہ کتابوں کی تلخیص یا آزاد ترجمے ہوتے تھے۔ان میں ترجمہ نگاری کے سائنٹفک اصولوں کی پابندی نہیں کی جاتی تھی جو اچھے ترجموں کے لیے ضروری ہیں۔آئندہ کی سطروں میں ہم ترجمہ نگاری کے چند اہم اصولوں کے بارے میں انگریزی کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔کیوں کہ آج ہم اور ہمارا میڈیا انگریزی ہی کے وسیلے سے تراجم کے کام انجام دے رہے ہیں۔اردو میں انگریزی سے ترجمے کے چند بنیادی اصول یہ ہیں :

1. عموماً کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں۔سیاق وسباق کی مماثلت کی بنا پر معنی میں توسیع کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ترجمہ نگار کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ موقع ومحل کے اعتبار سے لفظ کا انتخاب کرے۔

2. اگر انگریزی محاورے کا متبادل محاورہ اردو میں ملتا ہے تو ترجمے میں جوں کا توں محاورہ استعمال کرنا چاہیے کیوں کہ اس سے ترجمے کا حسن بڑھ جاتا ہے۔مثلاً Take to task آڑے ہاتھوں لینا۔

3. کسی انگریزی لفظ کا اردو متبادل جہاں تک ممکن ہو ایسا لفظ منتخب کریں جس سے مشتقات وضع ہو سکیں مثلاً ایڈمنسٹریشن کا ترجمہ انتظام ہو سکتا ہے، جس سے کئی لفظ اور نکلتے ہیں۔ اس سے ہم تنظیم، منتظم، انتظامیہ، تنظیمی وغیرہ الفاظ مشتق کر سکتے ہیں۔

4. اگر انگریزی کے بعض الفاظ ہماری زبان اور کلچر کا جزو بن چکے ہیں تو ان کے ترجمے کی ضرورت نہیں جیسے کالج، پن (Pun) یعنی ابہام، ہوم ورک، پروگرام، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور کرکٹ، فٹبال وغیرہ۔ بعینہٖ انگریزی ڈکشنریوں میں بھی اردو کے بعض الفاظ جوں کے توں شامل کر لیے گئے ہیں جیسے ہڑتال، لاٹھی، چمچہ (خوشامدی کے معنی میں)

5. اسم خاص، جسے اسمائے معروضہ بھی کہتے ہیں، کے متعلق اصول یہ ہے کہ انہیں ہو بہو لے لیا جائے۔ بعض اسماء کا تلفظ اردو میں ثقیل اور مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے اسمائے معروضہ کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق ڈھال لینے میں کوئی برائی نہیں اور ماضی میں ایسا ہوا بھی ہے جیسے Plato اور Aristotle کو اردو میں افلاطون اور ارسطو بنا لیا گیا ہے۔ اسی طرح مقامات کے ناموں میں بھی حسب ضرورت رعایت برتی جا سکتی ہے۔ جیسے Africa ہم نے افریقہ بنا لیا اسی طرح China کو چین بنا لیا۔

6. انگریزی کے اکثر الفاظ جمع میں برتے جاتے ہیں لیکن اردو میں ان کے مترادف الفاظ واحد کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً Scissors کے ترجمے کے لیے اردو میں واحد قینچی آئے گا۔ انگریزی میں بعض اوقات واحد اور جمع مختلف معنوں میں برتے جاتے ہیں۔ یعنی ایک لفظ واحد میں جو معنی دیتا ہے جمع میں اس کے معنی یکسر بدل جاتے ہیں۔ مثلاً Good کے معنی اچھا یا عمدہ کے ہوتے ہیں جب کہ یہی لفظ جمع میں صفت سے اسم بن جاتا ہے، Goods بمعنی مال و اسباب، اسی طرح Arm بازو (اسم)۔ Arms اسلحہ (اسم) ایسے الفاظ کے ترجمے میں احتیاط اور اردو روزمروں اور محاوروں کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

7. انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت ایک مرحلہ اصطلاحات سازی کا آتا ہے۔ اس سلسلے میں آگے تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اگر کوئی انگریزی اصطلاح اور اس کا اردو متبادل دونوں یکساں طور پر اردو میں مقبول ہوں تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں کو برتا جائے۔ مثلاً مجلس اور کمیٹی وغیرہ۔

8. اگر بعض انگریزی اصطلاحیں استعمال میں آ کر ہماری زبان کا جزو بن چکی ہیں تو ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً باڈی گارڈ، کسٹوڈین، ڈیفنس ایریا، وغیرہ۔ انگریزی میں بھی ہماری مالگزاری کی بہت سی اصطلاحیں شامل کر لی گئی ہیں جیسے چنگی، لگان، حرجانہ، خریف وغیرہ۔

9. انگریزی کی فنی اصطلاحوں کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھا جانا چاہیے کہ اردو میں بھی وہ لفظ اصطلاح کی شان رکھتا ہو نہ کہ لفظی معنی و مطلب ادا کرتا ہو۔ مثلاً Electrify (کسی چیز میں بجلی پہنچانا) اب اس کا اصطلاحی ترجمہ ہوا ہے۔ ''برقانا''۔ کسی ٹھوس مائع میں مقناطیسیت پیدا کرنے کے لیے اردو اصطلاح ''مقنانا'' استعمال ہوتا ہے۔

10. ہماری بعض اصطلاحیں تجارت، صنعت و حرفت اور مختلف پیشوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ اب ان کا ترجمہ کرتے وقت متعلقہ فنون کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ بعض وقت ان پڑھ لوگ بڑی اچھی اصطلاحیں ڈھال لیتے ہیں اور ترجمے کر لیتے ہیں۔ مثلاً Denting کے لیے ''مٹھارنا''

11. اردو زبان ایک مخلوط زبان ہے۔ اردو کا عربی اور فارسی زبانوں سے تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ کا تعلق ہے، جن کا اردو کی لسانی اور ادبی سطح پر کافی اثر پڑا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے انگریزی سے بھی الفاظ مستعار لیے ہیں۔ خود انگریزی بھی دوسری زبانوں سے اخذ و ماخوذ کے ذریعے اپنا دامن وسیع کرتی رہتی ہے۔ مخلوط زبانیں اس طرح دوسری زبانوں سے اپنا رشتہ استوار کر کے نہ صرف اپنی لفظیات میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ مختلف لسانی علاقوں، تاریخ اور تہذیب میں قبول عام کی سند بھی حاصل کر لیتی ہیں۔ چنانچہ ترجمے کے دوران ہمیں مناسب لفظ، محاورے اور اصطلاح کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً افریقہ کے ایک قبیلے کا نام بربر ہے جو ظلم اور سفاکی کے لیے مشہور ہے۔ اس کی مناسبت سے عربی میں ایک اصطلاح بربریت نے جنم لیا ہے، جسے انگریزی میں Barbarism کہتے ہیں۔ اردو میں بربریت عربی سے آیا ہے۔ عربی میں ایک لفظ ہے ''ہرج''، جس کے معنی ہیں شورش، ہنگامہ، خلل، وقفہ، ڈھیل، مضائقہ، برائی۔ انگریزی کی اصطلاح جو کورٹ میں استعمال ہوتی ہے وہ "Penalty" ہے اس کے

لیے اردو میں جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ ''ہرجانہ'' ہے۔ ہرجانہ بمعنی ''تاوان'' اہل اردو نے فارسی طرز پر بنائی ہے۔

ترجمے کے یہ چند بنیادی اصول ہیں۔ ویسے مترجم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی لسانی و ادبی صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے موقع و محل کے لحاظ سے بروقت مناسب اصول متعین کرے یا متعینہ اصولوں میں کمی و بیشی ترمیم و اضافے سے کام لے۔

5.3.4 مترجم کی ذمے داریاں

ترجمہ خواہ ادبی ہو یا علمی، آزاد ہو کہ پابند اس کے لیے مترجم میں غیر معمولی فہم و فراست کی ضرورت ہوتی ہے۔ متن کے مفہوم کی صحیح تفہیم اور تعین کرے اور پھر اُسے ویسے ہی برجستہ اور برمحل الفاظ و اسلوب میں ادا کرے۔

مترجم جب تک زبان کی نزاکتوں اور اسلوبیاتی نظام پر غور نہیں کرتا اور جب تک اپنے افکار کو مختلف اور گوناگوں انداز سے لفظوں کی معرفت سامنے لانے کی مشق بہم نہیں پہنچاتا، اس وقت تک وہ ترجمے کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

زبان دانی کی سطح پر اچھے مترجم کی خصوصیات میں جہاں اور بہت سے امور شامل ہیں وہیں زبان کی گرامر، لفظ کی شناخت، روزمرہ، محاورہ، استعارات، کنایات، علامات، تشبیہات، ضرب الامثال سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اس میں زبان کے مزاج، اسلوبی نظام اور پیرایۂ اظہار کو بھی یکساں اہمیت حاصل ہے۔

مترجم کے لیے ضروری ہے کہ جس زبان کے ادب یا فن کو وہ اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لیے سوچ رہا ہے پہلے اس زبان کے تہذیبی رچاؤ سے بھی واقفیت حاصل کرے۔

اسی طرح اردو مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو کی ہیئتِ ترکیبی کا علم رکھتا ہو، اس میں چار باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے :

1. ترجمہ کرنے کا ذوق، صبر و تحمل، زبان پر قدرت اور مضمون پر گرفت ہو۔
2. اصل متن اور مصنف سے وفاداری ہو۔
3. اصل متن اور مصنف سے عصبیت نہ رکھتا ہو۔
4. اصل متن کی روح، نوعیت، جذبات، محاکات، اسلوبیاتی نظام کا خیال رکھتا ہو۔

اصطلاحات کو کماحقہٗ سمجھ سکتا ہو اور وقتِ ضرورت اصطلاحات سازی کرسکتا ہو۔

5.3.5 ترجمے کی قسمیں

ترجمے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک عام، روایتی اور رسمی ترجمہ ہوتا ہے، خواہ وہ کسی قسم کا ترجمہ ہو۔ اسے سبک رواں اور عام فہم ہونا ضروری ہے، تاکہ ترجمے کا اصل مقصد یعنی ترسیل و ابلاغ بہ آسانی ممکن ہوسکے۔ ترجمے کے تین اقسام کا یہاں ذکر کریں گے، جن سے ترجمے کے دوران عموماً سابقہ پڑتا ہے۔

الف) لفظی ترجمہ

یہ ایک عام، روایتی اور رسمی ترجمہ ہوتا ہے، جس میں عبارت و مفہوم و مطالب کے گہرے احساس اور شعور کے بغیر لفظ بہ لفظ ترجمہ کردیا جاتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ ایک ناقص ترجمہ سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس سے ترجمے کا مقصد ادا نہیں ہوتا۔

ب) بامحاورہ ترجمہ

اس قسم کے ترجمے میں مترجم، ترجمے کے تقاضوں، اصول و ضوابط، مضمون کی گہرائی اور اسلوب کی صفائی کا خیال رکھتا ہے۔ اس میں زبان و بیان کے لسانی شعور و احساس کے دوش بدوش مضمون کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مضمون کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کامیاب ترجمہ کہلاتا ہے۔

ج) آزاد ترجمہ

یہ ترجمہ مضمون کے عین مطابق نہیں ہوتا بلکہ فکر وخیال کی کچھ آزادی کے ساتھ اظہار میں بھی آزادی برتی جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک پیراگراف پڑھ لیا جاتا ہے اور اس کے مفہوم کو اپنے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ خیال یہ رکھا جاتا ہے کہ پیش کردہ متن کے معانی و مفاہیم ادا ہو جائیں ،جس کے نتیجے میں انداز بیان میں فطری بہاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے ترجمے ادبی اعتبار سے عمدہ سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے علی حیدر نظم طباطبائی نے "Elegy Written in a Country Churchyard" کا ترجمہ ''گورِ غریباں'' کے عنوان سے کیا تھا اس میں مفہوم کی پابندی کے ساتھ اس کی ادائیگی آزادی کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔

د) متنی ترجمہ

بعض ترجمے ایسے ہوتے ہیں جن میں True to the text ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے قانونی، عدالتی، دفتری اور سائنسی ترجمے، جن کا اصل کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس لیے اس میں کافی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اس میں الفاظ، محاورے اور اصطلاحات کے استعمال میں احتیاط برتنی پڑتی ہے اور پوری ہوش مندی سے سمجھنا اور ادا کرنا پڑتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. صحیح تلفظ پر نشان لگائیے۔

تَرجَمہ ○

ترجُمہ ○

ترجمہ ○

2. ترجمہ کسے کہتے ہیں؟
3. ترجمے کے کوئی تین اصول بتائیے۔
4. اصطلاح ''بربریت'' کا ماخذ کیا ہے؟
5. ترجمے کی کتنی قسمیں ہیں؟

5.4 تراجم اور اصطلاحات

کسی بھی زبان میں الفاظ اور کلمات کے بعد اصطلاحات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ علمی اور سائنسی شعبوں میں مختلف مضامین اور مختلف تجربات، افکار و خیالات کو پیش کرنے کے لیے اصطلاحات درکار ہوتی ہیں۔ یہ معاملہ زبان کے لسانی ڈھانچے اور ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اصطلاح اور لفظ میں کیا فرق ہے؟ اس کے لیے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ اصطلاح کسے کہتے ہیں جس کے ساتھ ہی لفظ خود بخود سمجھ میں آ جائے گا۔

5.4.1 اصطلاح کیا ہے؟

کسی علمی یا فنی گروہ کا کسی لفظ کے عام معنوں کے علاوہ کوئی خاص مفہوم مقرر کر لینے کو اصطلاح کہتے ہیں، جو عام طور سے تشریح طلب ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب کوئی خاص گروہ، کسی علم و فن کے سلسلے میں کسی مفرد یا مرکب لفظ کو اس کے اصلی معنی کے سوا کسی اور معنی میں استعمال کرتا ہے تو وہ لفظ اس گروہ اور اس علم و فن کی اصطلاح کہلاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصطلاح اُس لفظ کو کہتے ہیں جس کے کسی خاص علم و فن میں لغوی معنی سے الگ کوئی مناسب معنی یا عام اور متعدد معانی میں سے کوئی ایک معنی متعین کر لیے جائیں۔ اور اس علم و فن کی متداول کتابوں میں وہ لفظ اپنے

اسی متعینہ معنی میں عام طور پر مستعمل ہو۔ جیسے ''حرف'' کے معنی ہیں ''کنارہ'' گرامر میں ''حرف'' ایک کلمہ ہے جس کے کوئی مستقل معنی نہ ہوں۔ ''فقہ'' کے معنی ہیں ''جاننا اور سمجھنا''۔ دینیات میں فقہ ''علم دین یا شریعت کا جاننا'' ہے لغت میں یہ لفظ عام تھا' اصطلاح میں خصوصی معانی میں لیا گیا ہے۔ مطلع' رباعی' تخلص' بحر' تقطیع اردو شعر و ادب کی اصطلاحات ہیں۔ یہ الفاظ اپنے اصلی معنی کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معنی بھی رکھتے ہیں جن پر ماہرین علم وفن کا اتفاق ہے۔ مثلاً ''مطلع'' کے لغوی معنی ہیں طلوع ہونے یا نکلنے کی جگہ ''لیکن ادب و شعر کی اصطلاح میں غزل کے پہلے شعر کو' جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوں مطلع کہتے ہیں۔ ایک مثال سے اسے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ''صرفیات (Morphology) لسانیات کی ایک شاخ ہے۔ اردو کی عام قواعد میں اس شاخ کو ''صرف'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ چوں کہ لسانیات میں یہ اصطلاح ایک خاص معنی میں استعمال ہوتی ہے اس لیے اسے مارفولوجی یا صرفیات کہتے ہیں۔

اصطلاح کی اس تعریف سے کبھی اس پر محاورے کا بھی گمان ہوتا ہے۔ محاورہ سے مراد ایسے الفاظ ہیں جن سے حقیقی لغوی معنی کے بجائے کوئی اور معنی مراد لیے جائے۔ ان لفظوں میں کوئی نہ کوئی مصدر بھی ضرور ہوتا ہے۔ یہی مصدر حقیقتاً اپنے اصل معنی سے الگ دوسرے معنی میں آتا ہے۔ روزمرہ کا تعلق حقیقی معنوں سے ہوتا ہے جب کہ محاورں کا تعلق مجازی معنوں سے ہوتا ہے۔ اصطلاح میں مفرد یا مرکب لفظ کو اصلی معنی کے بجائے دوسرے معنی میں لایا جاتا ہے۔ اصطلاحیں عموماً مفرد ہوتی ہیں۔ لیکن اصطلاحیں مرکب بھی ہیں جیسے حرارت پیما' حلف نامہ' مہنگائی بھتہ وغیرہ۔ عام بول چال کے الفاظ پر تو کسی کا بس نہیں جو لفظ عوام کی ٹکسال سے چل نکلا وہ رائج الوقت سکہ ہے۔ اصطلاح سازی البتہ اہل علم کا کام ہے۔ اصطلاح میں عظمت اور ایک طرح کی گمبھیرتا ہوتی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اصطلاحیں صوتی لحاظ سے موزوں' قواعد زبان کے مطابق اور بناوٹ میں وقار رکھتی ہوں اور معنی کی دلالت کی رو سے مناسب ہوں۔

5.4.2 اصطلاح سازی کے عمومی اصول

علوم وفنون کی کتابوں کے تمام ترجمے کے دوران سب سے مشکل مرحلہ اس شعبۂ علم کی اصطلاحوں کے مترادف یا مساوی المعنی اصطلاحات کی تدوین کا ہوتا ہے۔ تمام انگریزی اصطلاحوں کو جوں کا توں اردو رسم الخط میں لکھ لینا مناسب نہیں ہوگا اور نہ ہی اردو زبان بحسن وخوبی متحمل ہوگی۔ اسی طرح سنسکرت یا عربی و فارسی کے الفاظ کو اصطلاحوں کے نام سے ترجمے کی عبارت میں استعمال کرنا بھی مفید نہیں۔ لہٰذا دوران ترجمہ اصطلاح سازی لازمی عمل ہو جاتا ہے اس کے لیے کچھ اہم و بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو ذیل میں پیش کیے گئے ہیں :

1. اصطلاحات حتی الامکان مختصر اور جامع ہوں اور جس مفہوم کے لیے بنائی گئی ہوں اس کے پورے معانی و مطالب کے اظہار کی ان میں صلاحیت ہو۔ پڑھنے اور بولنے میں آسان ہوں۔ مثلاً Light کے تین معنی سامنے آتے ہیں۔ (1) روشنی (2) نور اور (3) پرکاش۔ اردو میں ''نور'' کو اپنایا گیا جو لکھنے اور بولنے میں آسان ہے اور اس سے بہت مشتقات بن سکتے ہیں۔
2. سنسکرت' عربی' فارسی اور ہندی الفاظ' اردو کے الفاظ شمار کئے جائیں اور اصطلاحات وضع کرنے میں اردو قواعد کے مطابق انہیں استعمال کیا جائے۔ ترجیح ان الفاظ کو دی جائے' جو مقبول اور مروّج ہوں۔
3. عربی ہندی یا فارسی ہندی کے میل سے اصطلاحیں وضع کر کے الفاظ اور اصطلاحات کی گویا متحدہ قومیت کو بڑھایا جا رہا ہے۔ یہ رجحان علمی اور ادبی نقطہ نگاہ سے مستحسن ہے۔ لفظوں کو جوڑنے اور مختلف زبانوں کے الفاظ میں پیوند لگانے کے لیے ان میں صوتی مناسبت اور ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ تاکہ مرکب الفاظ گھل مل کر ایک ہو جائیں' زبان اور کان پر بار نہ گزریں' جیسے مورت نگاری (ہندی + فارسی) (تصویر نگاری) ' عبادت گاہ (عربی + فارسی) ' کلاونت (ہندی + ہندی)
4. دو یا دو سے زیادہ لفظ پاس پاس رکھ دیے جائیں خواہ ان کے درمیان کوئی رشتہ یا ربط ہو یا نہ ہو جیسے گھڑ دوڑ' موم روغن' عمر قید وغیرہ۔
5. الفاظ تو پاس پاس رکھے جائیں مگر ان میں گرامر کے لحاظ سے کوئی رشتہ یا ربط ضرور ہو جیسے جیب کترا (Pick Pocket) ' Pick کے معنی چننے یا

اٹھانے کے ہیں۔ Man Eater ' (Man = آدمی' Eater = کھانے والا) اس سے بنا آدم خور حالانکہ انگریزی میں زیادہ موزوں لفظ Cannibal ہے۔

6. حتی الامکان عصری اور رائج الوقت الفاظ سے وضع اصطلاحات کا کام لیا جائے یعنی موجودہ الفاظ کو نئے نئے معنی میں استعمال کریں مثلاً نظر سے ناظر' نظارہ' منظر' ناظرہ' نظریہ وغیرہ۔

7. انگریزی الفاظ مقبول عام اور زبان زد ہو تو انہیں بجنسہٖ استعمال کیا جانا چاہیے۔ جیسے جج' پولس' موٹر وغیرہ۔

8. ہندی زبان کے الفاظ جو ہماری زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں انہیں بے تکلف وضعِ اصطلاحات کے دوران کام میں لانا چاہیے' جیسے ٹھٹھول' دھن وان' گن وان' گھروندا' کٹوتی۔ جوٹ وغیرہ۔

9. اصطلاحات کے بنانے میں سابقوں اور لاحقوں سے کام لینا اصطلاحات سازی کے مرحلے کو آسان کر دیتا ہے۔ جیسے خشمگیں' پائمال' ریگ مال' بنوٹ' کوتوال' گاڑی بان۔

10. جب کسی انگریزی مصدر کے مقابل فعل یا مصدر بنانا ہو تو پہلے مصدر کے مادے کا ترجمہ کریں' پھر اس کے آگے اردو کی علاماتِ مصدر سے کوئی مناسب علامت لگائیں۔ مثلاً Nationalise (قوم میں داخل کرنا) قومیانا - Electrify (بجلی پہنچانا) برقانا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اصطلاح سے کیا مراد ہے؟
2. اصطلاح اور محاورے میں کیا فرق ہے؟
3. اصطلاح سازی کے عمومی اصولوں میں سے دو کی تشریح کیجیے اور مثالیں بھی دیجیے۔

5.5 ترجمے کے دوران اصطلاحات کے مسائل

مختلف علوم وفنون کے تراجم کے دوران اصطلاحوں کے آجانے سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے' کیوں کہ اصطلاح کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں۔ اصطلاح کا مفہوم سمجھنا اور اس کا اردو میں ترجمہ کرنا اور اسی مفہوم کو ادا کرنے والی یا اسی مفہوم کی متحمل اصطلاح تراشنا آسان مرحلہ نہیں۔ مختلف علوم وفنون کی اصطلاحوں میں فرق ہوتا ہے' مخصوص علم کے جس نوع کی اصطلاح درکار ہے' ویسی اصطلاح تراشنا ایک صاحب علم' ماہر فن اور زبان پر قدرت رکھنے والی شخصیت ہی کا کام ہے۔ وہ زبانیں جو موضوع کے مزاج اور اس کی سرشت سے لگا نہیں کھا سکتیں ان سے مدد نہیں لی جا سکتی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے امہات الامہ لکھتے وقت ہجرت کے لیے رسول اکرم ﷺ کی شان میں غیر شعوری طور پر ایک ایسا ہندی لفظ استعمال کر گئے جو موقع' محل اور شانِ رسول اکرم ﷺ میں گستاخی سمجھا گیا۔ لکھتے ہیں ''وہ راتوں رات سٹک گئے'' یہاں موقع تھا ''راتوں رات تشریف لے گئے'' کے استعمال کا۔ تھوڑی سی بے احتیاطی نے بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔

ترجمے کے لیے بے پناہ موضوعات ہو سکتے ہیں مگر عام طور پر ہمیں چار میدانوں میں ترجمے کی اشد ضرورت پڑتی ہے اور ان چار میدانوں میں اصطلاحات کا بھی بڑا ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود نئی اصطلاحات کے امکانات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ چار میدان درج ذیل ہیں:

1. مذہبی 2. علمی 3. ادبی اور 4. صحافتی

5.5.1 مذہبی تراجم

مذہبی تقاضوں کے پیش نظر اور پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت کے لیے مشنریوں اور علمائے دین نے انگریزی اور عربی سے ترجمے کے میدان میں

گرانقدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ دیگر مذاہب کے بھی اردو میں ترجمے ہوتے آئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایک عام آدمی تک خدا کا کلام اور پیغام خود اس کی زبان میں پہنچایا جائے۔ یا پھر مذہبی تراجم بہت سے مترجمین کی روحانی ضرورت بن گئے ہیں۔ اس طرح کے تراجم میں اصطلاحات کا وضع کرنا اور ان کا برمحل استعمال کرنا کارِ شیشہ گراں سے کم نہیں۔ یہاں دو باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک اصطلاح کے لیے مترادف اصطلاح کی تلاش' دوسرے زبان کی تحدیدات کا لحاظ۔ تھوڑی سی بھی لغزش مترجم کے شخصی اور علمی مرتبے اور وقار کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ الفاظ' تراکیب اور اصطلاحات کا انتخاب مترجم کی لیاقت اور پرکھ کی دلیل ہوتا ہے اردو میں مذہبی ترجمے اور اصطلاحات کے استعمال کی بہترین مثال مولانا ظفر علی خاں کا ترجمہ ''معرکہ مذہب و سائنس'' ہے۔ جس میں انہوں نے مذہب اور علمی تراجم و اصطلاحات کے انتخاب و استعمال میں باریک بینی اور تہہ داری کا خوب خیال رکھا ہے۔ مذہبی تراجم میں فارسی اور عربی سے مدد لیے بغیر چارہ نہیں' کیوں کہ وہ ہمارے مذہبی مزاج کی غماز زبانیں ہیں۔

5.5.2 علمی تراجم

اس ذیل میں تمام سائنسی علوم کی کتابیں آتی ہیں۔ علمی تراجم میں اصل زبان کی اصطلاحات کے مترادفات کو ترجمے کی زبان میں ڈھونڈ کر لانے کی اہمیت ہے' بشرطیکہ وہ پہلے سے موجود ہوں ورنہ اس مخصوص موضوع سے متعلق اصطلاحوں کو مترجم کو خود بنانے کی زحمت کرنی پڑتی ہے۔ اصطلاحات کے تراشنے میں اصل لفظ کے انتخاب' صحیح سابقے اور لاحقے وغیرہ میں یکسانیت کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ اصطلاح' اصطلاح کی شان رکھتی ہو صرف یہ نہ ہو کہ مفہوم ادا کر دیا جائے۔ ہر علم و فن کی اپنی مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ دوسرے علوم و فنون کا اصطلاحی لفظ وہی معنی و مفہوم ادا کرے مثلاً (Analogy) منطق کی اصطلاح ہے قوس (Segment) اور اساس یا قاعدہ (Base) ریاضی کی اور استعارہ (Metaphor) علم بیان کی اصطلاحیں ہیں۔ انہیں ہم لسانیات کی اصطلاحات میں شامل نہیں کر سکتے۔ صوتیات (Phonetics)' معنیات (Semantics) لسانیات (Linguistics) کی اہم اور بنیادی اصطلاحیں ہیں۔ انہیں ہم گرامر / قواعد میں شامل نہیں کر سکتے۔ اصطلاحیں فن کے لحاظ سے موزوں و مناسب ہونی چاہئیں مثلاً ثقافت' عمرانیات کی ایک اصطلاح ہے' جس کے لغت میں متعدد معنی ہیں' جیسے عقل مند ہونا' مہذب ہونا' نیک ہونا وغیرہ۔ تاریخ و ثقافت سے متعلق سید علی بلگرامی کے تراجم ''تمدن ہند'' اور ''تمدن عرب'' معرکے کے تراجم ہیں۔

''ببلیوگرافی'' (Bibliography) لائبریری سائنس میں مستعمل انگریزی اصطلاح ہے۔ اس کے ابتدائی لغوی معنی ''تحریر کتب'' یعنی کتابوں کا تحریر کرنا تھا۔ سترہویں صدی کے بعد اس کے مفہوم میں تبدیلی آئی اور کتاب کے بارے میں لکھنا اس سے مراد لیا جانے لگا۔ لائبریری سائنس میں برطانوی مفکر ڈبڈن (T.F. Dibdin) نے پہلی بار کتابیات کو فہرست سازی کے معنوں میں استعمال کیا۔ اس اصطلاح کا استعمال فنِ طباعت اس کی تاریخ اور کتابوں کی تجارت اور انہیں جمع کرنے کے لیے بھی ہوا ہے۔ علمی تراجم میں صحتِ خیال کے ساتھ ساتھ قوت استدلال کا اظہار لازمی ہے۔ لہٰذا اصطلاحات کی صحت اور موزونیت اشد ضروری ہے۔

5.5.3 ادبی تراجم (منظوم)

ادبی تراجم دو طرح کے ہوتے ہیں نثری اور منظوم۔ زندگی جتنی پیچیدہ ہے ادب بھی اتنا ہی پیچیدہ اور پھیلا ہوا ہے۔ ترجمہ بھی ایک خاص ہنر ہے جیسے زندگی بسر کرنا ایک ہنر ہے۔ ترجمے کا ہنر اور فن ادبی ترجمے میں مترجم کے مقام و مرتبے اور صلاحیت کا بھرپور امتحان لیتا ہے۔ دوسرے پیشوں یا ہنروں کی طرح ادبی ترجمہ بھی بڑا ریاض مانگتا ہے۔ ادبی ترجمے بڑا دشوار کام ہے۔ لیکن ادبی ترجمے میں شاعری کا ترجمہ نہایت ہی دشوار' تقریباً ناممکن امر ہے۔ سر جان ڈینہم (Sir John Deinhan) نے تو اسے محض حماقت قرار دیا ہے۔ کالی داس سے لے کر اقبالؔ' غالبؔ' فیضؔ اور مخدومؔ درجنوں بڑے بڑے شعرا کا کلام کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ منظوم ترجمہ کرنے والوں میں شاعرانہ جوہر ہی وہ عنصر ہے جو ترجمے کی باقی تمام شرطوں کے علاوہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔ شاعری کے ترجمہ میں خصوصاً اور ادبی تراجم میں عموماً ان احساسات کا اظہار زیادہ اہم ہے' جن کے ذریعے خیالات ادا کیے گئے ہیں۔ شاعری صرف دماغ ہی کو اپیل نہیں کرتی بلکہ انسان کے تمام قوائے احساس کو اپیل کرتی ہے' جن میں احساس جمال بھی شامل ہے۔ اس لیے شاعری میں' جو

ادب کی اہم قسم ہے' الفاظ کی اہمیت صرف معنوی نہیں بلکہ صوتی اور روحانی بھی ہوتی ہے' جسے دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ایمرسن کی ایک نظم کا ترجمہ علامہ اقبال نے ''رخصت اے بزم جہاں'' کے عنوان سے پیش کیا ہے' جو منظوم ترجموں میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی خوبی الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات کے مترادفات تلاش کرنا ہی نہیں ہیں بلکہ نظم کی روح' جذباتی اور نغماتی زیر و بم کی پیش کشی میں مضمر ہے۔ نظم کا ترجمہ ایک مسلسل عمل ہے' جس میں افکار' جذبات' خیالات اور احساسات بدرجہ اتم شریک ہوتے ہیں۔ شعری ترجمے میں محاوروں' علامتوں' تشبیہوں' استعاروں' کنایوں اور صنعتوں کے مترادفات و ممکنات اور اصطلاحات کی تلاش بھی ایک مشکل امر ہے۔ ان میں سے کچھ کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ گرامر کا بہت سارا حصہ بھی ترجمے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ منظوم ترجمے میں لغت سے مدد تو لی جا سکتی ہے لیکن احساسات و جذبات اور شاعرانہ تہذیب کی عکاسی اولین مقصد ہوتا ہے۔ منظوم ترجمے میں اصطلاح سازی یا اصطلاحات کا استعمال بھی نزاکت اور نفاست کا طلب گار ہے۔ کامیاب ترجمہ وہ ہے' جو اصل کے مطابق ہو اور خلاقانہ شان رکھتا ہو۔ فٹز جیرالڈ کی شہرت کا دارومدار عمر خیام کی رباعیوں کے ترجمے پر ہے۔

5.5.4 نثری تراجم

نثر کے ترجمے میں وہ مسائل پیدا نہیں ہوتے' جو شاعری کے ترجمے میں ہوتے ہیں۔ فکشن کا ترجمہ شاعری سے آسان ہوتا ہے۔ اگر زبان پر قدرت ہو اور دونوں زبانوں کے تہذیبی پس منظر پر باقاعدہ نگاہ ہو تو ذرا سی توجہ کے باوصف نثری ترجمے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ترجمہ نثری ہو کہ منظوم' زبان کا اپنا جو مزاج ہوتا ہے' اس سے بھی واقفیت ضروری ہے' ورنہ بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ بعض وقت سنجیدگی باقی نہیں رہتی بلکہ مسخرا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ٹیگور کے ایک ڈرامے ''اُچلیاتن'' کا ترجمہ ہوا ہے۔ جس کا عنوان مترجم نے ''لڑکھڑاتا ہوا گھر'' لکھا ہے۔ ''اُچلیاتن'' بنگالی لفظ ہے' جس کے معنی ہیں وہ گھر جس کی دیواریں بوسیدہ یا کمزور ہو چکی ہوں' در و دیوار موجود تو ہیں مگر نہیں معلوم کب ڈھ جائیں۔ لہٰذا اُچلیاتن کا ترجمہ ''لڑکھڑاتا ہوا گھر'' نہایت بھونڈا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ترجمہ ''گرتا ہوا مکان'' ہوتا تو مناسب ہوتا۔ یہ ایک مثال ہے اُس مترجم کی جو لفظ کے صحیح معنی سے واقف نہیں۔ ادبی ترجمہ چوں کہ ان کتابوں' افسانوں یا ادب پاروں کا ہوتا ہے' جن کے لکھنے والے زبان و ادب کے رمز شناس مانے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کا مترجم بھی اسی مرتبے کا ہونا چاہیے۔ عبدالمجید سالک نے ایک اصطلاح کے ترجمے کی مثال دی ہے۔

There was an explosion in a coal mine, resulting in the death of five persons.

ترجمہ: ''ایک معدنِ زغال میں دھماکہ ہوا' نتیجے کے طور پر پانچ نفوس کی ہلاکت وقوع پذیر ہوئی۔''

ہلاکت وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ محاورے اور روزمرہ کے بجائے مترجم نے مرکب لفظ وقوع پذیر استعمال کیا۔ وہ صرف یہ کہتا کہ ''کوئلے کی کان میں دھماکہ ہوا۔ نتیجتاً پانچ افراد ہلاک ہو گئے۔'' تو صاف صاف ترجمہ ہو جاتا۔

ادبی ترجمہ افکار و خیالات کا ترجمہ ہوتا ہے' جن کا اظہار احساسات کے ذریعے ہوتا ہے۔ ترجمے میں تجربات کی مصوری' محاکات کی عکاسی اور خیالات کو محسوس کرانے کی کوشش ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اصل عبارت میں تصرف بھی کرنا پڑتا ہے۔ غلام السیدین نے موپساں کے ایک افسانے کا ترجمہ ''آخری سبق'' کے عنوان سے کیا تھا۔ اس ترجمے میں اصل کے تاثر کو اردو میں بہ خوبی پیش کیا گیا ہے۔ اختر حسن رائے پوری نے پرل بک کے ناول کا ترجمہ ''پیاری زمین'' میں خیالات اور احساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ایسے' جیسے وہ خود یہ ناول لکھ رہے ہوں' اس لیے اس میں روانی آ گئی ہے۔

5.5.5 صحافتی تراجم

صحافتی تراجم میں عموماً آزاد ترجمہ ہوتا ہے' جس میں روایتی موضوعہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ متن کے مفہوم کا ترجمہ سہل ترین ہوتا ہے۔ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان بلکہ اپنے اسلوب میں مطلب بیان کر دینا ہوتا ہے۔ اس میں ایک سہولت یہ ہے کہ طویل اور مرکب جملوں کو سادہ اور مختصر کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اپنے مضمون ''فنِ ترجمہ کے اصول و مبادیات'' میں لکھتے ہیں۔

''اخباری ترجمہ میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے۔''

مرزا حامد بیگ لغت سے مدد لینے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اخباری ترجمے میں ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لی جاسکتی ہے۔ صحافتی ترجموں میں دن بدن سیاست و معاشرت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے واقف نہ ہوں تو بڑی مضحکہ خیز غلطیاں سامنے آتی ہیں' یعنی صحافتی مترجم کو صحافت کی مختلف اصطلاحات اور لفظیات سے کما حقہٗ واقف ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست' معاشرت' کھیل' قانون اور جرائم کی دنیا سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ آج کے زمانے میں صحافت کا میدان بھی خاصا وسیع ہو گیا ہے۔ اسی حساب سے نئی نئی اصطلاحات کی بھی ضرورت پڑنے لگی ہے۔ صحافتی ترجمے کی بدولت ہماری زبان میں صفائی اور روانی آ گئی ہے۔ نئے نئے الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ ان تراجم کے باوصف ہم نے واقعیت کے اظہار پر قابو پالیا ہے۔ سچی تلی بات کرنے کا سلیقہ' رواں دواں تحریر اور اصلیت سے مطابقت پیدا کرنے کا ڈھنگ آ گیا ہے۔ اخباری ترجمہ نفس مضمون ادا کرنے سے متعلق ہوتا ہے۔ اس میں ادبیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صحافتی ترجمہ روزمرہ کی زندگی سے قریب ہوتا ہے۔ زبان کو نئے پیرائے اظہار سے متعارف کرتا ہے۔ اصطلاحات کو وقعت بخشتا ہے اور اس میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ بعض اوقات صحافتی تراجم ادب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ظفر علی خاں نے بیسویں صدی کے اوائل میں سیاسی' معاشرتی' علمی اور مذہبی اصطلاحیں وضع کر کے صحافت کے میدان میں اہم کام انجام دیا ہے۔ جن میں سے بعض انتہائی بھاری بھرکم اور بعض انتہائی برجستہ اور ہلکی پھلکی ہیں' لیکن ان کے زورِ قلم نے ہر دو قسم کی وضع کردہ صحافتی اصطلاحوں کو عام کر دیا ہے۔ جیسے دھرنا' ہڑتال' مرن برت' تانا شاہی' گھٹالا' تجویز' رابطہ' جرمانہ' حلف وفاداری' دائرۂ اختیار' اعزازی' غیر قانونی' عدم مساوات' ہنگامی' دستاویز' چالان' ضمانت' مچلکہ وغیرہ وغیرہ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. علمی تراجم کے دوران اصطلاحات کے کیا مسائل پیش آتے ہیں؟
2. منظوم تراجم میں اصطلاحات کی کیا مشکل پیش آتی ہے؟
3. صحافتی تراجم کو کس صحافی نے وقار عطا کیا؟

5.6 خلاصہ

زبان کا تہذیب سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ زبان نہ صرف خیالات کا آئینہ ہوتی ہے بلکہ انسانی گروہوں اور قوموں کی زندگی' عادات و اطوار کو محفوظ کرنے کا بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی اور تحفظ کا ایک بڑا ذریعہ ترجمہ ہے۔ ترجمے کی روایت ہماری زبان میں زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ آج عصری تقاضوں کی وجہ سے ترجموں کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے اس کے اصول و ضوابط مقرر ہوئے ہیں۔ اس کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش مسلسل جاری ہے۔

ترجمے کے دوران جہاں مترجم کو کئی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے' وہیں اصطلاحات سازی کے مرحلے سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اصطلاح کسے کہتے ہیں؟ اس کی کئی طرح سے تعریفیں کی گئیں ہیں۔ ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ کوئی خاص گروہ یا کسی علم و فن کے سلسلے میں کسی مفرد یا مرکب لفظ کو اس کے اصلی یا لغوی معنوں کے سوا کسی اور وسیع تر اور تشریح طلب معنی میں استعمال کیا جاتا ہے تو وہ لفظ اس علم و فن کی اصطلاح کہلاتا ہے۔ ترجمہ خواہ آزاد ہو کہ پابند' نظم کا ہو کہ نثر کا' سائنسی ہو کہ سماجی علوم کا ترجمے کے دوران نہایت ہی سخت اور مشکل مرحلہ اصطلاحات کا آتا ہے۔ اصطلاحات سازی کے بھی اپنے اصول اور قید و بند کے معیار ہوتے ہیں جن سے واقف ہوئے بغیر اصطلاحات وضع کرنا ممکن نہیں۔ ساتھ ہی جس فن' موضوع یا علم کی اصطلاح وضع کرنا مقصود ہو' اس علم پر بھی اصطلاح ساز کو قدرت حاصل کرنا ضروری ہے۔

5.7 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کی مختصر تاریخ بیان کیجیے۔

2. ترجمے کے عمومی اصول سے بحث کیجیے۔

3. ترجمے کی قسمیں اور اصطلاحات کے مسئلے پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. اصطلاح سازی کے عمومی اصول بیان کیجیے۔

2. نثری تراجم اور منظوم تراجم کی مشکلات کیا ہیں؟

3. صحافتی تراجم نے ہماری زبان کو کس طرح فروغ دیا؟

5.8 فرہنگ

مفتاح العلوم	=	علم کی کنجی
توسیع	=	وسعت، پھیلاؤ
مشتقات	=	وہ الفاظ جو اپنے مصدر سے بنے ہوں (Derivaties)
مزاولت	=	مشق
عہدہ برآ ہونا	=	فرض کو پورا کرنا
عصبیت	=	تعصب
مستحسن	=	قابل تحسین
موضوعہ	=	وضع کی ہوئی، مقررہ

5.9 سفارش کردہ کتابیں

1. وحیدالدین سلیم — وضع اصطلاحات، اورنگ آباد۔ 1921

2. نثار احمد قریشی — ترجمہ۔ روایت اور فن۔ اسلام آباد 1985

3. عطش درانی — اردو اصطلاحات سازی۔ اسلام آباد 1994

4. قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت

اکائی 6 : ترجمے کی روایت واہمیت اور اصطلاحی ولسانیاتی مسئلے

ساخت

6.1 تمہید

6.2 ترجمے کی اہمیت

6.3 اردو میں ترجمے کی روایت

6.4 ترجمہ اور اصطلاح سازی

6.4.1 اصطلاح سازی کے لیے دلی کالج کے مجوزہ اصول

6.4.2 مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کے مجوزہ اصول

6.4.3 سید میر حسن بلگرامی کے مجوزہ اصول

6.4.4 سید وحید الدین سلیم کے مجوزہ اصول

6.4.5 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مجوزہ اصول

6.4.6 اصطلاح سازی کے لیے لسانیاتی اشارے

6.5 ترجمے کے مسائل

6.5.1 کیفیت وشدت اور تہذیبی عناصر کی منتقلی کا مسئلہ

6.5.2 الفاظ، محاوروں اور صنعتوں کے انتخاب کا مسئلہ

6.6 ترجمہ اور لسانی ساخت

6.6.1 ترجمہ اور اسلوبی وتہذیبی پہلو

6.6.2 ترجمہ اور لسانی پہلو

6.7 خلاصہ

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

6.9 فرہنگ

6.10 سفارش کردہ کتابیں

6.1 تمہید

قوموں کے درمیان تعلق اور باہمی اشتراک کے احساس نے ترجمے کی ضرورت اور اہمیت کو پروان چڑھایا۔ انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ تعلق و اشتراک بڑھتا گیا لہٰذا ترجمے کی ضرورت کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ترقی یافتہ قوم وملک بننے کے لیے ترقی پذیر قوموں اور ملکوں نے ترقی یافتہ قوموں اور ملکوں کے تجربات ومشاہدات سے استفادہ کیا ہے۔ ترجمے ہی کی مدد سے ملک کے مختلف خطوں کے درمیان ہم آہنگی، قومی یکجہتی، علاقائی سالمیت برقرار رہتی ہے کیوں کہ ترجمے کے توسط سے لوگ ایک دوسرے کے اذہان وقلوب کو محسوس کرتے ہیں اور جانتے ہیں اور اسی کے مطابق ایک دوسرے کے لیے رویے طے کرتے ہیں۔ اس طرح سے کتابیں، جو انسانی فکر وعمل کے ارتقائی مدارج کے مانند ہوتی ہیں، ترجمے کے ذریعے اقوام عالم کا ورثہ بنتی ہیں اور دیگر اقوام میں نشاۃ الثانیے کا باعث ہوتی ہیں۔

اس اکائی میں ہم ترجمے کی روایت اور اہمیت کے موضوع پر مختصر تاہم جامع روشنی ڈالیں گے۔ نیز ترجمے سے متعلق اصطلاحی اور لسانیاتی مسئلوں پر

گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد اصطلاح سازی سے متعلق مختلف اداروں اور شخصیتوں کے تیار کردہ اصولوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد ترجمے کے کچھ اہم مسائل اور اصطلاح سازی کے لیے لسانیاتی اشاروں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس اکائی میں کیفیت وشدت اور تہذیبی عناصر کی منتقلی کے لیے مناسب لفظوں، محاوروں اور صنعتوں کے انتخاب کے مسئلے پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ آخر میں ترجمے اور لسانی واسلوبی اور تہذیبی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ کی سہولت کے لیے اکائی کا خلاصہ، نمونہ امتحانی سوالات، فرہنگ اور مزید مطالعے کے لیے کچھ اہم کتابوں کے نام پیش کیے گئے ہیں۔

6.2 ترجمے کی اہمیت

مختلف قوموں کے درمیان تعلق اور باہمی اشتراک کے احساس نے ترجمے کی ضرورت اور اہمیت کو پروان چڑھایا۔ جیسے جیسے انسانی ذہن ارتقائی مدارج طے کرتا گیا اور مختلف سماجی اور انسانی علوم کی ترویج واشاعت ہماری زندگی کا حصہ بنتی گئی، ترجمہ نہ صرف ہماری علمی ضرورت بن گیا بلکہ ہماری زندگی میں اس کا تصور بھی ناگزیر ہو گیا۔ ترقی یافتہ سماج میں قومیں ایک دوسرے کے تجربات ومشاہدات سے استفادہ کرتی ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں تو صورت حال یہ ہے کہ ترجمے کے بغیر زندگی ادھوری محسوس ہوتی ہے۔ ترجمے کے بغیر ہم اپنے ہم وطنوں کے تہذیبی رویوں سے ناواقف رہتے ہیں۔ ان کی پسند اور ناپسند کو نہیں سمجھ پاتے، ان کی ادبی روایتوں کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کی سماجی زندگی کی انواع و اقسام کی سرگرمیوں سے بہرہ ور نہیں ہو پاتے۔ کثیر لسانی ملکوں میں اگر ترجموں کے ذریعے ایک دوسرے کو نہ سمجھا جائے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب نہ لایا جائے تو قومی یکجہتی، علاقائی سالمیت اور سماجی آسودگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ آج گلوبلائزیشن کے تصور نے بنی نوع انسان کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ یہ ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہوا ہے۔ ترجمے کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے ہی ہماری یونیورسٹیوں میں اس طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ ترجمے کے شعبے اور ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور خود یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اس سلسلے میں مالی معاونت کر رہی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کی کیا اہمیت ہے؟
2. کثیر لسانی ممالک میں ترجمہ کیوں ناگزیر ہے؟
3. آج ترجمے کی ضرورت کیوں زیادہ محسوس ہو رہی ہے؟

6.3 اردو میں ترجمے کی روایت

اردو میں باقاعدہ ترجمے کی روایت دو ڈھائی سو برس پرانی ہے۔ اس کا آغاز قرآن شریف کے ترجمے اور بزرگوں کے اقوال وہدایات سے ہوا تھا۔ مدرسہ غازی الدین (قیام: 1792ء)، جو بعد میں ترقی کر کے اورینٹل کالج دہلی بنا، میں علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے تحت ترجمے کرائے گئے۔ یہاں شعبۂ مشرقیہ میں سنسکرت، عربی و فارسی کے علاوہ سماجی علوم اور جدید مغربی سائنس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ ترجمے کا کام دہلی کالج، ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی سرپرستی میں ہوتا تھا۔ آل احمد سرور کی تحقیق کے مطابق یہاں 117 کتابیں ترجمے اور تصنیف وتالیف کے ذریعے تیار کرائی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ (قیام 1800ء) میں اردو زبان وادب اور اس کے علمی وتعلیمی میدان میں ترجمے کے ذریعے ہی ایک انقلاب آیا۔ وہاں پرانے قصے کہانیوں کو لے کر ہی کتابیں لکھی گئیں۔ ترجمے ہوئے اور تاریخ پر بھی کتابی شکل میں کئی بڑے کام ہوئے۔ اس سلسلے میں سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ (قیام: 1863ء) کا نام بھی لیا جا سکتا ہے، جو سر سید احمد خاں کے ذریعے پروان چڑھی۔ سوسائٹی کی علمی مجلس، جسے کونسل مشیر کہتے تھے، نے مختلف موضوعات سے متعلق 48 کتابوں کے تراجم کی تجویز پیش کی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ نے نیچرل سائنس، ٹکنالوجی، پولیٹیکل اکانومی اور ہندوستان، یونان، جاپان، چین اور مصر وایران کی تاریخ پر تقریباً 17 کتابیں شائع کیں۔ سر سید احمد خاں نے سوسائٹی کے مقاصد کو سائنسی علوم کے اردو تراجم تک محدود رکھا۔ انجمن ترقی اردو (قیام: 1903ء) کے مقاصد میں اردو زبان کو فروغ دینا، اردو میں جدید علوم پر تصنیف وتالیف کا کام کرنا، دنیا کی اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کرانا، تحقیق کے سائنٹفک

اصولوں کی مدد سے اردو کے کلاسیکی سرمائے کو ترتیب دینا وغیرہ اہم مشاغل شامل تھے۔ یہاں ایک بڑا نام جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کا آتا ہے، جہاں دارالترجمہ عثمانیہ کا قیام 1917ء میں عمل میں آیا۔ جامعہ عثمانیہ میں قدیم وجدید، مشرقی ومغربی علوم وفنون کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر دارالترجمہ میں نصاب کی تیاری کے لیے تصنیف وتالیف کا کام شروع ہوا۔ عربی وفارسی اور انگریزی وغیرہ سے متعدد کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ اصطلاح سازی کے لیے کمیٹی بنائی گئی، جس کی سفارشات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہزاروں نئی نئی اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ یہاں لکھنؤ کی رسدگاہ کے ایک کارکن مولوی کمال الدین کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، جنھوں نے رسدگاہ کے ناظم کرنل ویکاک کی نگرانی میں کوئی بارہ رسالوں کا ترجمہ کیا، جو ہیئت، حرارت، طبیعیات، ریاضی، مقناطیس، کیمیا وغیرہ پر مشتمل تھے۔ انجمن پنجاب اور اورینٹل کالج لاہور نے بھی متعدد علمی، ادبی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کرکے انھیں شائع کیا ہے۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے زیر نگرانی اردو کی ترقی اور بقا کے لیے ترقی اردو بیورو قائم ہوا (قیام: 1971ء) جو آج قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں تعلیم، ادب، سائنس اور دوسرے جدید علوم کی کتابوں کی تیاری اور ان کی اشاعت کے علاوہ ترجمے کا کام بھی ہوتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام پر ترجمے کے ذریعے اردو میں جو علوم متعارف ہوئے ان میں تاریخ، تصوف، فلسفہ، علم نجوم، علم ہیئت، مذہب و اخلاقیات، جغرافیہ، علم حیات، طب اور زبان وادب اہم ہیں۔ اردو کا عربی، ترکی، فارسی اور سنسکرت سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ترجمے کے راستے سے ہمارے یہاں مشرقی علوم داخل ہوئے سماجی علوم کی دوسری شاخیں اور Pure و نیچرل سائنس جن کی ابتدا دلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ سے ہوئی تھی، انگریزی سے جدید مغربی علوم کی تعلیم کے لیے کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ دہلی کالج کے پرنسپل اسپرنگر نے 1845ء میں قدیم وجدید سائنسی علوم کو نصاب میں شامل کرکے متعدد کتابیں انگریزی سے ترجمہ کرائیں۔ مثلاً الجبرا، علم مثلث، تحلیل مستوی، علم ہیئت، ریاضیات، جغرافیہ، علم اقلیدس، معاشیات، طبیعیات، جراحی، حرکیات، نباتیات، سکونیات، علم کیمیا اور طبیعیات وغیرہ۔ سائنس، طب، ٹکنالوجی، زبان وقواعد اور اصطلاح سازی کی تبلیغ واشاعت میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ اس سلسلے کو دارالترجمہ عثمانیہ اور جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد (دکن) نے انتہا پر پہنچایا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے ان اداروں کے نام بتائیے جو انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں ترجمے کے مراکز تھے۔
2. سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ کب اور کیوں قائم ہوئی؟
3. انیسویں صدی میں ترجمے کے ذریعے اردو میں کون کون سے علوم متعارف ہوئے؟
4. دارالترجمہ عثمانیہ کب اور کہاں قائم ہوا؟

6.4 ترجمہ اور اصطلاح سازی

کسی بھی موضوع یا قسم کا ترجمہ ہو، ترجمہ کرتے وقت سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ مزید شدت اس وقت اختیار کرلیتا ہے، جب ہم مختلف درجوں کے لیے ایسے نصاب تیار کررہے ہوتے ہیں جو ہمارے لیے بالکل نئے ہوتے ہیں۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں۔ نئے نئے ادارے قائم ہوئے، وضع اصطلاحات کے اصول مرتب ہوئے اور ماہرین علوم اور اساتذہ کے مشوروں، ہدایتوں اور سفارشوں کی روشنی میں یہ کام انجام کو پہنچا۔ اس سلسلے میں اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ جیسے Society of knowledge in India through the medium of vernacular languages، انجمن ترقی اردو Institute of Scientific Society, Aligarh، دارالترجمہ عثمانیہ، حیدرآباد اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) وغیرہ۔ اس موضوع پر اردو میں کئی رسالے شائع ہوئے اور باقاعدہ کتابیں بھی لکھیں گئیں۔ جن میں وضع اصطلاحات کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں ''اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ'' عبدالحق، فرہنگ اصطلاحات علمیہ، انجمن ترقی اردو ہند، اصطلاحات علم جدیدیہ، عثمانیہ یونیورسٹی، اصول وضع اصطلاحات، سید حسن بلگرامی اور وضع اصطلاحات وحیدالدین سلیم خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

6.4.1 اصلاح سازی کے لیے دلی کالج کے مجوزہ اصول

اصطلاح سازی پر سب سے پہلے باقاعدہ کام دلی کالج میں شروع ہوا۔ کالج کی مجلس ترجمہ کے اراکین نے سماجی علوم اور سائنس کی اصطلاحیں وضع کرتے وقت حسب ذیل باتوں کو پیش نظر رکھا۔

- اگر سائنس کے کسی ایسے لفظ کا مترادف اردو میں نہ ہو جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہے تو وہ بجنسہٖ انگریزی سے مستعار لے لیا جائے، جیسے سوڈیم، کلورین وغیرہ۔
- سائنس کے کسی ایسے لفظ کا ہم معنی لفظ جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہے اگر اردو میں ہے تو اسے استعمال کیا جائے، جیسے آئرن کی جگہ لوہا وغیرہ۔
- اگر لفظ مرکب ہے اور اس کے دونوں جزو اردو میں نہیں ملتے تو اس لفظ کو بجنسہٖ اردو میں استعمال کیا جائے، جیسے ہائی ڈروجن، ایٹم وغیرہ۔
- اگر لفظ مرکب ہے اور اس کے دونوں جزو کے الگ الگ مترادف اردو میں ملتے ہیں تو انہیں ملا کر انگریزی لفظ کے مترادف اردو میں استعمال کیا جائے: جیسے ایروپلین کی جگہ ہوائی جہاز وغیرہ۔
- مرکب لفظ میں ایک جزو کا مترادف اردو میں موجود ہے اور دوسرے کا نہیں تو انگریزی سے دوسرے جزو کو لے کر اس میں اردو لفظ ملا کر مرکب بنا لیا جائے۔
- سائنس کا ترجمہ انگریزی سے کیا جا رہا ہے اس لیے دوسری زبان کے بجائے انگریزی سے ہی استفادہ کیا جائے۔
- اصطلاح کا ترجمہ کرتے وقت لفظی ترجمے کے بجائے مفہوم کو لے کر ترجمہ کیا جائے۔
- نباتیات کی اصطلاحوں کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ اس لیے انگریزی سے استفادہ کیا جائے، جس میں درختوں کی انواع کے نام یا تو اس نوع کے خاندان کے کسی ممتاز فرد کے نام پر رکھے جاتے ہیں یا نوع کی بعض مشترک خصوصیات کی بنا پر۔ اس قاعدے کی پابندی اردو میں بھی کی جانی چاہیے۔

6.4.2 مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کے مجوزہ اصول

Central Advisory Board of Education کے سامنے جب اصطلاحات کا مسئلہ آیا تو اس نے تجویز کیا کہ سارے ہندوستان کے لیے سائنس کی مشترکہ اصطلاحیں وضع ہوں۔ ان اصطلاحات کا مشترکہ اور بڑا حصہ انگریزی اصطلاحات ہوں جو بجنسہٖ اختیار کر لی جائیں۔ اس بورڈ نے یہ بھی تجویز کیا کہ اصطلاحات کے لیے ہر ہندوستانی زبان میں تین خاص درجے ہونے چاہئیں:

الف) بڑا حصہ انگریزی اصطلاحات پر مشتمل ہو۔

ب) ہر ہندوستانی زبان میں بہت تھوڑی تعداد اُسی زبان کے ایسے الفاظ کی ہو جو اس زبان سے متعلق ہوں۔

ج) سنسکرت اور دراوڑی خاندان کی زبانوں کے لیے سنسکرت کی اصطلاحیں اختیار کر لی جائیں۔ اور پراکرت زبانوں یعنی اردو، پشتو، سندھی کے لیے عربی و فارسی زبانوں سے استفادہ کیا جائے۔ لیکن ایسی اصطلاحوں کی تعداد کم ہو۔

اسی غرض کے لیے ایڈوائزری بورڈ نے ایک کمیٹی بنائی، جس کا جلسہ 15/اکتوبر 1940ء کو حیدر آباد میں منعقد ہوا۔ اس میں صوبوں کے ڈائرکٹر تعلیمات، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اور کچھ سائنس داں شریک تھے۔ کمیٹی کی تجاویز یہ تھیں:

- بین الاقوامی اصطلاحات تمام ہندوستان کی سبھی زبانوں میں یکساں استعمال ہوں۔
- جنرل ایجوکیشن کی خاطر ہر ہندوستانی زبان کی مخصوص اصطلاحوں کو معروف اور مروج ہونے کی وجہ سے قائم رکھا جائے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے نئی اصطلاحیں وضع ہوں۔
- ایسے بورڈ مقرر کیے جائیں، جو ہندوستانی اور دراوڑی تقسیم کی بنیاد پر زبانوں کے لیے مشترک اصطلاحیں وضع کریں۔

- یکسانیت کی خاطر نصاب کی کتابوں میں ایک ہی اصطلاح استعمال ہو۔
- یکسانیت قائم رکھنے کے لیے اردو میں ریاضی کے سوالات اور مسئلے بائیں سے دائیں لکھے جائیں۔

6.4.3 سید میر حسن بلگرامی کے مجوزہ اصول

سید میر حسن بلگرامی نے انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالحق کی درخواست پر ''اصولِ وضع اصطلاحات'' میں اصطلاح سازی کے چند اصول مرتب کیے ہیں، جنہیں اصطلاحات وضع کرتے وقت پیش نظر رکھنے کی تجویز کی گئی ہے۔

یہ اصول حسب ذیل ہیں:

- ایسی اصطلاحیں وضع کی جائیں، جن سے حافظے پر کم زور پڑے۔
- عربی و فارسی کی مروجہ اصطلاحوں کو قائم رکھا جائے۔
- نئی اصطلاحوں کے لیے حتی الامکان ہندی، فارسی، عربی اور پھر انگریزی سے مدد لی جائے۔
- ثقیل تلفظ والی اور بڑی ترکیبوں والی اصطلاحوں سے گریز کیا جائے۔
- اصطلاح وضع کرتے وقت اضافت اور واوِ عطف سے کام لیا جائے۔
- عربی و ہندی کے ٹھیٹ یعنی خالص الفاظ سے گریز کیا جائے۔
- جہاں دو یا تین لفظوں کو ملا کر ایک مرکب اصطلاح بنانا مقصود ہو، وہاں اس قدر تصرف کیا جائے کہ ہر لفظ کی ایک دو آوازیں حذف ہو جائیں تا کہ اختصار بھی آئے اور لفظوں کی اصل شکل بھی قائم رہے۔
- اسم سے فعل بنالینا ایک قسم کا تصرف ہے، جس سے اصطلاح بناتے وقت کام لیا جا سکتا ہے۔

6.4.4 سید وحیدالدین سلیم کے مجوزہ اصول

اصطلاح سازی کے سلسلے میں ایک بڑا اہم کام وحیدالدین سلیم کا بھی ہے۔ جنہوں نے اصطلاحات کے مسائل اور اصول وضوابط پر ایک مستقل کتاب ''وضع اصطلاحات'' کے نام سے لکھی، جو اردو میں اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں سادہ اور مرکب اصطلاحوں کے مسائل پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے خیالات سے دارالترجمہ عثمانیہ میں اصطلاح سازی کے وقت کافی مدد لی گئی۔ وحیدالدین سلیم، انگریزی الفاظ کا اردو ترجمہ کرتے وقت انہیں چھے حصوں میں بانٹنے کی، سفارش کرتے ہیں۔ پہلی قسم ان معمولی الفاظ کی ہے، جو بطور اصطلاح استعمال ہوئے ہیں۔ ایسے الفاظ اردو میں ترجمہ ہونے چاہئیں۔ دوسری قسم میں ایسے جامد اسما اور مختلف چیزوں کے نوعی نام آتے ہیں، جو نہایت عام فہم ہیں، لیکن زیادہ تر ایک خاص فن میں استعمال ہونے کی وجہ سے انہوں نے اصطلاحی شکل اختیار کر لی ہے۔ ایسے الفاظ کا اردو میں ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انہیں موزوں بنایا جائے۔ تیسری قسم میں سائنس کی اشیا کے غیر اشتقاقی نام آتے ہیں۔ ابتدا میں جب ایسے نام وضع کیے گئے، تو اکثر حالتوں میں جن چیزوں کے لیے استعمال کیے گئے، ان کی وہ خاصیت ظاہر نہیں کرتے تھے، لیکن ان میں سے بہت سے الفاظ کے اشتقاقی معنی عرصۂ دراز سے مفقود ہو گئے۔ یہ الفاظ دوسرے درجے کے جامد لفظ بن گئے۔ ایسے الفاظ کا ترجمہ نہ کر کے ان کی املا خاص قواعد کی پابندی کے ساتھ لکھی جائے۔ چوتھی قسم میں نباتات وحیوانات کے مرکب علمی ناموں کو شمار کیا جا سکتا ہے جو ابتدا میں اشتقاقی معنی رکھتے تھے۔ لیکن اب یہ کیفیت نہیں رہی، لہٰذا تیسری قسم کی طرح انہیں بھی جامد اسما تصور کیا جائے اور انہیں اردو میں جوں کا توں رکھا جائے۔ پانچویں قسم میں مفرد الفاظ کو رکھا گیا ہے، جن کے اشتقاقی معنی صاف وصریح ہوتے ہیں اور اسی حد تک کارآمد ہیں، جس حد تک سامع پر اشتقاقی معنی بخوبی واضح کریں، کیوں کہ یہ الفاظ علوم وفنون میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں خالص اصطلاحی الفاظ سمجھا جائے اور ان الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے موزوں بنایا جائے۔ چھٹی اور آخری قسم میں وہ مرکب الفاظ شامل کیے گئے ہیں جس کا ہر جزو کم از کم ایک اور اکثر

حالتوں میں کچھ نہ کچھ اشتقاقی معنی ضرور رکھتا ہے۔ یہی معنی ان اصطلاحوں کی جان ہوتے ہیں اور ایسے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن آلات کے ناموں کا صرف املا ہی زبان میں لکھا جائے۔

6.4.5 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مجوزہ اصول

یہاں آ کر اصطلاح سازی کا پہلا باب ختم ہو جاتا ہے۔ آزادی کے بعد نیا اندازِ فکر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے اثرات' اردو زبان پر بھی مرتب ہوئے' جس کی وجہ سے اردو کے معاملات دو حصوں میں بٹ گئے۔ پاکستان سے قطع نظر ہمارے یہاں اردو کے سلسلے میں جو بڑے کام ہوئے ہیں' ان میں ایک اصطلاح سازی بھی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (پچھلا نام : بیورو فار پروموشن آف اردو) کے زیر اہتمام مختلف ماہرین کی ایسی 18 کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں' جو قدیم و جدید تمام انسانی علوم کی اصطلاحیں وضع کر چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ وہاں مختلف علوم کی اس وقت تک تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار اصطلاحیں وضع ہو چکی ہیں۔ وضعِ اصطلاحات کے پرانے اصولوں اور جدید عہد کے تقاضوں اور ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصطلاحات وضع کرنے کے سلسلے میں جو اصول و ضوابط پیش نظر رکھے گئے ہیں' یہاں ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

- ایسی اصطلاحوں کو ترجیح دی جائے' جو مروج یا مقبول ہو چکی ہیں' خواہ ان میں کوئی معنوی یا لسانی سقم ہی کیوں نہ ہو۔
- اگر کوئی اصطلاح ایک سے زیادہ معنوں میں مستعمل ہے تو اس کے مختلف مفاہیم کو علاحدہ علاحدہ الفاظ میں اصطلاح سے واضح کرنا چاہیے۔
- اصطلاح اور عام لفظ میں فرق کیا جانا چاہیے۔ تمام الفاظ کو فرہنگ میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔
- ایک اصطلاح کا ایک ہی اردو متبادل دیا جائے بشرطیکہ وہ اصول نمبر دو میں نہ آتا ہو۔
- جہاں تک ممکن ہو اصطلاح یک لفظی ہونی چاہیے۔ ناگزیر صورتوں میں یہ دو لفظی بھی ہو سکتی ہے' مگر ایسی اصطلاحیں کم وضع کی جائیں۔
- ہندی اصطلاحوں کو عربی اصطلاحوں پر ترجیح دی جائے اگر وہ با آسانی تلفظ اور تحریر کی جا سکیں۔
- اگر کسی اصطلاح کو ایک سے زیادہ الفاظ کے ذریعے ادا کرنے کی ضرورت پیش آئے' تو حسب ذیل تراکیب کو نیچے دی ہوئی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کیا جائے۔

  1. وہ ترکیبات جن میں اضافی یا حروفِ ربط و جار کے الفاظ و علامات نہ ہوں
  2. وہ ترکیبات جن میں ہائے نسبتی ہیں۔
  3. وہ ترکیبات جن میں اضافت ہو۔ اگر ان میں ایک سے زیادہ اضافتیں ہوں' تو ان میں سے کم از کم ایک کو 'کا' 'کی' 'کے' سے بدل دیا جائے۔
  4. وہ ترکیبات جن میں 'کا' 'کی' کے استعمال کیے گئے ہوں۔

- اگر کوئی اصطلاح ایک سے زیادہ علم یا فن میں مشترک ہے اور سبھی علوم میں ایک ہی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے' تو اس کا اردو متبادل بھی ہر جگہ ایک ہی رکھا جائے گا۔
- اصطلاح کو وضع کرنے کے اصولوں میں اتنی کشادگی ہونی چاہیے کہ ہندی' عربی' فارسی اور پراکرت تراکیب بھی قابلِ قبول ہوں۔
- اگر انگریزی اصطلاح مروّج ہو یا عام فہم ہو تو اسے برقرار رکھا جائے۔

6.4.6 اصطلاح سازی کے لیے لسانیاتی اشارے

کسی علمی یا تکنیکی مضمون کے ترجمے میں بنیادی مسئلہ اصطلاحوں کا ہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات اصطلاحوں کو ہم بے دریغ مستعار لے کر حاشیوں میں

ان کی تشریح کر دیتے ہیں۔ اگر اصطلاحیں زبان کے صوتی و صرفی مزاج کے مطابق ہیں اور عبارت میں ثقالت کو نہیں بڑھنے دیتیں، تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ کھڑا ہو سکتا ہے کہ اپنی وقتی ضرورت کے تحت ہم جو اصطلاح اپنا لیتے ہیں، اس قبیل کے معنوں کے لیے جب مختلف اشتقاقی عمل رکھنے والی اصطلاحیں آئیں گی تو کیا انہیں بھی جوں کا توں مستعار لیا جائے گا؟ ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ پوری اصطلاح کے بجائے ہم اس کی ساق (Stem) کو ہی مستعار لیں اور مستعار لینے والی زبان کے مروج سابقے اور لاحقے ہی اس میں استعمال کریں، مثلاً انگریزی کی لسانیات کی ایک اصطلاح Morph کو لے کر اس کے سیاق میں لاحقوں اور سابقوں کی مدد سے متعدد اصطلاحیں بنائی گئیں ہیں۔ جیسے:

Morph > Morpheme > Allomorph > Morphemics > Morphology > Morphological > Morphologically > Morphophomemics > Morphenization

اس طرح اردو میں Morph یا Morpheme کو مستعار لے کر اردو سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے ان اصطلاحوں کے متبادل اختراع کیے جاسکتے ہیں: جیسے مارف > مارفیم > ذیلی مارف > مارفیمیات > علم مارفیم > مارفیمیاتی > مارفیمیاتی طور پر > مارف فونیمیات اور مارفیمیانہ وغیرہ۔ یہاں بہتر یہ ہوگا کہ ایک ساق کو لے کر اس سے جڑی جتنی اصطلاحیں ہیں، انہیں جمع کر کے چھوٹی چھوٹی بامعنی اکائیوں میں بانٹ لیا جائے اور ان کے متبادل اردو میں تلاش کر کے اصطلاحیں بنائی جائیں۔ جیسے

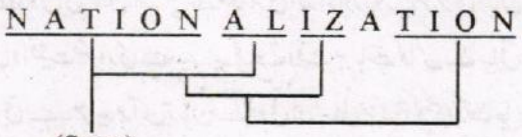

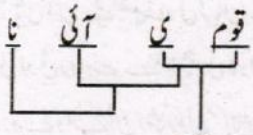

اصطلاحات وضع کرنے میں بعض دوسری قسم کی دشواریاں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر لسانیات کی اصطلاحات کو لیجیے۔ اس علم کے کسی موضوع کو لے کر اس کا ترجمہ کرنے بیٹھیں تو جگہ جگہ ہمیں سوچنا پڑے گا، کیوں کہ ہماری زبان اس علم سے قطعی بے بہرہ ہے۔ الفاظ کی ساخت کو زیر بحث لاتے وقت Root اور Stem کے لیے ہم حسب ترتیب مادہ اور ساق استعمال کر سکتے ہیں لیکن Nucleus کے لیے جو مادے اور ساق سے ذرا ہٹی ہوئی چیز ہے، ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔ اسی طرح صوتیات میں Concoid اور Vocoid کے لیے مصمتے (Consonant) اور مصوتے (Vowels) کی اصطلاح نہیں رکھ سکتے کیوں کہ یہ وہ مفہوم ادا نہیں کرتے جو پائک نے اختیار کیے ہیں اور اپنی اپنی تعریفوں کے اعتبار سے Consonant اور Vowel سے الگ ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اردو میں اصطلاح سازی کا کام سب سے پہلے کب اور کہاں شروع ہوا؟
2. سید وحید الدین سلیم نے اصطلاح سازی پر کون سی کتاب مرتب کی؟
3. سید میر حسن بلگرامی کا نام اردو میں اصطلاح سازی کے تعلق سے کیوں لیا جاتا ہے؟
4. علمی یا سائنٹفک مواد کا ترجمہ کرتے وقت بنیادی مسئلہ کہاں پیدا ہوتا ہے؟
5. اصطلاح سازی کے پانچ بنیادی اصول کیا ہیں؟

6.5 ترجمے کے مسائل

دراصل ترجمہ ایک مستقل فن / علم ہے۔ اس کے اپنے اصول و ضوابط ہیں، جو مسائل کی نوعیتوں کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ نفسِ مضمون اپنی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو جائے۔ صحت مند اور کامیاب ترجمہ اسی صورت

میں ممکن ہے، جب ہم (خصوصاً ادبی فن پارے کے تعلق سے) لکھنے والے کے ذہن میں سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس طرح ہم ان کیفیات اور احساسات سے گزر سکتے ہیں، جو تصنیف کا باعث بنی ہیں۔ اس طرح ترجمہ تحریروں کی روح تک پہنچتا ہے۔ ترجمہ محض ایک جسم کو دوسرا لباس پہنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک جسم کے مقابلے میں بالکل ویسا ہی جسم تراش کر اسے دوسرے لباس میں اس طرح سے پیش کرنا ہے جس سے دونوں قالبوں میں ایک ہی روح رواں دواں محسوس ہو۔ یہاں لباس، جسم اور روح سے مراد ترجمے کی زبان، اصل عبارت کا مرکزی خیال اور وہ تاثر ہے، جو پڑھنے کے بعد قائم ہوتا ہے ترجمے کے وقت مختلف مسائل سامنے آسکتے ہیں اور ان کی نوعیتیں بھی مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ترجمے کا مواد کیا ہے۔ اگر ترجمہ ادبی شاہکاروں کا ہے تو ہمارے مسائل علمی و تکنیکی مضامین کے ترجمے کے مقابلے میں بالکل مختلف ہوں گے۔ اول الذکر میں اگر شاعری ہے تو مجموعی تاثر، خیال کی شدت، مرکزی خیال، تخیل کی پرواز، امیجری کی نوعیت، الفاظ کی نشست و برخاست، صوتی آہنگ، بحری تناسب، اسلوب اور ہیئت وغیرہ سبھی کو ساتھ لے کر چلنا پڑے گا۔ نثر میں مرکزی خیال، مجموعی تاثر، سیاق وسباق میں پیوست الفاظ کے معنی اور اصطلاحوں جیسی باتوں پر ہماری خاص توجہ مرکوز ہوگی۔ شاعری اور نثر دونوں میں مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کو اہمیت حاصل ہے۔ جن پر مترجم کی گرفت مضبوط ہونی چاہیے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تصنیف و ترجمے کی زبانوں پر ہمیں عبور حاصل ہو۔ شاعری کے مقابلے میں نثر کا ترجمہ کرنا نسبتاً آسان ہے کیوں کہ اس میں مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کو پالینا زیادہ مشکل نہیں۔ شاعری کے ترجمے میں شاعر کے دل و دماغ سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کیفیات و محسوسات اور کرب کو پکڑنا پڑتا ہے جو شعری تخلیق کا باعث بنے ہیں۔ زبان بولنے والوں کی سماجی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار اور رویے مرکزی خیال کو پکڑنے میں رکاوٹ بنتے ہیں، اس لیے تصنیف کی زبان کے مذکورہ پہلوؤں سے مترجم کی واقفیت ضروری ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ہر بات کو اس کے سیاق میں دیکھنا چاہیے۔ زبان کی ادبی روایت سے مترجم کی ناواقفیت بھی ترجمے کو مجروح کر دیتی ہے۔ مزید برآں زبان کے صوتی اور لسانی مزاج کو بھی سمجھنا چاہیے۔ شاعری میں استعمال ہونے والے اُن اشاروں، کنایوں، استعاروں اور علامتوں کی جانکاری ضروری ہے جن میں خیال بن سنور کر سامنے آیا ہے۔ لسانی ساخت کے پیچ وخم پر بھی دسترس ہونی چاہیے۔ ان تمام باتوں کے بغیر ترجمے میں اصل مواد کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کو پیش نہیں کر سکتے۔

6.5.1 کیفیت وشدت اور تہذیبی عناصر کی منتقلی کا مسئلہ

ترجمے میں بڑی دقت اس وقت پیش آتی ہے، جب ترجمے کی زبان ان پہلوؤں مثلاً مشاہدات و تجربات، تخیل کی پرواز، خیالات، کیفیات اور احساسات کو پیش کرنے سے قاصر رہتی ہے جو تصنیف کی زبان میں ملتے ہیں۔ اس کمی کو زبان کے مزاج کے مطابق اختراعی عمل سے یا الفاظ مستعار لے کر پورا کیا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس زبان کی لسانی توضیحات سے پوری طرح واقف ہوں جس میں الفاظ اختراع کیے جارہے ہیں یا مستعار لیے جارہے ہیں، تصنیف کی زبان میں بھی یہ واقفیت ضروری ہے۔

مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کے علاوہ ترجمے میں تیسری اہم چیز ''شدت'' ہے یعنی جس نوعیت و کیفیت کے ساتھ فنکار نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں تقریباً وہی بات ترجمے میں آنی چاہیے۔ ورنہ وہ ترجمہ ناقص ہوگا۔ اس کے لیے الفاظ کا موزوں انتخاب اور مستحسن استعمال ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب الفاظ کے معنی کو سیاق وسباق میں جکڑ دیا جائے۔ اس طرح ترجمے کی زبان کے الفاظ کے معنی و مطالب اپنے استعمال سے ایسا ہی مفہوم ادا کریں گے جیسا کہ ترجمہ ہونے والی تحریر چاہتی ہے۔ تشبیہوں، استعاروں، علامتوں اور پیکر تراشی کا بھی خاطر خواہ ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ اصل تحریر و تخلیق اپنی ''شدت'' کی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ سامنے آسکے۔

6.5.2 الفاظ، محاوروں اور صنعتوں کے انتخاب کا مسئلہ

ترجمے میں الفاظ کا صحیح انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مرکزی خیال، مجموعی تاثر اور خیال کی شدت تینوں چیزیں متاثر ہوسکتی ہیں۔ اس عمل سے گزرتے وقت خصوصاً شاعری میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ہر لفظ، معنی کے اعتبار سے ایک دائرہ بناتا ہے۔ اس لیے یہ دائرے ترجمے میں اصل کے جتنے قریب ہوں گے، ترجمہ اتنا ہی اصل کے مطابق ہوگا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترجمے کے وقت زبان میں وہ لفظ نہیں ملتے جنہیں کسی خیال کی

ادائیگی کے لیے ہم ڈھونڈھنا چاہتے ہیں۔اس صورت میں زبان کی ساخت سے مطابقت رکھنے والے لفظ کو کسی قریبی زبان سے مستعار لے سکتے ہیں۔یہ بھی ممکن ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اس کے کسی لفظ کو اپنالیں۔بہر حال جو بھی صورت ہو یہاں ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ترجمہ کی جانے والی زبان کی انفرادیت، مزاج، صوتی آہنگ اور گردانوں میں وہ لفظ لسانی مزاج کے اعتبار سے زبان میں اپنی اجنبیت برقرار نہ رکھے۔یہاں مناسب ہوگا کہ سادہ (Simple) الفاظ ہی مستعار لیے جائیں تاکہ ضرورت پڑنے پر ان کے مادوں سے پیچیدہ (Complex) یا مرکب (Compound) الفاظ وضع کیے جاسکیں۔یہ ترجمہ کی زبان کے عین مطابق ہوگا۔

ترجمے کے وقت سیاق وسباق کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرنا زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ یہی واحد طریقہ ہے، جو لفظ کے صحیح معنی یا متن کا صحیح مفہوم ہم تک پہنچاتا ہے۔انگریزی لفظ ہاؤس (House) کا اردو میں ترجمہ کرنا بہت آسان ہے یعنی گھر یا مکان لیکن انگریزی میں یہ لفظ انفرادی طور پر یا دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر تحریر میں الگ معنی بھی دیتا ہے۔اب یہ سیاق وسباق ہی بتائے گا کہ عبارت میں لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔انگریزی کے اس لفظ ''ہاؤس'' کے مختلف استعمال اور معنی کو ذیل میں دیکھیے :

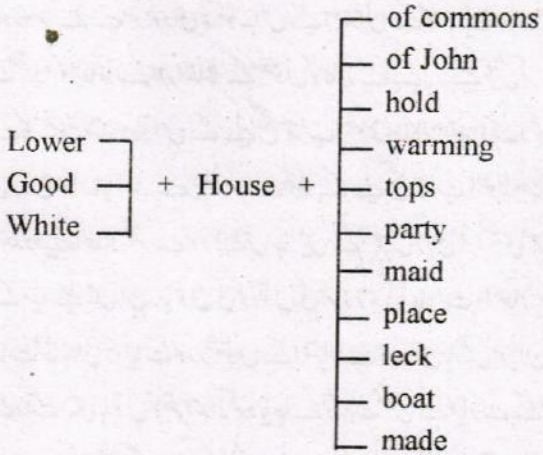

اسی طرح اردو میں رہنے کی جگہ کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں، جن میں معنی کے بڑے لطیف فرق موجود ہیں، جیسے گھر، مکان، جھونپڑی، کٹیا، محل، حویلی، رہائش گاہ اور دولت کدہ وغیرہ۔اب یہ سیاق وسباق ہی طے کرے گا کہ عبارت میں کہاں کون سا لفظ آئے گا کیوں کہ ہر لفظ میں رہنے کے الگ الگ معنی پوشیدہ ہیں۔کبھی کبھی الفاظ کردار سے منسوب ہوتے ہیں۔اس لیے یہ ترجمے کے وقت ہی طے ہوگا کہ کہاں کس لفظ کا کیا ترجمہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر ہندی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت اگر یہ جملہ ہے کہ ''سمراٹ اشوک نے پرستھان کا آدیش دیا'' تو اس کا مناسب ترجمہ 'شہنشاہ اشوک کے بجائے 'سمراٹ اشوک نے کوچ کا حکم دیا' ہوگا۔یہاں اشوک کی رعایت سے شہنشاہ کے بجائے سمراٹ لفظ ہی زیادہ درست ہے۔عام طور پر رسم ورواج، تیوہار، لباس اور مکانوں وعلاقوں کے نام کا ترجمہ نہیں ہوتا اور حاشیوں میں ان کی تشریح کردی جاتی ہے۔یہ اسی صورت میں مناسب رہے گا جب دونوں زبانوں کے معاشروں میں بڑا فرق ہو۔مثال کے طور پر عصمت چغتائی کے ''چوتھی کا جوڑا'' کا انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت ہمیں کچھ اس طرح کی حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کا ترجمہ کرتے وقت کوئی خاص دقت نہیں ہوتی سوائے اس وقت کے جب وہ ترجمہ ہونے والی زبان میں نہ ملیں یا اس میں بے معنی ہوں۔زبان بولنے والوں کے رجحانات، کیفیات اور سوچنے کے انداز سے ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ زبان میں کسی تشبیہ یا استعارے سے جو کام لیا جارہا ہے، دوسری زبان میں بھی یہ وہی تاثر یا شدت پیدا کریں۔

شاعری کا ترجمہ کرنا ایک مشکل عمل ہے۔یہاں کئی لغزشیں ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔ایک شاعر اپنے اشعار کی تخلیق میں جتنی محنت کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ کاوشیں مترجم کو کرنی پڑتی ہیں۔شاعر کی ''آمد'' کو مترجم ''آورد'' سے گزار کر ''آمد'' بناتا ہے۔اس کے لیے دونوں زبانوں پر گرفت کے علاوہ مترجم اپنے دل ودماغ کے گداز پن کو اس ماحول میں ڈھال لیتا ہے جس میں تخلیق وجود میں آئی ہے۔شاعری کے ترجمے کے وقت مترجم کو شاعر کے Tention, Conflict اور Compromise کو سمجھ لینا چاہیے۔الفاظ کے معنی ومطالب سے صلح کرنے کے لیے مترجم کو جنگ بھی کرنی پڑتی ہے اور

صوتی تاثر کے لیے الفاظ کی ایک ایک آواز کو ناپنا اور تولنا پڑتا ہے۔ غرض ایک لمبی تراش خراش اور تلاش و کاوش کے بعد روح کو صحیح قالب ملتا ہے۔ شاعری کے ترجمے کے وقت ہئیت اور فارم کا صحیح فیصلہ کرنا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اردو میں غزل، نظم، رباعی، مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ وغیرہ مختلف اصناف سخن ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی الگ خصوصیات اور اپنا الگ طرزِ بیان اور فضا ہے۔ ظاہر ہے ہر ادب میں یہ اصناف رائج نہیں ہیں۔ اس لیے ترجمے والی مروج اصناف میں سے کسی ایک صنف کو اپنے مقصد کے لیے اس طرح چننا چاہیے کہ وہ سارے تقاضے پورے کرے۔ شاعری کے ترجمے میں صرف مرکزی خیال کو ہی ظاہر کر دینا کافی نہیں ہے۔ ہمیں وہ تاثر بھی پیش کرنا چاہیے جو اصل کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں قائم ہوا ہے۔ ''زہر عشق'' میں وصیت نامہ کے ترجمے کے بعد مرکزی خیال کے ساتھ اگر وہ تاثر اور شدت ذہن میں قائم نہیں ہوگی جو زبان کے تعلق سے اصل میں قائم ہوئی ہے تو ترجمہ اور اصل دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

ترجمے میں ایک خاص پریشانی محاورات کے ساتھ پیش آتی ہے۔ ہر زبان کے محاورے، بولنے والوں کی روایات اور تہذیبی قدروں کے مطابق ہوتے ہیں اور وہ جو مفہوم ادا کرتے ہیں ان کے پیچھے ایک تاریخ ہوتی ہے۔ ایک خاص محاورے کے ذریعے ہم جو کہنا چاہتے ہیں بہت ممکن ہے کہ دوسری زبان میں اس خیال کو ادا کرنے کے لیے کوئی محاورہ سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ اس لیے اعتدال سے کام لیتے ہوئے ہمیں محاورے کی جگہ محاورے کی جستجو کے بجائے اپنی ضرورت کے مطابق محاورے کے مفہوم کو الفاظ سے اور الفاظ کے معنوں کو محاورے کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ترجمے کی زبان میں کسی خاص محاورے کا مفہوم ملتا ہے تو اس کے لیے صحیح قالب ڈھونڈھ نکالنا یقیناً ایک دشوار کام ہوگا۔ انگریزی کے قالب میں اردو محاورہ ''بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی'' کی روح اتارنا یا! منہ سے بولو، سر سے کھیلو کے لیے صحیح قالب ڈھونڈھنا مشکل کام ہے۔ اردو میں بیگمات کی زبان کے ساتھ بھی تقریباً یہی بات ہے جہاں متعدد ایسے الفاظ، فقرے اور جملے مل جائیں گے جنہیں روسی، فرانسیسی، جرمن یا انگریزی کے قالب میں ڈھالنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کے مقابلے میں ان زبانوں کی عورتوں کی طرز زندگی، عادات و اطوار، سوچنے اور بات کرنے کے انداز قطعی مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ مشرق میں بعض رسومات، خاندانی روایات اور رشتوں کے اعتبار سے بہت سی باتیں اور ان کے بیان کرنے کے انداز ایسے ہیں، جو مغرب والوں سے میل نہیں کھاتے۔ ترجمے کے وقت ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے عبارت کے منتہائے کمال پر اثر پڑے یا وہ فضا ہی قائم نہ رہے، جو اس تحریر کی جان ہے۔ مثال کے طور پر رجب علی بیگ سرورؔ کی ''فسانۂ عجائب'' سرشارؔ کی ''فسانۂ آزاد'' اور عصمت چغتائی کا ''چوتھی کا جوڑا'' کو لیجیے۔ ان نثر پاروں میں اتنی تہذیبی زندگی ہے کہ انہیں مغرب کی کسی زبان میں لانے کے لیے اس زبان کو ''اردو'' بننا پڑے گا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. شعری اور نثری فن پارے کے ترجمے میں کیا فرق ہے؟
2. شاعری کا ترجمہ کرتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے؟
3. ادبی ترجمہ، علمی ترجمے سے کیوں مختلف ہے؟
4. کسی لفظ کا ترجمہ کرتے وقت یا اصطلاح وضع کرتے وقت کیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے؟
5. ادبی ترجمہ کرتے وقت سب سے بڑا مسئلہ کہاں پیدا ہوتا ہے؟
6. ''چوتھی کا جوڑا'' کا ترجمہ کیوں ممکن نہیں ہے؟

6.6 ترجمہ اور لسانی ساخت

ترجمے کے دوران بعض اوقات قواعد کے کچھ ایسے بنیادی عناصر پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر جرمن سے اردو میں کسی ترجمے کو لیجیے۔ یہاں اسما کی تذکیر و تانیث مقرر کرتے وقت یہ مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے کہ جرمن کے مذکر، مونث اور Neutral کے فرق اردو اسما میں کس طرح ظاہر کیے جائیں، کیوں کہ اردو میں Neutral جنس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس طرح زمانوں (Tenses) میں Aeorist والے

جملوں کا کیا ہوگا۔ جب کہ اردو میں ماضی، حال اور مستقبل ہی ملتے ہیں۔ تحریر میں کبھی کبھی مکالمے سے وقت کا تعین ہو جاتا ہے۔ جرمن کی طرح اردو میں سلام کے لیے مختلف الفاظ ضرور ہیں، جیسے تسلیم، آداب وغیرہ، لیکن ان سے وقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جب کہ جرمن میں مختلف وقتوں کے لیے سلام کے لیے الفاظ موجود ہیں۔ ایسے مسائل سے نمٹنے کے لیے بڑی سوچ کے بعد قدم اٹھانے پڑیں گے۔

6.6.1 ترجمہ اور اسلوبی و تہذیبی پہلو

کسی ادب پارے کے ترجمے کے وقت متعلقہ زبانوں کی ادبیات پر مترجم کی گہری نظر ہونی چاہیے۔ جس مصنف یا شاعر کی تخلیق زیر بحث ہے اس کے دوسرے شاہکاروں سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ مصنف کے اسلوب کی مجموعی خصوصیات بھی ذہن میں ہونی چاہئیں۔ اس کے علاوہ دونوں زبانوں میں زبان اور بولی کے فرق کی جانکاری بھی ترجمے میں مفید ہو سکتی ہے، کیوں کہ نثری شہ پارے کے ترجمے کے دوران بہت ممکن ہے کہ مصنف نے اعلیٰ سوسائٹی اور متوسط یا دیہی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہو اور اپنی تحریر میں جگہ جگہ سماج کے ان طبقوں سے مکالمے ادا کروائے ہوں۔ مکالموں کے اس فرق کو زبان اور بولی کے فرق کو سمجھنے کے بعد ہی ترجمے میں صحیح طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور کرداروں کے مکالموں کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے۔

6.6.2 ترجمہ اور لسانی پہلو

نثری ترجمے میں جملہ، اس کی لسانی ساخت اور اس کے معنی و مفہوم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر جملے کی ساخت کو پوری طرح ذہن میں نہ رکھا جائے تو مفہوم کی روح تو متاثر ہوتی ہی ہے، خود تحریر میں خیال کا تسلسل اور جملوں کے درمیان منطقی ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ معیاری نثر میں ہر پیراگراف کا آخری جملہ عام طور پر اس پیراگراف کا نچوڑ ہوتا ہے اس لیے خصوصاً اس جملے کے ترجمے کے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر جہاں جملوں کا مفہوم سمجھ میں نہ آ رہا ہو، جملوں کو چھوٹے چھوٹے بامعنی حصوں میں تقسیم کر کے عمل اور مطابقت کے مطابق جملوں کے معنی و مفہوم کو سمجھنا چاہیے۔ عمل اور مطابقت کو مارفیموں سے لفظوں میں، لفظوں سے فقروں میں اور فقروں سے کلموں یا نیم جملوں میں دیکھنا کارآمد ہو سکتا ہے۔ مثلاً

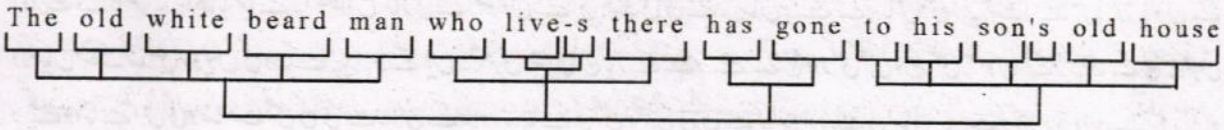

انگریزی کے اس جملے میں مختلف الفاظ، فقرے اور کلمے ملتے ہیں، جنہیں مربع قوسین کی مدد سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ مربع قوسین پہلے ساق اور لاحقوں کی مدد سے تشکیل پانے والے پیچیدہ الفاظ (Complex Words) کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پھر ان الفاظ سے مل کر بننے والے فقروں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ اس بات کا بھی پتہ دیتے ہیں کہ فقروں کی ترتیب نیم جملوں یا کلموں میں کیا ہے۔ انہیں مربع قوسین کی مدد سے جملے کی مجموعی ساخت سامنے آتی ہے۔ یہ مربع قوسین جملے میں ہر یونٹ کی مطابقت کو ظاہر کرتے ہیں، جن کی مدد سے ہم با آسانی جملے کے صحیح مفہوم تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہی وہ طریق کار ہے جس سے یہ پتا لگایا جا سکتا ہے کہ ترجمے میں اصل یونٹوں کے مطابق مختلف عملوں اور مطابقتوں کا صحیح تعین ہوا ہے یا نہیں۔ اس طریق کار کی روشنی میں انگریزی کے مذکورہ بالا جملے کا اردو ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

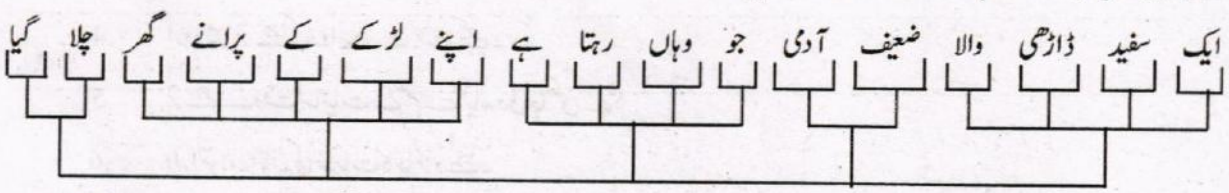

ترجمے کے وقت کبھی کبھی ایسے پیچیدہ فقرے یا نیم جملے سامنے آ جاتے ہیں، جن میں یونٹوں کے درمیان صحیح مطابقت کا پتہ نہیں چلتا۔ مثلاً انگریزی کا اک نیم جملہ دیکھیے۔

Old man and woman

اس نیم جملے کا ساخت کے اعتبار سے دوطرح سے ترجمہ کیا جاسکتا ہے یعنی بوڑھا آدمی اور (ایک) عورت یا بوڑھا آدمی اور (بوڑھی) عورت۔ ایسی صورت میں صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لیے یا تو ہمیں پورے جملے کی ساخت کو ذہن میں رکھنا ہوگا یا پھر سیاق وسباق کی مدد سے اس نیم جملے کے معنی طے کرنے ہوں گے۔

انگریزی یا کسی اور زبان سے ترجمے کے وقت کبھی کبھی ہمارا واسطہ مخففات سے بھی پڑتا ہے۔ اس کے بجائے کہ ہم اردو میں ان مخففات کے مخففات بنائیں، مناسب یہ ہوگا کہ پورے پورے الفاظ لکھے جائیں۔ یا ان کے لیے اپنے مخففات طے کریں۔ البتہ ایسے مخففات جو بین الاقوامی حیثیت پا چکے ہیں یا ہماری زبان کی قریبی زبانوں میں رواج پا چکے ہیں انہیں مستعار لے سکتے ہیں، جیسے ٹی۔ وی (ٹیلی ویژن)، یو۔ این۔ او (یونائیٹڈ نیشنس آرگنائزیشن) وغیرہ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے میں لسانیات سے کہاں مدد لی جاسکتی ہے؟
2. اصطلاح سازی میں لسانیات کہاں اور کیسے مدد کرتی ہے؟
3. لفظ اور جملے کو کس طرح چھوٹی چھوٹی بامعنی اکائیوں میں بانٹا جاسکتا ہے؟

6.7 خلاصہ

اس اکائی میں ترجمے کی اہمیت، افادیت اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مزید برآں اردو میں ترجمے کی تاریخ کو اصطلاح سازی کی روایت کے تناظر میں دکھایا گیا ہے۔ اصطلاح سازی کے اصولوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہاں ترجمے کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں، جو زبانوں کے درمیان مختلف تہذیبی رویوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ شعری ونثری فن پارے کے ترجمے کے بیچ اور کسی علمی وغیر علمی مضمون کے ترجمے کے بیچ جو فرق دیکھنے کو ملتا ہے، اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بتانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ لفظ اور جملے کی لسانی ساخت کو سمجھ کر ہی ان کے قطعی معنی و مفہوم تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اس کی چند مثالیں بھی دی گئی ہیں۔

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کی اہمیت پر اظہار خیال کیجیے۔
2. ترجمے کے مسائل سے بحث کیجیے۔
3. اصطلاحات اختراع کرنے کے اصولوں سے بحث کیجیے۔
4. اردو میں ترجمے کی روایت سے بحث کیجیے۔
5. ترجمے کے وقت لسانیات کے علم سے کیا مدد لی جاسکتی ہے؟
6. دارالترجمہ عثمانیہ کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. کسی فن پارے کا ترجمہ کرتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے؟
2. کثیر لسانی ممالک میں ترجمے کی زیادہ اہمیت کیوں محسوس کی جاتی ہے؟
3. وحیدالدین سلیم نے اصطلاح سازی کے وقت کن سفارشات کا ذکر کیا ہے؟
4. شاعری کا ترجمہ کرتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے؟

6.9 فرہنگ

سقم = خرابی، عیب، نقص، دکھ

ثقالت = گرانی، بھاری پن، بدہضمی کی وجہ سے طبیعت بوجھل ہونا

ساق = درخت کا تنا، ڈنڈی (Stem)

تصنیف = کتاب لکھنا، مضمون بنانا، طبیعت سے کوئی بات نکالنا

تالیف = دو چیزوں کو باہم ملانا یا جمع کرنا، مختلف کتابوں سے مضامین چن کر نئے پیرائے میں ترتیب دینا۔ دوستی پیدا کرنا

علم نجوم = ستاروں کا علم | علم ہیئت = اجرام فلکی کا علم

طبیعیات = علم الاجسام، فزکس | اشتقاق = ایک لفظ سے دوسرا لفظ بنانا

سکونیات = وہ علم جس میں اجسام حالت سکون سے بحث کی جاتی ہے

نباتیات = پیڑ پودوں کا علم (Botany)

مترادف = دو ایسے الفاظ جن کے معنی ایک ہی ہوں

مفقود = کھویا ہوا، گم کیا ہوا، ناپید، ندارد | صوتی = آواز سے متعلق

صرفی = علم صرف سے متعلق | مخففات = تخفیف کرنا، مختصر کرنا

لاحقہ = پیچھے لگا ہوا، وابستہ، لفظ بنانے کے لیے لفظ کے آخر میں کوئی لفظ بنانا (Suffix)

سابقہ = اگلا، اگلے زمانے کا، معاملہ، وابستہ، لفظ بنانے کے لیے لفظ کے شروع میں کوئی لفظ لگانا (Prefix)

6.10 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر خلیق انجم (مرتبہ) فن ترجمہ نگاری
2. پروفیسر قمر رئیس (مرتبہ) ترجمے کا فن اور روایت
3. اعجاز راہی اردو زبان میں ترجمے کے مسائل
4. نثار احمد قریشی (مرتبہ) ترجمہ: روایت اور فن
5. ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ترجمہ کا فن

اکائی 7 : اردو میں ترجمے کی روایت واہمیت

ساخت

7.1 تمہید

7.2 ترجمے کی اہمیت

7.3 ترجمے کے مقاصد

7.4 مترجم کی ذمے داریاں

7.4.1 آزاد اور لفظی ترجمے کا مسئلہ

7.4.2 معتدل رویہ

7.5 اردو میں ترجمے کی روایت

7.5.1 فورٹ ولیم کالج

7.5.2 ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

7.5.3 سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی

7.5.4 دارالترجمہ عثمانیہ

7.6 ترجمے کے دیگر شعبے

7.6.1 مذہبی لٹریچر کے تراجم

7.6.2 شاعری اور افسانوی ادب کے تراجم

7.6.3 بچوں کے ادب کے تراجم

7.7 خلاصہ

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

7.9 فرہنگ

7.10 سفارش کردہ کتابیں

7.1 تمہید

انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سماجی حیوان ہے، یعنی وہ صرف سماج ہی میں رہ سکتا ہے۔ سماج سے باہر یا ایک دوسرے پر منحصر ہوئے بغیر تنہا رہنے کا رجحان انسان میں نہیں پایا جاتا۔ سماج میں رہنے کا رجحان اس میں فطرتاً موجود ہوتا ہے، جو دراصل اس بات کا غماز ہے کہ سوچنے سمجھنے اور عقل و دانش رکھنے کی فطری صفت کے سبب وہ اپنے آپ کو جاننا چاہتا ہے اور اپنے وجود کی پہچان وہ اپنے آس پاس موجود لوگوں، ان کے ساتھ رشتوں اور ماحول کے حوالے سے کرتا ہے نیز اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے لین دین اور ایک دوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس ضرورت

کے پیش نظر بہت سے ذریعوں میں سے ترجمہ ایک اہم ذریعہ ہے۔ باشعور یا پڑھا لکھا شخص اپنی شخصیت کو اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنے علاقے، اپنی زبان اور اپنے مذہب کے پس منظر میں پہچانتا ہے۔ اس کے آگے دنیا و مافیہا میں اپنے کو رکھ کر مدلل طریقے سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے تشخص اور پہچان کے لیے اس کا بنیادی تجسس یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اپنی شناخت کو دوسرے لوگوں کے مقابل کر کے خود کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود کو برتر اور ممتاز حیثیت میں دیکھنے کی خواہش اسے دوسرے لوگوں کے بارے میں جاننے کی طرف مائل کرتی ہے۔ دوسرے لوگوں کو جاننے اور سمجھنے کا تجسس اسے ان کے عادات واطوار، رسم ورواج، تہذیبی قدروں، زبانوں، تاریخوں، جغرافیائی صورت حال اور ماحول کے بارے میں جاننے کی طرف راغب کرتا ہے۔ دوسری اقوام اور ممالک کے بارے میں جاننے کے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں لوگوں کے ساتھ ذاتی رابطے، باہمی بات چیت اور مختلف خطوں کا سفر کرنے کے علاوہ ایک بے حد اہم وسیلہ کتابیں بھی ہوتی ہیں۔ دنیا کی مختلف قوموں کی زبانیں مختلف واقع ہوئی ہیں۔ لہٰذا مختلف زبانوں میں لکھی گئی کتابوں میں پیش کردہ نسل انسانی کے تجربوں، مشاہدوں اور علوم تک رسائی کے لیے ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترجمے کی مدد سے انسانی علوم ایک مقام سے دوسرے مقام تک بہ آسانی پہنچتے ہیں۔

7.2 ترجمے کی اہمیت

کتابیں علم وادب اور انسان کے ذہنی سفر کا ذخیرہ ہوتی ہیں۔ انھیں بنی نوع انسان کا حافظہ کہا جاتا ہے۔ علم جب کتابوں کی صورت میں مرتب ہو جاتا ہے تو پھر وہ کسی ایک قوم یا ملک کی میراث نہیں رہ جاتا بلکہ دوسری قومیں اور دور دراز کے خطوں کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس مشترکہ میراث سے مختلف زبانوں کے جاننے والے لوگ کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے اس کا سب سے بڑا ذریعہ ترجمہ ہے۔ اسی لیے جب ہم دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں کے زبان وادب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تمام اہم زبانوں میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔ یہ ترجمے کی روایت ہی ہے جس کے سبب قدیم دور میں عرب اور ہندوستان کی سائنس، طب، ریاضی، ادب اور فلسفے کی کتب کے تراجم یونانی اور لاطینی زبانوں میں ہوئے اور یوروپی اقوام نے ان تراجم کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں کو نکھارا اور ان علوم کو مزید آگے بڑھایا، اور پھر یہ علوم یورپی قوموں کی مسلسل تحقیق وجستجو کے نتیجے میں پوری دنیا کے سامنے آئے۔ عرب وعجم کے علماء نے یونانی اور ہندوستانی فلسفے، طب، ہیئت، نجوم اور داستانوں کے عربی زبان میں ترجمے کیے۔ انھوں نے لاطینی زبانوں سے ترجموں کی مدد سے مشرق کو یورپ کے علوم سے متعارف کرایا اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو مشرق کی علمی فتوحات سے باخبر کیا۔ سقراط اور افلاطون جیسے مفکرین کے خیالات ہم تک صرف اس وجہ سے پہنچ سکے کہ سیکڑوں برس پہلے عربی زبان کے اسکالروں نے انھیں اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور تمام دنیا کو ان سے متعارف کرایا۔ اسی طرح بوعلی سینا، ابن رشد اور ابونصر فارابی کے کارناموں کو عرب ممالک کے حصاروں سے نکالنے کا کام لاطینی زبانوں نے کیا اور پھر ان کے فلسفے اور افکار سے یوروپی اقوام نے استفادہ کیا۔ اسی طرح بعد کے زمانے میں والٹیئر نے شیکسپیئر کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا اور پاسترناک نے روسی زبان میں اہم ادبی شاہکاروں کے تراجم کر کے اپنی زبان کی بیش بہا خدمت کی۔ اس طرح مشرق ومغرب ہر زمانے میں ایک دوسرے کے ادب سے استفادہ کرتے رہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انسانی علوم کے ارتقا اور فروغ میں تراجم کی اہمیت مستقل اور مسلّم ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترجمے کی ضرورت کس لیے محسوس کی جاتی ہے؟
2. ترجموں کے ذریعے لوگ کن کن شعبوں میں ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں؟

7.3 ترجمے کے مقاصد

ترجمے کا بنیادی مقصد علم کی ترسیل ہے۔ یہ علم کس قسم کا ہے، اس کی بنیاد پر ترجمے کے کئی مقاصد گنائے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن اپنے مضمون ''ترجمہ: نوعیت اور مقصد'' میں لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر ترجمے کے تین مقاصد ممکن ہیں: پہلا معلوماتی دوسرا تہذیبی اور تیسرا جمالیاتی۔

معلوماتی مقصد کے ضمن میں سائنسی، بشری یا سماجی علوم کی کتب کے تراجم آجاتے ہیں۔ان تراجم کی کامیابی اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ کتاب میں فراہم کردہ معلومات کو کتنی کامیابی کے ساتھ، بغیر کسی غلطی کے، صاف اور سادہ زبان میں اس طرح منتقل کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اسے سمجھنے میں کسی طرح کی الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے اور معلومات اس تک اپنے اصل مفہوم کے ساتھ پہنچیں۔اس طرح کے تراجم خصوصاً سائنسی کتب کے تراجم کو زیادہ مشکل کام نہیں سمجھا جاتا۔مترجم کے لیے بنیادی مسئلہ صرف اصطلاحات (Terms) کے ترجمے کا ہوتا ہے۔اگر اس کی زبان میں مختلف علوم کی اصطلاحات پہلے سے موجود ہیں تو پھر یہ کام آسان ہو جاتا ہے۔البتہ بشری علوم یا سماجی علوم کے ترجمے نسبتاً مشکل ہوتے ہیں کیونکہ مترجم کو مختلف علوم سے متعلق اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ نظریات کو بھی منتقل کرنا پڑتا ہے جو ذرا پیچیدہ کام ہے۔بشری علوم میں سب سے زیادہ مشکل کام فلسفیانہ کتب کے ترجمے کا ہے کیونکہ فلسفہ اشیاء کی معلومات فراہم نہیں کرتا بلکہ یہ اشیاء کے بارے میں تصورات اور نظریات پیش کرتا ہے۔یہ تصورات اتنے پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہوتے ہیں کہ اکثر و بیشتر زبان ساتھ نہیں دے پاتی۔اس کے لیے مترجم کو ہر اصطلاح اور تصور کی تعریف نپے تلے لفظوں میں طے کرنا ہوتی ہے۔

ترجمے کی دوسری ضرورت تہذیبی ہے، یعنی کسی معاشرے اور اس کی تہذیب کو سمجھنے کے لیے لوگ اس سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بھی ترجمے کا سہارا لیا جاتا ہے۔اس ضمن میں افسانوی ادب اور ناولوں کا ترجمہ آتا ہے کیونکہ ناول اور افسانے انسانی معاشرے اور تہذیب کی بھرپور عکاسی اور نمائندگی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ سماجی اور تہذیبی علوم سے متعلق ایسی کتابوں کے ترجمے کو بھی اسی دائرے میں رکھا جا سکتا ہے جن میں مختلف تہذیبوں اور تہذیبی مظاہر کا تفصیلی مطالعہ یا مشاہدہ کیا گیا ہو۔اس طرح کے تراجم میں ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ایسا عین ممکن ہے کہ کسی لسانی آبادی میں مستعمل کسی ایک لفظ سے یا پیرایۂ اظہار سے جو مخصوص تصورات وابستہ ہیں، دوسری تہذیب کے لوگوں کے لیے وہ تصورات ہی بے معنی ہوں۔اس طرح کی صورتِ حال پیش آنے پر لفظی ترجمہ اپنے مقصد میں پوری طرح ناکام ہو جائے گا۔اس کی ایک اچھی مثال پریم چند کے افسانے 'شطرنج کے کھلاڑی' سے دی جا سکتی ہے۔اس افسانے کی ایک کردار ایک بیگم صاحبہ ہیں جو مردانے میں بار بار اپنے شوہر کے پاس یہ پیغام بھیجتی ہیں کہ ان کی طبیعت ناساز ہے اور وہ ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتی ہیں۔ان کے شوہر جو بیٹھک میں دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں محو ہیں، ان کی بات پر کان نہیں دھرتے۔تنگ آ کر بیگم صاحبہ خبر بھیجتی ہیں کہ اب اگر ان کی بات نہیں سنی گئی تو وہ اکیلی ہی ڈاکٹر کے یہاں چلی جائیں گی۔بظاہر یہ بڑی عام سی بات ہے۔اس واقعے کو اگر کوئی بھی ایسا شخص پڑھے گا جو ہندوستانی معاشرے کے ایک مخصوص دور کے ایک مخصوص کلچر سے واقف نہیں ہے تو وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتا کہ جاگیردارانہ یا زمین دارانہ معاشرے میں ایک اعلیٰ طبقے کی عورت کا تنہا گھر سے باہر نکلنے کی بات تک سوچنا حد درجہ معیوب سمجھا جاتا ہے، اور اُسے بیگم صاحبہ کی اس بظاہر سادہ سی بات کو دراصل اعلانِ بغاوت سے تعبیر کرنا چاہیے۔

ترجمے کا تیسرا مقصد جمالیاتی احساس کی تسکین یا جمالیاتی انبساط ہے۔یعنی انسان کے احساسِ جمال کی تسکین کے لیے فنون (جن کو فنون لطیفہ یا فائن آرٹس بھی کہا جاتا ہے) کی تفہیم۔ظاہر ہے کہ فنون لطیفہ میں صرف شاعری ایسی چیز ہے جس کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے — مصوری، موسیقی، مجسمہ سازی اور فنِ تعمیر کی تفہیم کے لیے کسی مخصوص زبان کو جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔شاعری کا ترجمہ غالباً سب سے دشوار کام ہے کیونکہ شاعری تصورات کا ایک ایسا علامتی نظام ہوتی ہے جس میں بات کے لفظی اور سطحی معنی نہیں ہوتے بلکہ لفظوں کے آپسی تعلق کی رعایت سے تہذیبی تصورات اور افکار کو علامتی انداز میں یا رمز و ایمائیت کے وسیلے سے کہا جاتا ہے۔اس طرح بات کو براہِ راست کہنے کے بجائے بالواسطہ کہا جاتا ہے۔علامتوں، پیچیدہ استعاروں، رمز و کنایے اور صنعتوں کے نظام کی مدد سے قاری مفہوم تک پہنچتا ہے اور مفہوم تک پہنچنے کے اس عمل میں وہ ایک خاص مسرت اور انبساط سے گزرتا ہے۔اس سے ایک خاص طرح کی نفسیاتی کیفیت اور فضا کی تعمیر ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس انتہائی پیچیدہ عمل کو ایک دوسرے لسانی اور تہذیبی ڈھانچے میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔اس کے باوجود ہر دور میں شاعری کے ترجمے کی اچھی کوششیں ہوئی ہیں۔

شاعری کا ترجمہ کرنے کے لیے دونوں زبانوں پر ماہرانہ گرفت ضروری ہے۔اس کے علاوہ ان زبانوں سے وابستہ تہذیب، طرزِ زندگی اور تہذیبی علامتوں اور تصورات سے واقفیت بھی لازمی ہے۔ترجمہ کی جانے والی کتاب کے عہد اور اس دور کی تاریخ اور لسانی صورتِ حال وغیرہ سے واقف ہونا بھی کبھی کبھی مترجم کے لیے لازمی شرط ہوتی ہے۔لیکن اس پر مترجم کے شعری ذوق، اس کی فہم و علم، زبان پر اس کی مہارت وغیرہ کو فوقیت حاصل ہے۔ان

بنیادی شرائط کو پورا نہ کرنے والے شخص کو شاعری کا ترجمہ کرنے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ پھر بھی ضروری نہیں کہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اور انتہائی احتیاط کے ساتھ ترجمہ کرنے کے باوجود مترجم شعری شاہکار کی تمام تر خوبیوں کو ترجمے والی زبان میں منتقل کر سکے۔ سنسکرت شعریات کے ماہرین نے لفظ کے معنی کی سات نوعیتیں یا سطحیں بیان کی ہیں۔ یہ نوعیتیں ظاہر ہے کہ ایک مخصوص فکری نظام اور تہذیب کی عکاس ہوتی ہیں۔ اب جب ہم شاعری کا ترجمہ کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کے ساتھ تبھی انصاف کر سکیں گے، جب تہذیبی اور فکری نظام کو بھی منتقل کر سکیں کیوں کہ اس کے بغیر اس مخصوص انبساط و کیفیت تک نہیں پہنچا جا سکتا جس کا حصول شعر فہمی کا مقصد ہے۔ اسی لیے شاعری کا ترجمہ سب سے دشوار کام بتایا گیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترجمے کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟
2. شاعری کا ترجمہ کرنا کیوں ناممکن سمجھا جاتا ہے؟

7.4 مترجم کی ذمے داریاں

مترجم کو دو زبانوں اور دو قوموں کے درمیان لسانی اور ثقافتی سفیر کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ دو قوموں اور تہذیبوں کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے اور انھیں ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ اس اہم ذمے داری کے حامل شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ ترجمے کی بنیادی شرطوں سے واقف ہو، تبھی وہ اپنا کام ایمانداری سے انجام دے سکے گا۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ اصل تصنیف کی زبان، اس کے ادب اور قومی تہذیب سے اچھی طرح واقف ہو۔ اگر وہ کسی کلاسکی کتاب یا پھر کسی مخصوص عہد کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو پھر اس دور کی تاریخ، لسانی رویّوں، لفظوں کے معنیاتی نظام اور سماجی صورت حال سے بھی واقف ہو، تاکہ اس فن پارے میں پیش کیے گئے عہد کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس زبان پر بھی مکمل قدرت رکھتا ہو، جس میں وہ ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ نئے یا اجنبی تہذیب کے خیالات کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ منتخب کر سکے، اور ضرورت پڑنے پر نئے الفاظ، نئی اصطلاحیں اور تراکیب وضع کر سکے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں کے قواعد اور ان کی باریکیوں اور تہہ داریوں سے بہ خوبی واقف ہو۔ ان سب کے علاوہ اہم ترین شرط خود مترجم کی دلچسپی اور شوق و انہماک ہے۔ اگر وہ اس فن پارے اور اس کی زبان میں دلچسپی نہیں رکھتا تو پھر مشینی ڈھنگ سے ترجمہ کر کے وہ ترجمے کا حق ادا نہ کر سکے گا۔ مترجم کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے۔ یعنی اس کا کام اصل تصنیف کے ترجمے تک محدود ہے، تشریح و توضیح، تحریف و تخفیف اور حذف و اضافہ کرنا اس کا کام نہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے لکھا تھا کہ ترجمے کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش کسی بھی طرح اچھی بات نہیں ہے، اسے قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ مترجم کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ تصنیف کی فنی اور معنوی اہمیت کے پیش نظر اسے ترجمے کی زبان میں پوری ایمانداری سے منتقل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ کام کبھی کبھی طبع زاد تخلیق سے بھی زیادہ نازک، پیچیدہ اور ذمے داری کا ہوتا ہے۔

7.4.1 آزاد اور لفظی ترجمے کا مسئلہ

دونوں ہی کا مقصد اصل تخلیق کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا ہے کہ معنوی اور ظاہری ہیئت میں وحدت قائم رہے۔ آزاد ترجمے میں اصل تصنیف کے تخلیقی اور جمالیاتی عناصر پر زور دیا جاتا ہے اور لفظی ترجمے میں معنی کو منتقل کرنے پر۔ لفظی ترجمے میں دیانت دارانہ منتقلی کو ترجیح دی جاتی ہے، جب کہ آزاد ترجمہ کرنے والوں کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے ترجمے کو تخلیقی بازآفرینی کا عمل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ اصل تصنیف سے پیدا ہونے والے تاثرات میں اس طرح ڈوب جائے کہ وہ اس کا اپنا تجربہ معلوم ہوں۔ پھر وہ تخیل کی مدد سے اپنے تاثرات کو اپنی ہی زبان کے ایسے پیکر میں ڈھالے کہ اس کی زبان کے قارئین بھی اس کے اثرات سے اسی طرح محظوظ ہوں جس طرح وہ خود ہوا تھا۔ اس نظریے کی خامیاں بیان کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں:

ظاہر ہے کہ زمان و مکان کے مختلف نقطوں سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد پر اصل اثرات بھی مختلف ہوں گے۔ ہر

مترجم اپنے مخصوص تجربات اور اپنی ذہنی اور جذباتی افتاد کے آئینے میں ہی اصل تخلیق کے تاثرات قبول کرے گا اور پھر ان کی تخلیقی صورت گری میں اس کے تخیل کی منفرد کائنات اثر انداز ہوگی۔ اس طرح وہ ترجمے کے نام پر جو کچھ پیش کرے گا ضروری نہیں کہ وہ اصل تخلیق سے مطابقت رکھتا ہو۔

(ترجمہ: فن اور روایت۔ ص ص 17-16)

7.4.2 معتدل رویّہ:

اب سوال یہ ہے کہ مترجم آزاد ترجمہ کرے یا پھر لفظی ترجمے کا پابند ہو؟ دراصل اس کا کوئی سخت اصول طے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کوئی قید اچھے ترجمے کی راہیں محدود و مسدود کرتا ہے کیوں کہ ترجمے کا مقصد مفہوم اور لطفِ بیان کی ادائیگی ہے۔ اس لیے اگر یہ نکات منتقل نہیں ہوتے تو مترجم اپنے مقصد میں ناکام رہے گا۔ ظ۔ انصاری اپنے مضمون ''ترجمے کے بنیادی مسائل'' میں لکھتے ہیں:

ترجمے میں مصنف کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل کرنا دراصل ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ مقصد تو مفہوم اور لطفِ بیان کی ادائیگی ہے۔ اگر الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا، یا اسی وصف کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو کثر لوگوں کا ایک الزام سہہ کر اصل کے الفاظ، ان کی تقدیم و تاخیر، ان کے جوڑ اور جملوں کی ساخت کو بدل کر یہ مقصد پورا کرنا ہوگا۔ یہی ترجمے کا مقصود ہے۔ اور اسی مقصود کی تعمیلِ خاص اس فن کی دیانت داری ہے۔

(ترجمہ: فن اور روایت۔ ص 115)

دراصل ترجمہ ایک فن ہے جو دوسرے فنون، مثلاً موسیقی، گائیکی اور شاعری کی طرح تربیت اور ریاض چاہتا ہے، بس فرق صرف یہ ہے کہ گائیکی اور موسیقی کے مقابلے اس میں ریاض مستقل طور پر نہیں کرنا ہوتا یا کم کرنا ہوتا ہے۔ ایک بار یہ گرفت میں آجائے تو مترجم کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترجمے کی بنیادی شرائط کون کون سی ہیں؟
2. لفظی اور آزاد ترجمے میں کیا فرق ہوتا ہے؟
3. کس قسم کی کتابوں کا لفظی اور کس قسم کی کتابوں کا آزاد ترجمہ کرنا مناسب رہتا ہے؟

7.5 اردو میں ترجمے کی روایت

ترجمے کی اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ بادشاہوں اور جاگیرداروں کے زمانے میں ترجموں کی سرپرستی کا کام اِسی اعلیٰ طبقے کے لوگ کرتے تھے۔ دور دور سے مختلف زبانوں اور علوم کے ماہرین بلائے جاتے اور کتابیں ترجمہ کرائی جاتی تھیں۔ عہد قدیم کے ہندوستان میں اشوک کے زمانے میں دارالترجمہ قایم کیا گیا تھا۔ اکبر کے عہد میں آگرے میں، نظام کے دور میں حیدرآباد میں اور انگریزوں کے وقت میں فورٹ ولیم کالج میں مختلف زبانوں سے ترجمے کیے گئے جس کی وجہ سے ادب اور تہذیب و تاریخ کا علم فارسی اور اردو میں منتقل ہوا۔ اردو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو باقاعدہ ادبی اظہار کی زبان بنانے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ابتدائی دور میں اسے کوئی ادبی اظہار کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس زبان میں ترجمے ان معنوں میں شروع ہوئے کہ خیال اور نفسِ مضمون کو منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ تصورات اور لفظوں کا استعاراتی اور معنیاتی نظام بھی فارسی اور عربی زبانوں سے اردو میں لے لیا گیا اور اس طرح اس کا اپنا ادبی پیرایۂ اظہار صرف ایک صدی کے عرصے میں وجود میں آگیا۔ یہ کام ترجمہ کرنے کی غرض سے شروع نہیں کیا گیا تھا بلکہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی ایک زبان کی یہ ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ثروت مند اور قوی زبان اس کو سہارا دے تاکہ یہ بھی اپنے پیروں پر چلنا سیکھ سکے۔ اس لیے ہر زبان کے ابتدائی ادب میں زیادہ تخلیقات ایسی ہی ملیں گی جو دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان میں شیکسپیئر کو بطور

ڈراما نگار اور شاعر جو شہرت حاصل ہے وہ دنیا کی کسی زبان کے کسی ادیب کو میسر نہیں، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ شیکسپیئر کے تمام ڈرامے اپنے دور کی کلاسیکی زبانوں کے شاہکاروں سے ماخوذ ہیں۔ اردو کے معاملے میں بھی یہ ہوا کہ اس کے ارتقا کے ابتدائی دور میں فارسی اپنے عروج پر تھی، یہی ادبی اظہار کی زبان بھی تھی، اسی لیے اردو کے شاعروں نے سب سے زیادہ استفادہ بھی اسی سے کیا۔

اس طرح ہم دیکھیں گے کہ اردو میں ترجمے کی روایت ابتدائی دور ہی سے پڑ گئی تھی، گو کہ اس کو ترجمے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً اردو شاعری کو ہی لیجیے، ابتدائی دور کی اردو شاعری یعنی اٹھارہویں صدی کی شاعری کے موضوعات، مفاہیم، شاعرانہ تصورات، تراکیب اور استعاراتی نظام تمام کا تمام فارسی شاعری سے مستعار نظر آتا ہے۔ اکثر و بیشتر ایسے اشعار ملتے ہیں جو فارسی اشعار کا اردو ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ شعری اصناف بھی منتقل ہو گئی ہیں۔ نثری کتب میں بھی اردو کی کلاسیکی نثر کی بیش تر کتابیں فارسی اور سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ ملا وجہی کی 'سب رس'، فضلی کی 'کربل کتھا' عطا حسین خاں تحسین کی 'نوطرزِ مرصع'، میر امن کی 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' اور حیدر بخش حیدری کی 'آرائش محفل' کے علاوہ بے شمار داستانیں ایسی ہیں جو ترجمہ سمجھی جاتی ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ یہ ترجمہ کس نوعیت کا ہے، اس کے پیچھے ترجمے کے کچھ اصول اور ضابطے ملحوظ رکھے گئے ہیں یا نہیں اور ترجمہ نگار نے کہاں تک اصل تخلیق کے ساتھ دیانت داری برتی ہے؛ کیا صرف نفس مضمون لیا گیا ہے یا تہذیبی اور ثقافتی فضا کو بھی منتقل کیا گیا ہے؛ اصل متن کس حد تک منتقل ہوا ہے۔ اگر آزاد ترجمہ ہے تو اس کے کیا اصول ہیں، وغیرہ۔

ان تمام سوالات کی روشنی میں ان تالیفات پر سوالیہ نشان تو لگایا جا سکتا ہے لیکن ہمیں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ آج ترجمے کے جن اصول وضوابط کی ہم بات کرتے ہیں وہ ایک دن میں مرتب نہیں ہو گئے بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت یہ اصول بنے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اردو کو ایک جدید زبان بنانے، اس میں ادب کی روایت کو مستحکم کرنے اور زبان کو وسعت دینے میں ان تالیفات و تراجم نے اہم رول ادا کیا ہے۔ یوروپی، خصوصاً انگریزی اور روسی ادب کے تراجم کے ذریعے اردو پر ایک ترقی یافتہ دنیا کے، اس کی معاشرت اور تمدن کے، اور اس کے فکری نظام اور علوم کے نئے باب کھلے۔ نئے علوم اور نئے تصورات کو جگہ دینے کے لیے اردو میں نئی اصطلاحیں اور تراکیب وضع کی جاتی رہیں۔ درسی کتب، قانون، مذہب، فلسفے، سائنس، سیاسیات اور سماجی علوم کی کتب کے ترجموں کے سبب نئی نئی اصطلاحات رائج اور مقبول ہوئیں، اور ان سے اردو کا دامن وسیع ہوا۔

دوسرا اہم میدان جہاں ترجموں کا باقاعدہ آغاز ہوا وہ مذہب تھا۔ مشنری اداروں نے مذہبی تبلیغ کے پیش نظر مذہبی کتب کے ترجمے کا کام اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہی شروع کر دیا تھا۔ پادری بنجمن شلز نے 1748ء میں انجیل کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کے علاوہ قرآن، احادیث اور اسلام سے متعلق عربی اور فارسی کتب کے تراجم کا ایک بڑا ذخیرہ بھی اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں جمع ہو گیا۔ فضلی نے اپنی کتاب کربل کتھا 1732ء میں مرتب کی اور ۱۷۴۸ء میں اس میں ترمیم کی۔ ملا واعظ حسین کاشفی کی مشہورِ زمانہ فارسی کتاب روضۃ الشہدا محرم کی مجلسوں میں پڑھی جاتی تھی لیکن فارسی میں ہونے کے سبب عام لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے تھے، اسی لیے فضلی نے اسے 'کربل کتھا' کے عنوان سے اردو میں منتقل کیا۔ اٹھارہویں صدی کے خاتمے سے کچھ پہلے دلّی میں قرآن شریف کے دو ترجمے ہوئے۔ یہ ترجمے مشہور بزرگ اور عالم شاہ ولی اللہ دہلوی کے بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے کیے۔ شاہ رفیع الدین نے قرآن کا ترجمہ 1786ء میں اور شاہ عبدالقادر نے 1790ء میں کیا۔

اس دور میں مذہبی کتب کے تراجم کے علاوہ ایک اہم ادبی ترجمہ نوطرزِ مرصع ہے۔ یہ ایک فارسی داستان قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے جسے میر عطا حسین خاں نے کیا تھا۔ 'نوطرزِ مرصع' کا اسلوب مقفیٰ، رنگین اور مشکل ہے۔ فارسی اور عربی زبان کے مشکل الفاظ اس میں شامل ہیں، اور صنائع کا استعمال اس میں اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ عام بول چال کی اردو جاننے والا کوئی شخص اسے نہیں سمجھ سکتا۔ اس دور میں دیگر علوم کی کتابوں کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔ سید احتشام حسین نے 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' میں تاریخ کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جو ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کتاب میں تیمور کی ہندوستان پر چڑھائی سے لے کر 1780ء تک کے واقعات کا ذکر ہے۔ احتشام حسین کا خیال ہے کہ مصنف نے پہلے کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ کیا اور پھر اپنی طرف سے انگریزوں اور حیدر علی کی جنگِ میسور کی کہانی اس میں جوڑ دی۔ اسی طرح ایک اور کتاب بہادر نامہ لکھی گئی جس میں سری رنگا پٹنم کی تاریخ ٹیپو سلطان کے عہد تک بیان کی گئی ہے۔ یہ 1798ء کی تصنیف ہے اور اندازہ ہے کہ یہ بھی کسی فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

7.5.1 فورٹ ولیم کالج

انگریز ملازموں کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے ۴ رمئی ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اس میں ہندوستانی زبان کے شعبے کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کے بندوبست کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا ایک شعبہ بھی کھولا اور کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک دارالاشاعت قائم کیا۔ یہیں میر امن نے 'نوطرز مرصع' کا تتبع کرتے ہوئے باغ و بہار کی تالیف کی اور فارسی کی ایک مشہور کتاب 'اخلاق محسنی' کا ترجمہ 'گنج خوبی' کے عنوان سے کیا۔ سید حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی، آرائش محفل اور گلِ مغفرت لکھی جو درحقیقت مختلف کتابوں کے ترجمے اور خلاصے ہیں۔ 1801ء میں لکھی گئی 'طوطا کہانی' میں محمد قادری کی 'طوطی نامہ' کو آسان بول چال کی مروجہ زبان میں لکھ دیا گیا ہے۔ یہ سنسکرت کی ایک پرانی کتاب پر مبنی ہے۔ 'آرائش محفل' حاتم طائی کے فارسی قصے کا ترجمہ وخلاصہ ہے۔ ملا واعظ کاشفی کی 'کتاب روضۃ الشہداء' کا ترجمہ حیدری نے 'گل مغفرت' کے عنوان سے کیا۔ فارسی کی اس کتاب کا ترجمہ ان سے قبل فضلی نے 'کربل کتھا' کے عنوان سے کر دیا تھا۔ میر شیر علی افسوس نے فورٹ ولیم کالج میں 'گلستان سعدی' کا ترجمہ 'باغ اردو' کے نام سے کیا۔ ان کی دوسری کتاب منشی سبحان رائے کی 'خلاصۃ التواریخ' کا ترجمہ ہے، جو انھوں نے آرائش محفل کے عنوان سے کیا۔ میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مشہور مثنوی سحر البیان کو نثر میں لکھا اور اسے نثر بے نظیر کے عنوان سے شائع کیا۔ اخلاق ہندی کے قصے سنسکرت کی کہانیوں پر مبنی ہیں جو اردو میں انھوں نے فارسی سے منتقل کیے۔ انھوں نے تاریخ آسام کا بھی فارسی زبان سے ترجمہ کیا۔ یہیں مظہر علی خاں ولا نے کئی مشہور کتابیں تالیف کیں جو سب کی سب برج اور فارسی زبان سے لی گئی ہیں۔ یہ ہیں — مادھونل، کام کنڈلا، بیتال پچیسی اور تاریخ شیر شاہی۔ مرزا کاظم علی جواں نے کالی داس کی ابھیگیان شکنتلم کا اردو میں ترجمہ برج بھاشا کی مدد سے کیا اور شکنتلا ناٹک عنوان رکھا۔ نہال چند لاہوری نے عزت اللہ بنگالی کے قصۂ گل بکاؤلی کو اردو میں منتقل کیا اور اس کا نام مذہب عشق رکھا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور کئی بار شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ مولوی اکرام علی، بینی نرائن جہاں، مولوی امانت اللہ شیدا، مرزا جان طپش اور مرزا محمد فطرت وغیرہ نے بھی فورٹ ولیم کالج میں اہم تراجم کیے۔

فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی ترجموں کا کام ہو رہا تھا۔ میر کے ایک رشتے دار محمد حسین کلیم نے تصوف کی ایک مستند کتاب فصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ انوار سہیلی کا ترجمہ بستان حکمت کے نام سے فقیر محمد خاں گویا نے 1838ء میں کیا۔ اس میں پنچ تنتر اور ہتوپدیش کی کہانیاں ہیں۔ ان کے چند سال بعد ہیم چند کھتری نے فارسی کی ایک کہانی کا ترجمہ قصۂ گل وصنوبر کے نام سے کیا۔ اس زمانے میں ترجمے کا کام تیزی سے کیا جا رہا تھا، لیکن طباعت کی سہولتیں میسر نہ تھیں۔ اس لیے اندازہ ہے کہ بہت سے تراجم ضائع ہو گئے ہوں گے۔

7.5.2 ورنا کلرٹرانسلیشن سوسائٹی

ورنا کلر سوسائٹی کا قیام دہلی کالج میں اردو ذریعۂ تعلیم کے تدریسی مواد یا نصاب کی ضرورت کی وجہ سے عمل میں آیا۔ یہ سوسائٹی 1842ء میں قائم ہوئی اور غدر سے پہلے اس نے گیارہ کتابیں ترجمے اور تصنیف وتالیف کے ذریعے تیار کر لی تھیں۔ اس سوسائٹی نے ریاضی، سائنس، نجوم، منطق اور فلسفے کو اپنے ترجموں کے منصوبوں میں شامل کیا۔ زیادہ تر ترجمے انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت زبانوں سے کرائے گئے۔ ان تراجم کی بدولت اردو کے طالب علموں نے مغربی علوم وفلسفے سے براہ راست واقفیت حاصل کی۔ مادری زبان میں تعلیم دینے کا یہ تجربہ اتنا کامیاب ہوا کہ ریاضی، نیچرل سائنس، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ کے شعبوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کے طالب علم انگریزی والوں پر سبقت لے جانے لگے تھے۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، علم کیمیا، نباتات، علم جراحی، علم تمدن، علم معاشرت وغیرہ پر ان طالب علموں کے لیے اردو میں کتابیں فراہم نہیں تھیں۔ ان کی ضرورت کے پیش نظر ایک اشاعتی انجمن قائم کی گئی جس کا کام ملکی زبانوں میں ان علوم کی کتابیں شائع کرنا تھا۔ ان لوگوں میں جنھوں نے ورنا کلرٹرانسلیشن کو فروغ دینے میں بڑی کوششیں کیں، مسٹر فلکس بترو (Boutros) ڈاکٹر اشپرنگر (Alios Sprenger)، منشی کریم الدین، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرساد، پیارے لال آشوب، ہردیو سنگھ اور ڈاکٹر ضیاء الدین قابل ذکر ہیں۔ ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی اس انجمن کے روح رواں تھے۔ اس ادارے کی کامیابیوں سے حوصلہ پا کر آگرہ اور لکھنؤ میں بھی اس قسم کی کتابیں شائع کرنے کے ادارے قائم کیے گیے۔ اس سوسائٹی نے جو کتابیں ترجمہ کروا کے شائع کیں ان میں سے چند یہ ہیں — رامائن، مہابھارت، لیلاوتی، دھرم شاستر، شکنتلا اور رگھونش، تاریخ انگلستان، تاریخ یونان، تاریخ روم، رسالۂ اصول

حساب، مبادیات تفرقی احصاء و تکمیلی احصاء، روشنی کا انعکاس اور اجتماع شعاع، تجرباتی جیومیٹری، ہائڈرواسٹیٹک، حرارت اور برقیات وغیرہ۔

اس ادارے نے ترجمے کے اصول اور قواعد وضوابط بھی مقرر کیے تھے۔ زبان کو سادہ اور کارآمد بنانے کا جو کام فورٹ ولیم کالج میں شروع ہوا تھا وہ دہلی کالج میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ دہلی کالج میں فروغ پانے والی نثر دراصل فورٹ ولیم کالج اور سرسید کے زیر اثر وجود میں آنے والی نثر کے درمیان کی کڑی ہے۔

7.5.3 سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد 1864ء میں غازی پور میں پڑی۔ بعد میں اس کا دفتر سرسید کے تبادلے کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہوگیا۔ اس ادارے کا بڑا کارنامہ اردو میں انگریزی کتابوں کے ترجمے کر کے نئی فکر اور نئے علوم سے قوم کو روشناس کرانا تھا۔ ہندوستانی زبانوں میں نئے علوم کا ترجمہ کرنا ویسے بھی سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ سوسائٹی نے پچاسوں کتابوں کی فہرست تیار کر کے ترجموں کے لیے منظور کی لیکن اس کے تمام منصوبے پورے نہ ہو سکے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں، لیکن ڈاکٹر اصغر عباس نے تحقیق کر کے اپنے مضمون 'سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم' میں یہ لکھا ہے کہ اس سوسائٹی نے صرف پندرہ کتابیں شائع کیں جن میں سے ہمیں گیارہ دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں ہیں — مصر کی قدیم تاریخ، تاریخ چین، یونان کی قدیم تاریخ حصہ اول، دوم اور سوم۔ رسالۂ علم فلاحت جس میں فرنگستان کے طرز پر کاشتکاری کے فن کا بیان ہے، رسالۂ انتظام مدن، تاریخ ہندوستان، رسالۂ علم برقی، اصول سیاست مدن اور تاریخ ایران حصہ اول۔ جو کتابیں سوسائٹی نے چھاپیں لیکن دستیاب نہیں ہیں، یہ ہیں — رسالۂ علم جغرافیہ حصہ اول تا چہارم، رسالہ جر ثقیل اور رسالہ مسائل معادلات۔ ترجموں کی اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی نے تاریخ کے تراجم میں زیادہ دلچسپی لی۔ ان کتابوں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ حواشی کی مدد سے متن کے اشارات اور اصطلاحات کی وضاحت کی جاتی تھی۔ یہ ترجمے سلیس اور سادہ زبان میں ہیں۔

7.5.4 دارالترجمہ عثمانیہ

26 اپریل 1917ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی کارروائی شروع کرنے کا فرمان جاری ہوا۔ 1919 میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور یہ طے پایا کہ اس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ کے نصاب کے لیے اردو میں کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ سامنے تھا اس لیے یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی ترجموں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ مختلف سائنسی اور جدید علوم کی کتابوں کے لیے اردو اصطلاحات کا مسئلہ بھی درپیش تھا، اس لیے یونیورسٹی کے قیام سے دو سال پہلے، یعنی 14 اگست 1917ء کو دارالترجمہ قائم کرنے کا فرمان جاری ہوا اور یکم ستمبر 1917ء کو مولوی عبدالحق کی نظامت میں شعبۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا اور کام کرنا شروع کیا۔ نصاب اور ترجمے کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کئی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ مثلاً وضع اصطلاحات کی کمیٹی، اہل علم وفن کی کمیٹی، انتخابات نصابات کی کمیٹی، نظر ثانی کمیٹی اور مذہبی اور ادبی نقطہ ہائے نظر سے ترجموں کو دیکھنے والی کمیٹیاں وغیرہ۔ اس دارالترجمے کے ناظم مولوی عبدالحق تھے۔ چند ممتاز مترجمین جو اس ادارے سے وابستہ رہے، یہ ہیں — پروفیسر ہارون خاں شیروانی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، حکیم کبیر الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، سید ابوالخیر مودودی، عبدالمجید صدیقی، سید عبدالباری ندوی اور مرزا لبیب وغیرہ۔

دارالترجمے میں پہلے ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لیے کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آنے کے بعد بھی ڈگری کورسوں مثلاً قانون، سوشیالوجی، طب یونانی، میڈیسین، انجینیرنگ، ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ دارالترجمہ نے 1917ء سے 1948ء تک مسلسل کام کیا۔ 1950ء میں جب یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم انگریزی کو قرار دے دیا گیا تو پھر دارالترجمہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کتابوں کے ترجموں کے علاوہ دارالترجمہ میں اہم ترین کام وضع اصطلاحات کا ہوا۔ یہاں اصطلاحات کو وضع کرنے کے لیے باقاعدہ اصول مقرر کیے گئے۔

کچھ اور بھی ایسے ادارے ہیں جنھوں نے سائنسی، طبی اور علمی کتابوں کے تراجم کے گراں قدر کام انجام دیے۔ کشمیر میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دارالترجمہ اسی قسم کا ایک ادارہ ہے۔ اس ادارے نے زیادہ تر طبی کتابوں کے تراجم کرائے۔ حیدرآباد میں نواب فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی نے سائنسی

علوم کے انگریزی رسائل کے ترجموں کا کام دہلی کی ورنا کلر سوسائٹی کے قیام سے تین سال قبل شروع کر دیا تھا۔اسی طرح حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے ہی بہت سے اداروں نے ترجمے کا کام سنبھال لیا تھا اور اس طرح یونیورسٹی میں اردو ذریعۂ تعلیم کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ 40-1839ء میں انھوں نے ہیئت، ریاضیات اور دیگر علوم پر چھے کتابیں شائع کرائیں۔تقریباً انھیں کے زمانے میں اودھ کے نواب محمد علی شاہ کمال حیدر بھی مغربی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرا رہے تھے۔انھوں نے کوئی بارہ رسالوں کا ترجمہ کرایا جن کے موضوعات ہیئت، علم الہوا، علم المناظر، حرارت، طبعیات، آلات ریاضی، قوت مقناطیس اور کیمیا وغیرہ سے متعلق تھے۔بیسویں صدی کے آغاز میں انجمن ترقی اردو نے، جس کی بنیاد 1930ء میں پڑی تھی، ترجمے اور اصطلاحات سازی کو بہت اہمیت دی۔

ان تمام اداروں کے علاوہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، ترقی اردو بورڈ دہلی، ساہتیہ اکیڈمی دہلی، اردو اکیڈمی دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی وغیرہ نے بھی مغربی علوم اور ادب کے مستند اور معیاری ترجمے شائع کیے۔آج بھی بہت سے ادارے، اکیڈمیاں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مختلف علوم و ادبیات کے ترجمے کرانے میں پیش پیش ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ان اداروں کے نام لکھیے، جنھوں نے ترجمے کو اپنا بنیادی مقصد بنایا؟
2. ان اداروں نے کس قسم کی کتابوں کے ترجموں کو ترجیح دی؟
3. ان اداروں سے شائع ہونے والی کچھ اہم کتابوں اور ان کے مترجموں کے نام لکھیے۔

7.6 ترجمے کے دیگر شعبے

اب تک ہم نے جس قسم کے تراجم کے بارے میں بات کی ہے انھیں دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔پہلے حصے میں وہ تراجم آتے ہیں جو اردو زبان کے ارتقاء کے ابتدائی دور میں سامنے آئے۔ان میں مذہبی کتب، تمثیلیں، داستانیں، تاریخیں اور شاعری کے آزاد تراجم شامل ہیں یا پھر وہ ماخوذ کتب جنھیں کسی تخلیق کے نفس مضمون کو لے کر اردو میں اسی صنف ادب یا پھر کسی دوسری صنف میں منتقل کر دیا گیا۔

دوسری طرح کے ترجمے وہ ہیں جو مختلف اداروں یا افراد نے کسی خاص مقصد کو ذہن میں رکھ کر کرائے یا کیے۔ان کا بنیادی مقصد اردو جاننے والوں تک مختلف علوم کو پہنچانا تھا۔ان دونوں طرح کے تراجم میں ادب کی تمام اصناف کا احاطہ نہ ہو سکا۔خصوصاً افسانوی ادب کے تراجم کا کوئی باقاعدہ خاکہ نہیں ابھرتا اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ادب کے ترجموں کی طرف خاصی کم توجہ دی گئی۔لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے دوران انگریزی اور روسی ادب کے علاوہ کئی دوسری زبانوں کے ادب سے اردو میں کامیاب ترجمے ہوئے ہیں۔البتہ بچوں کے ادب کا شعبہ ایک ایسا شعبہ ہے جو تراجم کے معاملے میں بھی نادار ہی ہے۔آسانی کے خیال سے اب ہم مذہبی تراجم، ادب اور بچوں کے ادب کا الگ الگ جائزہ لیں گے۔

7.6.1 مذہبی لٹریچر کے تراجم

اردو کے ارتقائی دور میں ترجموں کا سب سے وقیع سرمایہ مذہبی کتب کے تراجم پر مشتمل ہے۔یہ سلسلہ صوفیاء کے احوال و کوائف سے متعلق سیکڑوں رسالوں کی اشاعت و تبلیغ سے شروع ہوا۔پادری بنجمن شلز 1748 میں انجیل مقدس کا اردو میں ترجمہ کر چکے تھے۔شمالی ہند میں فضلی کی 'کربل کتھا'، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم قرآن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، جن کو اردو کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔یہ تراجم بالترتیب 1748، 1786 اور 1790 میں ہوئے۔اردو میں قرآن کے سیکڑوں تراجم ہو چکے ہیں۔پروفیسر عبدالحق اپنے مضمون ''مذہبی تصانیف کے اردو تراجم'' میں لکھتے ہیں کہ ماہر علوم قرآنی ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق قرآن کے اردو میں تقریباً نوے ترجمے ہوئے ہیں۔ڈاکٹر محمد مسعود نے مترجمین و مفسرین قرآن کی تعداد ایک سو پچپن لکھی ہے۔قرآن کے مترجمین کے چند اہم نام یہ ہیں — شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا اشرف علی

تھانوی، ابوالاعلیٰ مودودی، عبدالماجد دریابادی، احمد رضا خاں بریلوی اور احمد سعید خاں دہلوی۔ قرآن کی چند اہم تفسیروں کے اردو تراجم بھی ملتے ہیں۔ تفسیر ابنِ کثیر کے دو ترجمے ہوئے ہیں۔ آزادی سے قبل تفسیرِ محمدی کے عنوان سے محمد عمر جونا گڑھی نے اور آزادی کے بعد انظر شاہ کشمیری نے کیا ہے۔ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن بھی بے حد پڑھی جانے والی تفاسیر میں سے ہے۔ اردو کی قدیم ترین منظوم تفسیر شیخ بہاء الدین باجن کی ہے جو مکمل نہیں ہو سکی۔ پروفیسر عبدالحق نے قرآن کے تراجم اور تفسیروں کی ایک لمبی فہرست اپنے مذکورہ مضمون میں شامل کی ہے۔

قرآن کے بعد اسلامی ادب میں سب سے زیادہ ترجمہ حدیثوں کا ملتا ہے۔ بخاری شریف، تجرید بخاری، مشکوٰت شریف کامل، ترمذی شریف کامل، ترمذی شریف، شمائل ترمذی، سنن ابن ماجہ، صحیح مسلم شریف، موطا امام مالک وغیرہ کے ترجمے آسان اور عام فہم اردو میں ملتے ہیں۔ قرآن اور احادیث کے بعد اسلامی آئین میں تاریخ اور سیرت نگاری کو فوقیت حاصل ہے۔ اردو میں سیرتِ نبوی پر گراں مایہ ذخیرہ موجود ہے جس میں عربی اور دوسری زبانوں میں لکھی گئی سیرتوں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ سیرۃ النبی کامل عبدالجلیل صدیقی اور غلام رسول مہر کا ترجمۂ سیرت ابن ہشام ہے۔ تمام معروف صحابہ کی حیات پر مبنی کتب کے تراجم بھی اردو میں ملتے ہیں۔ تصوف اور اخلاقیات سے متعلق کتب کے تراجم بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ عیسائیت، اسلام اور اسلامی فلسفے کے علاوہ اردو میں دنیا کے تمام اہم مذاہب سے متعلق مذہبی اور تاریخی کتب کے تراجم ہو چکے ہیں۔ ہندو، بدھ، جین، سکھ، آریہ سماج، برہمو سماج اور ہندو فلسفے اور اساطیر کے بارے میں اردو میں کثیر ذخیرۂ کتب ملتا ہے۔ ان مذہبوں کے صحائف کے کئی قسم کے تراجم اور تشریحات اردو میں ملتی ہیں۔ بھگوت گیتا کے اردو میں سب سے زیادہ تراجم ملتے ہیں۔ خواجہ دل محمد نے دل کی گیتا کے عنوان سے منظوم ترجمہ کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ رامائن کے ترجموں کی تعداد تقریباً بیس ہے۔ چاروں ویدوں کے خلاصے کا ترجمہ الکھ دھاری عرف منشی کنھیالال نے الکھ پرکاش کے نام سے کیا تھا جو 1861 میں شائع ہوا تھا۔ منشی سورج نرائن مہر نے بارہ اپنشد کا ترجمہ اور شرح 1900 میں شائع کی تھی۔ مہابھارت کے بھی منظوم اور نثری ترجمے شائع ہوئے ہیں۔

ہندستان میں جو مذہبی اور اصلاحی تحریکات مختلف ادوار میں پنپیں، ان کے سب کثیر تعداد میں لٹریچر موجود ہے۔ ان تمام تحریکات سے متعلق ادب کا، اور جین، بدھ اور سکھ مذہب کی کتب کا بھی اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ گرونانک کے عارفانہ کلام جپ جی صاحب اور گوپال سنگھ کی کتاب گرونانک دیو کا اردو ترجمہ مخمور جالندھری نے کیا ہے۔ گرو گوبند کے فارسی کلام ظفر نامہ کا بھی اردو ترجمہ موجود ہے۔

اسی طرح عیسائیت سے متعلق کتب کا ذخیرہ بھی بہت وقیع ہے۔ ان کے تراجم کی تاریخ بھی سب سے قدیم ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ان کے ترجموں کی زبان زیادہ رواں دواں اور ادبی زبان کے قریب ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بیشتر مذہبی کتب کے ترجموں کا مقصد و محرک اپنے اپنے نظریے اور مشن کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ یہی سبب ہے کہ اردو میں مذہبی کتب کے تراجم کا بہت بڑا سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔

7.6.2 شاعری اور افسانوی ادب کے تراجم

شعری تخلیقات کا ترجمہ حالانکہ بہت ہی مشکل کام سمجھا جاتا ہے، پھر بھی اردو میں شعری تخلیقات کے کم ترجمے نہیں ملتے ہیں۔ بیشتر ترجمے عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں سے ہوئے ہیں۔ عربی زبان کے بیشتر شعری سرمایے کا ترجمہ مدرسوں سے وابستہ لوگوں نے کیا ہے۔ ان میں اہم تراجم دیوان المتنبی، مقاماتِ حریری، سبعِ معلقہ، ازہار العرب وغیرہ کے ہیں۔ فارسی زبان سے دیوانِ حافظ کا ترجمہ کوثر چاندپوری نے کیا ہے اور شرح اشرف علی تھانوی نے لکھی ہے۔ سعدی کی بوستاں اور مثنوی مولانا روم کے بھی عمدہ تراجم ملتے ہیں۔ مثنوی معنوی کا ترجمہ پیراہنِ یوسفی کے نام سے شائع ہوا۔ سنسکرت کے بھی کئی شاعروں کی تخلیقات کے تراجم اردو میں ہوئے ہیں۔ کالی داس کے علاوہ بھرتری ہری کے بھی تراجم ملتے ہیں۔ رگھوناتھ گھئی نے بھرتری ہری کا خوبصورت منظوم ترجمہ لمعاتِ بصیرت کے عنوان سے کیا ہے۔

انگریزی زبان سے بھی شاعری کے بہت سے ترجمے ہوئے ہیں۔ انگریزی کے تمام بڑے شاعروں کی کچھ نہ کچھ تخلیقات کے ترجمے دستیاب ہیں۔ ان میں شیکسپیئر، ملٹن، کیٹس، شیلی، بلیک، ایلیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ کلاسکس میں سے لاطینی، فرانسیسی اور روسی تخلیقات کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔

لیکن ترجموں کا سب سے کثیر سرمایہ افسانوی ادب میں ملتا ہے۔ معروف نقاد احتشام حسین اردو میں افسانوی ادب کے تراجم سے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ افسانوی ادب کے تراجم اردو میں رسالوں اور اخباروں کا پیٹ بھرنے کے لیے ہوئے۔ یعنی رسالوں اور اخباروں کو چھاپنے

کے لیے مواد تو چاہیے ہی تھا، اور ادیبوں سے طبع زاد تحریریں تخلیق کرانے کے مقابلے میں ترجمے کرالینا قدرے آسان کام تھا، اسی لیے اردو میں بھی مختصر افسانے شروع میں اخبارات کی زینت بنے۔ لاہور سے نکلنے والے مخزن، کانپور کے زمانہ، آگرہ کے نگار اور دہلی کے صلائے عام رسالے یورپی افسانوں کے ترجمے چھاپتے تھے۔ ان ترجموں کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ ان کی بدولت اردو کے ادیب افسانہ نگاری کی طرف تیزی سے مائل ہوئے۔ البتہ اس دور کے ترجموں کی خرابی یہ ہے کہ اشاعت کے وقت ان میں اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ اصل مصنف کون ہے، کس زبان کا ہے، یا مترجم کون ہے، کون سا افسانہ اصل کے مطابق ہے، کون سا محض ماخوذ ہے، وغیرہ۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں گویا ترجموں کی باڑھ سی آئی ہوئی تھی اور ان ترجموں کا مقصد اخبار کی ضرورتوں کو پورا کرنا تھا۔ ابتدائی دور میں عبدالحلیم شرر، سر عبدالقادر، ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری وغیرہ نے مختلف زبانوں سے ترجمے کیے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان سے ترجموں کا آغاز کیا۔ انگریزی کے علاوہ کئی یورپی زبانوں کے ادیب اردو میں تراجم کی وجہ سے پہچانے جانے لگے تھے۔ ہندوستانی زبانوں میں بنگالی وغیرہ سے بھی ترجمے شروع ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس معروف مترجمین کی ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس فہرست میں خواجہ منظور حسین، حامد علی خاں، جلیل قدوائی، محشر بدایونی، فضل حق قریشی، اختر حسین رائے پوری، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی اور وحیدالدین سلیم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان لوگوں نے انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں کے انگیزی متن کی مدد سے بہت سی یورپی زبانوں کے تراجم اردو میں کیے۔ خواجہ منظور حسین اور جلیل قدوائی نے روسی افسانہ نگار چیخوف کے، اور اعظم کریوی نے ہندی زبان سے ترجمے کیے۔ مجنوں گورکھپوری نے تو اتنا اثر قبول کیا کہ اپنے افسانے ہی انگریزی کے مشہور ناول نگار تھامس ہارڈی کے افسانوں پر ڈھال لیے۔

اس دور کے تراجم سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ چیخوف اور فرانسیسی ادیب موپاساں کو زیادہ پسند کر رہے تھے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی ابتدا میں افسانوں کا ترجمہ کیا اور اپنے تراجم کا مجموعہ روسی ادب کے عنوان سے لاہور سے شائع کرایا۔ اس مجموعے میں ٹالسٹائے، چیخوف، گورکی اور سلوگب کے افسانے شامل تھے۔ روسی ادب میں حقیقت پسندی تھی۔ اس میں زندگی کے مسائل پر گہری نظر اور عوامی نقطہ نظر تھا۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جس طرح کی عوامی بیداری کی لہر تھی اور سیاسی تحریکات پنپ رہی تھیں، ان کے سبب معاشرے کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا۔ روسی ادب اس مزاج سے خاصا میل کھاتا تھا۔ اسی لیے اس دور میں روسی ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کے خوب ترجمے ہوئے۔ روسی زبان کے تقریباً تمام اہم لکھنے والوں کے ترجمے اردو میں ملتے ہیں۔ ان میں لیو ٹالسٹائے، فیودور دستوئیفسکی، سیمونوف، ترگنیف، شخوناف، الیکسی ٹالسٹائے، پشکن، اوستروفسکی اور شولوخوف وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ روسی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنے والوں میں اہم نام سبط حسن، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، منظر سلیم، تقی حیدر، ظ۔ انصاری، صابرہ زیدی، امیر اللہ خاں، حبیب الرحمان خاں اور مرزا اشفاق بیگ وغیرہ کے ہیں۔

''دنیا کے شاہکار افسانے'' سیریز کے تحت پروفیسر عبدالقادر سروری کی عمومی ادارت میں کئی مجموعے حیدرآباد سے شائع ہوئے۔ ان میں قدیم افسانے، انگریزی افسانے، فرانسیسی افسانے، چینی افسانے اور جاپانی افسانے کے عنوان سے مختلف مجموعے شائع ہوئے۔ انگریزی کے جن افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے اردو ترجمے اس سیریز میں ہوئے ان میں اہم نام گولڈاسمتھ، اسکاٹ، چارلس ڈکنس، تھامس ہارڈی، آر۔ ایل۔ اسٹیونسن، آسکر وائلڈ، رڈیارڈ کپلنگ، ایچ۔ جی۔ ویلز، کیتھرین مینس فیلڈ وغیرہ شامل ہیں۔ بعد میں ایڈگر ایلن پو کے افسانوں کا ترجمہ ابنِ انشا نے کیا۔ واشنگٹن ارونگ کا حامد علی خاں نے اور کپلنگ کا ظفر علی خاں نے کیا۔ پطرس بخاری اور قاضی عبدالغفار نے گالزوردی کے طویل اور مختصر افسانوں کا ترجمہ کیا۔ سامرسیٹ مام اور او۔ ہنری کے بھی اردو ترجمے دستیاب ہیں۔

دیگر اہم زبانیں، جن سے اردو میں ترجمے ہوئے، چینی، عربی، ترکی، فارسی، اور اسپینی ہیں۔ افریقی اور لیٹن امریکی ادب کا بھی خاصا ترجمہ ہوا ہے جو عموماً انگریزی اور اسپینی زبانوں کی مدد سے ہوا۔ لیٹن امریکی ادیب گبریل گارسیا مارکیز کی بہت سی تحریروں کے اردو ترجمے کتابی صورت میں آ چکے ہیں۔ عربی زبان سے مصطفیٰ المنفلوطی اور خلیل جبران کی بہت سی تخلیقات کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ضیاء الحسن نے عربی سے اور حامد حسن قادری اور منیب الرحمان نے فارسی سے ترجمے کیے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں بہت سے عرب ممالک کے اہم ادیبوں اور شاعروں کے ترجمے براہ راست عربی سے یا پھر انگریزی ترجموں کی مدد سے ہوئے ہیں۔ ان میں مصری، لبنانی، عراقی، فلسطینی، شامی، مراقشی، یمنی، لیبیائی اور سوڈانی ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ عربی،

فارسی اور انگریزی زبانوں سے ترجمہ کرنے والوں میں آج کے دور کے اہم نام فہمیدہ ریاض، انتظار حسین، محمد عمر میمن، چودھری محمد نعیم، محمد سلیم الرحمان، اسد محمد خان، نکہت حسن، نیّر مسعود، مسعود الحق، اجمل کمال، زینت حسام، احتشام شامی، عطا صدیقی، افضال احمد سید، فاروق حسن، راشد مفتی، آصف فرخی، حمید زماں، محسن جعفری اور شمیم حنفی وغیرہ ہیں۔

غیر ملکی زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی زبانوں میں ہندی، بنگالی، مراٹھی، پنجابی، کشمیری تامل، تیلگو اور ملیالم اور اڑیہ وغیرہ سے بھی اردو میں ترجمے ہوئے ہیں۔ ملیالم ادیب ویکوم محمد بشیر کی بہت سی کہانیوں کا ترجمہ مسعود الحق نے کیا ہے۔ بنگالی سے رابندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذر الاسلام، شرت چندر اور بنکم چندر وغیرہ کے بھی اچھے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

دنیا کی اہم زبانوں کے ادب کو اردو میں شائع کرنے کا کام کئی ادبی جریدے کر رہے ہیں، ان میں پاکستان سے نکلنے والے 'آج'، 'مکالمہ'، 'دنیا زاد' اور ہندوستان سے 'ذہن جدید' اور 'نیا ورق' کے علاوہ 'اردو ادب' کی خدمات بھی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ماہ نامہ 'آجکل'، 'شب خون' اور 'شاعر' وغیرہ بھی وقتاً فوقتاً ادبی ترجمے شائع کرتے رہتے ہیں۔

7.6.3 بچوں کے ادب کے تراجم

اردو میں بچوں کے ادب کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے، اور تراجم کی طرف تو اور کم۔ حالانکہ کوشش یہ ہونی چاہیے تھی کہ بچوں کی بہترین ذہنی نشوونما کے لیے انھیں بہترین معیاری کتابیں فراہم کی جائیں۔ اس کے لیے دنیا کے مختلف ممالک کے ادب، لوک کتھاؤں، تاریخی و تہذیبی قصوں، عالمی رہنماؤں کی زندگیوں پر مشتمل ادب اور عام معلوماتی کتابیں ترجمہ کرائی جاتیں، لیکن اردو میں ایسا بہت کم ہوا ہے، جس کے اسباب پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ آزادی کے بعد سرکاری سطح پر اس جانب توجہ دی گئی اور چلڈرن بک ٹرسٹ نے ہر عمر کے بچوں کے لیے طرح طرح کی کتابیں تیار کرائیں۔ ان کتب کے ترجمے ہندوستان کی بیشتر اہم زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اردو میں بھی چلڈرن بک ٹرسٹ کی سو (100) سے زیادہ کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں، جن کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ رنگین تصویروں سے سجی یہ کتابیں اچھے آرٹ پیپر پر شائع ہوئی ہیں۔ ماضی میں سابقہ ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ اور مختلف صوبوں کی اردو اکادمیوں نے بھی بچوں کا ادب اور ترجمے شائع کیے ہیں۔

چلڈرن بک ٹرسٹ کے مترجمین میں اہم نام شفیع الدین نیر، رضیہ سجاد ظہیر، رفیعہ منظور الامین، صالحہ عابد حسین، عرش ملسیانی اور انور کمال حسینی وغیرہ کے ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے بھی بچوں کے لیے بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں تراجم بھی شامل ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. کن کن زبانوں کے افسانوی ادب کے تراجم اردو میں زیادہ ہوئے ہیں؟ اہم مترجمین کون کون سے ہیں؟
2. روسی ادب کے تراجم اردو معاشرے میں کیوں پسند کیے گئے؟
3. اردو میں بچوں کے ادب کی کیا صورت حال ہے؟
   بچوں کے ادب کے تراجم کن کن اداروں نے شائع کیے؟
4. اردو میں کون کون سے مذاہب کی کتابیں ترجمہ ہوئیں؟ ان کی چند کتابوں کے نام بھی تحریر کیجیے۔

7.7 خلاصہ

ترجمے کی روایت نے ہر دور میں نئے نئے افکار و نظریات کو ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچایا ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے کی تہذیب، تاریخ اور سماجی زندگی کو سمجھنے میں مدد دی ہے، مختلف زبانوں میں لکھی جانے والی علمی کتابوں، تحقیقی کارناموں، سائنسی نظریات اور ہر طرح کے علوم کو ساری دنیا میں پھیلایا ہے۔ جیسے جیسے دنیا آگے بڑھ رہی ہے اور جتنی تیزی سے نئے نئے نظریات وجود میں آ رہے ہیں، اور سبھی ممالک اور اقوام کے ایک دوسرے کے

قریب آنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے، ترجمے کی اہمیت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ہرطرف ایک ہی بات کا شور ہے کہ دنیا عالمی گاؤں میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ اکثر ممالک معاشی طور پر ایک دوسرے پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ عالم کاری (Globalization) اور نوآزادہ روی (Neo-libralization) کا عمل عالمی پیمانے پر پھیل گیا ہے۔ ابلاغ اور آمدورفت کے ذرائع میں انقلابی تبدیلیوں اور ایجادات کے سبب عالمی رابطے اور ترسیل میں بہت آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس صورت حال نے عام لوگوں کو بھی عالمی سطح پر ایک دوسرے کے قریب کیا ہے اور باہمی رابطے کی ضرورت کو مزید بڑھادیا ہے۔ ایسے میں گو کہ انگریزی ایک عالمی زبان کے طور پر ابھری ہے اور رابطۂ عامہ کی واحد زبان بنتی جارہی ہے، تاہم دنیا کے ایک بڑے طبقے کی رسائی آج بھی انگریزی تک نہیں ہے۔ اکثر لوگ آج بھی غریب ہیں اور ہندوستان جیسے ملکوں میں آج بھی عوام کی اکثریت کے لیے ذریعۂ تعلیم مادری زبانیں اور علاقائی زبانیں ہیں۔ اس مسابقتی دور میں وقت کے ساتھ ہم قدم ہونے کے لیے ان کے پاس واحد ذریعہ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی علاقائی زبانوں یا مادری زبانوں میں علم حاصل کریں۔ یہ کام وہ ترجمہ شدہ کتابوں کی مدد سے کرسکتے ہیں، انھیں اسباب سے آج کے دور میں مترجمین کی اہمیت اور ضرورت مسلسل بڑھ رہی ہے۔

اوپر کے صفحات میں ترجمے کی اہمیت وافادیت کو واضح کیا جاچکا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اردو زبان میں بھی ہر دور میں تراجم کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس پر تفصیلی نظر ہم گزشتہ صفحات میں ڈال چکے ہیں۔ اس سلسلے میں خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ پر اگر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ باقاعدہ ادبی تخلیقات کے منظر عام پر آنے کے ساتھ ساتھ تراجم بھی ملنے لگے ہیں۔ ابتدا میں فارسی، عربی اور سنسکرت سے ماخوذ ادب کی تخلیق ہوئی۔ اسی میں ترجمہ نگاری کے ابتدائی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ مذہبی کتب کے تراجم بھی اردو کی تشکیل کے ابتدائی دور ہی میں سامنے آنے لگے۔ اردو میں ترجمہ نگاری کی باقاعدہ بنیاد انگریزوں کے آنے کے بعد پڑی جب مغرب سے آنے والے علوم کو اردو میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کئی قسم کے ادارے مختلف ادوار میں وجود میں آئے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، حیدرآباد کا دارالترجمہ عثمانیہ وغیرہ کی خدمات اس سلسلے میں گراں قدر ہیں۔ ان اداروں کی کوششیں عموماً مختلف علوم کے ترجموں تک محدود ہیں۔ ساتھ ساتھ ادبی کتب کے ترجموں کی روایت بھی پروان چڑھتی رہی اور مختلف زبانوں کی شاعری اور نثری ادب کے تراجم اردو میں ہوئے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ نئی ٹیکنالوجی آنے کے سبب اشاعتِ کتب میں بہت آسانیاں فراہم ہوئی ہیں جس نے ادیبوں کو نیا حوصلہ دیا ہے۔ رسالوں اور جریدوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے اور ان میں لکھنے والوں کی تعداد میں بھی۔ ان تمام وجوہ سے لکھنے والوں کی توجہ ترجمے کی طرف بھی بڑھ رہی ہے، اور آج بھی اردو میں مختلف علوم کی اور ادبی کتب کے تراجم کا سلسلہ جاری ہے۔

7.8 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اردو میں ترجمے کی روایت پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. اردو تراجم کے اہم اداروں کا تعارف کرائیے۔
3. اردو میں افسانوی ادب کے ترجموں پر ایک مضمون لکھیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالیے۔ یا
   ترجمے تہذیبوں اور علوم کے فروغ میں کس طرح سے معاون ہوتے ہیں؟
2. ترجمے کے لیے کون کون سے طریقے استعمال کیے جاسکتے ہیں؟ کیا شاعری کا اچھا ترجمہ کرنا ممکن ہے؟
3. ترجمہ کرنے کے لیے مترجم میں کس طرح کی صلاحیتیں ہونی چاہییں؟ ترجمے کی بنیادی شرطیں کیا ہیں؟
4. ترجمے کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔

7.9 فرہنگ

تجسس = جاننے کی خواہش — راغب کرنا = توجہ دلانا

رابطہ = تعلق — میراث = وراثت

ریاضی = علم حساب — علم نجوم = ستاروں کا علم

علم ہیئت = وہ علم جس میں اجرام فلکی، زمین کی گردش اور کشش وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

بشری علوم = سماجی علوم (Humanities) — وضع کرنا = بنانا

استفادہ = فائدہ حاصل کرنا — ترسیل = اطلاع پہنچانا

تفہیم = سمجھنا — رمز و کنایہ = اشارہ

تحریف = تحریر میں اصل الفاظ بدل کر کچھ اور کر دینا۔ ترجمے میں جان بوجھ کر اصل معنی کو بدل دینا۔

حذف کرنا = نکالنا۔ عبارت سے کسی لفظ کو، یا لفظ سے کسی حرف کو نکال دینا

دارالترجمہ = وہ ادارہ جس کا مقصد ترجمے کرانا ہو — تخفیف کرنا = کمی کرنا

مستعار = مانگا ہوا، ادھار لیا ہوا — ماخوذ = اخذ کیا ہوا، لیا ہوا

تالیف = جمع کرنا۔ مختلف کتابوں سے مضامین جمع کر کے نئے پیرایے میں ترتیب دینا

مرتب کرنا = ترتیب دینا۔ مختلف مضامین کو کتاب کی صورت میں جمع کرنا

وقیع = وقعت رکھنے والا — انحصار کرنا = بھروسا کرنا۔ کسی کا دست نگر ہونا

ابلاغ = کوئی بات یا خیال دوسروں تک پہنچانا — افادیت = فائدہ

ہنوز = اب تک — مسابقت = ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ (competition)

7.10 سفارش کردہ کتابیں

1. قمر رئیس — ترجمہ: فن اور روایت، دہلی
2. خلیق انجم — ترجمے کا فن، دہلی
3. انور سدید — اردو کی ادبی تحریکیں، کراچی، پاکستان
4. مولوی عبدالحق — دلی کالج،، دہلی
5. مجیب الاسلام — دارالترجمہ عثمانیہ کی خدمات، دہلی

اکائی 8 : اردو میں ادبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

8.1 تمہید

8.2 اردو میں ترجمے کا آغاز اور ادبی تراجم کی روایت

8.2.1 اردو زبان میں ترجمے کی ابتدا

8.2.2 ادبی ترجمے کی تعریف

8.2.3 اردو میں ادبی ترجمے کا آغاز اور روایت

8.2.3.1 شعری تراجم کی روایت

8.2.3.2 افسانوی تراجم کی روایت

8.3 ادبی تراجم کی اہمیت وافادیت

8.4 ادبی تراجم کے مسائل

8.4.1 افسانوی ادب سے مختص تراجم کے مسائل

8.4.2 شعری تراجم سے مختص مسائل

8.5 خلاصہ

8.6 نمونہ امتحانی سوالات

8.7 فرہنگ

8.8 سفارش کردہ کتابیں

8.1 تمہید

ترجمہ ایک ایسا فن ہے، جس کے وسیلے سے تہذیبیں نشوونما اور ترقی کے مراحل طے کرتی ہیں نیز انسانی شعور وذہن، اس کی زبان وبیان اور وجدانی و جمالیاتی تجربے میں توسیع واضافہ ہوتا ہے۔ ادب انسان کے جذبات وخواہشات اور خیالات کا مظہر ہوتا ہے اور انسان وکائنات کے باہمی رشتوں کی تفہیم کا بہترین ترجمان ہوتا ہے۔ یہ ایک طرف تہذیب وثقافت کا زائدہ اور اس کا علم بردار ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کی تعمیر وتشکیل کا ایک بہترین وسیلہ ہوتا ہے۔ اس لیے کسی تہذیب کے بہترین خیالات واحساسات کے اعلیٰ پیرایۂ اظہار سے مستفیض ہونے کے لیے اور وجدانی و جمالیاتی ارتفاع کے لیے ادبی ترجمے کے اہمیت وافادیت مسلم ہے۔ ادبی ترجمہ ایک خیال یا تصور کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک تہذیبی فضا اور روایت کو دوسری تہذیب وروایت سے ہم آہنگ کرنے کا عمل ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک مشکل ترین عمل ہے۔

اس اکائی میں اردو زبان میں ادبی ترجمے کی روایت کو بیان کرتے ہوئے ادبی ترجمے کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ادبی ترجمے کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے افسانوی اور شعری تراجم سے مختص مسائل کو علاحدہ علاحدہ بیان کیا گیا ہے۔

8.2 اردو میں ترجمے کا آغاز اور ادبی تراجم کی روایت

8.2.1 اردو زبان میں ترجمے کی ابتدا

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ترجمہ ایک زبان کی ساخت میں موجود معنی و مضمون کو دوسری زبان کی ساخت میں منتقل کرنے کا عمل ہے۔ ترجمے کی عمومی تعریف یہی ہے، لیکن اگر ہم اپنی روزمرہ کی سماجی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ کریں تو ہم پر یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ترجمے کا عمل ایک زبان میں بھی جاری رہتا ہے یعنی جب ہم اپنے یا دوسروں کے معنی و مطالب کو ان کے اصل الفاظ کے بجائے دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو اس وقت بھی ہم ترجمے کے عمل سے دوچار ہوتے ہیں مثلاً یہ جملے :

''میں کتوں کے بھونکنے پر دھیان نہیں دیتا''

''اس نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ میں بے کار کی باتوں پر دھیان نہیں دیتا''

''اس نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ میں بے معنی تنقید پر غور نہیں کرتا''

مذکورہ مثالوں میں دراصل معنی کی ترسیل اور انگیز کرنے کا عمل ہے۔ اس عمل کے رشتے ترجمے سے بہت گہرے ہوتے ہیں، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک زبان کے اندر بھی طبقوں، فرقوں، ملتوں اور علاقوں وغیرہ کے لحاظ سے کئی ذیلی زبانیں ہوتی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ترجمے کا فن انسان کی سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ نمو پذیر ہوا ہے، اس کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانی زندگی کی تاریخ۔ اس لحاظ سے ترجمہ دو لسانی یا ذیلی لسانی گروہوں کے درمیان تعامل اور رابطے کا ایک عمل قرار پاتا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اردو زبان مشترکہ تہذیب و ثقافت کی پیداوار اور علمبردار ہے۔ ہندوستان میں اس مشترکہ تہذیب کا آغاز محمود غزنوی کی آمد سے ہوتا ہے۔ اس عہد میں فارسی، پشتو، ترکی، عربی اور ہندوستانی کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان کا ہیولا تیار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دو زبانوں اور دو تہذیبوں کا تعامل اپنی سادہ شکل میں ترجمے کے فروغ کا باعث ہوتا ہے اور ترجمے کی وجہ سے ہی مشترکہ زبان اور نئے اسلوب وجود میں آتے ہیں۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک بالغ لسانی گروہ بازار یا دوسری عملی ضرورتوں کے تحت اجنبی زبان کو ایک معصوم بچے کی طرح انگیز نہیں کرتا بلکہ وہ اجنبی زبان کی ساخت کو اپنی لسانی ساخت کے مطابق اور اس کے مزاج کی ہم آہنگی سے قبول کرتا ہے یعنی ایک لسانی گروہ کے لیے کتے کے معنی کتا، ایک مخصوص جاندار یا جانور کے ہیں جب کہ دوسرے لسانی گروہ کے لیے کتے کے معنی پہلے Dog کے ہیں بعد میں مخصوص جانور کے۔ اس لحاظ سے ایک لسانی گروہ کے دوسری زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کے عمل میں ترجمے کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ بقول عبدالحق ہماری زبان میں لسانی سطح پر مترادفات سے ترجمے کا آغاز ہوا۔ ان مترادفات میں تصرف بھی ہوئے۔ گویا اردو کے عناصر ترکیبی میں ترجمے کا خمیر شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو زبان میں ترجمے کی تاریخ و ابتدا، اردو زبان کی تاریخ و ابتدا سے منسلک ہے۔ ماہرین لسانیات کے مطابق ماقبل اردو (Pre Urdu) کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر خواجہ سعد سلمان (بارھویں صدی) ہیں، جن کا دیوان اب موجود نہیں ہے۔ ان کے بعد خسرو اور دوسرے شعرا ہیں۔ خسرو کے کلام اور ان کے بعد کے عہد کے فارسی اور ہندوی کلام سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس عہد میں فارسی و عربی الفاظ، ضرب الامثال اور محاوروں کا ترجمہ اردو میں شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی تصورات و خیالات بھی اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ اس ذیل میں صوفی سنت پیش پیش تھے، جو اپنے اقوال اور شاعری کے ذریعے ترجمے کے کام کو آگے بڑھا رہے تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے مثالوں کے ساتھ اس بات کو واضح کیا ہے کہ کبیر (پ 1398ء) کی زبان اردو کے بہت قریب ہے۔ ان کے کلام میں دس فی صد سے زیادہ الفاظ فارسی کے ہیں۔ کبیر نے فارسی محاوروں اور ضرب الامثال کے ساتھ بعض فارسی اشعار کا ترجمہ بھی کیا ہے : چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

کبیر : کبیر نوبت آپنی دس دن لیہو بجائے

حافظ (فارسی) : ہر کسے پنج روزہ نوبت اوست

کبیر : کبیر سریر سرائے ہے کیا سووے سکھ چین
سوانس نگارا کوچ کا باجت ہے دن رین

فردوسی (فارسی) : چہ بندی تو دل بر سرائے فسوس
کہ ہر آن ہمی آید آواز کوس

کبیر : کویلا ہوئے نہ اوجرو نومن صابن لائے

فارسی ضرب المثل : کہ زنگی بشستن نہ گردد سفید

گجرات کے شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م 1565) اور نظامی بیدری کی دکن کی پہلی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں بھی ترجمے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے!

گام دھانی : جے تم لیلیٰ جو یا لوڑو منجہ مجنوں کی نینوں دیکھو

سعدی (فارسی) : لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید

گام دھانی : کان کرو یہ پرم کہانی

محاورہ (فارسی) : گوش کن کا ترجمہ کان کرو ہے

نظامی بیدری : نہ سنیا الولک کہ اس ورتمان۔ سکھی آپنا جیو تو سب جہان

فارسی ضرب المثل : جان خوش (تو) جہان خوش

نظامی بیدری : پنکھیرو واوڑے دیکھ کر اپنا ونس۔ چڑی مل چڑی (اور مل) ہنس ہنس

فارسی شعر : کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز بہ باز

نظامی بیدری : نکل جانو سر ہانڈی منج ننگ نہ۔ جہاں جانو سنسا تو تنگ نہ

فارسی ضرب المثل : خلق خدا تنگ نیست۔ پائے مرا لنگ نیست

امیر خسرو نے (تیرہویں، چودھویں صدی میں) عربی لغت کے نمونے پر درس و تدریس کے لیے ''خالق باری'' کے عنوان سے ایک لغت تیار کی، جس میں فارسی، عربی اور ترکی کے مستعمل الفاظ کے اردو مترادفات دیے گئے ہیں۔ خسرو کی یہ لغت بھی ایک قسم کا ترجمہ ہے۔ ''خالق باری'' کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

خالق باری، سرجن ہار ۔ واحد ایک، بڑا کرتار

انہی بنیادوں پر ماہرین کا خیال ہے کہ شمالی ہند میں غزنوی کے عہد سے مغلوں کے زمانے تک سرکاری ضرورتوں کے تحت اردو زبان میں ترجمے کا کام لازمی طور پر ہوتا رہا ہوگا جن کے نمونے آج دستیاب نہیں ہیں۔

اردو ادب کے ابتدائی عہد میں مذہب، تصوف، شاعری، داستانیں، ہیئت، فلسفے وغیرہ سے متعلق کتابوں کے ترجمے عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں سے ہوئے۔ مذہبی ضرورتوں کے تحت اردو میں سب سے زیادہ ترجمے عربی زبان سے ہوئے لیکن ادب عالیہ کے ترجمے فارسی، انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں سے ہوئے۔

8.2.2 ادبی ترجمے کی تعریف

ادبی ترجمہ ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان میں پوری ادبیت اور اثر آفرینی کے ساتھ منتقل کرنے کا عمل ہے۔ جس کے وسیلے سے ایک تہذیب و ثقافت دوسری تہذیب و ثقافت سے اخذ و استفادہ کر کے ذہنی اور وجدانی نشو و نما کے مواقع حاصل کرتی ہے۔ علمی ترجمے اور ادبی ترجمے میں سب سے بڑا

فرق یہی ہوتا ہے کہ علمی ترجمے میں سارا زور تصور و خیال کی ترسیل پر ہوتا ہے اس میں اسلوب بیان پر زیادہ توجہ نہیں ہوتی جب کہ ادبی ترجمے میں سارا زور تہذیبی سانچے اور تہذیبی فضا کی منتقلی پر ہوتا ہے۔ یہاں خیال کے ساتھ اسلوب بھی اہم ہے یعنی ترجمہ شدہ متن میں ادبی اثر آفرینی کا ہونا ضروری ہے۔

8.2.3 اردو میں ادبی ترجمے کا آغاز اور روایت

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اردو زبان اور ادب کی تاریخ کا نقطۂ آغاز ایک ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زبان تک رسائی کا واحد ذریعہ قدیم ادب ہوتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی زبان کے اولین ادبی نمونے شعر کی صورت میں ہوتے ہیں اس لحاظ سے یہ واضح ہے کہ اردو میں ادبی ترجموں کا کام اردو کی ابتدا ہی سے شروع ہو جاتا ہے جس کے بارے میں پچھلے صفحوں میں آپ تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ ابتدائی عمر کے تمام ترجمے جزوی حیثیت کے ہیں یعنی کسی مصنف کی مکمل تصنیف کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔

8.2.3.1 شعری تراجم کی روایت

اردو ادب میں باقاعدہ شعری ترجمے کا آغاز گولکنڈہ کے فرمان روا محمد قلی قطب شاہ کے عہد (1580-1611) اور اس کی شاعری سے ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں دکنی ادیبوں اور شعرا کا فارسی کی طرف زیادہ رجحان تھا جس کے نتیجے میں اس عہد میں ترجمے پر بھی باقاعدہ توجہ دی گئی۔ جمیل جالبی کے مطابق قلی قطب شاہ نے حافظ کی غزلیں کی غزلیں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ قطب شاہ نے حافظ کے علاوہ دیگر فارسی شعرا کے جستہ جستہ اشعار کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ اسی عہد میں شیخ احمد گجراتی نے مولانا جامی اور امیر خسرو کی فارسی مثنویوں ''یوسف زلیخا'' کا ترجمہ اسی عنوان سے مثنوی کی صورت میں کیا۔ جمیل جالبی کے مطابق اس مثنوی کا سنِ تصنیف 1580ء سے 1588ء کے درمیان ہے۔ احمد گجراتی کی مثنوی یوسف زلیخا کا ڈھانچہ اور پلاٹ جامی اور خسرو کی مثنویوں کے مطابق ہے۔ جس میں دونوں مثنویوں کے بہت سے اشعار کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ احمد گجراتی کی دوسری مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' بھی فارسی مثنوی سے ماخوذ ہے۔ اور ترجمے کے ذیل میں آتی ہے۔ 1631ء میں غواصی نے ''ہتوپدیش'' کے بجشی کے فارسی ترجمے ''طوطی نامے'' کا اسی عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ 1635ء میں قطب زاری نے راجو قوال کی فارسی تصنیف تحفۃ النصائح کا منظوم ترجمہ کیا۔ 1640ء میں بیجاپور کے سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر ملک خوشنود نے فارسی مثنوی ''یوسف زلیخا'' (جواب ناپید ہے) اور امیر خسرو کی مثنوی ''ہشت بہشت'' کا ترجمہ ''جنت سنگھار'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اس مثنوی کے ابتدائی حصے بیت بہ بیت ترجمہ ہیں بعد میں مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کیا گیا ہے یعنی آزاد ترجمہ۔ کچھ اشعار کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں استعاروں اور تلمیحوں کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

ہشت بہشت۔ امیر خسرو	جنت سنگھار
سخن آں بہ کہ بعد حمد خدائی	کہاں ہوں حمد اول میں خدا کا
بود از نعت خواجہ دو سرائی	کہاں ہوں نعت بعد از مصطفیٰ کا

1640ء میں ہی کمال خاں رستمی نے عادل شاہ کی فرمائش پر ابن حسام کی طویل مثنوی ''خاور نامے'' کا اسی عنوان سے ترجمہ کیا۔ فن ترجمہ کے لحاظ سے ''خاور نامہ'' ''جنت سنگھار'' سے بہتر مثنوی ہے۔

''خاور نامہ'' اردو کی سب سے طویل مثنوی ہے جو 24 ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی بڑی حد تک اصل کے مطابق ہے۔ کہیں کہیں مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ایک دو اشعار بڑھا دیے گئے ہیں اور کچھ اشعار چھوڑ دیے گئے ہیں۔ داستان کی ترتیب، قصے کا تسلسل اور اکثر قافیے بھی اصل کے مطابق ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی اردو کے شعری تراجم میں بہت اہم ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

خاورنامہ (فارسی)	خاورنامہ (اردو
نہد برسر کوہ زریں کمر	رکھے کوہ زریں کمر کے اوپر
گہے چتر مشکیں گہے تاج زر	کدھیں تاج مشکیں کدھیں تاج زر

اسی دور میں امینؔ نے ''بہرام وحسن بانو'' کے عنوان سے اپنی ہی فارسی مثنوی کا اردو میں ترجمہ شروع کیا۔ جسے ان کی وفات کے بعد دولت شاہؔ نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ''بہرام وحسن بانو'' اردو میں مصنفی ترجمے کی پہلی مثال ہے۔ مثال ملاحظہ کیجیے۔

بہرام وحسن بانو (فارسی) امینؔ	بہرام وحسن بانو (اردو) امینؔ
نشست آں دیو پیش شاہ و مے را	کیا شاہ اور دیو نیں مے کشی
بخور و گوش کرد آواز نے را	ہوئے آپ میں آپ دونوں خوشی

اس مثنوی میں بیت بہ بیت ترجمہ نہیں ہے بلکہ کہیں کہیں ایک بیت کا ترجمہ دو بیتوں میں کیا گیا ہے۔ ان تراجم کے علاوہ دکن کے چند اہم شعری تراجم مندرجہ ذیل ہیں:

پھول بن (1655ء۔ابن نشاطیؔ	ترجمہ۔ فارسی مثنوی بساتین الانس۔ محمد صدر ملا حسن دبیر تاج
گلشن عشق (1675ء)۔نصرتیؔ	ترجمہ۔ ہندی۔ منوہر مدھومالتی۔ شیخ منجھن
بہرام وگل اندام (1670ء)۔طبعیؔ	ترجمہ۔ فارسی مثنوی ہفت پیکر۔ نظامیؔ
وجودیہ (1675ء) شاہ امین الدین اعلیٰ	اس کتاب میں مصنف نے جو کچھ فارسی نثر میں لکھا ہے اسی کو اردو میں نظم کیا ہے۔
انوار سہیلی (1824ء) محمد ابراہیم	ترجمہ۔ فارسی تصنیف ملا حسین واعظ کاشفی

دکن میں تیرھویں صدی عیسوی میں خود مختار حکومتوں کے قیام سے سترھویں صدی عیسوی تک فارسی زبان وادب کے تراجم کا دور دورہ رہا خصوصاً قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں نے شعری تراجم پر خصوصی توجہ دی، جس کی وجہ سے ہندوستان میں ایک نئی تہذیب ''ہند ایرانی تہذیب'' وجود میں آئی اور اردو زبان نئے اسالیب، محاورہ، تشبیہات واستعارات اور مضامین وخیال سے مالا مال ہوگئی۔ اس میں جاذبیت وکشش پیدا ہوگئی۔ اردو کی اسی خصوصیت نے شمالی ہند کے فارسی گو شعرا کو متاثر کیا اور اٹھارہویں صدی عیسوی تک ترجمے کی مستحکم روایت کی وجہ سے اردو شعر وادب کا وافر کلاسیکل ذخیرہ تیار ہوگیا۔ شمالی ہند میں دکن کے برعکس مثنوی سے زیادہ غزل اور قصیدے پر توجہ دی گئی۔ اس لیے یہاں فارسی زبان سے زیادہ تر شعری ترجمے غزل کے جستہ جستہ اشعار کی صورت میں ہوئے، جن کو طبع زاد تخلیق کی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے شعرا کو بغیر اصل کے حوالے کے ترجمہ شدہ اشعار کو اپنے کلام کا حصہ بنانے میں کوئی عار نہ تھی۔ شمالی ہند میں یہ صورت حال عہد غالب (انیسویں صدی) تک رہتی ہے۔ کلاسیکی شعریات میں ترجمے کو ایک صنعت قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے اس عہد میں ترجمے اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں تھا۔ غزلیہ اشعار کے ترجمے کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

نظیریؔ	ولیؔ
نہ چناں گرفتہ ای جاں بہ میانِ جانِ شریں	ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں
کہ تواں نزاو جاں راز ہم امتیاز کردن	مشکل ہے جیوسوں کوں اب امتیاز کرنا

حافظؔ	سوداؔ
مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز	راز دیر و حرم افشا نہ کریں ہم ہرگز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست	ورنہ کیا چیز ہے یاں اپنی نظر سے باہر

امیر خسرو	میر
عام حکم شراب می خواہم	عام حکم شراب کرتا ہوں
محتسب را کباب می خواہم	محتسب کو کباب کرتا ہوں
آنند رام مخلص	یقین
ناخن تمام گشت معطر چوں برگ گل	کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند
بند قبائے کیست کہ وامی کنیم ما	برگِ گُل کی طرح ہر ناخن معطر ہوگیا
شوکت بخاری	غالب
جنوں مزا جم و نبود دماغ گل گشتم	محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
خیال بوئے گل افزوں کند زکام مرا	کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم

1857ء میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اردو میں مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم کا آغاز ہوا۔ 1864ء میں فلق میرٹھی کا منتخب انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ ''جواہر منظوم'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ 1869ء میں بانکے بہاری لال نے ''منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم'' کے عنوان سے دوسرا مجموعہ شائع کیا۔ جس کے بعد محمد حسین آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، سرور جہاں آبادی، ظفر علی خاں، اقبال وغیرہ جیسے شعرا نے انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کیے۔ 1897ء میں نظم طباطبائی نے انگریزی کے مشہور شاعر تھامس گرے کی نظم کا ''گورِ غریباں'' کے عنوان سے (An Elegy Written in a Country Churchyard) کا کامیاب منظوم ترجمہ کیا، جس کی مقبولیت کے بعد انہوں نے کئی دوسری نظموں کے ترجمے کیے۔ اقبال نے ٹینی سن، لانگ فیلو اور ولیم کاوپر کی انگریزی نظموں کے منظوم تراجم ''پیام صبح''۔ ''عشق اور موت''۔ ''رخصت اے بزم جہاں'' کے عنوان سے کیے۔ عبدالحلیم شرر نے، انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کو ایک تحریک کی حیثیت بخشتے ہوئے، خود بھی اچھے ترجمے کیے اور دوسرے شعرا کو بھی اس طرف راغب کیا۔ جس میں حسرت موہانی، عزیز لکھنوی اور محمود شیرانی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ انگریزی سے چند ابتدائی منظوم تراجم مندرجہ ذیل ہیں :

محمد حسین آزاد	:	اندھی پھول والی کا گیت۔ لارڈ لٹن، اُجڑا ہوا گھر، بہار کا آخری پھول، ٹامس مور
حسرت موہانی	:	موسم بہار کا آخری پھول۔ ٹامس مور
ظفر علی خاں	:	ندی کا راگ۔ ٹنی سن، وفا۔ ورڈس ورتھ
عزیز لکھنوی	:	مٹی کا جوان چاند۔ ٹامس مور
حافظ شیرانی	:	موت کا وقت

اردو میں باقاعدہ اینتھولوجی انتخاب کا آغاز ضامن کنتوری کی کتاب ''ارمغانِ فرنگ'' سے ہوا، جو 1901ء میں شائع ہوئی۔ بیسویں صدی میں انگریزی کے ساتھ مغرب کی دوسری زبانوں کے شعر و ادب کے ترجمے پر بھی زیادہ توجہ دی گئی۔ میراجی نے ''مشرق و مغرب'' کے نغمے ترتیب دے کر جدید مغربی شاعری کی طرف اردو شعرا کو متوجہ کیا۔ بیسویں صدی میں معنی و خیال پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے بیشتر انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کی شاعری کا ترجمہ نثر میں کیا گیا۔ نظم کی اس قلبِ ماہیت کے باوجود شعری تاثر کافی حد تک قائم رہتا ہے۔

8.2.3.2 افسانوی ترجم کی روایت

اردو زبان میں تخلیقی نثر اور افسانوی ترجمے کا آغاز ملا وجہی کی ''سب رس'' سے ہوتا ہے، جو 1635ء میں گولکنڈہ کے فرماں روا قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ''سب رس''، محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی مثنوی ''دستور عشاق'' (1436ء) کے نثری خلاصے ''قصہ حسن و دل''

کا ترجمہ ہے۔ دستور عشاق اپنے عہد کی مشہور تصنیف ہے۔ جس کے منظوم اور منثور ترجمے کئی زبانوں میں ہوئے اور جس نے اپنے عہد کے ادیبوں اور شاعروں کو بے حد متاثر کیا۔ دستور عشاق کی مقبولیت کے پیش نظر فتاحی نے اس قصے کو مسجع و مقفیٰ نثر میں 1439ء میں دوبارہ ''شبستان خیال'' کے عنوان سے پیش کیا۔

سترھویں صدی اور اٹھارھویں صدی میں داستان امیر حمزہ دکنی' ترجمہ ''طوطی نامہ''۔ ابوالفضل' ترجمہ ''طوطی نامہ''۔ ملا قادری (1729ء) اور ترجمہ ''سنگھاسن بتیسی'' منظر عام پر آئے۔ انیسویں صدی میں دکنی ''انوار سہیلی'' یا دکن انجم۔ مترجم میاں محمد ابراہیم بیجاپوری (1822ء) ''قصہ کام روپ و کام لتا'' مترجم سید حسین علی خاں وغیرہ داستانوں کے تراجم ہوئے۔

شمالی ہند میں اردو کی پہلی نثری تصنیف اور ترجمہ فضلی کی ''دہ مجلس'' یا ''کربل کتھا'' ہے۔ جو ملا واعظ حسین کاشفی کی روضۃ الشہداء کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد شمالی ہند میں پہلا اول ترجمہ ''نوطرزِ مرصع'' ہے' جسے 1775ء میں عطا حسین خاں تحسین نے محمد علی معصوم کے فارسی قصے ''چہار درویش'' سے ترجمہ کیا۔ تحسین نے اس ترجمے کو بامحاورہ بنانے کی پوری کوشش کی ہے' اس کے باوجود ترجمے میں تخلیقی عنصر پیدا نہیں ہو سکا۔ نوطرزِ مرصع' میں زیادہ تر فارسی عربی تراکیب اصل متن سے بعینہٖ لے لی گئی ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے نصف سے اردو میں فارسی' عربی زبانوں کے علاوہ انگریزی زبان سے بھی ترجمہ ہونے لگا تھا' لیکن یہ ترجمہ مذہبی نوعیت کا تھا 1794ء میں مہر چند کھتری مہر نے مشہور فارسی قصے ''سمن رُخ و آذر شاہ'' کا ترجمہ ''نو آئین ہند'' یا ''قصہ ملک محمد و گیتی افروز'' کے نام سے کیا۔ اس ترجمے کا مقصد انگریزوں کو اردو زبان سکھانا تھا اس لیے اس کی زبان آسان اور سادہ ہے' جس میں اردو شعرا کے اشعار بھی دیے گئے ہیں۔

اردو میں منصوبہ بند ترجمے کا آغاز کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہوا۔ جس کا مقصد ہندوستان میں تعینات انگریزوں کو اردو زبان سکھانا تھا۔ اس کالج کے تحت عربی' فارسی' سنسکرت اور دیسی زبانوں سے تقریباً ساٹھ کتابوں کے ترجمے اردو میں ہوئے' جن میں زیادہ تر کتابیں ادبی تھیں۔ کالج کے ان ترجموں نے اردو نثر کو نئے اسلوب اور نئی جہت بخشی۔ چوں کہ کالج کے اکثر ترجموں میں آزاد ترجمے کے اصول برتے گئے اس لیے یہ ترجمے قبل کے تراجم کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کا سب سے اہم ادبی ترجمہ ''باغ و بہار'' ہے' جسے 1802ء میں میر امن نے فارسی قصے ''چہار درویش'' کے ترجمے کے طور پر پیش کیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جملے' روانی' سادگی اور پرکاری اس ترجمے کی اہم خصوصیات ہیں۔ میر امن نے 1802ء میں فارسی کی کتاب اخلاق محسنی ''گنج خوبی'' کے نام سے ترجمہ بھی کیا لیکن یہ ترجمہ باغ و بہار کے مقابلے میں پست ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ ہونے والی چند اہم داستانیں و کتب مندرجہ ذیل ہیں :

توتا کہانی (1801ء)	حیدر بخش حیدری	ترجمہ۔ فارسی طوطی نامہ۔ سید محمد قادری
آرائش محفل (1805ء)	حیدر بخش حیدری	ترجمہ۔ فارسی زبان سے
قصہ لیلیٰ مجنوں (1801ء)	حیدر بخش حیدری	ترجمہ۔ فارسی زبان سے
بیتال پچیسی	مظہر علی ولا و للولال	ترجمہ۔ برج بھاشا سے۔ بیتال پنچ ویشا تکا
قصہ مادھونل و کام کندلا	للولال' مظہر علی ولا	ترجمہ۔ برج بھاشا سے
شکنتلا۔ (کالی داس) 1801ء	کاظم علی جوان	ترجمہ۔ برج بھاشا سے
داستان امیر حمزہ (1801ء)	خلیل خاں اشک	ترجمہ۔ کسی فارسی نسخے سے
اخلاق ہندی	بہادر علی حسینی	ترجمہ۔ فارسی کی ہتوپدیش کا
مذہب عشق	نہال چند لاہوری	ترجمہ۔ فارسی قصہ گل و بکاولی کا
خرد افروز	حفیظ الدین	ترجمہ۔ کلیلہ و دمنہ پر مبنی عیار دانش کا

باغ اردو	شیر علی افسوس	ترجمہ۔فارسی گلستان۔شیخ سعدی
باغ سخن	مرزا مغل	ترجمہ۔فارسی بوستان۔شیخ سعدی

فورٹ ولیم کالج کے باہر ترجمہ ہونے والی داستانوں میں رجب علی بیگ سرور کی داستان ''شگوفۂ محبت'' ہے جسے سرور نے 1856ء میں منشی شیو نرائن کی فرمائش پر کسی عربی نسخے سے ترجمہ کیا تھا۔ بیم چند کھتری نے داستان ''گل صنوبر'' کا 1836ء میں ترجمہ کیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں داستانوں کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ اس دور میں ''بوستان خیال'' اور ''داستان امیر حمزہ'' کے متعدد تراجم منظر عام پر آئے۔ ان مترجمین میں مرزا محمد حسن عسکری عرف چھوٹے آغا' مرزا محسن علی خاں عرف آغا بجو' پیارے مرزا' منشی تصدق حسین' احمد حسین قمر' محمد حسین جاہ' لالہ انبا پرشاد رسا لکھنوی اور غلام رضا رضا اہم ہیں۔

دہلی کالج (1842ء)' سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی (1862ء)' شمس الامرا دارالترجمہ' حیدر آباد (1843ء) انجمن ترقی اردو ئے ہند (1903ء)' دارالمصنفین' اعظم گڑھ (1913ء)' عثمانیہ دارالترجمہ (1917ء) وغیرہ ترجمے سے متعلق اداروں میں زیادہ توجہ علمی اور سائنسی موضوعات کے ترجموں پر دی گئی۔ اس لیے ان اداروں کے تحت ادبی تراجم بہت کم منظر عام پر آئے۔ اردو میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے علوم کے ترجمے کا آغاز 1843ء میں شمس الامرا کے دارالترجمہ سے ہوتا ہے۔ لیکن مغربی نثری ادب کے ترجموں کی ابتدا انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہوتی ہے۔ اس دور میں انگریزی کے مختصر افسانوں' ناولوں' انشائیوں' ڈراموں اور سفرناموں وغیرہ کو سرعت کے ساتھ اردو میں منتقل کیا گیا' جس کے نتیجے میں ہندوستان کی آزادی سے قبل اردو زبان میں مغربی ادب کا ایک وافر ذخیرہ ہوگیا اور سینکڑوں مترجمین پیدا ہوگئے۔ ان ابتدائی مترجمین میں مولانا محمد حسین آزاد' سر عبدالقادر' آغا حشر کاشمیری' سجاد حیدر یلدرم' نیاز فتحپوری' قاضی عبدالغفار' مرزا ہادی رسوا وغیرہ کے علاوہ اور اہم نام بھی ہیں۔ بیسویں صدی میں 1930ء کے بعد اردو میں انگریزی کے علاوہ فرانسیسی' جرمن اور روسی زبانوں کے ادب پر بھی توجہ دی گئی اور بہت سے ناولوں' افسانوں وغیرہ کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ عنایت اللہ دہلوی' عبدالرحمٰن بجنوری' سجاد ظہیر' مجنوں گورکھپوری' عابد حسین' منٹو' پروفیسر مجیب' قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین وغیرہ مترجمین نے ترجمے کی روایت کو مستحکم کیا۔ مغربی ادبی تراجم کی روایت کو استحکام بخشنے کے لیے 1927ء میں ہندوستانی اکیڈمی اور اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تحت جرمن ڈرامہ نگار ینگ اور انگریزی ڈرامہ نگار گالزوردی کی تخلیقات کا ترجمہ کیا گیا' جب کہ اردو اکیڈمی نے علمی کتابوں کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے ناولوں اور افسانوں کے تراجم پر بھی زور دیا۔ مغربی ادب کے ان تراجم کے نتیجے میں ہی آج اردو ادب میں داستان کو چھوڑ کر ساری نثری اصناف انگریزی سے مستعار ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ادبی ترجمے کی تعریف بیان کیجیے۔
2. اردو میں شعری و افسانوی ترجمے کا آغاز کب ہوا؟

8.3 ادبی تراجم کی اہمیت و افادیت

ادب انسان و کائنات کے درمیان رشتوں کا محسوساتی اور اکتشافی اظہار اور انسانی جبلتوں و خواہشوں اور ان کے وجدان کا مظہر ہوتا ہے۔ ادب ایک طرف حظ اور سکون کا باعث ہوتا ہے تو دوسری طرف عقل و فکر کو مہمیز کرنے کا آلہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ایک متمول ثقافت کے معنی ہیں دوسرے علوم و فنون کے ساتھ اعلیٰ ادبی شاہ کاروں کا موجود ہونا۔ ادب انسان کی ترقی اور اس کی حریت و آزادی کی علامت اور ضمانت ہوتا ہے۔ اسی لیے انسان سب سے زیادہ ادبی شاہکاروں سے متاثر ہوتا ہے' نتیجتاً اس میں زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی صلاحیتیں جلا پاتی ہیں یعنی انسان کی بنیادی اور مخفی صلاحیتوں کو اظہار کا وسیلہ حاصل ہو جاتا ہے۔ تہذیبیں فقط سیاسی و معاشی برتری یا خوش حالی کی بنیاد پر اعلیٰ و ادنیٰ نہیں ہوتیں بلکہ یہ معیار علم و فن اور ادب کے تناظر میں متعین ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ یونان پر روم کے تسلط کے بعد بھی یونانی ادب و تہذیب رومیوں کے لیے متاثر کن اور باعث تقلید تھے بلکہ بعد کے تمام

ترقی یافتہ معاشروں نے یونانیوں سے فیض حاصل کیا۔ عالمی تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو دنیا کی مختلف زبانوں میں ابتدا ہی سے اعلیٰ اور تخلیقی ادب پیدا ہوتا رہا ہے۔ اعلیٰ ادب کے لیے یہ لازمی شرط ہے کہ اس میں انسانی زندگی اور کائنات کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ ہو' اس میں زندگی اور اس کے مظاہر کی معنویت اور مقصدیت شامل ہو۔ اس لیے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا میں اعلیٰ ادب کے ابتدائی نمونے مذہبی اور الہامی کتابوں کی صورت میں ہوتے ہیں کسی تہذیب میں تصورِ انسان اور تصورِ کائنات بڑی حد تک ان الہامی کتب سے ہی قائم ہوتا ہے۔ یونانی ادب کے معمار ہومر کی تخلیقات ایلیڈ اور اوڈیسی جنہیں آج ہم کلاسک کا درجہ دیتے ہیں' افلاطون کے عہد تک ان کی قدر و قیمت مذہبی صحیفے سے کم نہیں تھی۔ اس اعتبار سے ادبی ترجمے کی معنویت اور اہمیت وافادیت واضح اور نمایاں ہے۔ اس اہمیت وافادیت کی دو جہتیں ہوتی ہیں (1) معنوی یعنی خیال و تصور کی سطح پر (2) لفظی یعنی زبان اور اسلوب کی سطح پر:

1) **معنوی جہت** : اس جہت کے تحت ایک قوم دوسری قوم کے خیالات' نظریات' تخیلی نیرنگیوں اور جمالیاتی و اخلاقی قدروں سے استفادہ کرتی ہے یا باہم دگر دو قومیں سچائیوں اور صداقتوں کی توثیق کر کے یکجہتی و یگانگت کو مستحکم کرتی ہیں اور اپنے ذہن و وجدان میں وسعت پیدا کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے ادبی ترجمہ تہذیبی نشو و نما کا باعث ہوتا ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عرصے کے بعد ایک تہذیب کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں' جس کے نتیجے میں اس کے افراد علاحدگی اور تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ادبی ترجمہ اس مردہ جسم میں روح پھونکتا ہے جس کے وسیلے سے مختلف گروہوں کے درمیان انسانیت اور انسان دوستی کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اسی انسانیت اور انسان دوستی کی خصوصیات سے ادب کی آفاقی قدریں متعین ہوتی ہیں۔

2) **لفظی جہت** : اس جہت کے تحت ایک زبان دوسری زبان کے ادب سے وسعت و گہرائی اور فکری بلندی کی خصوصیات حاصل کرتی ہے اور ایک زبان دوسری زبان کی ذیلی ساخت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نئے خیالات اور نئے احساسات کو بیان کرنے کے لیے زبان میں نئے اسلوب پیدا ہوتے ہیں' زبان میں نئے نئے الفاظ شامل ہوتے ہیں یا پرانے الفاظ کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی ہے یا انہیں ایک نئے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور نئے محاورے اور ضرب الامثال پیدا ہوتے ہیں یا ان سے آشنائی ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ایک زبان میں استحکام اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ ایک ترقی یافتہ زبان کے معنی یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات و تصورات کو بیان کرنے کی صلاحیت ہو۔ ادبی ترجمے کے وسیلے سے زبان کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ ادبی ترجموں کی اسی معنویت اور افادیت کے پیش نظر مغربی کلاسیکیت پسند حضرات اعلیٰ ترجموں کو تخلیقی فن پاروں کے ہم پلہ قرار دیتے تھے۔ اردو میں بھی قلی قطب شاہ کے عہد سے لے کر غالب کے دور تک ترجمے کو ایک صنعتِ معنوی قرار دیا جاتا تھا اور بغیر ماخذ کے حوالے کے ترجمہ کو اپنی تخلیق کا حصہ بنا لیا جاتا تھا۔

اردو کے تناظر میں اگر ترجمے کی اہمیت پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو کا ابتدائی ادب سولھویں صدی کے ربع اول تک جامہ ہندی روایت کے زیر اثر تھا۔ اس لیے اس میں وہ بلندی و توانائی نہیں پیدا ہوئی تھی' جو اعلیٰ ادب کے لیے ضروری ہوتی ہے' لیکن اسی زمانے میں جب فارسی سے اردو میں ادبی تراجم کا دور شروع ہوا تو اردو زبان و تہذیب نے ترقی و عروج کے مراحل طے کرنا شروع کر دیے۔ ان ادبی تراجم نے اردو زبان و ادب کی اس طرح کایا پلٹ دی کہ فارسی تہذیب اور پرایہ احساس نے ہندی روایت پر حاوی ہو کر اور اس سے آمیز ہو کر ایک نئی تہذیب ''ہند ایرانی تہذیب'' کو استقامت بخشی۔ بقول جمیل جالبی اگر فارسی روایت ہندوی روایت کو اس طور پر نہیں بدلتی تو اس براعظم کی قدیم تہذیب گل سڑ کر کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔ یعنی یہ کہ اردو نے اپنی بقا کا انتظام بھی کیا اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کو بھی نئی زندگی دی۔ ادبی ترجموں کے وسیلے ہی سے اردو زبان کی ساخت' اس کا پیرایۂ اظہار' اسلوب اور اس کی مستعمل قدیم و جدید اصناف پیدا ہوئیں۔ یعنی غزل' قصیدہ' مثنوی' رباعی' قطعہ' نظموں کی ہئتیں' عروض و بلاغت' داستان و حکایت فارسی ادب کے وسیلے سے اردو میں آئیں اور ناول' افسانہ' ڈرامہ' انشائیے' سفرنامے' آزاد نظم' نثری نظم' تنقید وغیرہ اصناف مغربی ادب کے وسیلے سے ظہور پذیر ہوئیں۔ معنوی جہت کے تحت تصورِ عشق' تصورِ کائنات' تلمیحات' علامات' غرض کہ اردو کی پوری شعریات فارسی اور بعد میں مغربی زبانوں کے ادب کی مرہون منت ہے۔ ادبی تراجم کی بدولت ہی اٹھارھویں صدی کے آخر تک اردو زبان و ادب اس قدر متمول اور مستحکم ہو چکا تھا کہ بقول مصحفی ریختہ ہمارے زمانے میں فارسی کے اعلیٰ مرتبے کو پہنچ چکا ہے بلکہ اس سے بہتر ہو گیا ہے۔ یعنی انیسویں صدی کے آخر تک اردو کا کلاسیکل ادب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا

تھا۔جس کے نتیجے میں اس کا زوال آمادہ ہونا منطقی تھا۔اس لیے انیسویں صدی کے آخر میں مغربی زبان وادب سے رجوع کرنا ناگزیر تھا جس کے باوصف اردو میں انگریزی زبان وادب کے ترجمے کا کام شروع ہوا۔اور اردو زبان وادب نے اپنی نشوونما کے ایک بار پھر سامان فراہم کیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. معنوی جہت سے ادبی ترجمے کی کیا اہمیت ہے؟
2. لفظی جہت سے اردو میں ادبی ترجمے کی اہمیت بیان کیجیے۔

8.4 ادبی ترجمے کے مسائل

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ادبی ترجمہ ایک تہذیب اور اس کے جمالیاتی عناصر کو دوسری تہذیب میں یکساں اثر آفرینی کے ساتھ منتقل کرنے کا عمل ہے۔اس لحاظ سے علمی ترجموں کے مقابلے میں ادبی ترجمہ سب سے زیادہ مشکل عمل ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمہ شدہ متن میں یکساں آفرینی پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے یعنی ترجمہ شدہ متن بھی اسی پائے کا ادب ہو۔مترجم کی یہ ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ ترجمے کو اصل کے متبادل کے طور پر پیش کرے۔ ظاہر ہے اس کشمکش کی صورت حال سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جن میں سے بعض مسائل ناقابل حل ہوتے ہیں۔کسی ادبی ترجمے کے پانچ مدارج ہوتے ہیں۔ (1) ادبی متن کا انتخاب (2) متن کی کلی تفہیم (3) متن سے ہم آہنگی (4) ترسیل وابلاغ (5) ترجمہ شدہ متن کا ادب پارہ ہونا۔ ترجمے کے ان پانچوں مدارج کے جداگانہ مسائل ہوتے ہیں۔آیئے ان مسائل پر غور کرتے ہیں۔

1) ادبی متن کا انتخاب:

اس مرحلے میں مترجم اپنی لیاقت، ذہانت اور ادبی ذوق وشوق کے اعتبار سے ادبی متن کو ترجمے کے لیے منتخب کرتا ہے۔اس انتخاب میں مترجم متن سے پوری وفاداری نبھانے کے لیے پابند ہو جاتا ہے۔اس لیے مترجم کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ متن کی اصل زبان، اس کا عہد، اس وقت کی تہذیب وثقافت اور سماجی و جمالیاتی قدروں کے ساتھ سیاسی وسماجی حالات سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ادبی ترجمے کے لیے دو زبانوں کا جاننا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے دو تہذیبوں سے واقفیت ضروری ہے۔اس کے ساتھ ہی متن کی قدر و قیمت، اس کے ترجمے کی ضرورت اور اہمیت و افادیت کا تعین بھی مترجم کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تہذیب دوسری تہذیب سے وہی چیزیں اخذ کرنا چاہتی ہے۔جو اس کی نشوونما میں معاون ہوں۔اس کے لیے ہر ادب پارہ اہم نہیں ہوتا۔اس ذیل میں مترجم کو اپنے عہد کی سیاسی وسماجی صورت حال، نظریات و میلانات، اس عہد کے ادبی ذوق ومزاج اور ذرائع ترسیل وابلاغ کے رویوں کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔قدیم اردو ادب میں زیادہ تر صوفیانہ نظریات واقدار کو فروغ دینے والے شعری وافسانوی فن پاروں کے ترجمے کیے گئے۔بقول شبلیؔ صوفیانہ خیالات واقدار سے استفادے کی بدولت ہی فارسی شعروادب دنیا کے اعلیٰ ادبوں میں شامل ہے۔جب کہ اس عہد میں نظامیؔ اور دوسرے شعرا کے قصائد وہجویات کے نمونے بھی تھے۔ اسی طرح سرسید تحریک کے دوران مغرب سے حقیقت پسندانہ ادب اور دور الیزابیتھ کے ادب کے تراجم ہوئے اور بقیہ بلند پایہ تخلیقات سے صرف نظر کیا گیا، جس کا ترجمہ بعد کے زمانے میں ہوا۔ان تمام مثالوں کا مقصد یہ ہے کہ ادبی ترجمہ دراصل لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے باعث تربیت ہوتا ہے۔جس زمانے میں جیسا ادب تخلیق ہوتا ہے، اسی طرح کے فن پارے بھی ترجمے ہوتے ہیں۔اس لیے انتخاب متن ایک مسئلہ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام معیارات کو برقرار رکھنا مشکل ترین امر ہے۔

2) متن کی کلّی تفہیم

اس مرحلے میں انفرادی متن کا مطالعہ اور اس کی کلی تفہیم وابلاغ کا عمل ہوتا ہے۔اس مرحلے میں مترجم فن پارے کی تہذیب، زبان، بیان، مصنف

کے بارے میں آ گہی' اس کی فکر' جذبے' نقطۂ نظر' لہجے اور اسلوب کی پوری طرح تفہیم کرتا ہے۔ اس مرحلے میں مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض فن پارے کلّی طور پر اور بعض جزوی طور پر ایسے ہوتے ہیں' جن میں ایک سے زیادہ لہجے (Tones) ہوتے ہیں اور ہر لہجے سے متن کے مختلف معنی برآمد ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض فن پاروں میں ایسا وجدانی تجربہ بیان ہوتا ہے' جس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے' لیکن اس کے اظہار سے اس کی معنویت ختم ہو جاتی ہے یا بعض فن پاروں میں اس قدر ابہام ہوتا ہے' جس کو اصل زبان میں ہی بیان کیا جا سکتا ہے یا اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس مرحلے میں ذرا سی لغزش فن پارے کی پوری جہت کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ متن کی کلی تفہیم کی وجہ سے ہی ایک متن کے دو ترجموں میں بڑا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جب کہ مترجم اپنے طور پر پوری طرح دیانت دار ہوتا ہے۔

3) متن سے ہم آہنگی

اس مرحلے میں مترجم متن کو اپنے ذہن و دل اور وجدان کا حصہ بناتا ہے یعنی تخیلی سطح پر متن کا تجربہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ہم آہنگی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب فن پارہ مترجم کے ذوق و مزاج اور طبیعت کے میلان کے مطابق ہو گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مترجم کا ذوق و مزاج فن پارے پر حاوی ہو جائے' فن پارے کا مزاج ہر حال میں مقدم ہوتا ہے۔ مترجم کو ہر حیثیت سے فن پارے کے مزاج میں ڈھلنا ہوتا ہے۔ مترجم کی فن پارے سے یہ ہم آہنگی ہی تخلیقی ترجمے کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ اسی ہم آہنگی کے وسیلے سے اصل معنی آفرینی اور اثر آفرینی کی ترجمے میں بازیافت ہوتی ہے۔ یہ ہم آہنگی ایک بڑا مسئلہ ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ تمام قابلیتوں اور مہارتوں کے باوجود مترجم کے لیے دوسری زبان اور تہذیب اکتسابی ہی ہوتی ہے اس لیے فلم کے ناظرین کی طرح تخیلی سطح پر وہ لاکھ خود کو فلم کا ہیرو تصور کرے لیکن وہ رہتا ناظر ہی ہے۔

4) ترسیل و ابلاغ

اس مرحلے میں مترجم' فن پارے کے معنی و مفہوم' اس کے وجدانی و تخیلی تجرات اور اثر آفرینی کو قاری کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔ یہ مرحلہ سب سے مشکل ہوتا ہے۔ خود سمجھنے اور تجربے سے گزرنے سے زیادہ دوسروں کو سمجھنا اور تجربے سے آشنا کرانا مشکل ہوتا ہے۔ ترسیل و ابلاغ کا یہ مسئلہ تخلیق سے زیادہ ترجمے میں پیچیدہ ہوتا ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف الفاظ و خیال کے انتخاب میں آزاد ہوتا ہے' جب کہ مترجم مصنف کا پابند ہوتا ہے۔ ایسی دو زبانیں جو اپنی تہذیب اور مزاج کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہوتی ہیں' کسی حد تک اس مسئلے کو حل کر لیتی ہیں یعنی وہاں اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ کوئی لفظ یا ترکیب ترجمے میں من و عن رکھ لی جائے جیسے فارسی' ہندی' عربی وغیرہ زبانوں سے اردو میں ترجمہ۔ لیکن وہ زبانیں جن کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے وہاں ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا ہے جیسے انگریزی' فرانسیسی' روسی اور دیگر مغربی زبانوں سے اردو میں ترجمے۔ خصوصاً یہ مسئلہ شعری ترجمے میں ناقابل حل ہو جاتا ہے۔ انگریزی کی منظوم شاعری کو اردو میں نظم کے اسی اثر کے ساتھ پیش کرنا ناممکن ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا صوتی نظام اور عروض و آہنگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اسی لیے شیلی نے شاعری کے ترجمے کو شاعری کی موت کے مترادف قرار دیا تھا۔

5) ترجمہ شدہ متن کا ادب پارہ ہونا

یعنی کوئی فن پارہ ترجمہ ہو کر بھی فن پارہ ہے اور اسے اصلی فن پارے کے مقابلے میں رکھا جا سکے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فن پارے کا ترجمہ ترسیل کے نقطہ نظر سے بھرپور ہوتا ہے لیکن اس کی اپنی ادبی حیثیت کوئی نہیں ہوتی۔ فقط اس ترجمے کو پڑھ کر اصلی فن پارے کی ادبی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ جس کی مثال قرآن کے لفظی تراجم ہیں۔ قرآن ایک مذہبی کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ عربی ادب کا ایک بلند ترین نمونہ بھی ہے لیکن اس کے تراجم کو بعض اوقات بلند ترین تو کیا ادب کہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے اس مرحلے میں مترجم کو فن پارے کے مرکزی خیال' جذبے اور تاثر کے ساتھ اس کے اسلوب و ہیئت کے مطابق ترجمے ہونے والی زبان کے ادبی مذاق کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اس ذیل میں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ادبی مذاقوں سے دیانت داری برتنا انتہائی مشکل ہے جس کے نتیجے میں ترجمے میں ترجمے پن کا عنصر پیدا ہونا ناگزیر

ہوتا ہے۔ یہاں مترجم کی یہ فن کاری ہوتی ہے کہ وہ ترجمے پن کے عنصر کو اس طرح برتے کہ وہ قارئین کے لیے قابل قبول ہو۔

8.4.1 افسانوی ادب سے مختص تراجم کے مسائل

شاعری کے مقابلے میں افسانوی ادب' زبان کی تہذیبی فضا کو زیادہ وضاحت وصراحت کے ساتھ سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لیے افسانوی ادب کے تراجم کے لیے دو زبانوں کی ثقافتی جزئیات سے واقفیت لازمی امر ہے۔ یہ واقفیت خود ایک مسئلہ ہوتی ہے۔ افسانوی ادب میں بیان ہونے والے مقامات' رسم ورواج' طرز معاشرت' مسائل' عقائد اور اسی قسم کے دوسرے امور جو فن پارے کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں اور جن کی رو سے فن پارے میں معنی پیدا ہوتے ہیں ترجمے کے عمل میں ایک مسئلہ ہوتے ہیں۔ اس مسئلے کو کسی حد تک وضاحتی نوٹ سے حل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود متن کے بین السطور معنی یعنی وہ معنی جو الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیے گئے ہیں' ترجمے میں ان کی جھلک بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ الفاظ کی صورت اور آہنگ سے بننے والے پیکر' تجنیس جیسی رسم الخط اور تلفظ پر مبنی صنعتیں' رعایت لفظی' مناسب الفاظ' مرصع اور مسجع نثری نمونے' جامع ترجمے کے عمل میں شکست خوردہ ہو جاتے ہیں' جیسے اردو کی داستانیں اور انشائیے نہ صرف بیانیہ کی وجہ سے جاذب نظر ہیں بلکہ ان کا حسن صنعتوں کے بہترین استعمال میں بھی ہے۔ دیانت دارانہ ترجمے کی صورت میں اگر مترجم کسی طرح ان مسائل پر قابو پانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری زبان کی تہذیب میں ان امور کی قدر و قیمت کیا ہے۔ ممکن ہے دوسری تہذیب میں یہ امور ترسیل کی راہ میں مخل سمجھے جاتے ہوں۔ اس لیے بقول انتظار حسین افسانوی ادب کے ترجمے میں دو نثری روایتیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتی ہیں اس لیے ان روایتوں میں مفاہمت پیدا کرنا مترجم کی فن کاری کی دلیل ہوتا ہے۔

8.4.2 شعری تراجم سے مختص مسائل

نثر کا بنیادی اسلوب ترسیلی اور وضاحتی ہوتا ہے' جب کہ شاعری رمز وایما اور علامتی اسلوب کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شعر میں وزن' قافیہ وردیف کا بھی التزام ہوتا ہے۔ شعر کی یہی مجموعی ہیئت اس کی اثر آفرینی اور وجدانی تجربے کا باعث ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے شاعری کا ترجمہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ شاعری کے ترجمے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ترجمے کے بعد بھی شاعری رہے۔ عجیب قسم کا نثری نمونہ نہ بن جائے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ نظم میں ہی ہونا چاہیے۔ نثری ترجمے سے اس کا شعری لطف زائل ہو جاتا ہے۔ چوں کہ ہر زبان کا عروضی اور صوتی نظام جدا ہوتا ہے اور مختلف اثرات کا حامل ہوتا ہے اس لیے شعر کی اصلی کیفیت کا ترجمہ ناممکن ہے۔ دوسرا مسئلہ ترسیل وابلاغ کا ہے۔ شاعری چونکہ رمز وایما اور علامتی اسلوب کی حامل ہوتی ہے اور زندہ علامتیں اپنے اندر کئی معنوی جہت رکھتی ہیں۔ اس لیے علامتی لفظ کے بدلنے سے نظم کی پوری کائنات درہم برہم ہو جاتی ہے۔ شاعری کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ ایک متن کی مختلف قرأتوں سے مختلف معنی برآمد ہوں۔ شاعری میں معنی آفرینی کی خوبی زبان وبیان اور لفظیات کے مخصوص استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ رعایت لفظی' مناسب الفاظ' الفاظ کے صوتی پیکر' ان کی غنائیت سب کچھ مل کر شعری معنی کی تشکیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ترجمے کے عمل میں ان تمام امور کا ایک ساتھ منتقل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ شاعری کے ترجمے میں صرف شاعرانہ خیال یا اس کا مضمون ہی ترجمہ ہو پاتا ہے۔ بقیہ فنی نزاکتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ شعری ترجمے کے ان ہی مسائل کے پیش نظر شیلی نے شاعری کے ترجمے کو شاعری کی موت قرار دیا تھا۔ ایذرا پاونڈ نے ترجمے کے نقطہ نظر سے شاعری کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

1) فونوپوئیا Phonapoeia : ایسی شاعری جس کا ترجمہ کسی حد تک ممکن ہے۔ اردو میں جیسے مثنوی کی بیانیہ شاعری یا ترقی پسندانہ خطابیہ شاعری یا سادہ شاعری
2) میلوپوئیا Melopoeia : ایسی شاعری جس کا ترجمہ ناممکن ہے اردو میں جیسے علامتی نظمیں غزلیہ شاعری
3) لوگوپوئیا Logopoeia : ایسی شاعری جس کا ترجمہ ناممکن ہے لیکن اصل خیال کی جھلک ترجمے میں آسکتی ہے اردو میں جیسے فکری وفلسفیانہ اور خیال بندانہ شاعری

آخر میں انگریزی اور جرمنی نظموں کے کچھ منظوم ومنثور یعنی نثری ترجموں کو ملاحظہ کیجیے :

جرمنی ادب کے مایہ ناز ڈراما نگار اور شاعر گوئٹے کی شاہ کار تخلیق ''فاؤسٹ'' کا نثری ترجمہ عابد حسین نے کیا ہے اور اس کا منظوم ترجمہ منور لکھنوی نے۔ ان دونوں ترجموں کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

	عابد حسین	منور لکھنوی
شاعر!	میرے سامنے اس رنگ برنگ مجمع کا نام	کیوں ذکر مجھ سے آخر اس بھیڑ بھاڑ کا ہے
	نہ ہو جسے دیکھ کر رفعتِ خیال رخصت	منظر یہ دیکھ کر دل الجھن میں پڑ گیا ہے
	ہو جاتی ہے مجھے اٹھتی ہوئی لہروں کا یہ	چڑھتی ہوئی ندی اک یہ بھیڑ واقعی ہے
	سیلاب نہ دکھاؤ جو ہمیں زبردستی	اک اک نفس میں کتنی وحشت بھری ہوئی ہے
	اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے	

ان دونوں اقتباسوں کے تقابل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عابد حسین کا ترجمہ بہت پُر شکوہ ہے اور منور لکھنوی کا ترجمہ سادہ اور بے روح ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اصل متن کا یہ اقتباس نہ تو اتنا سادہ ہے نہ ہی اتنا پر شکوہ۔

انگریزی زبان کے شاعر Frazer کی ایک نظم کے دو اردو منظوم ترجمے ملاحظہ کیجیے۔

Epitaph	لوح مزار : منظور الدین خاں	لوح مزار : حسین الدین احمد
Stop, stranger stop	راہرو ٹھہر ذرا سنتا جا	ذرا اجنبی چلتے چلتے تو رک جا
As you pass by	تو اب جس حال میں ہے	تو جیسا ہے اب ایک میں بھی وہی تھا
So you are now	میں کبھی ایسا ہی تھا	ہوں جیسا میں اب، کل ترا حال ہوگا
Once was I	کل تجھے میری طرح ہونا ہے	تو نقش قدم پر مرے چل خدارا
So I am now, you	ایسا کچھ کر کے یہاں	
Once must be	سے تو چل	
Therefore? proper to follow me	(کہ بہت یاد رہے)	

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اردو ترجمے میں نظم کی ساری کیفیت، زائل ہو گئی، وہ سوز و گداز جو انگریزی نظم میں ہے اردو ترجمے میں نہیں ہے اس کے بعد وہ Therefore? کے بعد سوالیہ نشان سے شاعر نے جو مبہم معنویت پیدا کی ہے اردو نظموں نے اس کی وضاحت کر کے اس کو زائل کر دیا۔

8.5 خلاصہ

اردو زبان میں ترجمے کا آغاز اس کے ابتدا سے ہی ہو گیا تھا۔ اردو کے ابتدائی عہد میں الفاظ، محاوروں، ضرب الامثال، جستہ جستہ اشعار کا ترجمہ فارسی زبان سے ہوا۔ اردو میں باقاعدہ ادبی ترجمے کا آغاز قلی قطب شاہ کے عہد سے ہوتا ہے اس زمانے میں فارسی کی مثنویوں کو اردو میں مثنوی کی ہیئت میں ترجمہ کیا گیا۔ اردو ادب میں ترجمے کی مستحکم روایت کی وجہ سے ہی اردو میں بہت جلد اعلیٰ پائے کا ادب تخلیق ہونے لگا اور انیسویں صدی تک اردو کے کلاسیکی ادب نے اپنے نقطۂ عروج کو حاصل کر لیا۔ اس لحاظ سے ادبی ترجمے کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ ادبی ترجمہ ایک بہت مشکل فن ہے۔ اس کے لیے دو تہذیبوں سے واقفیت بہت ضروری ہے لیکن ترجمے کے بعض مسائل ایسے ہیں جو مترجم کی تمام صلاحیتوں کے بعد بھی نا قابل حل ہوتے ہیں۔ نثری ترجمے میں تہذیبی جزئیات مسائل کھڑا کرتی ہیں جب کہ شعری ترجمے میں اس کی مجموعی ہیئت، وزن قافیہ وغیرہ۔ اس لیے بعض صورتوں میں شعری ترجمہ ناممکن ہوتا ہے۔

8.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اردو میں ادبی ترجمے کی روایت پر اظہارِ خیال کیجیے۔
2. شعری تراجم کی روایت پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. ادبی ترجمے کی اہمیت بیان کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. شاعری کا مکمل ترجمہ کیوں ناممکن ہے؟ بیان کیجیے۔
2. افسانوی ادب سے مختص تراجم کے مسائل کون سے ہیں؟
3. ادبی تراجم کے مسائل بیان کیجیے۔

8.7 فرہنگ

آفاقی = ساری دنیا کا۔عالم گیر ابلاغ = پہونچانا، بھیجنا

استقامت = استقلال، کسی امر پر مضبوط رہنا اسلوب = طریقہ، طرزِ تحریر، روش

اکتشاف = کسی نامعلوم بات کا دریافت کرنا تعامل = آپس میں عمل کرنا

توثیق = تصدیق، مضبوط کرنا پیکر = چہرہ، شکل، صورت

جمالیات = حسن شناسی، فلسفہ کی وہ شاخ جس میں حسن اور اس کے لوازم سے بحث کی جاتی ہے۔

بازیافت = کھوئی ہوئی چیز کی دستیابی، بازیابی ترکیب = مرکب کرنا، بناوٹ، تدبیر

رمزوایما = اشارہ، غمزہ، عشوہ لسانی گروہ = کسی زبان کو بولنے والا طبقہ

ہئیت = بناوٹ، شکل، حالت، وہ علم جس میں اجرام فلکی وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

مَظہر = ظاہر ہونے کی جگہ، تماشا گاہ غنائیت = موسیقیت، نغمے کی کیفیت

علامت = نشان، آثار، اشارہ معنی آفرینی = معنی پیدا کرنا

مصنفی ترجمہ = جب مصنف خود اپنی کتاب کا ترجمہ کسی دوسرے زبان میں کرتا ہے تو اسے مصنفی ترجمہ کہتے ہیں

مُظہر = بیان کرنے والا، گواہ

8.8 سفارش کردہ کتابیں

1. خلیق انجم — فن ترجمہ نگاری
2. ڈاکٹر قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت
3. اعجاز راہی — اردو زبان میں ترجمے کے مسائل
4. Jordon, Albert : Translation and Interculture understanding
5. Naide, Eugene, A. Theories of Translation

اکائی 9 : نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

ساخت

9.1 تمہید

9.2 نثری ترجمہ :اصول وتقاضے

9.3 منظوم ترجمہ :اصول وتقاضے

9.4 نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

9.5 خلاصہ

9.6 نمونۂ امتحانی سوالات

9.7 فرہنگ

9.8 سفارش کردہ کتابیں

9.1 تمہید

انسانی سماج ہمہ لسانی ہے۔مختلف خطہ ہائے زمین پر رہنے اور بسنے والوں کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ایک ہی ملک میں الگ الگ زبانیں بولی جاتی ہیں۔خود ہمارا ملک ہندوستان اس کی مثال ہے۔اس ہمہ لسانی انسانی سماج میں ایک دوسرے کے جذبات' خیالات' احساسات' افکار واحوال سے واقفیت کے لیے ترجمے کا عمل ناگزیر ہے۔یہی وجہ ہے کہ جس زمانے سے انسان نے لکھنا' پڑھنا' سیکھا اور اپنے افکار وخیالات نیز جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے تحریر کا سہارا لینے لگا تقریباً اسی زمانے سے ترجمے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔جیسے جیسے نظم ونثر کی صورتیں متعین ہوتی گئیں اور ہمارا تحریری سرمایہ نظم ونثر کے دو اہم خانوں میں تقسیم ہوتا گیا ویسے ہی تحریر کی ان دو صورتوں یا اظہار کے ان دو طریقوں کے اصول وضوابط بھی متعین کیے جانے لگے۔اظہار کے ان دو طریقوں میں جب انسان کا احساسِ جمال' اس کا تخیل' اس کے مشاہدات اور جذبات کی شمولیت ہونے لگی تو اس اسلوبِ اظہار کو ادب کا نام دیا گیا۔تحریر وتقریر کی دو صورتیں نظم ونثر وجود میں آ ہی چکی تھیں۔اب ادبی اور ناراست طریقۂ اظہار کے لیے نظم کو مختص کر لیا گیا جب کہ نثر میں ادب کے علاوہ راست اظہاریے اور تحریر وتقریر کے دوسرے طریقوں کی بھی گنجائش رہی۔یعنی نثر میں لکھی گئی ہر تحریر یا کہی ہوئی بات ادب نہیں ہو سکتی۔ لیکن شعر میں یا نظم میں کہی جانے والی بات کن ہی ادبی تقاضوں کو برتتے ہوئے یا ہیئتی وصنفی لوازم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہی کہی جائے گی۔ظاہر بات ہے کہ ادبی اظہار کے ان دو طریقوں یعنی نظم ونثر کے اپنے اصول ہیں تو ان کے ترجمے کے عمل میں بھی مختلف اصولوں اور طریقوں کو برتنا ہوگا۔یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ جب ہم نظم ونثر کے مابین پائے جانے والے فرق کو سمجھیں کیوں کہ ترجمہ کامیاب اسی وقت ہو سکتا ہے جب نثری اور منظوم ترجمے کے تقاضوں سے کما حقہٗ واقفیت ہو۔اس اکائی میں ہم نثری اور منظوم ترجمے میں جو فرق پایا جاتا ہے' اس پر گفتگو کریں گے۔

9.2 نثری ترجمہ :اصول وتقاضے

ترجمہ خواہ نثری ہو یا منظوم' اس کی پہلی شرط مترجم کی ذولسانیت ہے۔اسے تصنیف اور ترجمے دونوں کی زبان سے واقف ہونا چاہیے۔یہ واقفیت ان دونوں زبانوں پر قدرت کی حد تک ہو۔یہ قدرت صرف دو زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ پر ہی نہیں ہو بلکہ ان کی سماجی اور ثقافتی روایت پر بھی ہونا لازمی ہے۔ ہر لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ مرادی معنی بھی ہوتے ہیں اور یہ سماجی وثقافتی سرگرمیوں اور عوامل سے جڑے ہوئے ہیں۔اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مترجم کو

دونوں زبانوں کی لغت' اصطلاحات' محاورے اور مترادفات سے پوری طرح واقف ہونی چاہیے۔ ترجمے کے سلسلے میں یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی نوعیت عمومی ہے یعنی ترجمہ خواہ کسی بھی طرح کا ہو' مترجم میں مندرجہ بالا خصوصیات کا ہونا لازمی ہے

جب ہم نثری تراجم کی گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد نثری ادب کا ترجمہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ترجمہ علمی کتابوں کے تراجم کے مقابلے میں کئی ایسی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے جو اسے محض لفظی ترجمہ نہ رہنے دیں بلکہ اس کی حیثیت بازتخلیقی ہو۔ کیوں کہ مترجم کو ادبی نثر پارے کے ترجمے کے وقت نہ صرف یہ کہ ایک زبان کے متن کو دوسری زبان کا جامہ پہنانا ہوتا ہے بلکہ اسے اس متن کی تاثراتی فضا' اس کی جمالیاتی سطح' اس کے تہذیبی حوالوں اور اس کے ادبی وفنی محاسن کو بھی ترجمے کے وقت نہ صرف یہ کہ برقرار رکھنا پڑتا ہے بلکہ ترجمے کی زبان کی تہذیب اور ادبی وفنی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔ یعنی ہمیں ایک ادبی فن پارے کو پوری طرح جذب کر کے ترجمے کی زبان میں اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ جذبے' خیال' رویے اور نظریے کی سطح پر کوئی ترمیم واضافہ نہ کیا گیا ہو۔ نثری ادب کے ترجمے میں جن اصول ولوازم کی اہمیت ہے ان پر ذیل میں گفتگو کی جارہی ہے۔

پہلا مرحلہ زبان کا ہے۔ مترجم کو تصنیف اور ترجمے دونوں کی زبان سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ نثری ادب پارے کی زبان علمی کتابوں کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ادبی تصانیف کی زبان راست اظہاریہ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس میں فکر وجذبے کی آمیزش کے ساتھ جمالیاتی کیف وانبساط کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ مختلف تہذیبی حوالے' لفظی ومعنوی تہہ داریاں' فکر وخیال کی نزاکت ونفاست اور جذبہ واحساس کی پیدا کردہ تاثراتی فضا ادبی نثر کا جوہر ہوتے ہیں۔ مترجم کو اس ادبی زبان کی متذکرہ بالا تمام خوبیوں کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے تصنیف اور ترجمہ دونوں کی زبانوں کے استعاراتی وتشبیہاتی نظام' تہذیبی اصطلاحات' ضرب الامثال اور روزمرہ سے گہری واقفیت ہونی چاہیے۔ اگر نثری ادب ایک افسانوی بیانیہ ہے تو مترجم کی ذمے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ افسانوی بیانیہ کا ایک جز مکالمہ بھی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مکالمے کی زبان خود تخلیق کار کی زبان سے مختلف ہوتی ہے کیوں کہ مکالموں کی ادائیگی کرداروں کے ذریعے ہوتی ہے اور یہ مکالمے کردار کے سماجی وتہذیبی پس منظر' اس کے سماجی مقام ومرتبے اور تعلیمی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہی ہوں گے۔ مثلاً گئودان کا ''ہوری'' ۔فردوس بریں کے ''شیخ علی وجودی'' کے لہجے میں گفتگو نہیں کرے گا۔ دونوں کا لہجہ ان کے اپنے سماجی پس منظر اور علمی مقام ومرتبے کے مطابق ہی ہوگا۔ مترجم جب ان ادب پاروں کا ترجمہ کرے گا تو اسے سماجی' علمی وتہذیبی پس منظر کے اس فرق کو نہ صرف یہ کہ سمجھنا ہوگا بلکہ کوشش کرنی ہوگی کہ کرداروں کی گفتگو کے اس فرق کی جھلکیاں ترجمے میں بھی نظر آئیں۔ بیدی کے ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' کا کردار تلو کے ایک تانگے والا ہے۔ شراب پی کر اپنی بیوی رانو کو روزانہ زدوکوب کرنا اس کا معمول ہے۔ رانو سے اس کی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

''کتیے کنجریئے!.....میں تجھ سے باگ کھینچ کر بات کررہا ہوں اور تو ہے کہ چھوٹتے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوگئی''

دوران گفتگو ''باگ'' اور ''گھوڑے'' کے الفاظ تلو کے کے سماجی پس منظر کے عین مطابق ہیں۔ یہ الفاظ اس کے پیشے سے متعلق ہیں۔ اس لیے وہ ان سے اپنے جذبے وخیال کی ترسیل کا کام لیتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت کا ایک اہم کردار حجتہ الاسلام ہے۔ ابن الوقت کے انگریزی وضع اختیار کر لینے پر وہ اسے سمجھانے آتا ہے۔ اس موقع پر اس کی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

> ''اسباب کے بارے میں ایک کثیر الوقوع اور خطرناک غلطی یہ ہے کہ نتائج کو اسباب کی طرف اس طرح منسوب کیا جاتا ہے گویا اسباب ہی فائل اور مکنون متصرف ہیں۔ پانی غلہ اگاتا ہے۔ کونین دافع تپ ہے۔ سنکھیا ثم قاتل ہے اور یہی **منطنه ' شرک خفی اعاذ لله منه** ہے اور میرے پندار میں **ومایومن اکثرهم بالله الادهم مشرکون** میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ غرض اسباب کا مسئلہ بڑا نازک اور مزلتہ الاقدام ہے۔''

حجتہ الاسلام علوم مشرقیہ کا عالم ہے۔ عربی' فارسی' فقہ' منطق' قرآن اور حدیث سے اس کی واقفیت درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس کی گفتگو میں' اس کا یہ علمی پس منظر جھلکتا ہے۔ قرآن وحدیث کے حوالے' عربی وفارسی کے ثقیل الفاظ کی بھرمار اور منطق کی پیچیدگی سے اس کا لب ولہجہ گراں بار ہے۔ اگر مترجم ان ادب پاروں کا ترجمہ کرتا ہے تو اسے مفہوم کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے اس تہذیبی منظرنامے سے پوری طرح واقف ہونا پڑے گا جس سے

متذکرہ بالا کرداروں کا تعلق ہے۔اس کے بعد ہی وہ صحیح ترجمہ کر سکتا ہے۔

موزوں الفاظ کا استعمال ترجمے کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ذیل کی مثالوں سے اسے سمجھا جا سکتا ہے۔

1. He was a poor farmer — 1. وہ ایک غریب کسان تھا۔
2. Poor woman was weeping — 2. بیچاری عورت رو رہی تھی۔
3. Your writing is very poor — 3. تمہارا خط بے حد خراب ہے۔

دراصل ایک ہی لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اوپر دی گئی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔مترجم کو چاہیے کہ وہ لفظ کے تمام مفاہیم سے واقف ہو۔ایک ہی لفظ ادبی تحریر میں دوسرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور دوسرے علوم کی تحریروں میں اس کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں۔ ''فلک'' کے معنی آسمان کے ہوتے ہیں لیکن اردو ادب میں بمعنی خدا اس کا استعمال عام ہے۔انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت اسے خدا کے ہی معنوں میں لیں گے لغوی معنی ''آسمان'' کی جگہ مرادی معنی ''خدا'' کا انتخاب کرنا مترجم کے لیے اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ اردو شعر و ادب کے سرمائے پر نظر رکھتا ہوگا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

''کون ہے؟ جبریل۔کیوں آئے ہو؟
سرکار فلک کے لیے کوئی پیغام

Who is there? Angel Gabriel

Any message for the Lord of heaven?

مترجم کو جملے کی ساخت سے کما حقہ واقف ہونا چاہیے۔انگریزی اور اردو میں جملے بنانے کے طریقے مختلف ہیں۔ادبی نثر میں بسا اوقات جملے بنانے کے طریقوں سے انحراف بھی کیا جاتا ہے۔اردو میں اس کی مثال فسانۂ عجائب ہے۔چونکہ سرور کا مقصد مقفیٰ عبارت کے ذریعے اپنی قدرت کلام کو ظاہر کرنا تھا اس لیے انہوں نے قافیہ بند جملے لکھے جو از روئے قواعد درست قرار نہیں دیے جا سکتے۔

ادبی نثر کی ایک خاصیت مصنف (ادیب) کا مخصوص لب و لہجہ ہوتا ہے۔کبھی اس کا انداز بیان سیدھا سادہ ہوتا ہے اور کبھی پیچیدہ، کبھی جذبے کی شدت ہر لفظ سے ٹپکتی ہے اور تکرار الفاظ کا عمل بتاتا ہے کہ مصنف جوش و جذبے سے سرشار ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طرز ادا اور تیور کی بنا پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ جذبے کی حیثیت موج تہہ نشیں کی سی ہے۔اب یہ کام مترجم کا ہے کہ وہ مناسب الفاظ اور موزوں تشبیہات و استعارات کے انتخاب کے ذریعے قاری کو صاحب تصنیف کے افکار کے ساتھ اس کے لب و لہجے سے بھی آشنا کرا دے۔

نثری ادب پارے کے ترجمے کے سلسلے میں مترجم کو ایک اور اہم نکتے پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔اسے نثری ادب پارے کے مرکزی خیال، مجموعی تاثر، الفاظ کی نشست و برخاست کی پیدا کردہ تاثراتی فضا کا عرفان و ادراک ہونا چاہیے۔چوں کہ ادبی نثر میں لفظ صرف خیال یا جذبے کی ترسیل کے لیے ہی نہیں استعمال کیا جاتا بلکہ کسی مخصوص فضا کا اظہار بھی ادیب کا مقصد ہوتا ہے۔

مترجم کی کوشش ہونی چاہیے کہ ترجمے کے عمل میں فضا سازی کا وہ وصف فراموش نہ کرے جو نثری ادب پارے کے مصنف کے تخلیقی عمل کا حصہ رہا ہو۔کامیاب مترجم وہی ہے جو نہ صرف الفاظ کا ترجمہ کرتا ہے بلکہ ادب پارے کی تاثراتی فضا کو بھی ترجمے میں برقرار رکھتا ہے۔ادبی شہ پارہ اگر نثر میں ہے تو مترجم کو تصنیف کی زبان کی نثری اصناف ادب سے بھی واقفیت ہونی چاہیے پھر اس مخصوص صنف ادب (نثری) پر بھی اچھی نظر ہونی چاہیے جس میں وہ شہ پارہ لکھا گیا ہے۔ترجمہ اگر ناول کا ہے تو ناول کے فن سے بھی مترجم واقف ہو اور اس مصنف کے دوسرے ناولوں پر بھی اس کی نظر ہو۔اگر نثری تصنیف کسی دوسرے علم کی کتاب ہے تو اس سے واقفیت ضروری ہے۔ظاہر بات ہے کہ ترجمہ نگار اگر اس مخصوص علم سے واقف نہ ہوا تو اس کے لیے عبارت کا ترجمہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

نثری ترجمے کے یہی وہ اصول اور تقاضے ہیں جن پر مترجم کی گہری نظر ہونی ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر وہ مندرجہ بالا نکات پر غور نہیں کرے گا تو ترجمے کے فن سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ نثری تصنیف خواہ ادبی ہو یا دوسرے علوم سے متعلق دونوں کا ترجمہ چند مخصوص تقاضے رکھتا ہے' جنہیں پورا کرنا مترجم کے لیے ضروری ہے۔ اس مرحلے پر مترجم کا وسیع مطالعہ' اعلیٰ ذوق اور بلند تخیل ہی کام آ سکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. تحریر و تقریر کی دو صورتیں کیا ہیں؟
2. مترجم کو لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ اور کس معنی سے واقف ہونا چاہیے؟

9.3 منظوم ترجمہ : اصول و تقاضے

شعر کا شعر میں ترجمہ منظوم ترجمہ کہلاتا ہے۔ کسی بھی شعری تخلیق کو جب ہم اس کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثیر کے ساتھ دوسری زبان میں شعری عمل کے ذریعے ڈھالتے ہیں تو اسے منظوم ترجمہ کہا جاتا ہے۔ اگر بغور دیکھیں تو یہ بازتخلیقی عمل کی ایک صورت ہے۔ کیوں کہ یہاں صرف الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ سے بدل دینے سے ہی کام مکمل نہیں ہوتا۔ بلکہ شعری تصنیف کی پوری فضا کو اس کے تمام تر تہذیبی حوالوں کے ساتھ ترجمے کی زبان میں اس طرح منتقل کرنا ہوتا ہے کہ اس زبان (ترجمے کی زبان) کے بھی ادبی و شعری مزاج کے تمام تر تقاضوں سے عہدہ برآ ہوا جا سکے۔

جہاں تک منظوم ترجمے کے اصول و تقاضوں کا تعلق ہے تو دونوں زبانوں یعنی تصنیف کی زبان اور ترجمے کی زبان سے واقفیت تو پہلی شرط ہے ہی۔ اس کے ساتھ ہی منظوم شہ پارہ جس زبان کا ہے اس کے تہذیبی پس منظر سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی منظوم ترجمے کے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے' مترجم کا نہ صرف موزوں طبع ہونا' بلکہ عروض کی بنیادی باتوں سے واقف ہونا بھی ایک ضروری' بلکہ لازمی شرط ہے۔ مترجم سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ شعری ذخیرے اور شعری روایات سے بھی آشنا ہو۔ اسے اگر ان سے پوری واقفیت نہ ہو تو صحیح آہنگ اور صحیح فارمیٹ کا انتخاب کرنا مشکل ہوگا۔ منظوم ترجمے کے لیے صحیح ہیئت کا انتخاب بھی ضروری ہے۔ ایک بات اور بھی کہی جاتی ہے کہ نظم کا منظوم ترجمہ کرنے سے پہلے اگر اس کا نثری ترجمہ کرلیا جائے تو کام آسان ہو جائے گا۔ اور کوئی اہم پہلو نہیں چھوٹے گا۔ نثری ترجمے میں تو کچھ جملے بدلے جا سکتے ہیں کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن منظوم ترجمے میں ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ مترجم کو منظوم ترجمے میں شعری تصنیف کی روح اور جذبے کو سمو دینا چاہیے۔ جگر مرادآبادی کا ایک شعر ہے:

اے متاعِ سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

ضابطے کی شاعری اور اچھی شاعری میں فرق ماورائے سخن والی بات ہوتی ہے۔ منظوم ترجمے میں ماورائے سخن کی جہت پر توجہ دینا اور اس کو سمجھنا' یہ جہت ترجمے میں لانا' ضابطے کے ترجمے (Regulation Translation) کی سطح سے اوپر اٹھنے کی عادت ڈالنا' مترجم کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

منظوم ترجمے کے وقت' مترجم کو یہ امر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کیا وہ فن کار کے اصل منشا و مقصد کو اس کی تمام تر شعری فضا کے ساتھ اپنے قاری تک پہنچا سکا ہے۔ کیوں کہ منظوم ترجمے میں محض مفہوم کی ترسیل تک ہی معاملہ محدود نہیں رہتا۔ بلکہ شعری تصنیف کی وہ فضا جو تشبیہات' استعارات' احساس جمال' قوت تخیل اور جذبہ و احساس کے باہمی اتصال و امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ اس تک قاری کی رسائی ہونی ضروری ہے۔ ہر زبان کا اپنا تشبیہاتی و استعاراتی سرمایہ ہوتا ہے۔ اپنے محاورے' تراکیب اور علامتیں ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسری زبان میں وہ لفظ بہ لفظ موجود ہوں اس لیے مترجم کو چاہیے کہ ان کے لفظی ترجمے پر زور نہ دے بلکہ ان کے مفہوم اور معنی کی ترجمانی' ترجمے کی زبان میں پائے جانے والے ان کے مترادفات و مماثلات کے ذریعے کرے۔

ہر شعری تخلیق کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے جو طرز بیان' ادائے نگارش' انداز تخاطب اور لب و لہجہ کی بنا پر دوسری شعری تخلیق سے مختلف ہوتا ہے۔

مترجم کو منظوم ترجمہ کرتے وقت ان سب کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اپنے معتقدات' احساسات اور جذبات کو شاعر بہترین الفاظ میں نظم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مترجم کا فریضہ ہے کہ وہ ترجمے میں بھی اس صورت کو برقرار رکھے۔

منظوم ترجمے کے وقت ہئیت و فارم کا تعین بھی بے حد ضروری ہے۔ اردو شاعری کی اصناف اپنی الگ الگ خصوصیات رکھتی ہیں۔ اصناف شعر ہر زبان میں الگ بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً غزل فارسی میں ہے انگریزی میں نہیں ہے۔ مترجم کو یہ چاہیے کہ شعری متن جس ہئیت میں ہے اس کے قریب ترین جو ہئیت ترجمے کی زبان میں ہو اس کا انتخاب کرے تاکہ اصل فن پارے کی بیشتر شعری خصوصیات ترجمے میں منتقل ہو سکیں۔ منظوم ترجمے میں ایک اور خوبی ہونی چاہیے جس زبان میں منظوم ترجمہ کیا جائے اس زبان کی شاعری کے معیار پر اسے پورا اترنا چاہیے۔ شعری تخلیق کا آہنگ' موسیقیت' تاثراتی فضا اور کیفیت کو ترجمے میں منتقل کرنے میں مترجم تبھی کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ تصنیف و ترجمے دونوں کی زبان کے ادبی' شعری اور فنی تقاضوں سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔

ہم منظوم ترجمے کو کئی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لفظی ترجمہ' آزاد ترجمہ' ماخوذ ترجمہ اور تخلیقی ترجمہ۔ محض لفظی منظوم ترجمہ ہر قسم کی تخلیقی خصوصیات سے محروم ہوتا ہے اور مکھی پر مکھی بٹھانے کا کام کیا جاتا ہے۔ آزاد ترجمے میں شعری تخلیق کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثراتی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمے کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے ترجمے میں بڑی حد تک ترجمے کی زبان کے شعری لوازم سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ماخوذ ترجمہ بھی اس سے قریب ہوتا ہے اس میں بھی اصل شعری تخلیق سے مرکزی خیال اخذ کیا جاتا ہے۔ لیکن شاعر اپنے افکار و خیالات اور اپنے تجربات بھی اس میں شامل کرتا ہے' لیکن تخلیق کے مرکزی خیال کو باقی رکھ کر۔ منظوم ترجمے کی سب سے ارفع و اعلیٰ شکل تخلیقی ترجمہ ہے۔ اس میں مترجم' شاعر کے جذبات' احساسات اور کیفیات و تاثرات کو اپنے دل و دماغ پر اس طرح طاری کر لیتا ہے کہ وہ اس کے تخلیقی عمل کا حصہ بن جائے پھر اپنی زبان میں اسے اسی طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی حیثیت بازتخلیقی ہو جاتی ہے۔

نثری ترجمے کے مقابلے میں منظوم ترجمے کی مشکلات زیادہ ہیں۔ ذیل میں منظوم ترجمے میں پیش آنے والی مشکلات پر گفتگو کی جا رہی ہے۔

طبعی علوم کے علاوہ' ہر علم کی اصطلاحیں آہنی سانچے کی طرح قطعی نہیں ہوتیں' بلکہ طبیعیات کی بعض اصطلاحوں اور تعریفوں میں قطعیت نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان میں لفظوں کے بہت متعین معنی نہیں ہوتے۔ یہی نہیں زیادہ لفظ ایسے ہیں' جن کے ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں' اور بعض وقت ایک ہی لفظ کے دو متضاد معنی بھی ہوتے ہیں۔ شروع میں ایک لفظ کا ایک ہی مفہوم رہا ہوگا۔ وہ بنیادی معنی آج بھی لغوی معنی ہیں۔ لیکن ہر لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ اصطلاحی معنی بھی ہوتے ہیں' اور ان میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اصطلاحوں میں ظاہر ہے لفظ ہی ہوتے ہیں۔ اگر ہر علم کی اصطلاح ایسی ہو' جو صرف اسی کے لیے مخصوص ہو تو افراتفری کم ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر دوسری قسم کی افراتفری پیدا ہوتی ہے' جو تعریف وضع کی جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر تعریف' معین معنوں کے باوجود مدور ہوتی ہے۔ منتہی کو کنفیوژن نہیں ہوتا' لیکن مبتدیوں کے لیے یہ پہلو افراتفری پیدا کرتا ہے۔

ان دو مرحلوں کے علاوہ' ایک مرحلہ اور بھی ہے اور وہ ہے Concept کی سطح پر' Micro سطح پر ایٹم کے اجزا پروٹون (Proton) اور الکٹرون (Electron) بنیادی پارٹکلز (Fundamental Particles) بھی ہیں۔ لیکن لہر (Waves) بھی ہیں۔ ایسی صورت حال میں عالموں اور ماہروں کے لیے تو مشکلات ہوتی ہی ہیں' ترجمہ نگار' جو عام طور سے اس مخصوص علم کا ماہر نہیں ہوتا' اس کے لیے بھی عبارت کا ترجمہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ دشواری علوم کے سلسلے میں ہی نہیں۔ ادب اور خاص طور سے شاعری کی سلسلے میں بھی پیش آتی ہے۔ ذو معنیٰ الفاظ ہی کی وجہ سے نہیں' مضارع کے استعمال کی وجہ سے بھی دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شعر کے دو یا دو سے زیادہ معنی ایہام' یا لہجے کی وجہ سے ہوں..... کہ ایک لہجے میں پڑھنے سے شعر کے ایک معنی اور دوسرے لہجے میں پڑھنے سے دوسرے معنی ہوں..... تو ظاہر ہے ترجمہ کی ادائیگی کے راستے میں دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ملاحظہ ہو:

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق؟ (دعوت کے لہجے میں)

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق؟! (مایوسی کے لہجے میں' کہ کوئی نہیں!)

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اب اس کا منظوم ترجمہ (شرح کے بغیر) کسی اور زبان میں نہیں ہو سکتا۔ دوسری زبان میں ایسی صورت کسی نظم کی ہو' تو اردو میں بھی اس کا ترجمہ

تشریح کے بغیر نہیں ہوسکتا اور منظوم ترجمے میں تشریح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کی ایک نظم پہاڑ اور گلہری ہے جو ایمرسن سے ماخوذ ہے نظم ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایمرسن)

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے — " تجھے ہو شرم تو پانی میں جاکے ڈوب مرے "
"ذرا سی چیز ہے ' اس پر غرور ؟ کیا کہنا ! — یہ عقل اور یہ سمجھ ..... یہ شعور ! کیا کہنا ! "
" خدا کی شان ہے ' نا چیز ۔ چیز بن بیٹھیں — جو بے شعور ہوں ' یوں باتمیز بن بیٹھیں "
" تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے — زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے "

" جو بات مجھ میں ہے ' تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں!
بھلا پہاڑ کہاں ؟ جانور غریب کہاں ؟"

کہا یہ سن کے گلہری نے " منہ سنبھال ذرا — یہ کچی باتیں ہیں ' دل سے انہیں نکال ذرا"
" جو میں بڑی نہیں تیری طرح ۔ تو کیا پروا — نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا "
" ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے — کوئی بڑا ' کوئی چھوٹا ۔ یہ اس کی حکمت ہے "
" بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اُس نے — مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے "
"قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں — نری بڑائی ہے ! خوبی ہے اور کیا تجھ میں ؟"
" جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو — یہ چھالیہ ہے ! ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو !"

"نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں!"

علامہ اقبالؔ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ان کا شمار اس خاص زمرے کے شاعروں میں ہوتا ہے' جو عہد آفریں کہلاتے ہیں۔ بچوں کے لیے بہت کم شاعروں نے لکھا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ اقبالؔ نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں' طبعزاد بھی .....اور انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے یہ نظم بڑی رواروی میں لکھی۔ شروع میں ایک شعر تمہید کا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ مثلاً وہ نظم اس طرح شروع کرسکتے تھے :

پہاڑ اور گلہری میں تھا بہت ہی پیار
پر ایک روز ہوئی دونوں میں بہت تکرار

رواروی میں علامہ نے یہ نظم لکھی۔ NUT کا ترجمہ چھالیہ کیا ہے۔ حالانکہ یہاں مراد اخروٹ سے ہے۔ لفظی ترجمے کی توقع نہیں کرنی چاہیے کیونکہ علامہ اقبالؔ نے خود اس نظم کو ماخوذ از ایمرسن لکھا ہے۔ اس کے باوجود اس میں چھالیہ نہیں اخروٹ توڑنے کی بات ہوتی تو اچھا ہوتا :

جو تو بڑا ہے تو چھوٹا سا یہ ہُنر دکھلا
مری طرح سے اک اخروٹ توڑ کر دکھلا

بچوں کے لیے علامہ اقبالؔ کی اور نظمیں بھی ہیں جو یا تو آزاد ترجمے ہیں یا انگریزی نظموں پر مبنی ہیں۔ جیسے ایک گائے اور بکری ' ہمدردی اور ماں کا خواب۔

ادبی فن پاروں اور منظوم ترجموں میں ایک زبان کا اسلوب دوسری زبان میں برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر بھی نثر میں یہ زیاں کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ البتہ نظم میں زبان کی چاشنی، اور ڈکشن ہو بہو منتقل نہیں ہوسکتا۔ اردو والے، جنہوں نے فارسی پڑھی ہے، فارسی زبان کی نزاکتیں سمجھتے ہیں۔ کہیں کہیں جانکار بھی زچ ہو جاتے ہیں۔ خود غالبؔ جن کا خیال تھا کہ فارسی ان کے مزاج میں رچی بسی ہے۔ بیدلؔ کے ایک مصرع کا ترجمہ نہ کر سکے اور انہوں نے مقطع میں بیدل کا مصرع جوں کا توں رکھ دیا :

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
''عالم ہمہ افسانۂ ما داردو ما ہیچ''

غالبؔ سے پہلے خدائے سخن میر تقی میرؔ، جنہوں نے اپنی خودنوشت فارسی میں لکھی اور جو فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، انہوں نے بیدلؔ کی اس غزل پر غزل کہی، لیکن فارسی ہی میں اور مطلع میں بیدلؔ کے اس مصرع پر تضمین کی۔ سوداؔ نے ان سے پہلے اردو میں اسی زمین میں غزل کہی اور بیدلؔ کے فارسی مصرع کو مقطع میں رکھا، اردو میں منتقل نہ کر سکے۔ گو کہ فارسی ان کے مزاج میں بھی رچی بسی تھی۔ چندر بھان برہمن کا ایک شعر ہے:

ببیں کرامت بت خانۂ مرا اے شیخ
چوں خراب شود، فسانہ، خدا گردد

شعر اردو میں منتقل نہ ہوسکا۔ البتہ اس کا مفہوم اور تاثر کسی حد تک اردو میں آ سکا۔ کچھ اضافے اور کچھ کمی کے ساتھ :

اک دل ہے کہ اجڑ جائے تو بستا ہی نہیں
ایک بت خانہ ہے اجڑے تو حرم ہوتا ہے

اسے تاثر تو کہا جا سکتا ہے، ترجمہ نہیں۔

مثنوی مولانا روم (مثنوی مولوی معنوی) یعنی جلال الدین رومی کی مثنوی کو ہست قرآں در زبان پہلوی کہا جاتا ہے اور اس سے مذہبی عقیدت بھی وابستہ ہے۔ خواجہ شمس الدین حافظؔ کو لسان الغیب کہا جاتا ہے۔ صدیوں سے ان کے دیوان سے فال نکالنے کا دستور ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں کے منظوم اردو ترجمے نہیں ہوئے۔ یعنی مکمل منظوم ترجمے نہیں ہوئے، حالانکہ شریمد بھگوت گیتا کے مکمل ترجمے بھی ہوئے اور مسلمان شعرا نے بھی کچھ ترجمے کیے۔ مثنوی مولانا روم کا نثر میں ایک اچھا ترجمہ قاضی سجاد حسین نے کیا اور حافظ کے دیوان کا نثر میں مکمل ترجمہ عبدالحکیم خاں نشترؔ جالندھری نے کیا۔ اس کے علاوہ اور ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ منظوم ترجمے کے لیے یہ دونوں کام پہلے مرحلے کے بنیادی کام ہیں۔ لیکن اردو میں منظوم ترجمے کرنا ایسا پروجیکٹ ہے جس سے آج شاید ہی کوئی فردِ واحد عہدہ برآ ہو سکے۔

شان الحق حقی نے ایک پروجیکٹ کی طرح مشرق اور مغرب کی زبانوں کے کچھ شعری شاہکاروں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ ''درپن در پن'' ان کے تراجم کا مجموعہ ہے۔ اس میں سوا سو سے زیادہ منظومات ہیں۔ قرآن پاک کی چار سورتوں کا بھی منظوم ترجمہ اس مجموعے میں ہے اور کتاب کی ابتدا انہی سے ہوئی ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ یہ نظم ان کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے۔ اس کے تین بند یہ ہیں:

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا
تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا
کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا؟
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

یہ سحر کا حسن ' یہ سیارگاں اور یہ فضا
یہ معطر باغ یہ سبزہ ' یہ کلیاں دلربا
یہ بیاباں ' یہ کھلے میدان ' یہ ٹھنڈی ہوا
سوچ تو کیا کیا کیا ہے تجھ کو قدرت نے عطا
کب تک آخر اپنے کی نعمتیں جھٹلائے گا

خُلد میں حوریں تری مشتاق ہیں ' آنکھیں اُٹھا
نیچی نظریں جن کا زیور ' جن کی آرائش حیا
جن و انساں میں ' کسی نے بھی نہیں جن کو چھوا
جن کی باتیں عطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صبا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا ؟

جوشؔ کی اس نظم میں قرآن کے اسلوب کے جاہ وجلال کی ذرا سی بھی رمق نہیں۔ایک وجہ شاید اس کی یہ بھی ہے کہ جوشؔ نے رمل محذوف کا جو آہنگ اس کے لیے چنا (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) وہ سب سے کاہل آہنگ ہے' اور اس سورۃ کے ترجمے کے لیے مناسب نہیں۔**فبای آلاء ربکما تکذبن** O (اردو میں' آسانی سے پڑھنے کے لیے :**ف ب ای آلاے ربکا ماتکذبان**) کا وزن عروضی ہے :متفاعلُن ' فاعِلُن ' متفاعلُن فعل۔ اگر جوشؔ نے رمل کے بجائے کامل کا آہنگ رکھا ہوتا اور محنت کی ہوتی ' تو شاید قابل ذکر نتیجہ سامنے آتا۔کامل سالم کے آہنگ میں جوشؔ نظم کرنے پر قادر تھے۔لیکن بندھے ٹکے آہنگ سے ذرا سا انحراف کر کے ایک مزاحف آہنگ وضع کرنا شاید وہ جائز نہ سمجھتے۔متفاعلن کے ساتھ متفعِلُن کا خلط کرنے کی بھی مثال ان کے کلام میں نہیں ملتی' حالانکہ فارسی میں ایسا کثرت سے نہ سہی لیکن ہوتا رہا ہے۔سعدیؔ کی نعت بلغ العلا بہ کمالہ میں ایسا ہے۔کامل سے ہٹ کر بھی ایک آہنگ اس کے لیے مناسب تھا۔

تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے

چودہ رکنی متدارک مخبون بُعُلُن ' مصرعے میں سات ارکان۔ تسکینِ اوسط سے ہر فعلن فعُلن بھی ہوسکتا ہے۔اس کی وجہ سے آزادی اور آسانی بھی ہوتی ہے اور آہنگ میں رنگا رنگی بھی پیدا ہوتی ہے۔

شعر کا منظوم ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کا اصل متن کے معنی پوری طرح سمجھنا بھی ضروری ہے اور ترجمے کی زبان میں شعر کہنے پر پوری طرح قادر ہونا بھی ضروری ہے۔طبعزاد شعر کہنے کا ملکہ اور ہے اور ترجمے کی ذمے داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا اس سے کچھ زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ طبعزاد شعر میں مضمون کم زیادہ کیا جاسکتا ہے۔ترجمے میں نہیں۔منظوم ترجمے کی ذمے داری سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کے لیے مناسب ہے کہ پہلے نثر میں ترجمہ کرلیا جائے' پھر اصل متن اور ترجمہ کو سامنے رکھ کر طے کیا جائے کہ منظوم ترجمہ کے لیے بحر اور آہنگ کیا ہو؟ فارمیٹ کیا ہو؟ مردف اور مقفّی ..... یا صرف قافیے رکھے جائیں' ردیف نہ رکھیں اور اگر اصل متن میں آزاد نظم' یا نظم معرا کا فارمیٹ ہو تو ترجمہ بھی اسی طرز اور ہیئت میں ہو۔

امیر خسروؔ کی ایک غزل ہے' جس کا مطلع ہے :

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تارگشتۂ حاجت ِ زنار نیست

ظ انصاری نے ''خسرو کا ذہنی سفر'' میں ص 139 پر اس مطلع کا نثر میں یہ ترجمہ کیا ہے:

''میں عشق کا مارا کافر۔ مجھے مسلمانی کی حاجت کیوں؟ اور میری ہر رگ تار بن گئی ہے اس لیے مجھے زنار کی بھی ضرورت نہیں۔''

شان الحق حقی نے در پن در پن کے صفحہ 69 پر منظوم ترجمہ یہ کیا ہے:

عشق کا بندہ مسلمانی مجھے درکار کیا
میری ہر رگ تار ' مجھ کو حاجتِ زنار کیا

حاجت عربی لغت ہے اور اس کے معنی ضرورت ہیں۔ اردو میں اس لفظ میں ایک اضافی معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ جس سے اس کی فضا متاثر ہوئی ہے۔ شاید اس وجہ سے مرکب لفظ رفع حاجت بنا' اور وہ کم از کم لکھنؤ میں ضرورت کے معنی میں مستعمل نہیں' باوجود غالبؔ کے مشہور شعر کے:

کون ہے' جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

''کس کس'' کی جگہ غالبؔ نے ''کس'' سے کام چلانے کی کوشش کی ہے۔

فارسی میں امیر خسروؔ کا مطلع بہت خوب ہے' لیکن اردو ترجمے میں دونزاکتوں کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں' لازمی ہے۔ حاجت کے علاوہ مسلمانی کے بھی اضافی معنی ہیں اور اس کے استعمال سے اردو میں ذم کا پہلو' بہت قبیح نکلتا ہے۔ تیس برس پہلے' جب خسرو کا جشن منانے کے ہنگامے تھے' تو ڈائرکٹوریٹ جنرل آل انڈیا ریڈیو میں (جب ٹیلی ویژن بھی ڈائرکٹوریٹ کے تحت تھا) خسروؔ کے بارے میں قومی پروگراموں کی نگرانی ہی نہیں' پروگرام لکھنے کی خدمت بھی میرے سپرد کی گئی تھی۔ اتفاق ہے کہ اسی غزل کا مجھے ترجمہ کرنا پڑا۔ جن قباحتوں کا ذکر کیا گیا ہے' اُن کے پیش نظر قافیہ بدل کر ترجمہ کیا گیا۔ ذیل میں شان الحق حقی اور راقم الحروف کا منظوم ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

عشق کا بندہ ' مسلمانی مجھے درکار کیا
میری ہر رگ تار' مجھ کو' مجھ کو حاجت زنار کیا

میرے سرہانے سے اٹھ بھی جا بس اے ناداں طبیب
درد مندِ عشق کا چارہ بجز دیدار کیا

مژدہ اے دل کل تجھے بازارِ عشق میں
قتل کا وعدہ ملا ' پھر حسرتِ دیدار کیا

ناخدا کشتی میں میری گر نہیں ' اچھا نہ ہو
میں خدا رکھتا ہوں ' مجھ کو ناخدا درکار کیا

کہتی ہے دنیا کہ خسروؔ ہو گیا ہے بت پرست
جی بجا ہے' ہو گیا ' دنیا سے مجھ کو عار کیا

قافیے برقرار رکھتے ہوئے ترجمے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں لیکن بہ وجوہ' اگر قافیے بدلنا پڑیں تو بھی شاید ترجمہ ممکن ہے۔

راقم الحروف کا ترجمہ:

عشق کا بندہ ہوں میں' اب دین کیا' اسلام کیا
ہر رگِ جاں تار ہے' زنار سے اب کام کیا

چارہ گر ' نادان چارہ گر ' مجھے للہ چھوڑ

اس دوا دارو سے مجھ کو ہوگا اب آرام کیا

قتل کرنے آئے تو جی بھر کے دیکھیں گے اُسے

اس سے بڑھ کر اور ہوسکتا ہے اب انعام کیا

ناخدا کوئی نہیں کشتی میں ؟.....اچھا ہی ہوا

ناخدا کے آسرے سے بڑھ کے ہے الزام کیا

کچھ سنا خسرو ! تمہیں کہتی ہے دنیا بت پرست

جو بھی کہتی ہے کہے ' دنیا سے مجھ کو کام کیا

اپنی معلومات کی جانچ :

1. منظوم ترجمے کی کتنی اقسام ہیں؟
2. ہست قرآں در زبان پہلوی کس کو کہا جاتا ہے؟
3. جوش ملیح آبادی نے قرآن پاک کی کس سورۃ کا منظوم ترجمہ کیا ہے؟

9.4 نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

نثری اور منظوم ترجمے کے اصولوں اور تقاضوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ سب سے بڑی شرط ذولسانیت کی ہے' جو نثری اور منظوم دونوں ترجموں کے لیے ضروری ہے۔ ترجمے اور تصنیف کی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ پر قدرت اور ان زبانوں کے تہذیبی پس منظر سے آگاہی اور محاورات وضرب الامثال سے واقفیت دونوں طرح کے ترجموں کے لیے ضروری ہے۔ نثری اور منظوم ترجمے میں اگر کوئی بہت بڑا فرق ہے تو وہ یہ ہے کہ منظوم ترجمہ کرنے والے کو موزوں طبع ہونا چاہیے اور دونوں زبانوں کے شعری سرمائے پر نہ صرف یہ کہ اس کی گہری نظر ہو بلکہ وہ دونوں زبانوں کے شعری تلازمات اور تشبیہی و استعاراتی نظام سے بخوبی واقف ہو۔ جملوں کی ساخت اور مکالموں کی زبان نیز لب ولہجہ کا خیال رکھنا نثری ترجمے کا اہم تقاضا ہے۔ نثری تصانیف میں مترجم کو صرف مصنف کی ہی زبان سے سابقہ نہیں پڑے گا بلکہ اس کو ناول ' افسانے' داستان اور ڈرامے کے کرداروں کی زبان کو بھی اس کے تمام تر تہذیبی و سماجی حوالوں کے ساتھ سمجھنا پڑے گا۔ منظوم ترجمے میں اسے ایسی کسی صورت حال کا سامنا نہیں ہوتا۔ منظوم ترجمے میں مصنف کو ہئیت یا فارم کا بھی انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جس شعری تخلیق کا وہ ترجمہ کر رہا ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ جس فارم میں ہو وہ فارم ترجمے کی زبان میں بھی موجود ہو۔ ایسے موقع پر مترجم کو ترجمے کی زبان میں ایسی ہی شعری صنف کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو طرز ادا' موضوع اور فارم کے لحاظ سے شعری تخلیق سے قریب تر ہو۔ نثری ترجمے میں اس طرح کی دقت کم پیش آتی ہے۔ ان چند نکات کے علاوہ نثری اور منظوم ترجمے کے تقاضے تقریباً یکساں ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مترجم کا موزوں طبع ہونا کس ترجمے کے لیے ضروری ہے؟
2. ہیئت یا فارم کا انتخاب مترجم کو کس ترجمے میں کرنا پڑتا ہے؟

9.5 خلاصہ

ترجمہ خواہ نثری ہو یا منظوم، مترجم کی ذولسانیت پہلی شرط ہے۔ اسے تصنیف اور ترجمے دونوں کی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ، محاورات، مترادفات، تشبیہات واستعارات نیز اس زبان کے تہذیبی وسماجی پس منظر سے گہری واقفیت ہونی چاہیے۔

نثری ترجمے کے لیے مصنف کو زبان کے ساتھ ہی نثری اصناف ادب سے بھی واقفیت ہو۔ جملوں کی ساخت اور نثری ادب پارے کی مکالماتی زبان کی خصوصیات اور اس کے پس پردہ کارفرما تہذیبی محرکات سے بھی وہ واقف ہو۔ موزوں الفاظ کا استعمال بھی نثری ترجمے یا منظوم ترجمے کی اہم ضرورت ہے۔ منظوم ترجمہ بھی کم وبیش اسی طرح کے تقاضے رکھتا ہے۔ مترجم کو چاہیے کہ ترجمہ خواہ منظوم ہو یا نثری اس تاثراتی فضا کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کرے جو اس نثری یا شعری فن پارے میں موجود ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مترجم کو فن پارے کے مرکزی خیال، مجموعی تاثیر، الفاظ کی نشست و برخاست اور اسلوب اظہار سے مکمل واقفیت ہو۔ وہ ادب پارے کی ان تمام خصوصیات کو خود میں جذب کرلے۔ منظوم ترجمے کے لیے مترجم کا موزوں طبع ہونا اور تصنیف وترجمہ دونوں کے شعری سرمایے نیز اصناف شعر پر گہری نظر ہونا لازمی ہے۔ منظوم ترجموں کے لیے مترجم کو فارم یا ہیئت کے انتخاب کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جس شعری تخلیق کا وہ ترجمہ کررہا ہے۔ ترجمے والی زبان میں کون سی شعری صنف ایسی ہے جو ہیئت اور مزاج کے اعتبار سے اس شعری تخلیق کے قریب ہے۔ نثری اور منظوم ترجمے کے تقاضوں اور اصولوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہاں مترجم کا موزوں طبع ہونا منظوم ترجمے کی اہم شرط ہے۔ اسی طرح دونوں قسم کے ترجموں میں زبان وبیان پر قدرت اور زبان کے تہذیبی ولسانی سرمایے سے مکمل واقفیت ضروری ہے۔

9.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. نثری ترجمے کے اہم اصولوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. منظوم ترجمے کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟
3. نثری اور منظوم ترجمے کے لیے مترجم کو کن اہم نکات کو ذہن میں رکھنا چاہیے؟

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. جملوں کی ساخت اور مکالموں کی زبان کو سامنے رکھنا نثری ادب کے مترجم کے لیے کیوں ضروری ہے؟
2. امیر خسرو کی غزل کے منظوم ترجموں کی روشنی میں منظوم ترجمے کی مشکلات کا جائزہ لیجیے۔

9.7 فرہنگ

ناراست	=	جو سیدھا نہ ہو	راست	=	سیدھا
ذولسانیت	=	دو زبانوں سے واقفیت	بازتخلیقی	=	دوبارہ پیدا کرنا
انبساط	=	خوشی، شادمانی	زدوکوب	=	مار پیٹ
مکنون	=	پوشیدہ، چھپا ہوا	ادراک	=	عقل، فہم، رسائی
متصرف	=	قابض، قبضہ کرنے والا، برتنے والا	اتصال	=	میل، قرب، ملاپ، نزدیکی
ادائے نگارش	=	طرز تحریر، لکھنے کا طریقہ	ارفع	=	نہایت بلند، عالی مرتبہ

منتہی = انتہا کو پہونچا ہوا، عالم، تحصیل علم سے فارغ مبتدی = نو آموز، ابتدا کرنے والا

ذم = مذمت، برائی، ہجو

تضمین = ملانا، شامل کرنا، اصطلاح شاعری میں دوسرے کے شعر پر مصرعہ یا بند لگانا

لسان الغیب = غیب کی زبان، حافظ شیرازی کا لقب

زنار = جینو، وہ دھاگا جو ہندو گلے اور بغل کے درمیان ڈالے رہتے ہیں۔

خلط = آمیزش

9.8 سفارش کردہ کتابیں

1. عطش درّانی — اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد، 1994ء
2. اعجاز راہی — روداد سمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اسلام آباد، 1994ء
3. خلیق انجم — فنِ ترجمہ نگاری، دہلی، 1995ء
4. نثار احمد قریشی — ترجمہ: روایت اور فن، اسلام آباد، ستمبر 1985ء
5. قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت، دہلی، جون 1976ء

اکائی 10 : اردو میں علمی وفنی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

10.1 تمہید

10.2 علمی ترجمے کے اصول اور اصطلاح سازی

10.3 اردو میں علمی ترجمے کی ابتدائی روایت

10.4 علمی وفنی ترجمے کے ادارے

10.4.1 فورٹ ولیم کالج میں علمی وفنی تراجم

10.4.2 فورٹ سینٹ جارج کالج میں علمی وفنی تراجم

10.4.3 دارالترجمہ شمس الامرا میں علمی وفنی تراجم

10.4.4 نوابین اودھ کے زیر اہتمام علمی وفنی تراجم

10.4.5 ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی کالج میں علمی وفنی تراجم

10.4.6 سائنٹفک سوسائٹی میں علمی وفنی تراجم

10.4.7 مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دارالترجمے میں علمی وفنی تراجم

10.4.8 دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں علمی وفنی تراجم

10.4.9 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں علمی وفنی تراجم

10.4.10 مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں علمی وفنی تراجم

10.5 خلاصہ

10.6 نمونۂ امتحانی سوالات

10.7 فرہنگ

10.8 سفارش کردہ کتابیں

10.1 تمہید

قوموں کی ترقی میں ترجمے بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہی وہ وسیلہ ہے، جس کے ذریعے دوسری زبانوں میں موجود علوم وفنون تک ایک ایسے شخص کی رسائی بھی ممکن ہو جاتی ہے، جو اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتا۔ اگر کوئی مترجم اس شخص کی مادری زبان میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کر دے، تو پھر وہ بھی نئے علوم اور ان کی باریکیوں سے آگاہ ہو سکتا ہے نتیجتاً قوم کی ترقی میں حسبِ استعداد ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ کسی زبان کی مقبولیت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ اس میں علوم وفنون کی کتنی کتابیں موجود ہیں۔ آج عالمی سطح پر انگریزی کی عالمی مقبولیت کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس میں دنیا بھر کے علوم وفنون سے متعلق کتابیں دستیاب ہیں اور ان میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اردو کے عالموں نے بھی اس بات کو محسوس کیا تھا کہ زبان اور قوم کی ترقی کا راز علمی وفنی معلومات پر ہے۔ چوں کہ اردو کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے اس لیے علمی وفنی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اردو کا ابتدائی سرمایہ

شعروشاعری اور فکشن یا داستانوں پر مشتمل تھا۔لیکن جب اردو زبان نے ہندوستان بھر میں مقبولیت حاصل کی اور عام طور پر بولی لکھی اور پڑھی جانے لگی تو یہ ضروری ہوگیا کہ علوم بھی منتقل کیے جائیں' جس کا آسان طریقہ یہ تھا کہ دوسری زبانوں سے علوم وفنون کی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جائیں تا کہ اردو بولنے والے دوسری ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بہ شانہ چل سکیں۔

10.2 علمی ترجمے کے اصول اور اصطلاح سازی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ کیوں کیا جاتا ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کو کوئی خاص زبان نہیں آتی اور وہ چاہتا ہے کہ اُس زبان میں موجود مواد سے استفادہ کرے۔مجبوراً وہ کسی ایسے شخص سے ربط پیدا کرتا ہے' جو اس زبان سے واقف ہے اور پھر اس سے درخواست کرتا ہے کہ وہ مطلوبہ مواد کا ترجمہ کردے۔یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ کوئی مضمون یا کتاب پڑھتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس مضمون یا کتاب سے وہ لوگ بھی فائدہ اٹھائیں' جو اس زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے راست نہیں پڑھ سکتے۔چنانچہ آپ سوچتے ہیں کہ اس مضمون یا کتاب کا ترجمہ کردیا جائے۔ادبی تخلیقات کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں زبان کی نزاکتیں بھی ہوسکتی ہیں۔علامتیں' محاورے' روزمرّہ' استعارے اور کنائے بھی ہوسکتے ہیں اور چوں کہ ہر زبان کی اپنی کچھ منفرد خصوصیات ہوتی ہیں' اس لیے اکثر و بیشتر دشواری پیش آتی ہے۔لیکن اگر مترجم اصل زبان اور ترجمے کی زبان سے بخوبی واقف ہو تو وہ دشواریوں پر قابو پا سکتا ہے۔پھر بھی اصل زبان کا حسن ترجمے کی زبان میں قدرے ماند پڑ سکتا ہے۔اگر اصل مواد علمی نوعیت کا ہے تو یہاں صرف مفہوم سے غرض ہوتی ہے تا کہ پڑھنے والا اصل متن ہی کی طرح ترجمہ شدہ متن سے استفادہ کر سکے۔اسی لیے علمی ترجمے کا سب سے عام اور اہم اصول یہ ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت اصل مفہوم کا ترجمہ مقصود ہونا چاہیے۔ادبی تخلیقات میں یہ مسئلہ بھی ہوتا ہے کہ استعمال کیے گئے لفظ کے مفہوم کی کئی سطحیں ہوسکتی ہیں۔لیکن علمی مضامین میں ادبیات کی طرح اظہار کی پیچیدگی نہیں ہوتی۔پھر بھی اگر کسی ایسے علم یا فن کا ترجمہ کیا جارہا ہو' جو اس زبان کے لیے نیا ہو تو سب سے بڑا مسئلہ اصطلاح سازی کا ہوتا ہے' کیوں کہ ہر علم وفن کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں۔چوں کہ علمی تراجم کا مقصد اصل مضمون کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ پڑھنے والا اس کو پوری طرح سمجھ سکے اس لیے اصل زبان میں استعمال کی گئی اصطلاحات کو ترجمے کی زبان میں اس طرح منتقل کرنا ضروری ہے کہ مطلوبہ علم یا فن کو آسانی سے سمجھا جاسکے۔اس لیے یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ علمی تراجم کا دارومدار بہتر اور معنی خیز اصطلاحات پر ہوتا ہے۔ہر علم اور ہر پیشے کی کچھ مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں۔یہاں تک کہ کھیلوں میں بھی مخصوص اصطلاحوں سے کام لیا جاتا ہے جن کا لغوی مفہوم چاہے جو کچھ ہو' متعلقہ علم یا پیشے میں وہ جداگانہ مفہوم کی حامل ہوتی ہیں۔عموماً یہ اصطلاحیں ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں' جو مرادی مفہوم تک ذہن کو منتقل کرسکیں۔علمی ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کے سامنے جب اصطلاحیں آتی ہیں تو سب سے پہلے وہ ترجمے کی زبان میں موجود اسی مفہوم کی اصطلاح تلاش کرتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ترجمے کی زبان میں وہ اصطلاح موجود ہو۔یہیں مترجم کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ متبادل اصطلاح ڈھالے یا وضع کرے۔چوں کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے اس لیے آسانی یہ ہے کہ مترجم کسی دوسری شناسا زبان سے اصطلاح لے سکتا ہے یا نئی اصطلاح ڈھال سکتا ہے۔

اردو میں بیشتر علوم بنیادی طور پر دوسری زبانوں ہی سے آئے ہیں اور ابتدا میں زیادہ تر علمی سرمایے فارسی اور عربی سے اردو میں منتقل کیے گئے۔خاص طور پر شرعی مسائل اور فقہ وغیرہ کے لیے جو اصطلاحیں استعمال ہوئیں وہ زیادہ تر عربی میں استعمال ہوتی رہی ہیں۔ہندوستان میں اردو کے ابتدائی دور سے لے کر بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک بھی فارسی اور عربی زبانیں عام طور پر استعمال ہوتی تھیں۔دفتری معاملات میں فارسی غالب تھی اور مذہبی مسائل کے لیے عربی کا سہارا لیا جاتا تھا۔ہر پڑھا لکھا شخص فارسی اور عربی اصطلاحات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔اسی لیے مترجمین کو عربی اور فارسی سے اصطلاحیں لینا یا ان زبانوں کی مدد سے اصطلاحیں ڈھالنا زیادہ آسان لگتا تھا۔لیکن آج کے دور میں فارسی اور عربی کا چلن کم ہوگیا ہے۔اس لیے عربی یا فارسی کی دقیق اصطلاحیں مشکل لگنے لگی ہیں۔ایک بات یہ بھی ہے کہ علوم وفنون کی ترقی کی رفتار بے حد تیز ہوگئی ہے اور تقریباً سبھی کتابیں انگریزی میں دستیاب ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ اب انگریزی الفاظ ہمارے عام ذخیرۂ الفاظ کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔آج ایک دیہاتی کے لیے بھی ٹریکٹر' اسٹیشن' بس جیسے الفاظ نامانوس نہیں ہیں۔کسی بھی زبان کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی لفظ مسلسل استعمال میں آتا رہے تو وہ زبان کا حصہ بن جاتا ہے۔انگریزی کی ڈکشنریوں

میں کئی الفاظ اردو، ہندی اور دوسری کئی زبانوں سے شامل کر لیے گئے ہیں، کیوں کہ ماہرین نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ عام بول چال کے علاوہ تحریری زبان میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ ہندوستان میں بھی کئی انگریزی الفاظ عام طور پر بولے جانے لگے ہیں۔ اس لیے بیشتر نئی اصطلاحات کے لیے انگریزی الفاظ کو جوں کا توں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ریڈیو، ٹی۔وی، ٹیلی فون، ایکسرے، ایمبولینس، کمپیوٹر جیسے الفاظ اب سبھی جانتے ہیں۔ ابتدائی دور میں ان کے لیے نئے الفاظ بنانے کی کوشش کی گئی لیکن عوام نے قبول نہیں کیا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ٹسٹ ٹیوب کے لیے امتحانی نلی کا لفظ عام تھا اور آسانی سے آج بھی سمجھا جاتا ہے لیکن جدید میڈیسن کی تحقیقات نے ایک اور نیا لفظ ٹسٹ ٹیوب بے بی دیا اور یہ لفظ اردو والوں نے جوں کا توں قبول کر لیا۔ اس کو امتحانی نلی کا بچہ یا طفلِ امتحانی نلی کہنا ظاہر ہے کہ ایک مضحکہ خیزسی بات ہے۔

اصطلاحات بناتے ہوئے ماہرین نے اس بات کا خیال رکھا کہ اگر اردو میں پہلے سے اسی مفہوم کا کوئی لفظ استعمال ہو رہا ہو تو پھر انگریزی یا عربی یا فارسی کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسی لفظ کو استعمال کرنا چاہئے جو اردو میں صحیح متبادل کے طور پر رائج ہے۔ جیسے انگریزی لفظ کوچ (Coach) کے لیے بگھی اور رتھ کے الفاظ پہلے سے موجود تھے۔ اس لیے ترجمہ کرتے ہوئے کوچ کی جگہ بگھی یا رتھ ہی استعمال کیا گیا۔ سیمنٹ نئے دور کا لفظ ہے اور گچ یعنی تعمیری مسالے سے بالکل مختلف ہے۔ انگریزی میں گچ کے لیے مارٹر (Mortar) کا لفظ لکھا جاتا ہے لیکن ہم نے مارٹر کے لیے گچ ہی استعمال کیا جب کہ سیمنٹ کو سیمنٹ ہی رہنے دیا۔ اگر اصطلاح عربی، فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہے تو پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس لفظ کو اردو میں کیسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسکول انگریزی لفظ ہے اور اس کا صحیح تلفظ سکول ہے لیکن چوں کہ اردو الفاظ کا پہلا حرف متحرک ہوتا ہے اس لیے اس میں الف کا اضافہ کر لیا گیا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ اردو میں آنے کے بعد لفظ کبھی کبھی تبدیل بھی ہو جاتا ہے اور مسلمہ اصول یہ ہے کہ جو لفظ اردو میں عوام استعمال کر رہے ہیں وہی درست مانا جانا چاہیے۔ اس لیے عربی یا فارسی الفاظ استعمال کرتے ہوئے پیچیدہ ترکیب پر مبنی اصطلاح کے بجائے ایسی سادہ اور عام فہم اصطلاح بنائی جانی چاہیے جو اردو نحوی ترکیب پر مشتمل ہو۔

علم اور پیشے کے اعتبار سے ایک ہی لفظ کو کئی مفاہیم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ انگریزی لفظ Field خود انگریزی میں بھی کئی مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ کہیں اس کا مطلب کھیت ہے تو کہیں میدان۔ یہی لفظ دوسرے لفظوں کے ساتھ مل کر آتا ہے تو کچھ اور مفہوم دیتا ہے جیسے Field work میں اس لفظ کا مفہوم بالکل مختلف ہے۔ کرکٹ فیلڈ کے لیے ہم کرکٹ کا میدان تو کہہ سکتے ہیں لیکن انگریزی میں Field-day کے لیے کامیابی کے لیے وسیع موقع، مصروفیت کا دن مطلب لیا جاتا ہے۔ اس لیے اردو میں ترجمہ کرتے وقت مترجمین کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ لفظ میں مضمر علم کے سیاق و سباق کو دیکھ کر مناسب متبادل لفظ کا انتخاب کریں۔ آج کل سائنسی اور علمی میدان میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اردو میں ترجمے کا کام بھی بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ علمی ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاح سازی بھی ہوتی ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ایک ہی اصطلاح کے لیے مختلف مترجمین نے مختلف اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بعد میں کون سی اصطلاح مقبول ہوگی۔ اس لیے مترجم کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ متعلقہ علمی موضوع پر ترجمہ کی گئی کچھ کتابوں کا مطالعہ بھی کرے اور ان سے اصطلاحات حاصل کرے۔ لیکن اسے یہ آزادی بھی ملنی چاہیے کہ اگر وہ پہلے کی پیش کردہ کسی اصطلاح سے متفق نہیں ہے تو نئی اصطلاح وضع کر لے، جو صحیح اصطلاحی مفہوم کو پیش کرنے میں کامیاب ہو اور آسانی سے سمجھ میں آئے۔ مترجم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ترجمہ کیے جانے والے علمی موضوع کے علاوہ دوسرے متعلقہ علوم، ان کے تراجم اور وضع کی گئی نئی اصطلاحات سے بھی واقف ہو۔ اس طرح مترجم کو زیادہ بہتر اور جامع اصطلاحات ڈھالنے میں مدد مل سکتی ہے۔

علمی ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاحات سے قطع نظر عموماً لفظی ترجمہ ہی کیا جاتا ہے، کیوں کہ علمی تحریریں ادبی تخلیقات کے مقابلے میں کم پیچیدہ ہوتی ہیں۔ ادبی تخلیقات کا ترجمہ کرتے وقت صرف و نحو یا قواعد کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہر زبان کے قواعد کے اصول مختلف ہوتے ہیں۔ مترجم کو اس پہلو کا بھی خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کسی سائنسداں کا نام Mary Smith ہے اور اس کی کسی تحقیق کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ تو اگر اصل متن میں ضمیر She کا استعمال نہ ہوا ہو اور مترجم کو ضمیر کے استعمال کی ضرورت پیش آئے تو اسے احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ مرد ہے یا عورت۔ اور اسی اعتبار سے ضمیر یا فعل کے متعلقات استعمال کیے جانے چاہئیں، کیوں کہ انگریزی میں جنس کا تعین

فعل سے نہیں ہوتا جب کہ اردو میں فعل جنس کے تابع ہوتا ہے۔طویل اور مرکب جملوں کا ترجمہ کرتے ہوئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے ضرورت کے مطابق دو یا تین جملوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ کیوں کہ مترجم کا اصل مقصد تو مفہوم کی ترسیل ہے۔اگر ترجمہ زیادہ طویل مرکب جملے کی شکل میں ہو تو قاری کو سمجھنے میں دشواری پیش آسکتی ہے۔بعض مرتبہ خاص علمی موضوعات میں بھی روزمرہ اور محاورہ استعمال ہوسکتا ہے۔ایسی صورت میں مترجم کو چاہئے کہ وہ اصل مفہوم پر توجہ دے نہ کہ محاورے یا روزمرہ کی تلاش پر۔ویسے اگر متبادل محاورہ ترجمے کی زبان میں موجود ہو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کو دونوں زبانوں پر عبور ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن صرف یہی کافی نہیں۔دراصل ترجمہ اور خصوصاً علمی ترجمہ کرتے ہوئے خود مترجم کو سب سے پہلے اصل متن اور اس کے مشمولات کو پوری طرح سمجھنا اور اس طرح ترجمہ کرنا ضروری ہے کہ پڑھنے والا آسانی سے سمجھ سکے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ادبی تخلیق اور علمی مضمون میں کیا فرق ہے ؟
2. مترجم کے لیے اصطلاح سازی کب اور کیوں ضروری ہوتی ہے ؟
3. ابتدا میں کن زبانوں سے علمی سرمایہ اردو میں منتقل کیا گیا؟

10.3 اردو میں علمی تراجم کی ابتدائی روایت

اگر کوئی علم مادری زبان میں ہو تو اسے سمجھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان سے بھی واقف ہو۔اور اگر علم کسی اجنبی زبان میں ہو تو اس کی تفہیم ممکن نہیں ہوتی۔پھر بھی ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ان میں سے بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ انھوں نے دوسری زبان سے جو کچھ حاصل کیا وہ دوسروں تک بھی پہنچ جائے اور لوگ استفادہ کرسکیں۔اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر دیا جائے تا کہ علم کی مزید اشاعت ہو۔ اس بات کو لوگ زمانۂ قدیم سے جانتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے ترجمے کا رواج رہا ہے۔

عربوں نے اس معاملے میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔چنانچہ خلافتِ عباسیہ کے دور میں حکومت کی سرپرستی میں باضابطہ طور پر ترجمے کیے جانے لگے۔ بغداد میں کئی عدیم المثال کتب خانے تھے جہاں دنیا بھر سے کتابیں اکٹھا کی گئی تھیں اور ان کو عربی میں منتقل کرنے کا عمل بڑی تیز رفتاری سے کیا جانے لگا تھا۔یونانی، سنسکرت اور دوسری کئی زبانوں سے یہاں مختلف علوم کا عربی میں ترجمہ ہوا اور اس طرح عرب قوم بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی۔ترجمہ قوموں کی زندگی میں جست کا کام کرتا ہے۔عربوں نے علم ہی کی فراوانی کی بدولت ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ ساری دنیا میں ان کے ڈنکے بجنے لگے۔بغداد پر منگولوں کے حملے کے بعد سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ کتب خانوں کو آگ لگا دی گئی اور بیش قیمت علمی سرمایے ضائع ہو گیا۔اس تباہی سے جو کتابیں محفوظ رہ گئیں ان سے اہل یورپ نے فائدہ اٹھایا اور جہاں تک ممکن ہوسکا، عربی کتابوں کا یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور وہ ترقی کی راہ پر چل پڑے۔یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔یورپ اور امریکہ میں آج جو بے پناہ ترقی ہوئی ہے اس کا منبع ترجمہ ہی ہے جس کے ذریعے انھوں نے دوسری زبانوں سے علم حاصل کر کے اس پر مزید تحقیق کی اور آج ان کا شمار صفِ اول کی اقوام میں ہوتا ہے۔

اردو میں ترجمے کی روایت اسی وقت سے ہے، جب یہ زبان گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔اردو میں سب سے پہلا ترجمہ حضرت میراں جی خدانما کا ہے۔تمہیداتِ ہمدانی عربی کی ایک بہت مشہور کتاب ہے جسے ابوالفضائل شیخ عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی نے تحریر کیا تھا۔اس کتاب میں شرع، فقہی اور تصوف کے مسائل کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا تھا۔حضرت خواجہ بندہ نواز نے اس کتاب کی شرح فارسی میں لکھی۔1655ء میں میراں جی خدانما نے اس کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا تا کہ وہ لوگ جو فارسی اور عربی سے واقف نہیں ہیں، وہ بھی اس کے مطالب کو آسانی سے سمجھ سکیں۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس ترجمے پر وجہی کی سب رس کو اولیت حاصل ہے، جو 1635ء میں لکھی گئی۔کہا جاتا ہے کہ سب رس تاج الحقائق کا ترجمہ ہے۔جب کہ یہ بات پوری طرح درست نہیں ہے۔ہوسکتا ہے کہ سب رس کا بنیادی خیال وجہی نے تاج الحقائق سے لیا ہو لیکن اس کی اعلیٰ انشا پردازی کی وجہ سے اسے

ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔

علمی ترجمے کے ضمن میں دوسرا اہم کام میراں جی یعقوب نے کیا۔ انھوں نے رکن عماد الدین کی فارسی تصنیف شمائل الاتقیا کا 1673ء میں شمائل الاتقیا ہی کے نام سے دکنی اردو میں ترجمہ کیا۔ تقریباً تیرہ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مختلف بزرگوں، صوفیوں اور اولیاء اللہ کے احوال ہیں۔

دکن ہی میں 1704ء میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی کتاب معرفت السلوک کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں بھی تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. بغداد پر منگولوں کے حملے کے بعد سب سے بڑا نقصان کیا ہوا؟
2. تمہیدات ہمدانی کے مصنف کا نام لکھیے۔
3. شمائل اتقیا کا موضوع کیا ہے؟

10.4 علمی وفنی ترجمے کے ادارے

شخصی کوششوں سے بلاشبہ بہت اہم کتابوں کے ترجمے انجام پائے اور بے شمار کتابوں کو عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل کیا گیا۔ علمی وفنی ترجمے کی رفتار میں اس وقت تیزی آئی جب ترجمے کے باضابطہ ادارے قائم کیے گئے۔ ذیل میں ایسے چند اداروں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

10.4.1 فورٹ ولیم کالج میں علمی وفنی تراجم

1800ء میں یہ کالج کلکتہ میں اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ انگلستان سے آنے والے انگریز افسروں کو تربیت دی جاسکے۔ اس کالج کے ایک پروفیسر گل گرسٹ نے ترجمے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ان میں ادبی نوعیت کی کتابیں زیادہ ہیں۔ شکنتلا، سنگھاسن بتیسی، چہار درویش، وغیرہ کا ترجمہ گل گرسٹ ہی کی ایما پر انجام دیا گیا۔ یہاں قرآن کا بھی ترجمہ کیا گیا تھا اور اس کے 56 صفحات کی طباعت بھی ہوچکی تھی لیکن اچانک حکومت کی ہدایت پر باقی صفحات کی طباعت روک دی گئی۔ اس طرح یہ کام ادھورا رہ گیا۔ علمی نوعیت کی کتابوں کے کم ہی ترجمے ہوئے۔ البتہ فن تاریخ پر تین کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے گئے جو فورٹ ولیم کالج کے تنخواہ دار منشیوں نے کیے۔ اردو میں ان تراجم کا مقصد یہ تھا کہ نووارد انگریز افسر زبان کے ساتھ تاریخ بھی جان لیں۔ غلام اکبر نے فارسی سے تواریخ السلاطین کا ترجمہ اسی نام سے کیا۔ محمد عمر نے فارسی ہی سے تواریخ عالم گیری کا ترجمہ کیا اور تصدق حسین نے تواریخ تیموری کو اردو میں منتقل کیا۔ ان کے علاوہ میر شیر علی افسوس نے تاریخ آسام کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

10.4.2 فورٹ سینٹ جارج کالج میں علمی وفنی تراجم

1717ء میں انگلستان سے آنے والے انگریز منشیوں یا رائٹرس کی تربیت کے لیے ایک اسکول قائم کیا گیا تھا۔ اسی اسکول کو 1812ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج کا نام دیا گیا۔ یہاں کے اساتذہ نے ترجمے بھی کیے۔ تاج الدین بہجت نے سید عبدالقادر پاشاہ الحسینی کے ایک رسالے کا ''مرصاد المشتاقین'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ محمد مہدی واصف نے شیخ عبدالحق دہلوی کی کتاب ''آداب الصالحین'' اور ''تکمیل الایمان'' کے اقتباسات کا ترجمہ ''تکمیل الایمان ہندی'' کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ امام غزالی کی دو کتابوں کیمیائے سعادت کا ''ترجمہ کیمیائے سعادت'' کے نام سے اور احیاء العلوم کے ایک باب کا ترجمہ ''رسالہ اخلاق النبی کریم'' کے نام سے کیا۔ انھوں نے امام بخاری کی ایک کتاب التعبیر کا ترجمہ رسالہ تعبیر خواب کے نام سے کیا تھا لیکن وہ شائع نہ ہوسکا۔ مہدی واصف نے جلال الدین شافعی اور جلال الدین سیوطی کی تحریر کردہ تفسیر جلالین کا بھی ترجمہ اسی نام سے کیا۔ یہاں انگریز اساتذہ نے بھی ترجمے کے کام انجام دیئے۔ یہ سارے ترجمے مذہبی نوعیت کی کتابوں کے ہیں۔ علمی نوعیت کی دو کتابوں کے ترجمے بھی کیے گئے۔ ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور نے گلیک کی کتاب کا ترجمہ ''کتاب علم نجوم'' کے نام سے اور کنکویسٹ کی کتاب کا ترجمہ ''اصول فن قبالت'' کے نام سے کیا۔

10.4.3 دارالترجمہ شمس الامرا میں علمی وفنی تراجم

نواب فخر الدین خاں شمس الامرا پائیگاہ کے امیر تھے۔ انھیں ذاتی طور پر علم کی اشاعت سے دل چسپی تھی۔ یورپ کی سائنسی اور صنعتی ترقی سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ حیدرآباد کے باشندے جدید علوم سے بھی واقف ہوں۔ چنانچہ انھوں نے فرانس، برطانیہ اور دیگر یوروپی ممالک سے جدید علوم کی کتابیں منگوائیں اور ماہر مترجمین سے اُردو میں ان کے ترجمے کروائے۔ اس ضمن میں نئی سائنسی اصطلاحات بھی وضع کی گئیں۔ انھوں نے حیدرآباد میں مدرسہ فخریہ قائم کیا، جہاں جدید علوم وفنون اور سائنسی موضوعات پر مشتمل نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ ان ہی کی کوششوں سے 1844ء میں ہندوستان کا پہلا مدرسہ طبابت ریزیڈنسی میں قائم کیا گیا۔ مدرسہ فخریہ کے تعلیم یافتہ طلبا نے یہاں داخلہ لیا اور چونکہ وہ دوسروں کے مقابلے میں جدید علوم بشمول طبی نصاب سے واقف تھے اس لیے وہ بہتر طالب علم ثابت ہوئے۔ شمس الامرا نے فلکی مشاہدے کے لیے رصد گاہ بھی قائم کی۔ ترجمے کے کام کو آگے بڑھانے کی غرض سے انھوں نے محلہ جہاں نما کی ایک حویلی میں دارالترجمہ شمس الامرا قائم کیا جہاں ہندو، مسلم، انگریز اور فرانسیسی علما کو ترجمے کے کام پر متعین کیا گیا۔ ان میں غلام محی الدین حیدرآبادی، مسٹر جونس، جوزف، رتن لال، میر شجاعت علی کرم اور دوسرے شامل ہیں۔ شمس الامرا، کے بعد بھی ان کے خاندان سے وابستہ افراد نے ان کے کام کو آگے بڑھایا اور یہ سلسلہ 1833ء سے 1877ء تک جاری رہا۔ اور اس عرصے میں یہاں 37 کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ یہاں سے ترجمہ ہونے والی کتابوں میں مقطع الارض 1836ء، علم ہندسہ، رسالہ علم واعمال کروی، ستہ شمسیہ کے عنوان سے چھ جلدیں، علم جرثقیل، علم ہئیت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر، علم برق (1840) انوار بدریہ، افضل الآداب، طبی لغت 1853ء، شمس الہندسہ شامل ہیں لیکن ان میں سے چند کتابیں محروم اشاعت رہیں۔ یہ کتابیں کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہیں۔

10.4.4 نوابینِ اودھ کے زیر اہتمام علمی وفنی تراجم

اودھ کے نواب نصیر الدین حیدر نے انگریزی سے اردو میں سائنسی کتابوں کا ترجمہ کروانے کے لیے ایک انگریز کو مقرر کیا۔ جس کی اعانت سے سید کمال الدین حیدر اور دوسروں نے اردو میں ترجمے کا کام انجام دیا۔ نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ اور پھر امجد علی شاہ نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ 1833ء سے 1853ء تک بیس سال کے عرصے میں دیگر کتابوں کے علاوہ یہ کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں۔ مفتاح الافلاک (1833ء)، رسالہ ہئیت (1847ء) مقاصد علوم (1841ء)، رسالہ مقناطیس، رسالہ ہیضے کا علاج (1853ء)۔

10.4.5 ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی کالج میں علمی وفنی تراجم

یہ کالج 1825ء میں قائم ہوا۔ یہاں ریاضی، سائنس، فلسفہ، تاریخ اور اخلاق کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کالج کے ذمے داروں نے تعلیمی معیار کو بلند کرنے اور طلبا کے لیے نصابی کتب مہیا کرنے کی غرض سے اسکول بک سوسائٹی کے نام سے 1840ء میں ایک سوسائٹی قائم کی گئی۔ 1843ء میں اس سوسائٹی کا نام تبدیل کر کے ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کر دیا گیا اس کا مقصد دیسی زبانوں میں سائنسی اور جدید علوم کے تراجم کرانا تھا۔ اس سوسائٹی نے تراجم کے اصول مقرر کیے اور اصطلاحات وضع کیں۔ اس سوسائٹی کے ترجموں اور تالیف کی تعداد 128 ہے۔ مندرجہ ذیل کتابیں انگریزی سے ترجمہ کر کے طلبا کے لیے مہیا کی گئیں۔

الجبرا، اصول علم ہئیت، رسالہ کیمسٹری، جغرافیہ طبعی، علم وعمل طب، مساحت، طبیعیات، رسالہ مقناطیس، حرکیات وسکونیات، علم مناظر، حرارت، رسالہ علم برق، گالون ازم، رسالہ علم حساب، رسالہ علم مساحت مستعمل وعلم مثلث (1844ء) رسالہ علم طلب (1847ء) رسالہ اعمال جراحی (1848ء) اصول وقواعد مایعات (1850ء)، مزید الاموال یا سلاح الاحوال (1854ء)۔ اصول علم مثلث وترش ہائے مخروطی وعلم ہندسہ بالجبر (1844ء) رسالہ اصول کلوں کے باب میں (1863ء)۔ یہاں کے مترجمین میں مسٹر بوتروس، ڈاکٹر اسپرنگر، منشی کریم الدین، مولوی ذکا اللہ، ماسٹر رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرساد، پیارے لال، ہردیو سنگھ، ڈاکٹر ضیا الدین اور دوسرے کئی لوگ شامل ہیں۔

10.4.6 سائنٹفک سوسائٹی میں علمی وفنی تراجم

یہ سوسائٹی سرسید احمد خان نے 1863ء میں قائم کی۔اس کا پہلا اجلاس غازی پور میں 1864ء میں منعقد ہوا۔ سوسائٹی کا مقصد انگریزی یا یورپ کی دوسری زبانوں میں لکھی گئی علوم وفنون کی کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنا تھا۔1866ء میں علی گڑھ میں اس کی اپنی عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی۔1887ء کو سائنٹفک سوسائٹی کو مدرسۃ العلوم میں ضم کر دیا گیا۔ 7/نومبر 1887ء کو یہ سوسائٹی بند ہوگئی۔سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً پندرہ کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کرائیں۔ان میں تاریخ مصر، تاریخ چین، قدیم یونان کی تاریخ، رسالہ فلاحت، فن کاشت کاری، رسالہ علم انتظام مدن، تاریخ ہندوستان، رسالہ علم برقی، اصل سیاست مدن، تاریخ ایران، رسالہ علم جغرافیہ، رسالہ جرثقیل وغیرہ شامل ہیں۔ان کتابوں میں سے کسی پر بھی مترجم کا نام نہیں لکھا گیا بلکہ یہ لکھا ہے کہ ''ترجمہ کیا اور مشتہر کیا سائنٹفک سوسائٹی نے''۔اس لیے یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ ان کے مترجمین کون تھے۔کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر کتابوں کے ترجمے خود سرسید نے کیے اور تقریباً ساری کتابوں پر اشاعت سے قبل نظرِ ثانی بھی کی۔

10.4.7 مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دارالترجمے میں علمی وفنی تراجم

جموں کشمیر کے مہاراجہ نے 1850ء کے آس پاس ایک دارالترجمہ قائم کیا' جہاں مختلف علوم کو ڈوگری' ہندی' پنجابی اور اردو میں منتقل کرنے کا کام انجام دیا گیا جن میں طب' جدید میڈیسن' کاغذ سازی' انجینیرنگ' فوجی فنون' آلات حرب اور مذہبیات پر مشتمل کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔علم طب سے متعلق ترجمہ کی گئی کتابوں میں امراض اطفال' تشریح الابدان' علم امراض پر ترجمہ شرح اسباب' اسبابِ امراض' اسبابِ امراض والعلاجات' علاج الامراض' ہدایات پیدائش بچہ' امراض الاصبیان اور ہدایت الاطبا جیسی کتابیں شائع کی گئیں۔

10.4.8 دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں علمی وفنی تراجم

جامعہ عثمانیہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ریاست حیدرآباد کے طلبا کو ان کی اپنی مادری زبان یعنی اردو میں جدید علوم وفنون کی تعلیم دی جاسکے۔لیکن سب سے بڑے مسئلہ طلبا کے لیے کتابوں کی فراہمی تھی۔چنانچہ جامعہ میں ایک شعبہ تالیف وتصنیف قائم کیا گیا' جو بعد میں دارالترجمہ عثمانیہ کہلایا۔اس سے قبل فخر الملک کے قائم کردہ دارالترجمہ کی کتابیں نصاب میں رائج تھیں لیکن ایک یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی ضرورت کی تکمیل لازمی تھی۔دارالترجمہ نے اس کام کو انجام دے کر اردو میں علمی وفنی علوم کی تعلیم کو ممکن بنا دیا۔یہاں ایسے لوگ ملازم رکھے گئے' جو کسی خاص مضمون کے ماہر بھی تھے اور انگریزی کے علاوہ اردو' عربی اور فارسی پر عبور رکھتے تھے۔ابتدا میں قاضی محمد حسین' قاضی تلمذ حسین' محمد الیاس برنی' سید ہاشمی فرید آبادی' چودھری برکت علی' نظم طباطبائی' عبداللہ عمادی' سید علی رضا' عبدالحلیم شرر اور بلدیو سنگھ مترجم ہوئے۔بعد میں مزید مترجمین کے ذریعے ترجمے کروائے گئے۔کتابیں ترجمہ کرنے کے لیے متعلقہ علوم کے ماہرین کی ایک کمیٹی تھی' جو کتابوں کا انتخاب کرتی تھی اور پھر یہ کتابیں ماہر مترجمین کے حوالے کی جاتی تھیں۔ترجمہ کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کرنے کے لیے ناظرِ ادب اور ناظرِ مذہب ہوتے تھے جو ادبی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ترجمے کا تجزیہ کرتے اور اپنی سفارشات بھیجا کرتے تھے۔ دارالترجمہ کے پہلے ناظم بابائے اردو مولوی عبدالحق مقرر کیے گئے۔

دارالترجمہ میں میڈیسن' انجینئرنگ' طبیعیات' کیمیا' فلسفے' تاریخ' معاشیات' ریاضی' غرض ہر علمی موضوع پر انگریزی کی بہترین کتابوں کا انتخاب کر کے ان کے ترجمے کیے گئے۔

تاریخ پر یہاں 95 کتابیں ترجمہ کی گئیں' جن میں سے 83 کتابیں شائع ہوئیں۔ان تراجم میں ہندوستان کی قدیم تاریخ' وسطی تاریخ' جدید تاریخ' تاریخ انگلستان' تاریخ یونان' تاریخ روم' تاریخ یورپ وغیرہ شامل ہیں۔ان تراجم کے لیے مندرجہ بالا مترجمین کے علاوہ پروفیسر ہارون خان شیروانی' پروفیسر جمیل الرحمٰن' ڈاکٹر سید سجاد' ڈاکٹر ابن حسن' ڈاکٹر سید عابد حسین اور کئی دیگر ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔

معاشیات کی کتابوں کے ترجمے' پروفیسر حبیب الرحمٰن' مولوی رشید احمد' پروفیسر الیاس برنی' احمد محی الدین انصاری' مولوی محمد نصیر الدین' محمد احمد سبزواری اور دوسروں نے کیے۔معاشیات پر یہاں ترجمہ کی ہوئی 19 کتابیں شائع ہوئیں۔

فلسفے کی کتابوں کے ترجمے خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر میر ولی الدین، مولوی احسان احمد، مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر سید وحید الدین، عبداللہ عمادی، مرزا ہادی رسوا، ابوالخیر مودودی اور دوسرے علما نے کیے۔ فلسفے کے موضوع پر دارالترجمہ سے 27 کتابیں شائع ہوئیں۔

نفسیات کے موضوع پر مولوی احسان احمد کے علاوہ معتضد ولی الرحمٰن، عبدالباری ندوی اور مرزا رسوا نے 15 کتابوں کے ترجمے کیے۔ اخلاقیات پر 12 کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ اس موضوع پر ترجمہ کرنے والوں میں مولوی عبدالباری، حکیم عبدالباقی، معتضد ولی الرحمٰن، مولوی احسان احمد اور دیگر مترجمین شامل ہیں۔ انجینئرنگ کے تراجم پروفیسر ضیاالدین انصاری کے علاوہ مولوی محمد احمد مرزا، قاضی محمد حسین، للت موہن مکرجی، بالا پرشاد، لوکندر بہادر، مرزا مہدی علی، محمد عظمت اللہ اور دوسرے کئی مترجمین نے کیے۔

قانون کی کتابیں مولوی مسعود علی، رائے ویدناتھ، سید علی رضا، ڈاکٹر میر سیادت علی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، پروفیسر حسین علی وغیرہ نے اردو میں منتقل کیں۔

دارالترجمے کا قیام 1917ء میں ہوا اور دو سال کے اندر ہی کتابوں کے شائع ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 1948ء میں ریاست حیدرآباد ہند یونین میں ضم کر دی گئی، جس کے بعد ترجمے کے کام کی رفتار کم ہو گئی اور 1949ء میں دارالترجمہ کے دفتر میں آگ لگ گئی اور کئی قیمتی مسودات شعلوں کی نذر ہو گئے۔ 1950ء میں یہ شعبہ ختم ہو گیا، کیوں کہ جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم اردو سے انگریزی کر دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر مجیب الاسلام کی تحقیق کے مطابق:

> ''دارالترجمہ عثمانیہ میں 1917ء سے 1947ء تک یعنی تیس سال میں 457 کتابیں ترجمہ و تالیف کی گئیں۔ ان میں سے 426 کتابیں ترجمہ اور 31 کتابیں تالیف کی گئیں۔ تمام تراجم میں 360 کتابیں انگریزی سے ترجمہ کی گئیں۔ ان میں سے 306 تراجم شائع ہوئے۔ 5 جرمن تصانیف کے ترجمے کیے گئے۔ یہ پانچوں شائع ہوئے۔ 3 فرانسیسی زبان سے ترجمے کیے گئے۔ یہ تینوں شائع ہوئے۔ 51 عربی زبان سے کیے گئے۔ جن میں 45 شائع ہوئے۔ 17 فارسی تصانیف کے ترجمے ہوئے ان میں سے 9 شائع ہوئے اور 31 تالیفات میں سے 27 شائع ہوئیں۔ مجموعی طور پر 395 تراجم و تالیفات شائع ہو کر کورس میں شامل کیے گئے۔''
>
> (دارالترجمہ کی علمی و ادبی خدمات۔ صفحہ 144)

چوں کہ دارالترجمہ عثمانیہ جل کر تباہ ہو چکا تھا اور یہاں شائع کی گئی کتابوں کا پورا سٹ کسی ایک لائبریری میں موجود نہ تھا، لیکن بہ دقتِ تمام ڈاکٹر مجیب الاسلام نے ترجمہ کی گئی کتابوں کی ایک فہرست تیار کی جو ان کی کتاب ''دارالترجمہ کی علمی و ادبی خدمات'' میں شامل ہے۔ اگرچہ یہ فہرست بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی لیکن بیشتر کتابوں کے مترجمین کے علاوہ اصل کتاب اور اس کے مصنف کا ذکر بھی اس فہرست میں ہے۔

10.4.9 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں علمی و فنی تراجم

مارچ 1996ء میں حکومت ہند نے اردو زبان کی ترقی کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نامی ادارہ قائم کیا۔ جسے پہلے ''ترقی اردو بیورو'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ قیام سے لے کر اب تک اس ادارے نے خاصی تعداد میں علمی و فنی کتابوں کے اردو ترجمے کروا کے شائع کیے ہیں۔ ان میں تاریخ، تعلیم و تدریس، حیات و خدمات، زبان و لسانیات، سائنس، ٹکنالوجی، جغرافیہ، کیمیا، طبیعیات، گھریلو سائنس، ریاضی، زراعت، سماجیات، سیاسیات، طب و معالجات، کمپیوٹر سائنس، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، لائبریری سائنس، معاشیات، کامرس، نفسیات پر سینکڑوں کتابیں شامل ہیں۔

10.4.10 مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں علمی و فنی تراجم

جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعۂ تعلیم کے خاتمے کے بعد ملک بھر میں ایسی کوئی یونیورسٹی نہ تھی جہاں اردو زبان کے ذریعے مروجہ علوم و فنون کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہو۔ برسوں تک جدوجہد کرنے کے بعد 1998ء میں حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے ذریعے طلبا کو جدید علوم کی تعلیم دی جائے۔ یہاں بھی نصابی کتب کا مسئلہ درپیش تھا۔ چنانچہ یہاں ایک ٹرانسلیشن ڈویژن قائم کیا گیا، جواب

شعبہ ترجمہ ہو گیا ہے۔ تقریباً ہر کورس کے لیے انگریزی سے ترجمہ کر کے طلبا کو کتابیں مہیا کی جانے لگیں۔ اس یونیورسٹی سے 250 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں تقریباً نصف کتابیں ترجمہ ہیں۔ اس مقصد کے لیے اردو یونیورسٹی نے دوسری یونیورسٹیوں جیسے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سے معاہدہ کیا ہے اور وہاں کی نصابی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام انجام دیا جا رہا ہے۔

مندرجہ بالا اداروں کے علاوہ اور بھی کئی ادارے جیسے NCERT، نیشنل بک ٹرسٹ، انجمن ترقی اردو، دہلی اکیڈمی اور ملک بھر کی دوسری اکیڈمیاں ترجمے کے کام کو آگے بڑھا رہی ہیں اور قارئین کے لیے اردو میں علمی و فنی کتابیں انگریزی سے ترجمہ کرا کے شائع کر رہی ہیں۔ دنیا بھر میں علمی و فنی ترقیاں بامِ عروج پر ہیں اور ہر روز سینکڑوں نئی کتابیں انگریزی اور دوسری زبانوں میں لکھی جا رہی ہیں۔ نئی کتابوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ بہتر سے بہتر کتابیں اردو میں منتقل ہوں۔ اور یہ کام شد و مد سے جاری ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فورٹ ولیم کالج کب قائم کیا گیا؟
2. فورٹ سینٹ جارج کالج میں کون سی علمی و فنی کتابیں ترجمہ کی گئیں؟
3. دارالترجمہ شمس الامرا کے چند مترجمین کے نام لکھیے۔
4. ترجمے اور نصابی کتاب کی فراہمی کے لیے دلی کالج کے تحت کب اور کون سا ادارہ قائم کیا گیا؟
5. سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا مقصد کیا تھا؟

10.5 خلاصہ

کسی زبان کی مقبولیت کا راز اس بات میں ہوتا ہے کہ اس میں علوم و فنون کی کتنی کتابیں ہیں۔ اردو میں علمی و فنی کتابیں نہ ہونے کے برابر تھیں اس لیے ضروری تھا کہ دوسری زبانوں سے علوم و فنون سے متعلق کتابوں کو ترجمہ کیا جائے تاکہ اردو بولنے والے ترقی کی راہوں میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ جدید سائنسی ترقیات نے علوم و فنون کے ذخیرے میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ ہر علم کے ساتھ اس کی اپنی اصطلاحیں بھی ہوتی ہیں۔ اردو ترجمہ کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا کہ اگر کسی اصطلاح کے لیے عام طور پر سمجھا جانے والا کوئی لفظ موجود نہ ہو تو نیز اصل زبان کا لفظ عام طور پر بولا اور سمجھا جاتا ہو تو نئی اصطلاح وضع کرنے کے بجائے انگریزی لفظ کو ہی استعمال کر لیا جائے۔

علمی ترجمہ عموماً لفظی ہوتا ہے، کیوں کہ علمی تحریریں ادبی تخلیقات کے مقابلے میں کم پیچیدہ ہوتی ہیں اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ نثر میں مرصع زبان کے بجائے سادہ اور سلیس زبان استعمال کی جائے تاکہ علم حاصل کرنے کے خواہش مندوں کو اصل مفہوم تک رسائی میں دشواری نہ ہو۔ اردو میں ترجمے کا عمل زبان کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ ابتدا میں مذہبی موضوعات کے ترجمے کیے گئے بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ فنی اور علمی کتابوں کے بھی ترجمے کیے جانے چاہئیں۔ چنانچہ مختلف اداروں نے ترجمے کے کام کو آگے بڑھایا۔ جن میں فورٹ ولیم کالج، فورٹ سینٹ جارج کالج، دلی کالج وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ، نوابین اودھ اور حیدرآباد میں شمس الامرا کی سرپرستی میں علمی و فنی تراجم کیے گئے۔ سرسید احمد خاں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کر کے کئی علمی کتابوں کے ترجمے کروائے۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں طلبا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے 426 کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔

موجودہ دور میں انجمن ترقی اردو، این سی ای آر ٹی، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی اکیڈمی جیسے اداروں نے بھی اس ضمن میں کام کیا ہے۔ حکومت ہند کے ادارے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سینکڑوں علمی و فنی کتابیں اردو میں منتقل کیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ ترجمہ نے بھی طلبا کی کئی نصابی کتب کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

اس تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں علمی و فنی موضوعات پر کتابوں کی دستیابی اگر پوری طرح نہیں تو کم از کم کچھ حد تک تو ضرور ہے۔

10.6 : نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. دارالترجمہ شمس الامرا کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
2. دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. علمی ترجمے کے بنیادی اصولوں کی نشاندہی کیجیے۔
2. سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. علمی وفنی تراجم کے ضمن میں دتی کالج کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

10.7 فرہنگ

حسب استعداد	=	حسب مقدور، صلاحیت کے مطابق	شانہ بہ شانہ چلنا	=	ساتھ ساتھ چلنا
مطلوبہ	=	درکار	مخلوط زبان	=	ملی جلی زبان
دقیق	=	گاڑھی، مشکل	متبادل	=	قائم مقام، اسی طرح کی دوسری چیز
مشمولات	=	وہ چیزیں جو شامل ہیں	مرصع	=	خوش بیانی سے آراستہ موتی یا جواہرات سے جڑا ہوا

10.8 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر قمر رئیس (مرتبہ) — ترجمے کا فن اور روایت
2. ڈاکٹر خلیق انجم (مرتبہ) — فن ترجمہ نگاری
3. ڈاکٹر مجید بیدار — دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات
4. ڈاکٹر مجیب الاسلام — دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی علمی وادبی خدمات
5. ثریا حسین — سرسید احمد خاں اور ان کا عہد

اکائی 11 : اردو میں دفتری و قانونی تراجم کی روایت و اہمیت اور مسائل

ساخت

11.1 تمہید

11.2 ہندوستان میں دفتری اور قانونی تراجم کی روایت کا آغاز

11.3 دکن کی سرکاری زبان

11.4 ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی سرکاری زبان

11.4.1 مغل عہد کی قانونی اور دفتری اصطلاحات

11.5 ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سرکاری زبان

11.5.1 ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں دفتری اور قانونی زبان اور اصطلاحات

11.6 اردو میں دفتری اور قانونی اصطلاحیں

11.6.1 آزادی کے بعد ہند و پاک میں قانونی اور دفتری زبان کی صورتِ حال

11.6.2 پاکستان میں قانونی اور دفتری اصطلاحات کے ادارے

11.6.3 دفتری مراسلت پر کچھ کتابیں

11.7 خلاصہ

11.8 نمونۂ امتحانی سوالات

11.9 فرہنگ

11.10 سفارش کردہ کتابیں

11.1 تمہید

انسان کی سماجی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی انتظامی اور قانونی زبان وجود میں آئی۔ سماجی زندگی کا آغاز اس طرح ہوا تھا کہ کوئی ایک شخص اپنی طاقت اور فہم و ادراک کے بل پر ایک مخصوص گروہ کا سردار بن جاتا۔ گروہ کو منظم رکھنے کے سلسلے میں وہ کچھ قوانین وضع کرتا اور ساتھ رہنے کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتا، جن کی مدد سے گروہ کے تمام افراد ایک ساتھ رہ کر آرام اور سکون سے زندگی گزار سکتے۔ سردار گروہ کو منظم رکھنے کے سلسلے میں کچھ قوانین وضع کرتا۔ اس طرح سماجی نظام کے ساتھ انتظامی اور قانونی زبان بھی وجود میں آئی۔

قانون کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ''یہ انسانوں کے لیے قاعدۂ عمل ہے، جسے سماج کے مقتدر اعلیٰ نے بنایا ہے''۔ اس قاعدۂ عمل کی تعمیل اس طرح کرائی جاتی رہی ہے کہ گروہ کے تمام افراد کو بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ قاعدے پر عمل کریں گے تو آرام سے زندگی گزاریں گے اور اگر عمل نہیں کریں گے تو انھیں سزا دی جائے گی۔ یہ قاعدے قانون صرف اُن لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو قاعدۂ عمل کی پابندی نہیں کرتے۔

11.2 ہندوستان میں دفتری اور قانونی تراجم کی روایت کا آغاز

مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو وہ جو قانونی اور انتظامی اصطلاحیں ساتھ لائے تھے وہ فارسی، عربی اور ترکی زبانوں سے لی گئی تھیں۔ خود ہندوستان میں مقامی زبانوں میں انتظامیہ کی اصطلاحیں موجود تھیں۔ مسلمانوں نے ان اصطلاحوں کا بھی فراخ دلی سے استعمال کیا۔ آٹھویں صدی سے سولہویں صدی تک مسلمانوں کی حکومت میں انتظامی ڈھانچے اور قانون کی صورتیں الگ الگ رہی ہیں۔ ہندوستان میں غوری، ترک، خلجی، پٹھان، لودھی اور مغل حکومتوں کی انتظامی اور قانونی اصطلاحیں ہندوستان کے انتظامیہ میں استعمال ہوتی رہیں۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں ان میں انگریزی اصطلاحیں بھی بڑی تعداد میں شامل ہوگئیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے قانونی اور انتظامی مقاصد کے لیے کن زبانوں کا استعمال کیا؟
2. مسلمان ہندوستان میں اپنے ساتھ کون کون سی زبانیں لائے؟
3. مسلم حکمرانوں کی انتظامی اور قانونی زبان کس صورت میں محفوظ ہے؟

11.3 دکن کی سرکاری زبان

جب سلطان محمد بن تغلق 1325ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے دکن میں کپل، دھارواڑ، رائچور، بلاری اور انند پور کے علاقوں کو فتح کرلیا۔ اُس نے شمالی ہندوستان اور دکن کے درمیان سیاسی رابطہ قائم کرنے کے لیے دکن میں دولت آباد کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ تغلق کے حکم سے ساری آبادی دولت آباد منتقل ہوگئی۔ جو لوگ دہلی سے دولت آباد منتقل ہوئے تھے۔ ان کی مادری زبان اردو بھی ان کے ساتھ منتقل ہوئی' جو آہستہ آہستہ آس پاس کے علاقوں میں بھی پھیل گئی۔ محمد بن تغلق کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ 1347ء میں علاء الدین حسن بہمنی شاہ نے جنوبی ہندوستان میں پہلی مسلم حکومت قائم کی۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ بہمنی حکومت کی سرکاری زبان اردو تھی لیکن اکثریت اُن مؤرخین کی ہے' جن کا خیال ہے کہ بہمنی حکومت کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ بہمنی سلطنت کے بعد ابراہیم عادل شاہ کا دور شروع ہوا۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ عادل شاہی حکومت کی سرکاری زبان اردو تھی لیکن اس سلطنت کے بادشاہ یوسف عادل شاہ نے پھر فارسی کو سرکاری زبان بنا دیا۔ اس خاندان کا ایک اور بادشاہ ابراہیم عادل شاہ جب تخت نشین ہوا تو اُس نے پھر اردو کو سرکاری زبان بنا دیا۔ سرکاری زبان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُن حکومتوں کی دفتری اور قانونی زبان اردو تھی۔ عادل شاہی سلطنت کی ہم عصر سلطنت قطب شاہی حکومت تھی۔ اس خاندان کے محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہا جاتا ہے لیکن قلی قطب شاہ کی دفتری اور قانونی زبان فارسی تھی۔ غرض یہ ہے کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بعض مؤرخین نے دکنی سلطنتوں کی سرکاری زبان یعنی دفتری اور قانونی زبان تامل، کنڑ، مرہٹی کو بھی بتایا ہے۔

اردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے اپنی کتاب 'حیدر آباد میں اردو کی ترقی' میں مدلّل طریقے سے ثابت کیا ہے کہ ان تمام سلطنتوں کی قانونی اور دفتری یعنی سرکاری زبان فارسی ہی تھی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''بہمنیوں کا زمانہ ہو کہ عادل شاہی یا قطب شاہی عہد اردو کبھی دفتروں کی زبان نہیں رہی۔'' ایسی صورت میں ترجمہ ترسیل کا واحد ذریعہ رہا ہوگا۔ اس زمانے میں فارسی نے مقامی زبانوں سے بہت سی دفتری اور قانونی اصطلاحیں مستعار لی تھیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. شمالی ہندوستان کے کس بادشاہ نے پہلی بار دکن کے بڑے علاقے پر قبضہ کیا؟
2. کس بادشاہ نے دکن میں دولت آباد کو اپنا دارالسلطنت بنایا؟
3. تغلق کی بادشاہت ختم ہونے پر دکن میں کون سی حکومت قائم ہوئی؟

11.4 ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی سرکاری زبان

برصغیر ہندو پاک کی تاریخ تقریباً چار پانچ ہزار سال کی طویل مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق ہندوستان کی قدیم ترین تہذیب وادی سندھ کی تہذیب ہے، جو چار پانچ ہزار برس قبل وجود میں آئی، اس تہذیب نے موہن جوداڑو اور ہڑپا نام کے دو ایسے شہروں کی تعمیر کی جو انسانی تاریخ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس تہذیب میں حکومت کا باقاعدہ نظام اور اس نظام کے لیے انتظامیہ اور قانون کی زبان اور اصطلاحیں نہ ہوں، مگر اس زمانے تک لکھنے کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ہمیں اس عہد کی زبان اور اصطلاحوں کا علم نہیں ہو سکا۔ موہن جوداڑو تہذیب کے چار پانچ ہزار سال بعد مسلمان ہندوستان میں آئے۔ اس دوران بے شمار حکومتیں بنیں اور بگڑیں۔ کوئی حکومت انتظامی اور قانونی زبان کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ مگر اس مدّت کا کوئی تحریری ریکارڈ ہم تک نہیں پہنچا۔ مسلمان حکمرانوں کے ابتدائی عہد سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک کی انتظامی اور قانونی زبان کا مختلف صورتوں میں ریکارڈ موجود ہے۔ ہندوستان میں پہلے مسلم حکمران شہاب الدین غوری سے لے کر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عہد تک تمام بادشاہوں کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔ اس لیے انتظامی اور قانونی کاموں کے لیے مسلم حکمرانوں کی اپنے ساتھ لائی ہوئی عربی، فارسی، ترکی اور مقامی زبانوں کی انتظامی اور قانونی اصطلاحیں استعمال ہوتی رہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان اصطلاحوں میں ترمیم، حذف اور اضافے ہوتے رہے۔

ماہرین اصطلاح سازی کا کہنا ہے کہ مغل عہد کی بہت سی ایسی تاریخیں موجود ہیں، جن میں دفتری اور قانونی اصطلاحات خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس عہد میں انتظامی امور اور ان سے متعلق اصطلاحات باقاعدہ کتابی صورت میں مرتب کی گئی تھیں۔ مغل عہد کے بعد جب اردو نے فارسی کی جگہ لی تو قانونی اور دفتری اصطلاحات کا یہ بیش بہا ذخیرہ اردو کی اصطلاحات سازی میں بہت کام آیا۔

مغل عہد کی اصطلاحوں کی کتابیں اردو اور ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں انتظامیہ اور قانون کی اصطلاحیں وضع کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ ان کتابوں سے مستعار لی گئی اصطلاحیں آج بھی استعمال ہوتی ہیں۔

11.4.1 مغل عہد کی قانونی اور دفتری اصطلاحات

کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں کے زمانے میں دفتروں کی زبان کے طور پر مال گزاری کا ریکارڈ مقامی زبانوں میں رکھا جاتا تھا۔ مغلوں کے عہد کی قانونی اور دفتری زبان پر ایک بہت اچھی لغت 1754ء میں 'مراۃ الاصطلاح' کے نام سے مرتب ہوئی تھی۔ اس لغت سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں جاگیر کی کتنی قسمیں تھیں۔ اس کے علاوہ درخواستوں، عرضداشتوں اور نظم و نسق سے متعلق اصطلاحات کا علم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ مغل عہد میں جو دفتری اور قانونی اصطلاحات رائج تھیں، اُن میں وزیر، دیوان، کاشتکار، زمیندار، مال گزار، تعلق دار، اہل کار، منصب دار، قانون گو اور چودھری جیسی بے شمار اصطلاحوں کا استعمال آج بھی ہوتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1- ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی حکومت کی قانونی اور دفتری زبان کون سی تھی؟

2- مسلم حکمرانوں کے عہد میں کس کس زبان سے قانونی اور دفتری اصطلاحیں لی گئیں؟

3- مغل حکومت کے زمانے میں جو قانونی اور دفتری اصطلاحیں استعمال ہوتی تھیں وہ کہاں محفوظ ہیں؟

4- شاہ جہاں کے زمانے میں مال گزاری کا ریکارڈ کن زبانوں میں رکھا جاتا تھا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں استعمال ہونے والی ایسی چار اصطلاحیں بتائیے، جو آج بھی استعمال ہوتی ہیں۔

5- 'مراۃ الاصطلاح' کس زمانے میں مرتب ہوئی تھی؟

11.5 ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سرکاری زبان

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے عہد تک پورے برصغیر کی سرکاری وعدالتی اور تہذیبی وثقافتی زبان فارسی تھی۔ فارسی پورے ہندوستان میں رابطے کی زبان تھی۔ انگریز ہندوستانیوں کو سماجی اور اقتصادی طور پر کمزور کرنا چاہتے تھے۔ نیز ہندوستانیوں کی انفرادیت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے 1837ء میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ فارسی کو دفتری اور قومی زبان کا جو درجہ دیا گیا ہے، وہ غلط ہے، کیوں کہ عوام فارسی سے نا آشنا ہیں۔ اس لیے برطانوی حکومت محسوس کرتی ہے کہ اردو کو یہ مرتبہ دیا جانا چاہیے۔ دراصل برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ فارسی کو ہٹا کر انگریزی کو انتظامیہ کی زبان بنایا جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی منظر عام پر آئی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں سنسکرت، فارسی اور دیسی زبانوں میں تعلیم دینے سے طلبہ کی زندگی خراب ہوتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم انگریزی میں دی جائے۔ فارسی کو دفتری اور قانونی زبان کے طور پر جاری رکھنے کے خلاف برطانوی حکومت کی دلیل یہ تھی کہ فارسی عوام کی نہیں خواص کی زبان ہے۔ لیکن دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانیوں پر جس انگریزی کو تھوپا جارہا تھا وہ عوام اور خواص دونوں میں سے کسی کی بھی زبان نہیں تھی۔ مگر ہونا وہی تھا جو حکمران وقت چاہتے تھے۔ یعنی اسکولوں اور کالجوں میں فارسی کے بدلے انگریزی پڑھائی جانے لگی۔ برطانوی حکومت کی اس تعلیمی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی نئی تعلیم یافتہ نسل انگریزی پڑھ کر خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہی رہی لیکن فکر ونظر اور تہذیب وثقافت کے اعتبار سے انگریز بن گئی۔

برطانوی حکومت کی یہ تعلیمی پالیسی بہت سوچی سمجھی سازش تھی جس کے ذریعے ہندوستانی تہذیب اور نظریات وعقائد کو ختم کرنے کی دانستہ کوشش کی جارہی تھی۔ اس پالیسی نے ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی قدروں کو یکسر بدل دیا۔ جس کا اثر آج بھی ہندوستان کی سماجی زندگی پر نظر آتا ہے۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدالتوں اور دفتروں کی زبان انگریزی ہوگئی، جس کی وجہ سے انگریزی نے انتظامیہ میں فارسی کو نکال کر خود یہ مقام حاصل کرلیا۔ عدالتوں اور بعض دفتروں میں اوپر کی سطح پر انگریزی اور نچلی سطح پر اردو میں کام شروع کیا گیا۔

عدالتوں میں اوپری سطح کے فیصلے انگریزی میں اور نچلی عدالتوں کے فیصلے اردو میں دیے جانے لگے۔ عدالت کی نچلی سطح پر درخواستیں اردو میں دی جاسکتی تھیں۔ زمینوں کے ریکارڈ اردو میں رکھے جانے لگے۔ ہندوستان کے بہت سے صوبوں کی عدالتوں میں گواہی اردو میں دی جانے لگی اور گواہی کا ریکارڈ اردو میں رکھا جانے لگا۔ ان حالات میں دفتروں اور قانون کی انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ ضروری تھا۔ اس لیے بڑے پیمانے پر دفتری اور قانونی کتابوں کے اردو میں ترجمے شائع کیے جانے لگے۔

11.5.1 ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں دفتری اور قانونی زبان اور اصطلاحات

ہندوستانی حکومت سے متعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہت سے دستاویزات شائع کرنے پڑتے تھے۔ ان دستاویزوں میں ایسی بے شمار قانونی اور دفتری اصطلاحیں شامل ہوتیں، جو آج بھی ہندوستان اور پاکستان کے انتظامیہ میں استعمال ہوتی ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران سرکاری ضرورتوں کی وجہ سے جب خطوط لکھتے تو ان میں بڑی تعداد میں ایسی اصطلاحیں ہوتیں، جنھیں اکثر انگریز افسر نہیں سمجھ پاتے تھے۔ مثلاً آبدار، آبپاشی، فتویٰ، فقہ، احلال، ابضاع، پنڈی، خصومت، خوردہ فروش، کاشتکار، لگان، قطع بندی، جمع بندی، تحصیل، کھاتا، کھیت، منڈیر، رعیت، دزد، پرگنہ وغیرہ۔ یہ تمام اصطلاحیں عدلیہ اور مال گزاری سے متعلق تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں اردو، ہندی، عربی، فارسی، سنسکرت، مراہٹی، گجراتی، بنگالی، اڑیہ، تیلگو، کنڑ، تامل اور ملیالم زبانوں کی اصطلاحیں عدلیہ اور دفتری کاروبار میں استعمال ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزوں میں ان الفاظ کا شامل ہونا لازمی تھا۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ اکثر انگریز افسران اصطلاحوں کا مطلب نہیں سمجھ پاتے تھے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ہندوستانی زبانوں کی دفتری اور قانونی اصطلاحوں کو مرتب کرکے شائع کیا گیا۔ ان ہندوستانی زبانوں کی اصطلاحوں کا مطلب انگریزی میں بیان کیا گیا۔ یہ کام اٹھارہویں صدی کے آغاز میں شروع ہوا تھا۔ ایسی اصطلاحوں کی پہلی لغت گلیڈون نے مرتب کرکے شائع کی تھی۔ یہ لغت اب ناپید ہے۔ اس سلسلے کی دوسری اہم کوشش ایک انگریز افسر H.H. Wilson نے کی تھی جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرز کی ترغیب پر Glossary of

Judicial And Revenue کے نام سے سوا سات سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم فرہنگ تیار کی۔ جو 1855ء میں شائع ہوئی۔ دفتری اور انتظامیہ اصطلاحوں کو مرتب کر کے شائع کرنے کی یہ دوسری اہم کوشش تھی۔ **ولکنز** اور فیلن وغیرہ نے بھی دفتری اور قانونی اصطلاحات کو مرتب کر کے شائع کیا۔ درگا پرشاد نے ایک انگریزی اردو لغت Guide to Legal Translation مرتب کی۔ یہ لغت 1869ء میں شائع ہوئی۔ اُن کی ایک اور قانونی اصطلاحات کی انگریزی ڈکشنری A Concise Dictionary, 1905ء میں شائع ہوئی تھی۔ درگا پرشاد الٰہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم کے طور پر ملازم تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1- کس سن میں اعلان کیا گیا کہ برطانوی حکومت کا سرکاری کام فارسی کے بجائے اردو میں ہوگا؟

2- لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی میں کیا کہا گیا تھا؟

3- قانون کی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی ؟

4- شاہ جہاں کے زمانے میں مال گزاری کا ریکارڈ کن زبانوں میں رکھا جاتا تھا؟

5- قانونی اور دفتری اصطلاحات کی پہلی لغت کس نے مرتب کی؟

6- درگا پرشاد کی دفتری اور قانونی اصطلاحوں کی کسی ایک ڈکشنری کا نام لکھیے۔

11.6 اردو میں دفتری اور قانونی اصطلاحیں

اردو میں قانونی اصطلاحات کا وافر ذخیرہ مہیا ہو چکا ہے اور اس میں بیشتر زیرِ استعمال رہا ہے۔ اس میں زیادہ تر مترادفات مقامی ذرائع اور نظام ہائے عدالت سے لیے گئے ہیں یا پھر اسلامی فقہ و شریعت سے لیے گئے۔ انگریزی عدالتوں کے قائم ہوتے ہی انگریزی اور رومن اصطلاحات، مقولوں اور کتابوں کے اردو میں ترجمے ہونے لگے۔ اس لیے اردو میں قانونی ذخیرۂ اصطلاحات بقول ڈاکٹر سید عبداللہ انگریزی سے کسی طرح کم نہیں بلکہ ملکی تقاضوں کے لحاظ سے انگریزی اردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی البتہ نئے وکیل ان اصطلاحوں میں سے بیشتر کو نہیں جانتے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے پہلی بار انکم ٹیکس ایکٹ کا 'قانون انکم ٹیکس' کے نام سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بابو شیو پرشاد کے اشتراک سے یہ ترجمہ کیا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے 1860ء میں 'مجموعۂ قوانین تعزیراتِ ہند' کے نام سے انڈین پینل کوڈ کے اٹھارہویں باب کا ترجمہ کیا۔ اُنھوں نے 1861ء میں تعزیرات کے ضمیمے کا 'ضابطۂ فوجداری' کے نام سے ترجمہ کیا جو گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی وضع کردہ اکثر قانونی اصطلاحیں آج تک مروج ہیں۔ مثلاً Criminal Breach of Trust کا ترجمہ خیانتِ مجرمانہ، Defamation کا ازالہ حیثیت عرفی، Solitary Confinement کا ترجمہ قیدِ تنہائی وغیرہ۔

اُنیسویں صدی کے آخر میں جو اصطلاحات اردو اخبارات، تراجم، قوانین، سرکاری احکامات اور سرکاری دفتروں میں استعمال ہوتی تھیں، منشی زوار حسین نے ان اصطلاحوں پر مشتمل ایک انگریزی اردو لغت مرتب کی، جو 1887ء میں مطبع مرتضوی، لکھنؤ سے 'فرہنگِ فرنگ' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس لغت میں تقریباً دو ہزار اردو اصطلاحات شامل ہیں۔

1985ء میں مجیب الرحمٰن مفتی کی مرتبہ لغت دفتری ترغیبات، محاورات اور فقرات کی لغت شائع ہوئی تھی۔ اس میں حکومت کے مختلف محکموں اور دفتروں کے مراسلات سے جملے اور ترکیبیں یکجا کیے گئے ہیں۔ مجیب الرحمٰن صاحب نے اصطلاحوں کے ایک سے زیادہ اردو مترادفات دیے ہیں اور انھیں مختلف جملوں میں استعمال کر کے دکھایا ہے۔ 413 صفحات کی اس لغت میں تقریباً دس ہزار اصطلاحات دی گئی ہیں۔

جس طرح فارسی سے بے شمار الفاظ اردو میں داخل کر لیے گئے ہیں۔ اُسی طرح انگریزی سے بھی بڑی تعداد میں الفاظ جوں کے توں اردو میں داخل کر لیے گئے ہیں اور اردو والوں نے اس کا ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مثلاً جج، پولیس، اسکول، کالج، بورڈ وغیرہ۔ بعض لوگوں نے انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان میں سے کچھ الفاظ تو ترجمے کے چلن میں آ گئے لیکن بہت سے الفاظ نہیں آ سکے۔ اردو کے ذریعے تعلیم پانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فارسی کی بہت سی سائنسی اور دوسرے علوم کی اصطلاحوں کو ہم جوں کا توں اردو میں لے لیں۔ چناں چہ انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو میں لے لیے گئے۔ مثلاً بلاؤز، لاٹری، ریڈیو، ریفریجریٹر، کمپیوٹر جوں کے توں لے لیے گئے ہیں۔

دفتری اور قانونی اصطلاحات کے سلسلے میں اردو میں بہت کام ہوا ہے۔ بڑی تعداد میں ان اصطلاحات کو جمع کیا گیا یا نئی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ قدیم زمانے سے اردو میں دفتری اصطلاحات بہت بڑی تعداد میں تھیں لیکن یہ مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ انھیں یکجا کر کے مرتب کیا گیا۔ ڈاکٹر عطش درّانی نے لکھا ہے کہ دفتری و قانونی اصطلاحات کی لغات خاصی بڑی تعداد میں اردو میں شائع ہوئی ہیں اور خاص طور سے قانون کے موضوع پر زیادہ لغتیں تیار ہوئیں۔

قانون میں دو طرح کی لغتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ لغتیں جو اردو سے اردو میں ہیں اور دوسری اردو سے انگریزی کی صورت میں ہیں۔ ان میں سب سے قدیم لغت گلیڈون کی ہے، جو 1797ء میں مرتب ہو کر شائع ہوئی۔ اس کے بعد روسو (1802ء)، فیلن (1879ء) وغیرہ کی لغتیں ہیں، جو اردو سے انگریزی کے زمرے میں آتی ہیں۔ اردو سے اردو لغتوں میں ''اردو قانونی ڈکشنری''، مختصر قانونی لغات اور لغاتِ قانونی از شمس الدین خاں شامل ہیں۔ انگریزی سے اردو اصطلاحاتِ قانونی کے لغات میں سب سے پہلے ڈاکٹر فیلن نے کام کیا۔ اس لغت میں الفاظ و محاورات کے ساتھ ضرب الامثال اور فقرات بھی دیے گئے ہیں۔ گھشتر اموہن بونیر جی کا ٹرانسلیٹر زفرینڈ (1905ء) ہے، جو اب تک کئی بار طبع ہو چکا ہے۔ یہ اس کی مقبولیت ہے کہ 1950ء تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا لغت۔ آر ڈی۔ بھاٹیا کا ہے جو 1904ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے بعد جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کا قانونی لغت (1963ء) ہے جس کا چوتھا ایڈیشن (1983ء) میں شائع ہوا۔ ایک اور لغت لاہور سے ایم فارانی کالا ٹائم پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ چوتھا لغت مقتدرہ قومی زبان اور جامعہ کراچی کے تعاون سے 1982ء میں شائع ہوا۔ پانچواں لغت جو دراصل حیدر آبادی دور میں مرتب ہونا شروع ہوا، کشافِ قانونی اصطلاحات کے نام سے مقتدرہ نے 1987ء، 1998ء میں تین جلدوں میں شائع کیا۔ اسی طرح مقتدرہ نے اسلامی اصطلاحات پر ایک جامع لغت شائع کیا ہے۔

11.6.1 آزادی کے بعد ہندو پاک میں قانونی اور دفتری زبان کی صورتِ حال

1947ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو ہندوستان اور پاکستان کے ذمے داروں کو یہ احساس ہوا کہ ان کے ملکوں کی دفتری زبان ان کی قومی زبان ہونی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے دونوں ملکوں میں ایسا ادارہ قائم کیا گیا، جن کا کام دفتری کام کے لیے دفتری یادداشت کے نمونے تیار کرنا تھا۔ نیز دفتری کاروبار کے لیے اصطلاحات وضع کرنی تھیں۔ ہندوستان میں ہندی اور پاکستان میں اردو اس مقصد کے لیے منتخب کی گئیں۔ دفتری کام کے مختلف شعبوں میں استعمال ہونے والی اصطلاحوں کا انگریزی اور ہندی میں ترجمہ کیا گیا۔ پھر 1949ء میں پاکستان میں 'مجلسِ زبانِ دفتری' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے کا مقصد تھا کہ پاکستان میں حکومتِ پنجاب کے تمام محکموں میں انگریزی کی جگہ اردو کو دی جائے۔ اس ادارے نے اردو کو سرکاری اور دفتری زبان بنانے کے سلسلے میں بہت بڑا کام کیا بلکہ تمام اصطلاحوں کو یکجا کیا گیا اور نئی اصطلاحیں وضع کر کے ایک بہت جامع اور مستند لغت تیار کی گئی۔

یہ بات مستحسن تھی کہ دفتری زبان اور دفتری اصطلاحات کو بہت سہل اور آسان بنایا گیا۔ اس کے بعد اسلام آباد میں 'مقتدرہ قومی زبان' کے نام سے ایک بہت بڑا ادارہ قائم کیا گیا جس نے بڑی تعداد میں دفتری نظام کے لیے اردو میں کتابیں تیار کیں۔

11.6.2 پاکستان میں قانونی اور دفتری اصطلاحات کے ادارے

پاکستان میں اردو کو جب قومی زبان کا درجہ دیا گیا تو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی محسوس کی گئی کہ سرکاری محکموں میں انگریزی کے بجائے اردو میں کام کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر دفتروں میں استعمال ہونے والی زبان کا ڈھانچہ تیار کیا جائے۔ اس کی ایک ہی صورت تھی وہ یہ کہ چوں کہ پہلے دفتری زبان انگریزی تھی۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی تھی کہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ پنجاب (پاکستان) کے تمام محکموں اور عدالتوں میں انگریزی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے لیے دسمبر 1949ء میں پاکستان میں آفیشل لینگویج کمیٹی موسوم بہ مجلس زبان دفتری قائم کی گئی ہے، جس نے بڑے پیمانے پر، دفتری اور قانونی اصطلاحوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ کچھ سال بعد اسلام آباد میں اس مقصد کے لیے 'مقتدرہ قومی زبان' کے نام سے ایک بڑا ادارہ قائم کیا گیا' جس نے قانونی اور دفتری زبان کی اصطلاحوں پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔

11.6.3 دفتری مراسلت پر کچھ کتابیں

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے 1984ء میں 'دفتری مراسلت' (انگریزی۔اردو) کے نام سے ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی ہیں اور مجیب مفتی نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔

اس کتاب میں سرکاری خطوط انگریزی اور اردو زبانوں میں دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں مراسلوں کی مختلف قسمیں بتائی گئی ہیں۔ مثلاً سرکاری مراسلت، نیم سرکاری مراسلت، یادداشت، دفتری یادداشت، اعلان، قرارداد، اعلانیہ اور دفتری حکم نامہ وغیرہ۔

اس کتاب سے نہ صرف پڑھنے والا دفتری نظام کی اردو زبان اچھی طرح سمجھ لیتا ہے بلکہ وہ دفتری نظام کے مختلف شعبوں سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر چند اور کتابوں کے نام ہیں:

'سرکاری خط و کتابت'، 'یادداشتیں'، 'سرکاری مراسلت'، 'رہنمائے دفتری اردو'، 'جدید عرائض نویسی'، 'قانونِ دستاویزات قابلِ بیع و شریٰ'، 'سرکاری خط و کتابت'، 'گشتی مراسلات اور تظہیریں'، 'اردو کی قدیم دفتری دستاویزات'

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو میں شائع ہونے والی دو قانونی لغتوں کے نام لکھیے؟
2. انکم ٹیکس کا اردو میں کس نے ترجمہ کیا تھا؟
3. 'مجموعۂ قوانینِ تعزیراتِ ہند' کے نام سے 'انڈین پینل کوڈ' کے اٹھارھویں باب کا ترجمہ کس نے کیا؟
4. آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں دفتری کام کاج کے لیے کون سی زبانیں منتخب ہوئیں؟
5. 'مجلسِ زبانِ دفتری' نام کا ادارہ کہاں اور کب قائم ہوا؟
6. 'مقتدرہ قومی زبان' پاکستان کے کس شہر میں قائم کیا گیا؟
7. 'مقتدرہ قومی زبان' کے نام کا ادارہ کہاں واقع ہے؟
8. اردو کو قومی زبان بنانے کے بعد دفتری زبان کے سلسلے میں پاکستان نے کیا قدم اُٹھایا؟
9. پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے افیشل لینگویج کمیٹی کب قائم کی گئی؟
10. دفتری مراسلت پر کم سے کم تین کتابوں کے نام بتائیے۔
11. دفتری مراسلتوں کی کم از کم چار قسمیں بتائیے۔

11.7 خلاصہ

اس اکائی میں بتایا گیا ہے کہ قانون کسے کہتے ہیں۔ قانونی اور دفتری زبان اور اصطلاحوں کا آغاز کس زمانے میں اور کس ضرورت کے تحت ہوا۔ اس اکائی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں جب مسلمان حکمراں آئے تو اپنے ساتھ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں لائے۔ جب ہندوستان میں اُن کی حکومتیں قائم ہوئیں تو اُنھوں نے دفتری اور قانونی زبان کے طور پر فارسی ہی کو استعمال کیا۔ دکن میں بہمنی حکومت قائم ہوئی تو بعض مورخین کے قول کے مطابق حکومت کی دفتری اور سرکاری زبان اردو تھی لیکن اکثریت اُن مورخین کی ہے جن کا کہنا ہے کہ سرکاری زبان اردو نہیں تھی۔ دکنی حکومتوں کی سرکاری زبان فارسی، اردو، مرہٹی، تمل اور تیلگو کو بتایا جاتا ہے۔ شمالی ہند کی مسلم حکومتوں کی قانونی اور دفتری زبان ہمیشہ فارسی رہی۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں پہلے فارسی اور پھر انگریزی اور اردو سرکاری زبانیں رہیں۔

11.8 نمونۂ امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. دکنی حکومتوں کی سرکاری زبان کون کون سی تھی؟
2. مغلوں کے عہد کی سرکاری زبان کون سی تھی؟ دفتری اور قانونی زبان کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا تدبیریں کی گئیں؟
3. ہندوستان میں برطانوی حکومت میں دفتری اور قانونی زبانوں پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. قانونی اور دفتری زبان کا آغاز کس زمانے میں اور کس ضرورت کے تحت ہوا؟
2. مغل عہد کی دفتری اور قانونی اصطلاحات پر روشنی ڈالیے۔
3. ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں قانونی اور دفتری زبان کے تراجم کے لیے کیا اقدام کیے گئے؟

11.9 فرہنگ

فہم وادراک = دریافت۔ سمجھ۔ عقل
قانون وضع کرنا = قانون بنانا
مراسلت = خط وکتابت
جانشین = جو کسی کی جگہ پر بیٹھے۔ قائم مقام
مؤرخ = تاریخ لکھنے والا۔ مؤرخین جمع مؤرخ کی
مدلّل = دلیل پر مبنی
نظم ونسق = بندوبست۔ انتظام۔ دستور
تسلّط = حکومت پر قبضہ کرنا۔ قابو میں لانا
ضخیم = بڑے حجم والا۔ موٹا۔ بہت بڑا
مترادف = دو ہم معنی لفظ
عرائض نویس = (عریضہ کی جمع عرائض) درخواستیں یا عرضیات لکھنے والا

منظم = وہ چیزیں جو انتظام کے ساتھ ہوں
مقتدر = طاقتور، زور آور، معزز
حکمراں = حکم چلانے والا
منتقل ہونا = ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا
ہم عصر = ایک ہی زمانے کے۔ ایک ہی عہد کے
مستعار لینا = عارضی طور پر مانگنا۔ قرض لینا
مستشرق = وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو۔
استفادہ کرنا = فائدہ حاصل کرنا
ضرب المثل = کہاوت۔ وہ جملہ جو مثال کے طور پر مشہور ہو۔
مترادفات = جمع مترادف

11.10 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال — حیدرآباد میں اردو کی ترقی، حیدرآباد، 1990ء
2. ڈاکٹر عطش دُرّانی — اردو و اصطلاحات سازی، اسلام آباد، 1994ء
3. مختصر اصطلاحاتِ دفتری، — کراچی، 1981ء
4. دفتری اصطلاحات، تجارت، بنکاری — کراچی یونی ورسٹی، یہ کتاب چھ جلدوں میں مرتب کی گئی ہے اور سائیکلو اسٹائیل ہے۔
5. مصطلحاتِ دکن — نواب عزیز جنگ ولا، حیدرآباد، دکن، 1904ء
6. ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن — لاہور، 1983ء
7. احمد حسین خاں — اصطلاحات قانونی (اردو انگریزی)، لاہور 1858ء
8. دفتری اردو انٹرمیڈیٹ — اسلام آباد، 1980ء
9. خادم حسین — دفتری، طریقۂ کار، لاہور، 1982ء
10. ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی — سرکاری خط و کتابت، جلد اوّل 1987ء
11. ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی — دفتری مراسلت (انگریزی اردو)، اسلام آباد، 1984ء
12. نیاز عرفان — سرکاری خط و کتابت (جلد چہارم) اسلام آباد، 1991ء
13. ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری — اردو اصطلاحات سازی (کتابیات) 1984ء

اکائی 12 : اردو صحافت میں ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

12.1 تمہید

12.2 صحافت کیا ہے؟

12.3 اردو صحافت میں ترجمے کی روایت

12.4 اردو صحافت میں ترجمے کی اہمیت وافادیت

12.5 صحافتی تراجم کی خصوصیات

12.6 اردو صحافت میں ترجمے کے مسائل

12.7 خلاصہ

12.8 نمونۂ امتحانی سوالات

12.9 فرہنگ

12.10 سفارش کردہ کتابیں

12.1 تمہید

الکٹرانک میڈیا سے پہلے صحافت کا لفظ صرف اخبارنویسی کے لیے تھا۔ جرنلسٹ اور جرنلزم کے لیے اخبارنویس اور اخبارنویسی کی اصطلاحیں آج بھی رائج ہیں۔ خبر عربی مادہ ہے اور اخبار خبر کی جمع ہے۔ خبر کے معنی ہیں آگاہی، جانکاری۔ اس کے اصطلاحی اور توسیعی معنی اور بھی کئی ہیں۔ جیسے کسی کی بات، حدیث، اور خبردار کا ایک طرح سے مخفف بھی ہے۔

صُحف عربی مادہ ہے، فارسی میں یہی لفظ حَ کے سکون سے ہے۔ اور اس کی جمع صحیفہ ہے، جس کے معنی کتاب کے ہیں۔ صُحف سے صحافت مشتق ہے، اور اصطلاح کے طور پر اسے اخبارنویسی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اخبارنویسی کے ہوتے ہوئے صحافت کی اصطلاح کیوں وضع کرنی پڑی، یہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ عہدِ قدیم میں گُپت چر ہوا کرتے تھے۔ چانکیہ نے ارتھ شاستر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ راجدھانی میں اور راجدھانی سے دور علاقوں میں خاص طور سے سرحدی علاقوں میں محکمہ خفیہ کے ایجنٹ ہوتے تھے، جو راجہ کو حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ زیادہ تر اطلاعات زبانی بھیجی جاتی تھیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں، خاص طور سے دلی میں سلطنت کے قیام کے بعد گپت چروں کا کام کرنے والوں کو پرچہ نویس کہا جانے لگا۔ انہی کا نام اخبارنویس بھی تھا اور ایک تیسرا نام بھی تھا۔ یعنی وقائع نگار۔ درسی کتابوں کے علاوہ سیر المتاخرین اور اور آئین اکبری میں بھی اس محکمے اور اس کی افادیت کا ذکر ہے۔ اس سبق کے لیے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اختصار کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو اس لیے کی گئی کہ اخبارنویسی/صحافت پر اردو میں جو کتابیں ہیں، ان میں پرچہ نویسی، اخبارنویسی اور وقائع نویسی کو اردو صحافت کی ابتدا قرار دیا گیا ہے۔ محکمہ خُفیہ /خفیہ کا کام کچھ اور تھا اور صحافت کا ادارہ کچھ اور ہے۔ اور شاید اسی لیے صحافت کی اصطلاح وجود میں آئی۔

اس اکائی میں صحافت کی تعریف اور اس کی نوعیت سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد اردو صحافت میں ترجمے کی روایت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون تسلیم کیا جاتا ہے لہٰذا اس کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک اچھے صحافتی ترجمے میں کیا کیا خوبیاں پائی جانی

چاہئیں ان خصوصیات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ ہر کام کے دوران کچھ نہ کچھ مسائل حائل ہوتے ہیں اسی طرح ترجمے کے دوران بھی مسئلے درپیش ہوتے ہیں ان پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد پوری اکائی کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ امتحان میں کس طرح کے سوالات آسکتے ہیں اس کے لیے سوالات کے کچھ نمونے دیے گئے ہیں۔ آخیر میں آپ کی آسانی کے لیے فرہنگ اور کچھ کتابوں کے نام دیے گئے، جن سے آپ استفادہ کرسکتے ہیں۔

12.2 صحافت کیا ہے؟

ہر تعریف (Definition) کی کم وبیش کچھ نہ کچھ تحدیدات (Limitations) ہوتی ہیں۔ اس کا اطلاق صحافت پر بھی ہوتا ہے۔ جو واقعہ ہوا ہو، اسے معروضی طور سے، اپنے اخلاقی، سماجی، سیاسی اور مذہبی نظریے کی آمیزش کے بغیر، اپنے طبقاتی مفاد یا اخبار کے مالک کے مفاد کا لحاظ رکھے بغیر، اخبار پڑھنے والوں کی اطلاع کے لیے لکھ کر ایڈیٹوریل شعبے کو بھیج دینا صحافت ہے۔

کوئی تعریف مکمل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ یہ بھی ادھوری یا جزوی تعریف ہے۔ اخبار میں ایڈیٹوریل بھی ہوتا ہے۔ شذرے بھی ہوتے ہیں، مختلف کالم بھی ہوتے ہیں، مضامین بھی ہوتے ہیں اور یہ سب شفاف اور بے رنگ نہیں ہوتے۔ خبریں بھی بے رنگ یعنی معروضی نہیں ہوتیں۔ خبروں کے مختلف پہلو بھی ہوتے ہیں۔ کسی اخبار میں ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے، کسی میں دوسرا۔

ہر خبر کا ہر پہلو پیش بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود اخبار چھپتے ہیں، اور ان میں شہ سرخی والی خبریں بھی چھپتی ہیں، چہار کالم سے لے کر یک کالم سرخیوں والی خبریں بھی چھپتی ہیں۔

خبر کیا ہے؟ اس کی کوئی جامع تعریف جب وضع نہ ہوسکی، تو زچ ہو کر اس پر توڑ کرنا پڑا کہ اگر کتا آدمی کو کاٹ لے، تو یہ خبر نہیں ہے، ہاں آدمی کتے کو کاٹ کھائے، تو یہ خبر ہے۔ مزاح سے قطع نظر..... آج خبریں وہی ہیں، جن میں انسان کاٹا جاتا ہے۔ صرف فرقہ وارانہ دنگوں ہی میں نہیں، ٹیکسوں کے نہ دکھائی دینے والے دانت، گرانی، افراط زر (Inflation)، تعلیمی اداروں میں داخلہ نہ ملنا، بے روزگاری، رشوت، خودسرکاری کارندے..... فہرست ان گنت کی سرحد تک پھیلی ہوئی ہے۔

مترجم سے اس کا کیا تعلق؟ سوال بظاہر نہایت معقول ہے۔ میرے بھائی، میری بہن..... ترجمے اور ترجمے میں فرق ہے۔ لہٰذا مترجم کو چاہیے کہ وہ اس فرق کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ مذہبی صحیفے کا ترجمہ اس طرح نہیں ہوگا، جس طرح عمر خیام کی رباعی کا ترجمہ۔ اور پارلیمنٹ کے پاس کیے ہوئے کسی قانون کا ترجمہ اس طرح نہیں ہوگا، جس طرح کسی سیاسی لیڈر کے بیان کا ترجمہ اخبار کے لیے، کیوں کہ عزت مآب اکثر اپنے بیانوں کی غلط رپورٹنگ کی بنیاد پر (درست یا نادرست) تردید بھی کرتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. صحافت میں کن چیزوں کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے؟
2. اخبار نویسی کے مختلف پہلو کیا ہیں؟
3. کیا موضوعات کے فرق کے پیش نظر ترجمے کی کئی قسمیں ہیں؟

12.3 اردو صحافت میں ترجمے کی روایت

اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز "جام جہاں نما" نامی اخبار سے اس وقت ہوا جب برطانوی سامراج اپنے عروج پر تھا۔ یہ اخبار اردو کا پہلا اور ہفتہ وار اخبار تھا جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی سامراجی ضرورتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر جاری کیا تھا۔ یہ کبھی اردو میں نکلتا تھا تو کبھی فارسی میں اور بعض اوقات دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ مگر پنجاب کی سکھ ریاست پر انگریزوں کے حملے کی تیاری کا راز کھولنے کی وجہ سے انگریزوں کے عتاب کا شکار ہوا۔ وہاں سے چل کر رفتہ رفتہ اردو صحافت نے نہ صرف ترقی کے مراحل طے کیے بلکہ بحیثیت مجموعی قومی زندگی کے بہت سے شعبوں میں بیداری کی لہر بھی پیدا کی۔ آزادی وحریت اور قومی خود اعتمادی کے ساتھ رواداری کی وہ نرمی اور لچک داری بھی پیدا کی جو ہندوستان جیسے بڑے ملک کی سالمیت اور قومی ہم آہنگی اور اجتماعی

ترقی کے اہم اقدامات کے لیے اشد ضروری ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی سے 15 اگست 1947ء کو آزادی ملنے تک سیاسی رہبروں کی طرح اردو صحافت کے ابتدائی معماروں کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا وہ یہ کہ برطانوی سامراج ہندوستان کی سرزمین سے جلد از جلد اپنا بوریا بستر لپیٹ کر روانہ ہو اور ہندوستان کے عوام اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو اخباروں میں مضمونوں' کالموں' اداریوں' شذروں اور جنگ آزادی کے رہنماؤں کے بیانات کی اشاعت کو جو اہمیت اور اولیت دی جاتی تھی وہ اہمیت روزمرہ کی زندگی میں معرض وجود آنے والے واقعات کی خبروں کو حاصل نہیں تھی۔ بیشتر خبریں اخباروں کے نامہ نگار یا ان کے قارئین مہیا کرتے تھے اکثر خبریں مراسلے کی شکل اختیار کر لیتی تھیں لہذا ترجمے کی ضرورت مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ چوں کہ اس وقت پورا معاشرہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک طرف انگریز حکمراں تھے تو دوسری طرف ہندوستانی عوام' انگریزی اخباروں میں جو کچھ شائع ہوتا تھا اس کے اپنے تقاضے اور مقاصد ہوتے تھے یعنی انگریزی حکومت کی برتری کا احساس پیدا کرنا اور ہندوستان میں اس کے قیام کا جواز فراہم کرنا' لہٰذا ترجمے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی کیونکہ انگریزی جاننے اور پڑھنے والا طبقہ یا تو انگریزی حکومت سے متاثر تھا یا انگریزوں کے انتظامیہ میں ملازمت کرتا تھا اور ان ہی کی سوچ رکھتا تھا۔ نیز انگریزوں کا یہاں ہونا ہندوستان کے لیے سودمند اور ضروری سمجھتا تھا۔ اس لیے مذکورہ طبقے کو اردو اخباروں کو پڑھنے کی نہ تو عادت تھی اور نہ ہی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزی خبروں' کالموں اور مضمونوں کا ترجمہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اردو اخبار پڑھنے والوں کا مذاق یہ تھا کہ وہ صرف برطانوی سامراجی حکومت کی مخالفت میں لکھے گئے کالموں' اداریوں وغیرہ کو پڑھنا پسند کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ جب اردو روزنامے سہ روزہ' ہفتہ وار اور ماہنامہ اخبار و رسائل آبادی کے ایک حصے کو متاثر کرنے لگے تو اس وقت بھی اردو صحافت مالی اعتبار سے اتنی صحت مند نہیں تھی کہ اردو روزنامے اپنے دفتروں میں ٹیلی پرنٹر لگائے اور ان کے ذریعے دستیاب ہونے والی خبروں اور کالموں کے تراجم کرتے یا کراتے۔ بیشتر ہفتہ وار' سہ روزہ اور ماہنامہ اخبار و رسائل اہم شخصیات کی ملکیت ہوتے تھے اور یہ اشخاص اپنا مخصوص ذہن' مخصوص مقاصد اور مخصوص عزائم رکھتے تھے۔ ہر اخبار اور رسالے کے لیے ایک بڑا مسئلہ ترجمہ کرنے والوں کو ان کے کام کا معقول معاوضہ دینا تھا۔ اس لیے تراجم کی ضرورت و اہمیت کو نظر انداز کرنا ایک مجبوری ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی عادت بھی بن گئی تھی۔ اس لیے اردو صحافت میں مجبوریوں' عادتوں اور ضرورتوں کے عدم احساس کے پیش نظر ترجمے کی کوئی باقاعدہ روایت قائم نہیں ہو پائی۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو روزناموں کا طریقۂ کار بدلتا گیا لہٰذا انگریزی اخباروں میں جو خبریں چھپتی تھیں انہیں میں سے ہر اخبار اپنی پالیسی یا اس کا کارروائی عملہ اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق چند خبریں منتخب کر لیا کرتا تھا اور اس بات کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا کہ اخبار کے قارئین کس مزاج کے حامل ہیں اور کس قسم کی خبریں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی جیسی تیسی تلخیص اور آزاد ترجموں سے کام چلا لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تازہ ترین خبروں کا دوسرا ذریعہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والی اردو نیوز تھی جسے ہر اخبار کا ادارتی عملہ تیزی سے نوٹ کرتا اور پھر ان کے مفہوم کو اپنی عبارت میں لکھ لیتا۔ ان حالات میں ترجمے کی ضرورت اتنی شدید نہیں تھی کہ کوئی اخبار اس کے بغیر اپنا کام نہ چلا سکے۔ مزید برآں ضخامت کے اعتبار سے بھی اردو اخباروں میں اتنی خبروں کو پیش کرنا ممکن نہ تھا جتنی خبریں انگریزی اخباروں میں چھپتی تھیں اس لیے اردو اخباروں کا ادارتی عملہ انگریزی خبروں کا ترجمہ کرنے کے بجائے ان کی تلخیص پیش کرنے لگا اس لیے اردو صحافت سے جڑے ہوئے لوگوں میں تلخیص پیش کرنے عادت تو پڑی لیکن ترجمے کا فن نہیں آیا اور نہ ہی انہوں نے اس فن کو حاصل کرنے کی کوئی خاص کوشش کی۔ اسی لیے صحافت میں ترجمے کی بہت صحت مند روایت قائم نہیں ہو پائی اور شاید یہی وجہ ہے کہ صحافت کے میدان میں بہت معیاری مترجم نہیں پائے جاتے۔ عالم گیر دنیا (Globalised World) کے پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ترجمے کے معیاری روایت کا فقدان کمزور اردو صحافت کے پس پشت اہم وجوہ میں ایک اہم وجہ ہے۔

اس زمانے میں ادارتی عملے کی تنخواہوں کا کوئی اسکیل نہیں تھا اور نہ ہی اردو اخباروں کی اتنی آمدنی تھی کہ ہر شخص کو اس کی بنیادی ضرورتوں کی کفالت کرنے والی تنخواہ دی جائے تاہم ادارتی عملے سے جڑا ہوا ہر شخص اخبار نویسی کو اپنی زندگی کا ایک مقصد سمجھتا تھا اور اپنے خلوص اور جذبہ قربانی کی بنا پر اس مقصد میں خود کو اس حد تک گم کر دیتا تھا کہ تجارتی ذہن رکھنے والے بیشتر اخباروں کے مالک ان کے اس مزاج کا غلط استعمال کرتے تھے۔ اپنی باعزت

بقا کے لیے بیشتر اخبار نویسوں کو ایک سے زیادہ اخباروں میں کام کرنا پڑتا تھا اور ان سب کی مجموعی آمدنی سے وہ اپنا اور بچوں کی پرورش کرتے تھے۔ یہ ایک مکمل مجبوری کا ماحول تھا۔ اس لیے جس طرح صحافت کا فن اردو اخباروں میں تعلیم و تربیت کا محتاج رہا۔ بعینہٖ ترجمے کا فن بھی اپنی ترقی کے راستے پر نہیں چل سکا اسی لیے اردو صحافت میں ترجمے کی کوئی صحت مند روایت قائم نہیں ہو سکی شاید اسی لیے اردو اخباروں کے دفتروں میں بقول مہدی نظمی :

"The struggle کا ترجمہ میری جدوجہد تو کیا گیا جو لفظی ترجمہ تھا لیکن تلاشِ حق نہیں کیا گیا جو فنکارانہ ترجمہ تھا"

(اردو صحافت اور ترجمے کا فن۔ مشمولہ اردو صحافت' اردو اکادمی' دہلی)

آج صورت حال قدرے مختلف ہے۔ گرچہ یہ حقیقت ہے کہ اردو کے صحافیوں کے لیے کوئی تربیتی ادارہ نہیں ہے لیکن عالم گیر دنیا کی حقیقت کے پیش نظر تمام ورنا کولر زبانوں کی صحافت کو ترجمے پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔ اور اسی انحصار کو بحسن و خوبی نبھانے ہی میں علاقائی زبانوں کی صحافت کی کامیابی پوشیدہ ہے۔ اس ضرورت و اہمیت کے پیش نظر ہی ترجمے کے فن اور مترجمین کو قدر اہمیت دی جا رہی ہے۔ یو۔ این۔ آئی (United News of Inida) کی اردو سروس میں کام کر رہے بیشتر لوگ بنیادی طور سے مترجم ہیں اور یہ مترجمین یو۔ این۔ آئی کی انگریزی سروس سے خبروں کا ترجمہ' کمپوزنگ اور اڈیٹنگ کر کر اک ٹیلی پرنٹر سروس کے ذریعے ہندوستان کے مختلف شہروں سے شائع ہو رہے اردو اخباروں کو فراہم کرتے ہیں۔ اس سروس سے فائدہ اٹھانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی' اردو اخباروں کو پچاس فیصد سبسڈی بھی دیتی ہے۔ اس سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ خبروں کی سطح پر تمام زبانوں کے اخباروں میں یکسانیت آتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے پہلے اخبار کا کیا نام ہے اور کس نے نکالنا شروع کیا؟
2. اردو صحافت کے ابتدائی معماروں کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد کیا تھا؟
3. شروع شروع میں صحافت میں ترجمے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوئی تھی؟
4. کس سروس کے ذریعے ملک کے مختلف شہروں سے نکلنے والے اخباروں کو ایک جیسی خبریں فراہم ہوتی ہیں؟

12.4 اردو صحافت میں ترجمے کی اہمیت وافادیت

ہر کسی انسانی گروہ کو معاشرے کی شکل اختیار کرنے کے لیے ترسیل و ابلاغ اشد ضروری ہے۔ اس لیے کہ معاشرے کے مسائل کے مہذب حل کے لیے ترسیل و ابلاغ کی ضرورت پڑتی ہے۔ معاشرے کی متعدد اور متنوع ضروریات کی تکمیل کے لیے لین دین کرنا پڑتا ہے۔ معاشرے کے لوگ اظہار و ترسیل اور لین دین کے لیے زبان کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہر معاشرہ کسی نہ کسی علاقے تک محدود ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی زبان' تہذیب وغیرہ بھی علاقائی حدوں میں محصور ہوتی ہیں۔ صحافت ایک ایسا اجتماعی ذریعۂ اظہار ہے جس کے توسط سے معاشرے کی تمام اہم باتیں' ترقیاں اور اہم شخصیات کے کارہائے نمایاں روز کے روز منظر عام پر لاتے ہیں اور معاشرے کے لوگ ان سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح سے پورا معاشرہ اس ذریعے سے ایک دوسرے سے پوری طرح سے آگاہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں وہ معاشرہ تعفن کا شکار ہو جاتا ہے اور جب اس گھٹن سے آزاد ہونے اور وسعت و ترقی کے لیے ذرائع ڈھونڈتا ہے تو دوسرے معاشروں کی حدوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے ترجمے کا سہارا لینا اس لیے اشد ضروری ہو جاتا ہے کہ دیگر معاشروں کی بہت سی چیزیں مختلف ہو سکتی ہیں انہیں میں سے زبان بھی ہو سکتی ہے اور کوئی معاشرہ جتنا محدود ہوگا اس کی زبان بھی اتنی ہی محدود ہوگی نتیجتاً اس کو ترجمے کی اتنی ہی ضرورت پیش آئے گی۔

مذکورہ بالا بحث کے پیش نظر اردو صحافت میں ترجمے کی اہمیت وافادیت واضح ہو جاتی ہے۔ اردو صحافت میں ترجمے کی ضرورت اس لیے محسوس کی جاتی ہے کہ اردو ایک ورنا کولر زبان ہے یا الگ بات ہے کہ اس کا دائرہ دنیا کے مختلف ملکوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس زبان میں براہ راست بہت ساری چیزیں دستیاب نہیں ہیں۔ لہٰذا ترجمہ واحد ذریعہ ہے۔ جس سے تمام چیزیں منتقل ہو سکتی ہیں۔ اس عالم گیر دنیا میں زبانوں کو بھی عالم گیر ہونا پڑے گا نہیں تو انسان کی

بقا خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ لہٰذا زبانوں کو دنیا کی دیگر تہذیبوں سے باہم دیگر ہونا نہایت ضروری ہے۔ ترجمے سے اردو صحافت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ اس کے ذریعے اردو میں متنوع قسم کے مواد دستیاب رہے ہیں۔ سب ایڈیٹر حضرات یہ کرتے ہیں کہ انگریزی کے مختلف اخبارات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور موزوں و مناسب مواد ترجمے کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح سے نہ صرف اپنے قارئین کو ان کی پسند کے مطابق مواد فراہم کرتے ہیں بلکہ کسی خاص قسم کے موضوع و مواد کے مطالعے کے لیے ذوق و شوق بھی پیدا کرتے ہیں۔

اردو صحافت میں ترجمے کے ذریعے زبان میں بھی وسعت آئی ہے۔ چونکہ ترجمے کے ذریعے صحافت میں متنوع قسم کے موضوع و مواد در آتے ہیں اس لیے بہت سے موضوع و مواد سے متعلق لفظیات اور اصطلاحات کے بھی ترجمے کرنے پڑتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ چونکہ صحافت کی زبان آسان، پیش کش دلکش اور انداز بیان سلیس ہوتا ہے اس لیے صحافتی تراجم میں لفظیات و اصطلاحات کی منتقلی بھی آسان ہوتی ہے نیز ان لفظیات و اصطلاحات کو آسان جملوں میں پیش کیا جاتا ہے اس لیے ان کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے لہٰذا ان کا چلن عام ہو جاتا ہے کیوں کہ اخبار ہر طبقے کو سامان رکھ کر نکالے جاتے ہیں اور عوام الناس کی زبان میں مواد پیش کیا جاتا ہے۔

متنوع قسم کے موضوع و مواد مختلف قسم کے انداز بیان اور اسالیب کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اس لیے جب مختلف قسم کے موضوع و مواد کا اردو صحافت میں ترجمہ ہوتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اندازِ بیان اور مختلف اسالیب سے بھی اردو صحافت متمول ہوتی ہے۔

صحافت میں مواد کی پیش کش کی تکنیک بھی اہمیت کی حامل ہے۔ جب آپ صحافت کے لیے ترجمے کرنے بیٹھتے ہیں تو دنیا کے دیگر اخباروں وغیرہ کی پیش کش کی تکنیک سے شعوری یا لاشعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں اور انہیں بھی منتقل کرتے ہیں اس طرح سے اپنی زبان اور اپنی زبان کی صحافت بھی تکنیکی اعتبار سے متمول ہوتی ہے۔

صحافت میں ترجمے کے ذریعے اشتہارات کی بھی منتقلی ہوتی ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی متعدد اسکیموں اور پالیسیوں کی منتقلی سے اردو قارئین آگاہ اور مستفید ہوتے ہیں۔ اس طرح سے آپ کی زبان اور صحافت متعدد طریقے سے متمول ہوتی ہیں اشتہارات کے ترجمے کے ذریعے ہی مختلف تجارتی ادارے صحافتی اداروں کو معاشی طور سے مدد کرتے ہیں اس طرح سے اردو صحافت میں وسعت آتی ہے۔ کھلی فضا ملتی ہے اور ترقی کے مزید امکانات ممکن ہو پاتے ہیں۔

اردو صحافت میں ترجمے سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر مترجم نے بحسن و خوبی ترجمہ کیا ہے تو اس سے آپ کی صحافت میں تجزیاتی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ چونکہ مختلف ترقی یافتہ زبانوں اور موضوعات میں ترقی یافتہ تجزیاتی طریقے استعمال ہو رہے ہیں۔ اس لیے اچھے ترجمے میں یہ تجزیاتی طریقے اور خصوصیات بھی منتقل ہوتی ہیں، نتیجتاً نہ صرف صحافی اور نو آموز صحافی حضرات میں جدید تر تجزیاتی قوت و صلاحیت پیدا ہوتی ہے بلکہ قارئین میں متوازن رائے قائم کرنے کی بھی خاصیت پیدا ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ اردو صحافت میں از خود تجزیاتی عمل شروع ہو جاتا ہے۔

ترجمے سے صحافتی دنیا کو ایک اور بڑا فائدہ یہ پہنچتا ہے کہ ترجمے کے باوصف امتدادِ زمانہ براہ راست تحریری اور تخلیقی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ صحافی مترجمین کی ذولسانیت اس معیار کی ہو جاتی ہے کہ اسی میں سوچنے لگتے ہیں اور ان میں مختلف موضوعات پر از خود لکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے اردو صحافت کی دنیا میں نہ صرف وسعت بلکہ گہرائی و گیرائی آ جاتی ہے اور شروع شروع میں یہی عمل دنیا کی سبھی زبانوں اور مضامین کے ساتھ ہوا ہے۔ اس طرح سے ترجمے کے باوصف صحافت کی دنیا بحیثیت مجموعی متمول ہوتی ہے لیکن صحافی مترجمین میں ترجمے کے ذریعے ترجمے کی دنیا سے آگے نکلنے کی خواہش ہونی چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کے باوصف اردو زبان میں کس طرح کی تبدیلیاں آتی ہیں؟
2. کیا صحافتی تراجم کے ذریعے موضوع و مواد میں وسعت آتی ہے؟
3. کیا امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں صحافتی تراجم سے صحافت کے میدان میں تجزیاتی و تخلیقی سطح پر کوئی تبدیلی آتی ہے؟

12.5 صحافتی تراجم کی خصوصیات

ترجمے کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم علمی وفنی ترجمے کی ہوتی ہے۔ دوسری قسم ادبی ترجمے کی ہوتی ہے اور تیسری قسم صحافتی ترجمے کی ہوتی ہے۔ علمی وفنی ترجمہ عموماً لفظی ترجمے کی تکنیک کے زمرے میں آتا ہے اور ادبی ترجمہ بامحاورہ ترجمے کے زمرے میں آتا ہے جب کہ صحافتی ترجمہ آزاد ترجمے کے زمرے میں آتا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں قسموں کے ترجمے کے دوران ترجمے کی تینوں تکنیکوں کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ لفظی ترجمے کی تکنیک علمی وفنی ترجمے کے دوران غالب ہوگی کیوں کہ اس قسم کے ترجمے کے دوران لفظوں اور اصطلاحوں کے ترجمے کی ضرورت کچھ زیادہ ہی پیش آتی ہے۔ اسی طرح سے ادبی تخلیقات کے ترجمے کے دوران محاوروں، تشبیہوں، استعاروں وغیرہ کے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ادبی تخلیقات کی اثر انگیزی میں ان کا بنیادی رول ہوتا ہے۔ لہٰذا ادبی ترجمہ بامحاورہ ہونا چاہیے اسی لیے عموماً بامحاورہ ترجمے کی تکنیک ہی کارفرما ہوتی ہے لیکن اس کا قطعی مطلب نہیں کہ دیگر تکنیکیں بالکل کام میں نہیں آتیں۔ اسی طرح سے آزاد ترجمے کی تکنیک کا اطلاق عموماً صحافتی ترجموں پر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ دیگر تکنیکوں کا استعمال صحافتی ترجموں کے دوران نہیں ہوتا۔ کیوں کہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسی کتاب ہوگی جس میں صرف لفظوں اور اصطلاحوں ہی کا استعمال ہوا ہوگا اور محاوروں کا استعمال نہ ہوا ہو، دوسری اہم بات یہ ہے کہ چونکہ زبانوں کا تعلق تہذیبوں، معاشروں اور مخصوص علاقوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی ضروری نہیں کہ اصل زبان کی سبھی چیزیں ترجمے کی زبان میں پائی جائیں۔ لہٰذا ترجمہ کرتے وقت آزادی یعنی مجبوری ہو جاتی ہے۔

صحافتی ترجمہ کرتے وقت یہ مجبوری مزید ناگزیر ہو جاتی ہے کیوں کہ صحافت کے میدان میں وقت کی کافی اہمیت ہوتی ہے۔ بہت کم وقت میں بہت زیادہ کام تیزی سے کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے زبان و بیان کی سطح پر آزادی لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ صحافی مترجم کو مفہوم تک اپنے آپ کو محدود کرنا پڑتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ عموماً اخبار کی اہمیت اسی دن تک رہتی ہے۔ اس لیے بھی صحافتی ترجمے کی اہمیت دیرپا نہیں ہوتی۔ لیکن صحافی مترجم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ صحافتی ترجموں کے دوران بھی آزاد ترجمے کی تکنیک کے علاوہ دیگر تکنیکوں کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے صحافی مترجم دونوں زبانوں پر عبور رکھنے کے علاوہ دیگر تکنیکوں سے بھی بخوبی نہ صرف واقف ہو بلکہ وقت ضرورت پڑنے پر استعمال میں بھی لاتا رہے۔

صحافت میں عام طور سے ترجمے کا کام سب ایڈیٹر ہی کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ مواد کا انتخاب کرتا ہے۔ پھر لفظوں کا مفہوم سامنے رکھ کر ترجمہ کرتا ہے اور ترجمہ کرنے کے بعد دوبارہ زبان اور مفہوم کی صحت کا اہتمام کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سب سے اچھا ترجمہ وہی ہوتا ہے جس میں لفظ اور مفہوم دونوں منتقل ہو جائیں۔ اسی لیے صحافی مترجم کو دونوں پر پورا عبور ہونا چاہیے تاکہ آزادی لیتے وقت وہ اتنی بھی آزادی نہ لے لے کہ سیاست کار یا دیگر حضرات یہ کہیں کہ ان کی بات ہی نہیں سمجھی گئی یا بقول ان کے یہ تو میں نے کہا ہی نہیں۔

چونکہ خبروں کو دور دراز کے علاقوں اور تمام طبقوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا خبروں کا ترجمہ آسان اور سادہ زبان میں ہونا چاہیے۔ نیز چونکہ عموماً خبر سننے اور اخبار پڑھنے والا کم علم ہوتا ہے اور اس کی زبان غیر معیاری اور لفظیات بھی بہت محدود ہوتی ہے اس لیے صحافی مترجم کو کم سے کم لفظیات اور آسان زبان میں ترجمہ کرنا چاہیے۔ سلیس، عام فہم اور مختصر جملوں کا استعمال کیا جانا چاہیے۔

خبروں میں بھی آغاز اور متن کا باقاعدہ ارتقا اور عروج و اختتام کا عمل کارفرما ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اخبار میں سرخیوں کی زبان، لفظوں کا انتخاب اور ان کی ترتیب کی بھی کافی اہمیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اچھے خاصے لوگ اخباروں کی سرخیاں ہی دیکھ کر متن یا مواد کی نوعیت کا تعین کر لیتے ہیں۔ اس لیے سرخی کافی احتیاط سے لگانی چاہیے تاکہ قارئین نہ صرف متوجہ ہوں اور پوری خبر پڑھنے کی طرف راغب ہوں اور اگر پوری خبر نہ بھی پڑھیں تب بھی سرخی اور آغاز سے پوری خبر کا اندازہ ہو جائے۔ اسی خبر کی اہم اہم باتیں آغاز میں ہی دے دی جاتی ہیں۔ صحافتی ترجمے کے دوران کفایت لفظی سے جہاں تک ممکن ہو کام لینا چاہیے اور مترادفات وغیرہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ خیالات اور الفاظ وغیرہ کی تکرار بھی نہیں ہونی چاہیے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں قارئین کا نہ صرف وقت ضائع ہوگا بلکہ خبر کی اثر انگیزی بھی ضائع ہوگی۔

آخیر میں ترسیل کے میڈیم، یعنی زبان اور اظہار کے اسلوب کے بارے میں ایک بنیادی بات کہنی ہے۔ صحافت وہ اخبار کی ہو یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ہو، جملہ چھوٹا اور سادہ ہونا چاہیے۔ وہ زبان لکھیں جو بولتے ہیں اور جس طرح بولتے ہیں۔ پیچیدہ جملے صحافی کی تحریر کو گنجلک اور ناقابل فہم بنا دیتے

ہیں۔شروع میں عرض کیا تھا کہ جس عبارت کا ترجمہ کرنا ہے اس کو ایک بار یا کئی بار توجہ سے پڑھ لیجیے۔اس کا مفہوم ذہن نشین کر لیجیے۔ذولسانی لغت میں ان الفاظ کے معانی دیکھ لیجیے اور نوٹ کر لیجیے، جن کے مفہوم کے بارے میں آپ کو شک ہے۔اور پھر اس طرح ترجمہ کیجیے۔یہ تصور کر کے کہ کوئی آپ کے سامنے بیٹھا ہے اور اس عبارت کا مفہوم سمجھانا ہے۔ظاہر ہے تقریر نہیں کرنا ہے، وضاحتیں نہیں کرنی ہے۔عبارت میں جس ترتیب سے جملے اور فقرے ہیں، اس ترتیب سے گفتگو کرنا، کوئی تحریر لفظوں کے بغیر نہیں ہوتی۔لیکن لفاظی سے احتراز کرنا لازمی ہے۔کہیں کہیں ذرا سا انحراف کیا جا سکتا ہے..... ترجمہ لفظوں کا نہیں خیال کی ترسیل کا مقصد ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کی کون سی تین قسمیں ہیں؟ اور ترجمے کی کس تکنیک کا اطلاق بالخصوص صحافت پر ہوتا ہے؟
2. صحافت کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟
3. صحافتی ترجمے کے دوران وقت کی کتنی اہمیت ہوتی ہے؟

12.6 صحافت میں ترجمے کے مسائل

اردو صحافت میں ترجمے کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ صحافتی مترجمین کی تربیت کے لیے کوئی باقاعدہ ادارہ نہیں ہے۔اردو صحافیوں کے لیے ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ جیسے کورس تو بعض اداروں اور یونیورسٹیوں کے ذریعے چلائے جا رہے ہیں لیکن ان ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسوں سے نیم صحافی پیدا ہوتے ہیں نتیجتاً اردو صحافت بھی متاثر ہوئی ہے۔ترجمے کا بھی وہی حال ہے۔متعدد اداروں اور یونیورسٹیوں میں ترجمے کے سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورسس چلائے جا رہے ہیں اور ان کورسوں سے نیم مترجم پیدا ہوتے ہیں۔لہٰذا اردو صحافت میں ترجموں کا بھی تقریباً وہی حال ہے۔جیسا تیسا ترجمہ کر کے لوگ کنارے ہو جاتے ہیں اور یہ احساس کہ دوسرے روز ان ترجموں کی کوئی وقعت نہیں رہ جائے گی، صورت حال کو مزید بدتر بنا دیتا ہے۔اس لیے اشد ضروری ہے کہ صحافت اور ترجمے کے فن کے لیے باقاعدہ اور معیاری کورسس چلائے جائیں اس کے لیے اداروں اور یونیورسٹیوں کو بڑھ چڑھ کر آگے آنا ہوگا۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ماس میڈیا میں باقاعدہ ایم۔اے شروع کیا ہے۔اس کورس میں ایک پرچہ ترجمے کا بھی ہے۔شعبۂ اردو نے بھی اپنے ایم۔اے کے کورس میں ایک پرچہ ترجمے کا بھی رکھا ہے۔لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ترجمے میں ایم۔اے کا آغاز جلد ہی کرنے جا رہی ہے۔جس سے قوی امید ہے کہ صحافت اور ترجمے کے مسائل کافی حد تک حل ہونے لگیں گے۔

اردو صحافت میں ترجمے کا ایک دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ملک گیر پیمانے پر اصطلاح سازی اور ان کی معیار بندی کا کوئی معقول نظام موجود نہیں ہے۔گرچہ یہ حقیقت ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے تقریباً پندرہ بیس موضوعات کی فرہنگیں تیار کرائی ہیں تاہم پورے ملک کے متعلقہ ماہرین سے ان پر نظر ثانی کرا کے مبسوط بنانے کی ضرورت ہے تاکہ پورے ملک میں ان فرہنگوں کی قبولیت اور مقبولیت کو یقینی بنایا جائے۔ویسے بھی ابلاغ عامہ میں ان فرہنگوں سے استفادہ کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔چونکہ اس میدان میں کام بہت تیز ہوتا ہے اور وقت کی پابندی ضروری ہوتی ہے اس لیے استفادہ کرنے کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ لغات و فرہنگ سے رجوع کرنے کا بھی بہت کم رجحان پایا جاتا ہے۔علاوہ ازیں ایجادات و انکشافات کی تیز رفتار ترقی کے اس دور میں روز نئے نام اور اصطلاحیں وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔مرکزی نظام کا مطلب یہ ہے کہ مرکزی سطح پر ایک ایسا نظام ہونا چاہیے جس کے تحت تمام نئے لفظوں اور اصطلاحوں کے موزوں تراجم تیار ہو کر صحافت کے میدانوں اور اداروں میں پہنچ کر استعمال ہونے لگیں۔کیوں کہ اردو اخبارات میں ترجمے کے کام پر لگے ہوئے لوگوں کے لیے کوئی نظام یا ادارہ موجود نہیں ہے۔وہ الفاظ کے معانی انگریزی اردو لغت میں دیکھتے ہیں۔لغت میں ہر لفظ کے کئی معنی دیے ہوتے ہیں لہٰذا مترجمین اپنی سمجھ کی سطح کے مطابق ترجمے کر لیتے ہیں۔زبان و موضوع پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے غلطیوں کے کافی امکانات ہوتے ہیں۔

صحافتی ترجمے کے لیے صرف دو زبانوں پر عبور ہی کافی نہیں ہے بلکہ مترجم کو تاریخ، جغرافیہ، سیاست وغیرہ کا جانکار ہونا چاہیے۔مختلف علوم و فنون،

مختلف پیشوں، مشغلوں اور کھیلوں کی معروف اصطلاحوں کا بھی علم ہونا چاہیے۔ دونوں زبانوں پر قدرت ناگزیر ضرورت ہے۔ دونوں زبانوں میں جملے بنانے کے طور طریقوں، زبان کے مزاج، محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات واستعارات اور تشبیہات وغیرہ سے واقفیت کے بغیر اردو میں صحیح ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے صحافتی نظام میں ترجمے جیسے مشکل کام کو نوآموز صحافیوں کے حوالے کیا جاتا ہے لیکن ان کی رہنمائی اور مدد کے لیے تجربے کار صحافی بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہ کام انتہائی ذمے داری کا ہوتا ہے اور اس کام سے وہی لوگ بحسن وخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جن کے علم، واقفیت عامہ، زبان دانی اور تجربے کا دائرہ زیادہ وسیع ہو کیوں کہ خبروں اور دوسرے صحافتی مواد کا ترجمہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اکثر صورتوں میں ان میں حالات کے سیاق وسباق میں مکمل اضافہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اکثر وبیشتر خلاصہ نویسی کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ ایک اور حقیقت یہ بھی بہت ہم ہے کہ ترجمہ کرنے والے کا بنیادی طور پر اپنی زبان میں براہ راست تحریر کرنے یا تخلیق کرنے والے سے زیادہ عالم وفاضل، تجربہ کار اور ماہر ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں جیسا تیسا ترجمہ کر لینے ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اردو میں کسی نہ کسی طور پر مفہوم ادا ہو جائے۔

صحافت میں ترجمے کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں ملکوں کے نام مختلف ہوتے ہیں۔ اور بعض اسم معرفہ مختلف طریقے سے تلفظ کیے جاتے ہیں۔ اگر مترجم تاریخ، جغرافیہ اور مختلف زبانوں کے لسانی پہلوؤں سے بخوبی واقف نہ ہو تو وہ ملکوں کے نام اور اسم معرفہ کو صحیح صحیح منتقل نہیں کر پائے گا۔ مثال کے طور پر مصر انگریزی میں ایجپٹ (Egypt) ہو جاتا ہے جب کہ اردو میں مصر ہی استعمال ہوتا ہے۔ اردن انگریزی میں جارڈن ہو جاتا ہے اور شام انگریزی میں سیریا (Syria) ہو جاتا ہے۔ اردو کے کئی حروف عربی میں نہیں پائے جاتے اس لیے ناموں کے تلفظ میں دقت آتی ہے۔ عربی زبان کے حروف تہجی میں حرف ''گ'' موجود نہیں ہے لیکن جیم سے شروع ہونے والے کئی عربی وفارسی نام انگریزی حرف "G" کی بدولت ''گ'' میں بدل جاتے ہیں۔ جولان کی پہاڑی کو ہمارے یہاں گولان کی پہاڑی پڑھا اور لکھا جاتا ہے یہ اس لیے کہ یہ عربی نام ہمارے یہاں انگریزی سے آیا ہے۔ اسی طرح سے گیلانی اور جیلانی کا مسئلہ ہے۔ بات یہی ختم نہیں ہو جاتی۔ فرانسیسی، ہسپانوی، جرمن اور روسی نام بھی بذریعہ انگریزی اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ لیکن اصل زبانوں میں ان کا تلفظ مختلف ہوتا ہے۔ نتیجتاً اردو میں کئی ناموں کی املا غلط ہو جاتی ہے۔

صحافت میں ترجمے کا ایک مسئلہ ہے کہ لوگ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مفہوم ادا ہو جانا چاہیے۔ یہ روش اس لیے رواج پا گئی ہے کہ زبان پر عبور نہیں ہوتا۔ اکثر بہت سے انگریزی الفاظ اردو املا میں لکھ دیے جاتے ہیں جن کے مناسب اور خوبصورت اردو مترادف موجود ہیں۔ اگر کوئی لفظ زبان زد ہو چکا ہے تو اسے اردو میں من وعن لے لینا چاہیے مثلاً اسکول، کالج، ورکر، فائل، انسپکٹر، یونیورسٹی وغیرہ لیکن اردو میں انگریزی زبان کے قواعد کے مطابق واحد کو جمع بنا کر اردو میں لکھنا اپنی زبان کے ساتھ ظلم ہوگا۔

ان پیشوں سے متعلق لوگوں کے لیے جن کا تعلق اردو زبان سے ہے کوئی تربیتی ادارہ اور کورس کا نہ ہونا بھی ایک مسئلہ ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں مختلف پیشوں سے متعلق لوگوں کے لیے ملازمت کے دوران تربیت کے لیے اور ان کی کارکردگی میں بہتری کے لیے کورسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان پیشوں سے جڑے ہوئے لوگوں کی بہتری کے لیے ورکشاپ اور سیمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان پیشوں سے جڑے لوگوں کی کارکردگی کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے اور ان کی کارکردگی کو بہتر کرنے کے لیے طور طریقے سکھائے جاتے ہیں اور حکمت عملیاں تیار کی جاتی ہیں۔ لیکن صحافت اور ترجمے کے فن کو مزید بہتر کرنے اور ان سے جڑے لوگوں کی کارکردگی کو مزید بہتر کرنے کے لیے ابھی تک ہمارے یہاں بہت معقول ماحول دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے ماحول کا اہتمام خود صحافیوں کی تنظیموں یا اردو اخبارات کے ذمے دار افراد کو کرنا چاہیے ایسے پروگراموں سے قوی امید ہے کہ ترجمے کا معیار اور نتیجتاً صحافت کا معیار بہتر ہوگا

کیا ترجمے کے لیے کوئی بنیادی اصول ایسا ہے، جسے ترجمے کا زریں اصول کہہ سکیں؟

جی ہاں ہے..... اور اگر مترجم اس پر کاربند رہے اور کبھی اس زریں اصول کو ذہن سے اوجھل نہ ہونے دے تو ترجمے میں ہمیشہ کامیابی ہوگی۔

ترجمے کا زریں اصول:

ترجمہ عبارت کے لفظوں کا نہیں

ترجمہ عبارت کے مفہوم کا ہوتا ہے

لیکن کیا کیجیے کہ عبارت لفظوں پر مشتمل ہوتی ہے اور لغت کے لفظ کے ترجمے میں مترجم کو مہارت ہونی چاہیے۔ اس مہارت کے لیے بھی ایک زرین اصول ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دونوں زبانوں پر عبور ہو۔ عبور پچاس فیصدی یا پچھتر فیصدی نہیں ہوتا۔ عبور مکمل ہوتا ہے۔ یعنی سو فیصدی۔ آپ کہیں گے / کہیں گی کہ اگر عبور مکمل ہوتا ہے تو پھر ذولسانی لُغت کی ضرورت کیا ہے؟ دراصل ذولسانی لغت سے دو زبانوں پر عبور حاصل کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ انگریزی کا برمحل لفظ یا محاورہ، یا مناسب اسلوب القانہ ہو تو معاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی کبھی مادری زبان اردو کا برمحل لفظ، فقرہ یا ترشا ہوا جملہ کسی ذہنی مشقت کے بغیر زبان پر نہ آئے، بہ الفاظِ دیگر القانہ ہو، مخلص لوگ کش مکش کی حالت و کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مہارت، جسے واقعی مہارت کہہ سکیں، وہ تو برسوں کی ریاضت کے بعد پیدا ہوگی۔ نوجوان مترجم کے لیے مفید یہ ہوگا کہ جس عبارت کا ترجمہ کرنا ہو، اس کو توجہ سے ایک بار نہیں، کئی بار پڑھ لے، اور اس کا مافیہا سمجھ لے۔ مافیہا سمجھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ متن میں جس لفظ کے معنی کے بارے میں ذرا بھی شک ہو، اس کے لغوی اور اصطلاحی معانی ذولسانی لغت میں دیکھ لے، اور جن معنوں میں یہ لفظ متن میں استعمال ہوا ہے، وہ نوٹ کر لے۔ یہاں دو باتیں عرض کرنی ہیں اور ان پر دھیان دینا چاہیے۔ اچھا لغت خریدنا ایک طرح سے سرمایہ کاری ہے۔ رقم ایک بار لگائی جاتی ہے اور علمی جستجو اور مشاغل میں قیمتی مدد اور رہنمائی کے روپ میں نہ صرف لغت کے خریدار کو، بلکہ اگلی پیڑھی کو بھی منافع ساری زندگی ملتا رہتا ہے۔ لغت بہت سوچ سمجھ کر خریدنا چاہیے۔ چار معیاری لغات فراہم ہیں :

1. انگلش اردو ڈکشنری: عبدالحق (بابائے اردو)

مولوی عبدالحق کی ڈکشنری بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ آپ اس سے ترجمے میں استفادہ کریں۔ اس لغت کی تالیف میں جن لوگوں نے مولوی عبدالحق کا ہاتھ بٹایا، ان کے نام دیباچے میں مولوی حق نے لکھے ہیں، وہ یہ ہیں :

> ''سید وہاج الدین، مولوی محمد حسین محوی، مولوی وحید الدین سلیم، مولوی غلام یزدانی، مولوی سید ہاشمی، سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر یوسف حسین، شیخ چاند، سید سراج الدین ناگامیاں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ..... لیکن گردِ راہ میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اختر رائے پوری کو نظر ثانی کا اہم کام دیا گیا تھا۔ کچھ حروف خود مولوی عبدالحق دیکھ رہے تھے، لیکن ایک حادثے میں ان کے شانے کی ہڈی اُتر گئی تو ان کا کام بھی اختر حسین رائے دیکھتے تھے۔ لغت کا زیادہ اہم کام عابد صاحب اور اختر صاحب نے کیا۔ ڈکشنری اجتماعی کوشش سے بنتی ہے۔ لیکن مرتبین کچھ ناموں کو ظاہر نہیں کرتے۔''

مولوی عبدالحق کی لغت بنیادی ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر دو اور اہم لغات مرتب ہوئے ہیں۔

2. ڈاکٹر جمیل جالبی کی قومی انگریزی اردو لغت، دو جلدوں میں

3. چھ جلدوں پر مبنی جامع انگریزی اردو لغت، جو پروفیسر کلیم الدین احمد کی نگرانی میں کوئی بیس برس پہلے مرتب ہوئی تھی۔ کلیم الدین صاحب اس پر توجہ سے نظر نہ ڈال سکے تھے، اس لیے اس میں خامیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک اچھا اور مبسوط انگریزی اردو لغت ہے۔

4. شان الحق حقی کی مرتب کی ہوئی انگلش اردو ڈکشنری جدید ترین اور بہت معیاری ہے جسے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے 2003ء میں شائع کیا۔

آپ جب کوئی ایسا کام کریں، جس میں آپ نے کسی سے استفادہ کیا ہو، تو اس کا حوالہ ضرور دیں۔ اس سے آپ کی بات کو استناد حاصل ہوگا۔ لغات کی کئی قسمیں ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا بھی لغت ہے۔ اور مختلف موضوعات پر اصطلاحوں کی کتابوں کو فرہنگ کہتے ہیں۔ حالانکہ بڑی اور چھوٹی لغات کو بھی فرہنگ کہا گیا ہے۔ فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ آصفیہ اس کی مثالیں ہیں۔ کچھ اہم کتابوں اور کچھ اہم مصنفوں کی بھی فرہنگیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً گلستان شیخ سعدی کی فرہنگ۔ جس طرح حادثوں کے لیے کوئی وقت معین نہیں ہے، اسی طرح مترجم کے لیے بھی یہ معین نہیں کہ کس وقت کس موضوع پر ترجمے کی مشقت

اس کے سپرد کردی جائے۔اس لیے ہر وقت معلومات کی کتابوں سے مسلح' آراستہ اور تیار رہنا چاہیے۔ایک اچھی ذولسانی لغت۔ ہو سکے تو انسائیکلو پیڈیا نیز قومی اردو کونسل' دہلی اور مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد کی مختلف موضوعات مثلاً میڈیا' لسانیات' سیاسیات' تاریخ وغیرہ پر تیار کردہ فرہنگوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے صحافیوں کی تربیت کے لیے کیا کوئی ادارہ ہے؟
2. صحافتی تراجم کے دوران مترجم کو کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟
3. کیا صحافی مترجم کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے؟
4. اردو طلبہ کے لیے ماس میڈیا سے ایم۔اے کس یونیورسٹی میں شروع ہوا ہے؟
5. صحافتی تراجم کے دوران لغت وفرہنگ کی کیا اہمیت ہے؟

12.7 خلاصہ

اس اکائی میں اس بات پر گفتگو کی گئی ہے کہ اخبار نویسی کو خفیہ نویسی اور اخبار نویسوں کو پرچہ نویسوں کے زمرے میں رکھنا' صحافت کی روایت کے بارے میں خلط مبحث ہے۔اس بات پر بھی گفتگو ہے کہ اخبار نویسی کی اصطلاح کے موجود ہوتے ہوئے' صحافت کی اصطلاح کو کیوں ترجیح دی گئی۔ادبی ترجمے اور صحافتی ترجمے میں فرق ہوتا ہے۔ترجمے کے لیے اگر کوئی زریں اصول ہے' تو وہ کیا ہے؟ لغت اور فرہنگوں کی اہمیت کیا ہے' خاص طور سے ذولسانی لغات ترجمے اور مترجم کے لیے ضروری ہیں۔اردو کی اہم ذولسانی لغات کا بھی اختصار سے ذکر ہے۔

صحافت میں کسی واقعے کو معروضی طور سے پیش کیا جاتا ہے۔اس میں اپنے اخلاقی نظریے' سماجی نظریے' سیاسی نظریے اور مذہبی نظریے کی آمیزش نہیں کی جاتی۔اخبار نویسی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔مثلاً ایڈیٹوریل ہوتے ہیں' شذرے ہوتے ہیں' مختلف قسم کے کالم ہوتے ہیں مضامین اور مراسلے ہوتے ہیں۔جس طرح سے ترجمے کی عموماً تین قسمیں ہوتی ہیں اسی طرح سے ترجمے کی تین تکنیکیں بھی ہوتی ہیں۔علمی ترجمہ یعنی دفتری اور قانونی ترجمہ' ادبی ترجمہ اور صحافتی ترجمہ۔بڑے پیمانے پر ترجمے کی یہی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ان تینوں پر عام طور سے تین قسم کی تکنیکوں کا اطلاق ہوتا ہے۔پہلی تکنیک لفظی ترجمہ' دوسری تکنیک بامحاورہ ترجمہ اور تیسری تکنیک آزاد ترجمہ ہے۔

اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ہے۔جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے شروع کیا تھا۔اردو صحافت کے ابتدائی معماروں کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد انگریزوں کو ملک سے بے دخل کر کے آزاد کرانا تھا جس کے لیے ان کا صحافتی قلم مانند تلوار چلتا تھا۔شروع شروع میں اردو صحافت میں ترجمے کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں ہوئی کہ پورا ملک انگریزی اور دیگر زبانوں کے زمرے میں منقسم تھا۔ورنا کولر زبانوں کے اخباروں کے ذریعے عوام کو بیدار کرنا مقصود تھا جو بغیر ترجمے کے بحسن وخوبی انجام دیا جارہا تھا۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ تمام چیزیں بدلتی گئیں حالات بدلتے گئے موضوع ومواد اور زیادہ سے زیادہ خبروں کی خاطر ترجمے شروع ہوئے اب تو یو۔این۔آئی کی اردو سروس ٹیلی پرنٹر سروس کے ذریعے ملک کے مختلف شہروں سے نکل رہے اخباروں کو ایک جیسی خبریں ترجمہ کرا کے فراہم کر رہی ہے۔

صحافتی تراجم کے باوصف اردو زبان میں وسعت وگیرائی آئی ہے عوام الناس تک یہ پہنچ پاتی ہے۔اس میں متعدد قسم کی لفظیات اور اصطلاحیں ترجمہ ہو کر عوام میں زبان زد ہوئیں نیز موضوع ومواد کی سطح پر بھی زبان کافی متمول ہوئی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترجمے کرتے کرتے صحافتی مترجم دونوں زبانوں میں سوچنے اور لکھنے لگتے ہیں اور اس طرح سے صحافتی تراجم سے باوصف امتدادِ زمانہ ترجمے کی زبان میں تحریری اور تخلیقی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

صحافت کی زبان عام فہم، سادہ اور سلیس ہونی چاہیے کیوں کہ اس کا تعلق عوام و خواص دونوں سے ہوتا ہے اور سادگی اور سلاست ہی ایسی خوبیاں ہیں جن کی طرف ہر کس و ناکس متوجہ ہوتا ہے اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سمجھ لیتا ہے۔ صحافتی ترجمے میں مفہوم پر پورا زور دیا جاتا ہے کیوں کہ وقت کی قلت ہوتی ہے۔ اردو کے صحافیوں کی تربیت کے لیے معقول اداروں کا فقدان ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ماس میڈیا میں ایم۔اے کا کورس شروع کر کے اس کمی کو دور کرنے کی سمت میں ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ صحافتی مترجم کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے۔ اس کی واقفیتِ عامہ عہدِ حاضر سے بھی ہم آہنگ ہونی چاہیے۔

12.8 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اردو صحافت میں ترجمے کی روایت پر روشنی ڈالیے۔
2. اردو صحافت میں ترجمے کی اہمیت و افادیت سے بحث کیجیے۔
3. صحافتی تراجم کی خصوصیات پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. صحافت کے مادے، تعریف اور آغاز کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
2. صحافتی ترجمے کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟
3. پرچہ نویس یا اخبار نویس کیا فرائض انجام دیتے ہیں؟

12.9 فرہنگ

تحدیدات = پابندیاں، مجبوریاں، معذوریاں

شذرہ = پراگندہ، منتشر، بکھری ہوئی چیز، اخبار میں ایڈیٹر کا کسی واقعے پر مختصر تبصرہ

آمیزش = ملاوٹ

زِچ = عاجز، تنگ، مجبور، بے بس

اِلقا = ڈالنا، غیب سے دل میں ڈالنا

ریاضت = محنت، مشقت، سختی

استناد = سند میں پیش کرنا، سند لانا

ضرب الامثال = کہاوت، وہ جملہ جو مثال کے طور پر مشہور ہو۔

تلمیح = کلام میں کسی قصے کی طرف اشارہ کرنا، اچٹتی نگاہ ڈالنا

عہدہ برآ ہونا = بری الذمہ ہونا، فرض ادا کرنا، وعدہ پورا کرنا

اسم معرفہ = وہ اسم جو کسی خاص شخص، مقام یا چیز کا نام ہو

من وعن = ہو بہو، جیسے کا تیسا

محصور	=	حصر کیا گیا، گھرا ہوا
اِمتداد	=	طوالت، درازی، لمبائی، مدت
تعفن	=	سڑاند، بدبو، عفونت
بقا	=	قیام، ہمیشگی، دوام، پائیداری، باقی رہنا، زندہ رہنا
عوام الناس	=	عام لوگ، بازاری آدمی، تمام آدمی
متمول	=	مالدار، دولت مند

12.10 سفارش کردہ کتابیں

1. اعجاز راہی (مرتبہ) — اردو زبان میں ترجمے کے مسائل
2. انور علی دہلوی (مرتبہ) — اردو صحافت
3. خلیق انجم (مرتبہ) — فن ترجمہ نگاری
4. قمر رئیس (مرتبہ) — ترجمہ کا فن اور روایت
5. ڈاکٹر کمال احمد صدیقی — اردو: ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل اور ابلاغ کی زبان
6. ڈاکٹر محمد شاہد حسین — ابلاغیات
7. سجاد حیدر — ریڈیائی صحافت
8. ڈاکٹر شافع قدوائی — خبر نگاری
9. محمد عتیق صدیقی — ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں
10. گربچن چندن — جام جہاں نما: اردو صحافت کی ابتدا

اکائی 13: اردو میں سائنسی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

13.1 تمہید

13.2 اردو میں سائنسی تراجم کی روایت

13.2.1 اردو میں سائنس کے اولین تراجم

13.2.2 شمس الامرا نواب فخر الدین کے دارالترجمے میں سائنسی تراجم

13.2.3 شاہانِ اودھ کے زیر اہتمام سائنسی تراجم

13.2.4 دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں سائنسی تراجم

13.2.5 دہلی کالج اور ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی میں سائنسی کتب کے تراجم

13.2.6 سائنٹفک سوسائٹی اور سائنسی تراجم

13.2.7 طامسن انجینیرنگ کالج رڑکی کی جانب سے سائنسی تراجم کا اہتمام

13.2.8 قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا سائنسی ترجموں میں رول

13.2.9 ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ اور سائنسی تراجم

13.2.10 دارالمصنفین اور سائنسی تراجم

13.2.11 ہندوستان میں سائنسی تراجم کا اہتمام کرنے والے دیگر ادارے

13.2.12 پاکستان میں سائنسی تراجم

13.3 سائنسی تراجم کی ضرورت واہمیت

13.4 سائنسی تراجم کے مسائل

13.4.1 سائنسی تراجم کے دوران اصطلاح سازی کے مسائل

13.4.2 سائنسی مترجمین کی عدم دستیابی

13.5 خلاصہ

13.6 نمونۂ امتحانی سوالات

13.7 فرہنگ

13.8 سفارش کردہ کتابیں

13.1 تمہید

زبانیں معلومات کی ترسیل کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتی ہیں۔ ہر دور میں ماہروں، عالموں اور مفکروں نے اپنے علم وفضل کو عام کرنے کے لیے تصنیف وتالیف اور ترجمے کے راستے کو ہی اپنایا ہے۔ قوموں کی ترقی کی رفتار کا اندازہ بھی اس کے علمی اور تحقیقی ذخائر کو دیکھ کر ہی لگایا جاتا ہے۔ انسان کے علم و عرفان اور افکارِ تازہ کو بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث بنانے میں ترجمے نے غیر معمولی اور نتیجہ خیز رول ادا کیا ہے۔ ترجمے کے ذریعے ایک قوم کے ذخیرۂ

علم وادب کو دوسری قوموں تک پہنچایا ہے۔ یہ مترجمین ہی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے انسانوں کے تجربات، تحقیق اور علوم وفنون کے میدانوں کی مختلف ایجادات کو دیگر انسانوں تک پہنچاتے ہوئے فروغ علم میں زبردست تعاون فراہم کیا ہے۔ بیسویں صدی کے دوران علوم اور فنون کی ترقی اور سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں انسان کی حیران کن فتوحات اور کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ اس تیز رفتار ترقی نے ترجمے کی رفتار کو بھی تیز ترین کر دیا ہے۔ جدید تحقیقات کے باعث نت نئی اصطلاحات نے جنم لیا ہے۔

سائنس کی اصطلاح کو عام طور پر مخصوص میدان سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا اصل مادہ لاطینی لفظ ''سائنشیا'' ہے۔ جس کے لغوی معنی ''علم'' کے ہیں۔ آکسفرڈ ڈکشنری میں سائنس کے معنی منضبط یا منظم علم کے بیان ہوئے ہیں اور انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مطابق ''وہ علم جو منظم اور نتیجہ خیز ہو سائنس ہے''۔ سائنسی علوم کی خاص بنیادیں دو ہیں' (1) دلیل (2) نتائج کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھنا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ سائنس نئی نئی ایجادات کرتی ہے اور ٹکنالوجی نئی نئی ترکیبیں نکالتی ہے۔

اردو زبان دنیا کی شائستہ اور شیریں زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ یقیناً اردو کا لسانی و ادبی سرمایہ ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ دشواریوں کے باوجود اردو سائنسی اور تکنیکی ادب کی دوڑ میں کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں رہی۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں موجود سائنسی سرمایہ ہندوستان کی بہت سی دیگر زبانوں کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے۔

اگر راستے کی مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے خلوص کے ساتھ سائنس اور تکنالوجی کے میدان کے جدید ترین تصورات کو اردو میں منتقل کیا جائے تو آج اس شیریں زبان میں وہ وسعت اور پھیلاؤ موجود ہے کہ اس کے دامن میں علم و تحقیق کے نئے موتی جڑ سکتے اور پیدا ہو سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں موجود سائنسی ادب کے سرمایے کو جو بہت پہلے سے موجود ہے مربوط اور یکجا کیا جائے، اس ذخیرے کو پرکھا جائے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے اور پھر مزید ترقی دینے کے لیے واضح منصوبے تیار کیے جائیں اور اقدامات کیے جائیں۔

13.2 اردو میں سائنسی تراجم کی روایت

اردو کا شمار مشرق کی نوعمر زبانوں میں ہوتا ہے۔ تاہم اردو میں سائنسی ادب کی روایت کا آغاز تقریباً دو سو سال قبل ہی ہو چکا تھا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق سولھویں صدی میں بھی اردو کے سائنسی لٹریچر کی موجودگی کا امکان ظاہر ہوتا ہے۔ گو کہ قدر و قیمت کے لحاظ سے اردو میں سائنسی سرمایہ انگریزی کے مقابلے میں نہایت قلیل ہے لیکن تاریخی اعتبار سے اردو کے نثری سرمایے میں اس کا بھی قابل لحاظ حصہ ہے۔

ہندوستان میں ترجمے کا آغاز مغلیہ دور حکومت سے ہوتا ہے۔ ابتدا میں فارسی زبان میں علمی سرمایے کو منتقل کرنے پر توجہ زیادہ رہی۔ عربی زبان میں بھی کئی تراجم کیے گئے۔ پھر اردو زبان کی طرف توجہ ہوئی اور شروع میں فارسی، عربی اور سنسکرت زبان میں موجود علمی سرمائے کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ اٹھارھویں صدی میں زیادہ تر کتابیں فارسی اور عربی سے اردو میں منتقل ہوئیں۔ انیسویں صدی عیسوی اردو تراجم کے عہد زریں کا آغاز ہے۔

یہاں سے اردو ترجمے کو ترقی کا نیا موڑ ملا۔ مختلف ادارے قائم ہوئے۔ اصطلاحات وضع کی جانے لگیں۔ تراجم پر نقد و نظر کا باضابطہ آغاز ہوا۔ ترجمے کے مختلف انداز اور اسلوب اختیار کیے گئے۔ سادہ، سلیس اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی زبان کا استعمال شروع ہوا۔ ان اداروں نے علوم وفنون، ادب، سائنس اور درسی کتابوں کے اردو تراجم کا باقاعدہ کام شروع کر دیا۔

13.2.1 اردو میں سائنس کے اولین تراجم

سائنسی کتابوں کے قدیم ترین ترجموں میں پادری پرکنس کی تالیف کردہ کتاب ''بحر حکمت'' ہے' جس کا ترجمہ سید کمال الدین حیدر نے کیا تھا۔ یہ کتاب 1798ء میں اردو میں ترجمہ کی گئی۔ اس میں ''اسٹیم'' یعنی ''بھاپ'' کے موضوع پر بحث کی گئی ہے اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 1811ء میں کپتان ٹامس روبک نے لغت ''جہاز رانی'' شائع کی' جس میں جہاز رانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا بھی اردو ترجمہ کیا گیا جو کمان

داروں کے لیے میدان جنگ میں اور بارکوں میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

اردو کے ابتدائی مترجمین میں سید محمد میر لکھنوی کا بھی نام آتا ہے انہوں نے ریورنڈ چارلس کی چھے جلدوں پر مشتمل کیمیا سے متعلق کتاب کا ترجمہ کیا تھا جو 1828ء میں طبع ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب میر امّن دلی والے نے ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' کے بعد ریورنڈ چارلس کی سات جلدوں پر مشتمل ''ستہ شمسیہ'' کا ترجمہ غلام محی الدین متین حیدر آبادی، مسٹر جونس اور موسیو تنڈرس کے ساتھ مل کر مکمل کیا۔

1834ء میں دارالترجمہ کے قیام کے بعد شاہ علی متوطن قلعہ ادھونی نے ''ترجمہ شرح چغمنی'' کا کام انجام دیا۔ علم ہیت اور فلکیات کی یہ مستند کتاب سمجھی جاتی تھی۔

شمس الامرا کی سرپرستی میں رتن لال نے 1836ء میں انگریزی کے ایک رسالے علم جغرافیہ کا اردو میں ترجمہ کیا اور طلبا کی معلومات کے لیے ایک اور رسالہ مرتب کیا جو ''رسالہ علم ہندسہ'' کے نام سے طبع ہوا۔

رائے منولال نے، جو کہ مدرسہ انجینیر ی حیدر آباد کے پرنسپل بھی تھے ''برنارڈ ہنٹر'' کی انگریزی کتاب ''علم ہندسہ'' ترجمہ کی، جو 562 صفحات اور 16 ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ اردو زبان میں ''ہندسہ بالوتر'' کے موضوع پر اردو زبان کی سب سے پہلی کتاب ہے، جس میں نظری مساوات کو اشکال کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ مسٹر مرّی نے ڈاکٹر میکلن کے انگریزی رسالے ''رسالۂ چیچک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں چیچک کے دہشت ناک اثرات کو واضح مثالوں کے ساتھ سمجھایا گیا ہے اور احتیاطی تدابیر کے ساتھ چیچک کے مریض کی جملہ کیفیت، پرہیز اور علاج سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ رسالہ 1848ء میں شائع ہوا۔

مولوی محمد احمد نے 1851ء میں چارلس واکر کی انگریزی تصنیف کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں ایک دھات سے دوسری دھات پر ملمع سازی کے آسان طریقے عام فہم زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔

سید محمد عبدالرحمٰن نے فارگیوسن کے ''رسالۂ علم ہیئت'' کے ایک جزو کا ترجمہ ''تختۂ گراں'' کے نام سے 1875ء میں کیا۔

اس عہد میں اردو ترجمے کا کام لکھنؤ میں بھی شروع ہوا۔ لیکن حالات زمانہ کی وجہ سے اس دور میں ترجمہ کی جانے والی اہم ترین کتابوں کے نسخے پوری طرح شہرت نہ پا سکے۔ سید کمال الدین حیدر نے نہ صرف یہ کہ اردو ترجمے کی ابتدا کی تھی بلکہ انہوں نے 19 مغربی رسالوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

13.2.2 شمس الامرا نواب فخر الدین کے دارالترجمے میں سائنسی تراجم

ہندوستان میں سائنسی علوم کی اشاعت اور فروغ میں شمس الامرا کبیر ثانی نواب فخر الدین خان کا کردار نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے جدید سائنسی علوم سے متعلق ہر نئی کتاب فرانس اور انگلستان سے منگوانی شروع کی اور ان کتابوں کے ترجمے کا اہتمام کرنے کے لیے عملی طور پر ایک ''دارالترجمہ'' قائم کیا۔ انہوں نے اپنی تمام درباری ذمے داریوں سے سبکدوش ہوتے ہوئے ساری توجہ ادبی اور سائنسی علوم پر مرکوز کی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے 1825ء میں ایک مطبع سنگی بھی قائم کیا تھا۔

شمس الامرا نے اردو تراجم کے لیے سائنسی اصطلاح سازی کا کام بھی انجام دیا۔ انہوں نے حویلی جہاں نما میں دارالترجمہ شمس الامرا قائم کیا۔ اس میں ہندو، مسلم، انگریز اور فرانسیسی عالموں اور دانشوروں نے اپنی خدمات انجام دیں۔ جدید علوم کو عوام سے روشناس کرانے کے لیے دارالترجمہ نے بے شمار کتابیں شائع کیں۔ شمس الامرا وہ پہلے ہندوستانی ہیں، جنہوں نے یورپی زبانوں سے اردو میں سائنسی تصنیفات کے تراجم پیش کیے۔

دارالترجمہ کے قیام اور تراجم کے سلسلے میں عملی تعاون دینے والوں میں قابل ذکر عالموں اور دانشوروں میں غلام محی الدین حیدر آبادی، مسٹر جونس، مسٹر جوزف، رتن لال اور میر شجاعت علی مکرم قابل ذکر ہیں۔ دارالترجمہ سے شائع ہونے والی تقریباً 50 کتابوں میں حساب، جیومٹری، طبیعیات،

کیمیا، فلکیات، طب یونانی اور میڈیسن وغیرہ شامل ہیں۔

شمس الامرا اور ان کا خاندان اور اس خاندان سے علمی طور پر وابستہ افراد کی سائنسی خدمات 1833ء سے 1877ء تک جاری رہیں۔ شمس الامرا کے علاوہ ان سے متعلق اربابِ علم کی انفرادی کوششوں اور خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان قابل ذکر اصحاب میں بدرالدین خاں رفعت جنگ تمیز، وزیرالدین خان، شمس الدین خاں فیض، میر عبداللطیف حکیم، شاہ علی، رتن لال، رام پرشاد، رائے منولال، مسٹر جوزف ولیم میکنزی، موسیو تندوسی، مسٹر جونس، مسٹر مرّی، حکیم قمرالدین، خواجہ نورالدین خاں عظمت جنگ، شیر علی، غلام امام خان، شمس العلما سید علی بلگرامی، میر طفیل علی، مولوی محمد احمد، سید محمد عبدالرحمٰن اور ابوعلی وغیرہ تھے۔ ان سب حضرات نے اپنی علمی استعداد اور صلاحیت کے مطابق علمی موضوعات اور سائنسی تراجم کے سلسلے میں گراں بہا کارنامے انجام دیے۔

شمس الامرا ابوالفتح خان کے بڑے فرزند شمس الامر افخرالدین خان نے حکمت، ہندسہ اور ریاضی میں سب سے پہلے یورپی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔

مندرجہ ذیل کتابیں ان ہی کی سرپرستی میں تصنیف و ترجمہ ہوئیں۔ ان میں زیادہ تر سنگی مطبع شمس الامرا سے ہی شائع ہوئیں۔ ترجمہ شرح چغمنی (قلمی) (1834ء)، اصول علم حساب (1836ء)، رسالہ کسوراتِ اعشاریہ (1837ء)، ترجمہ شمس الہندسہ (1839ء)، رسالہ علم جرثقیل (ستہ شمسیہ جلد اول) (1840ء)، رسالہ علم ہیئت (ستہ شمسیہ جلد دوم) (1840ء)، رسالہ علم آب (ستہ شمسیہ جلد سوم) (1840ء)، رسالہ علم ہوا (ستہ شمسیہ جلد چہارم) (1840ء)، رسالہ علم مناظر (ستہ شمسیہ جلد پنجم) (1840ء)، رسالہ علم برق (ستہ شمسیہ جلد ششم) (1840ء)، رسالہ علم واعمال کرّے کے بیان میں (1841ء)، منتخب البصر (دورنما) (1841ء)، کیمسٹری کا مختصر رسالہ (1843ء)، رسالہ مفتاح الافلاک (1844ء)، رسالہ کیمسٹری (1845ء)، خلاصۃ الادویہ (1846ء)، نافع الامراض (1846ء)، ترکیب ادویہ (1846ء)، رسالہ حیوانیاتِ مطلق (1848ء)، مرقع تصویر حیوانات (1848ء)۔

شمس الامرا رفیع الدین خاں کی سرپرستی میں جو کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئی ہیں ان کی تعداد بھی خاصی ہے ان میں سائنسی موضوعات پر مشتمل تصانیف و ترجمہ مندرجہ ذیل ہیں:

رسالہ علم ہندسہ (1835ء)، رفیع الحساب (1836ء)، تکملۂ رفیع الحساب (1838ء)، رفیع البصر (1841ء)، رفیع الصّنعت (1852ء)، رفیع التّرکیب (1868ء)، تختۂ گرداں (1875ء)۔

مندرجہ بالا مطبوعات کے علاوہ کئی قلمی کتابیں، کتب خانہ سالار جنگ میں آج بھی بہتر حالت میں موجود ہیں جن کی طباعت نہ ہوسکی۔

13.2.3 شاہان اودھ کے زیر اہتمام سائنسی تراجم

ہندوستان میں جدید علوم و فنون کی راہیں انگریزوں کے تسلط سے پہلے ہی استوار ہوگئی تھیں، جن میں شاہان اودھ کو ایک ادارے کی حیثیت سے مرکزیت حاصل رہی۔ یوں تو انفرادی طور پر بہت سی کوششیں ریاضی، کیمیا، طبیعیات، حیاتیات، طب، ہیئت، نجوم اور موسیقی وغیرہ پر کی گئیں، لیکن ان میں باقاعدگی نہ تھی۔ دوسرے ان کی اشاعت و ترویج کے لیے اس دور میں وہ ذرائع اور وسائل بھی مہیا نہ تھے، جو بعد میں ہندوستان کو میسر آئے۔

شاہان اودھ کی سائنسی اور علمی سرگرمیوں کا باقاعدہ عہد 1833ء سے 1853ء تک ہے۔ اس عرصے میں نواب غازی الدین حیدر، نواب نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ اودھ کے قابل ذکر حکمران رہے اور ان سبھی نے حسب استطاعت خود بھی جدید علوم سے متعلق کتابیں ترتیب دیں اور دیگر اصحابِ علم سے سائنسی کتابوں کے ترجموں اور تالیفات میں مدد بھی لی۔ اودھ کے اربابِ اقتدار کے علاوہ عبدالسلام لکھنوی، سید کمال الدین حیدر وغیرہ نے کئی انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔

سائنسی علوم کی اردو میں منتقلی اور اشاعت میں اودھ کے حکمرانوں کا کردار نمایاں اور قابل ستائش ہے۔ اودھ کے آخری فرماں رواؤں کو جدید

علوم اور بالخصوص علم ہیئت سے نہایت دلچسپی تھی۔ اور انہوں نے انگریزی زبان سے مختلف سائنسی علوم کے ترجمے کرائے، جو مطبع سلطانی سے طبع ہوئے۔ انہوں نے رصد خانۂ سلطانی میں ایک انگریز عالم کو بطور مہتمم رکھا، تاکہ سائنسی ترجموں میں مدد ملے۔ اس مطبع سے شائع ہونے والے سب سے زیادہ ترجمے سید کمال الدین حیدر نے کیے۔ جواب تمام دستیاب نہیں ہیں لیکن 11 کتابوں کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ (1) رسالۂ علوم طبعیہ، (2) رسالۂ مقناطیس، (3) رسالۂ علم الحرارت، (4) رسالۂ علم المنظر، (5) رسالۂ علم الکیمیا، (6) رسالۂ مقاصد العلوم مصنفہ لارڈ بردوم، (7) رسالۂ علم الماء، (8) رسالۂ علم ہیئت مصنفہ جان برنکلی، (9) بحر حکمت از پادری پرکنس، (10) رسالۂ علم الہوا، (11) رسالۂ ہیئت مصنفہ ڈاکٹر ولسن وغیرہ۔

13.2.4 دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں سائنسی تراجم

اردو زبان میں سائنسی موضوعات کی منتقلی کا نکتۂ آغاز شمس الامرا کی کوششیں تھیں اور اس کے تقریباً ایک صدی بعد حیدرآباد ہی کی سرزمین سے ایک اور اجتماعی منظم کوشش نواب میر عثمان علی خاں کے عہد میں ہوئی، جنہوں نے سائنسی موضوعات کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے دارالترجمہ قائم کیا۔ دارالترجمہ کا قیام عثمانیہ یونیورسٹی کے عظیم الشان منصوبے کا ایک حصہ تھا جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم اردو میں دی جائے گی۔ اس کے لیے نصابی کتابوں کی فراہمی اور ترجمے کے لیے اصطلاح سازی بنیادی مسائل کی شکل میں ابھر کر سامنے آئے۔ لہٰذا عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے دو سال قبل 14/اگست 1917ء کو تالیف اور ترجمے کا شعبہ قائم کیا گیا۔ ترجمے کے لیے دارالترجمہ میں مستقل اسٹاف رکھا گیا تھا۔ اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ مترجم اپنے مضمون کا ماہر ہو۔ اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی پوری قدرت رکھتا ہو۔ مستقل مترجمین کے علاوہ ہندوستان کے اسکالرز کی خدمات دارالترجمہ کے لیے بھاری معاوضے پر حاصل کی گئی تھیں۔ ابتدا میں دارالترجمہ کی نظامت مولوی عبدالحق کے سپرد کی گئی۔ دارالترجمہ کے اولین مترجمین میں قاضی محمد حسین کی تقرری ریاضیات کے لیے اور چودھری برکت علی کی تقرری سائنس کے لیے عمل میں آئی۔ دارالترجمہ کا کام دو طرح کا تھا یعنی اصطلاح سازی اور ترجمہ۔ شروع میں مغربی زبانوں کی کتابوں کے تراجم کیے گئے۔ بعد میں عربی، فارسی اور مشرقی علوم کی کتابیں بھی اردو میں منتقل کی گئیں۔ یہاں وضع اصطلاحات کے لیے مختلف علوم وفنون کی ذیلی مجلسیں اپنے اجلاس منعقد کرتی تھیں۔

متعلقہ فن اور لسانیات کے ماہر پورے غور وخوص اور مباحثے کے بعد اصطلاحات وضع کرتے تھے۔ ہر وضع کردہ اصطلاح کو مختلف پہلوؤں سے پرکھنے کے بعد ہی منظور کیا جاتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں وضعِ اصطلاحات کے مسئلہ پر سخت اختلافِ رائے تھا۔ اور خاص طور سے سائنسی اصطلاحات کی تدوین کے سلسلے میں یہ اختلاف نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ابتدا میں یہ طے کیا گیا کہ انگریزی زبان کی اصطلاحات کے لیے اردو زبان میں اصطلاحات وضع کی جائیں۔ چودھری برکت علی خان نے وضعِ اصطلاحات کا طریقۂ کار تجویز کیا اور مخصوص بنیادی اصولوں پر مبنی ایک خاکہ تیار کیا۔ مختلف لوگوں نے اس خاکے کو پسند کیا، لیکن پروفیسر وحیدالدین سلیم کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کے مطابق یورپین زبانوں کی تمام اصطلاحوں کے لیے اردو اصطلاحیں وضع کرنا ضروری تھا۔ مسلسل دو سال کی بحث وتمحیص بھی اتفاق رائے پیدا نہ کرسکی۔ آخر کار غور وخوص کے بعد یہ طے کیا گیا کہ بحالت مجبوری موجودہ بین الاقوامی اصطلاحات ہی کو اختیار کیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی اردو میں وضع اصطلاحات کی تحریک کو جاری رکھا جائے۔

اس تاریخی فیصلے کے بعد سائنسی کتابوں میں بین الاقوامی اصطلاحات کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ بعد میں طب وانجینیرنگ کے لیے بھی اس فیصلے سے استفادہ کیا گیا۔ تاہم ان شعبہ جات میں اصطلاح سازی کا کام بھی جاری رہا۔ یہ کام کس قدر پھیلا ہوا تھا اس کا اندازہ وضع کردہ اصطلاحات کی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر نظام الدین ناظم نے اصطلاحوں کی جملہ تعداد 91088 بتائی ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اصطلاحات علمیہ کا شماریاتی اشاریہ Numerical Index

ا۔ شعبۂ فنون:

1۔ فلسفہ	837
2۔ تاریخ	618
3۔ عمرانیات (سیاسیات ومعاشیات)	1728

ب۔	شعبۂ تعلیم:	
	تدریسیات (مطبوعہ)	537
ج۔	شعبۂ قانون:	
	قانون	18000
د۔	شعبۂ سائنس	
	1۔ ریاضیات وعلم ہئیت	1696
	2۔ طبیعیات	2000
	3۔ کیمیا	2452
	4۔ ارضیات	1387
	5۔ حیاتیات	7000
ھ۔	شعبۂ طب (حروف A-D مطبوعہ)	40000
و۔	شعبۂ انجنیری	10000
	جملہ	91088

اس طرح کل ملا کر سائنس وتکنالوجی اور میڈیسن کی اصطلاحات کی تعداد 63,146 ہوتی ہے۔ متفرق اصطلاحات کی کثیر تعداد اس میں شامل نہیں ہے۔ ایسی اصطلاحات پر نظر ثانی کی جارہی ہے اور عنقریب انہیں فن وار شائع کیا جائے گا۔ شرح دستخط ڈاکٹر محمد نظام الدین (مارچ 1946ء)

اس ادارے میں اصطلاح سازی کا کام نہایت احتیاط اور دانش مندی کے ساتھ انجام دیا گیا۔ پھر بھی بے احتیاطیاں ہوئیں اور بعض ثقیل اور نامانوس اصطلاحیں بھی مدون کر لی گئیں۔

دارالترجمہ نے مغربی علوم کی اردو میں منتقلی کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا اور مستقبل کے لیے راہیں ہموار کیں۔ شعبۂ ترجمہ واشاعت، جامعہ عثمانیہ کے مطابق دارالترجمہ میں 306 کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ اور انہیں شائع کیا گیا۔ ان میں طبیعیات، نظری کیمیا، فزیکل کیمیا، آرگینک کیمیا، باٹنی، زوالوجی، انجینیرنگ، اناٹومی، فزیالوجی، ہسٹیالوجی، آپتھلمالوجی، امراضِ نسواں، الجبرا، جیومیٹری، علم مثلث، کلکولس، اطلاقی ریاضی، اسٹرونومی اور جیالوجی وغیرہ جیسے اہم سائنسی میدانوں کی کتابیں شامل ہیں۔

13.2.5 دہلی کالج اور ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی میں سائنسی کتب کے تراجم

ہندوستان میں جن اداروں نے جدید علوم اور سائنس کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، ان میں دہلی کالج اور اس کی ورنیکلر سوسائٹی کا نام سرفہرست ہے۔ 1825ء میں اس کالج کا افتتاح ہوا۔ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ ریاضی، سائنس، فلسفہ، تاریخ اور اخلاقیات وغیرہ کے لیے بھی ذریعۂ تعلیم اردو ہی رہا۔ کالج کے مصلح بوترو نے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے 1841ء میں ایک انجمن قائم کی۔ جس کا مقصد دیسی زبانوں میں سائنسی اور جدید علوم کے تراجم کرانا تھا۔ سوسائٹی نے تراجم کے اصول مقرر کیے اور اصطلاحیں وضع کیں۔ 1842ء سے یہ انجمن دہلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کہلانے لگی۔ یہ کالج کے لیے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی۔ غدر سے پہلے تک اس سوسائٹی میں ایک سو سترہ (117) کتابیں ترجمے اور تصنیف کے ذریعے تیار ہوئیں۔ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو فروغ دینے والوں میں مسٹر بوترو، ڈاکٹر اسپرنگر، منشی کریم الدین، مولوی ذکاءاللہ، پنڈت رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرشاد، پیارے لال، ہردیو سنگھ اور ڈاکٹر ضیاالدین قابل ذکر ہیں۔ اس سوسائٹی کے ترجموں اور تالیف کی جملہ تعداد 128 ہے، جو تاریخ، جغرافیہ، اصولِ قانون، ریاضی، کیمیا، میکانیات، فلسفہ، طب، جراحی، نباتیات، معاشیات، دیگر علوم وفنون نیز

ادب وغیرہ پر مشتمل ہے۔

دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اردو ادب اور خصوصاً اردو نثر کا دامن وسیع کرنے میں اس قدر اہم خدمات انجام دیں کہ اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں ہی اردو زبان میں متنوع مضامین پر متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابوں میں درج ذیل اہم ہیں۔

الجبراء، اصول علم ہیئت، رسالۂ کیمسٹری، جغرافیہ طبعی، علم وعمل طب، مساحت، طبیعیات، رسالۂ مقناطیس، حرکیات وسکونیات، علم مناظر، حرارت، رسالۂ علم برق، گالون ازم، رسالۂ علم حساب، رسالۂ علم مساحت، مستعمل وعلم مثلث (1844ء)، مبادیات تفرقی احصاء وتکمیلی احصاء، رسالۂ اعمال جراحی (1848ء)، اصول وقواعد مایعات (1850ء)، مزید الاموال یا سلاح الاحوال (1854ء)، اصول علم مثلث وترش ہائے مخروطی وعلم ہندسہ بالجبر (1844ء) اور رسالۂ اصول کلوں کے باب میں (1863ء) وغیرہ۔

چوں کہ کالج کو پہلے درسی کتابوں کی ضرورت تھی اس لیے سب سے پہلے درسی کتابیں ترجمہ یا تصنیف کی گئیں اس کے بعد دیگر کتابوں کے ترجموں اور تالیف کا اہتمام کیا گیا۔ ترجمے کے لیے اس سوسائٹی کے ذریعے تدوین کیے گئے اصول وضوابط کی اہمیت آج بھی مسلمہ ہے۔ ان قواعد کی روشنی میں آئندہ امکانات کی راہیں تلاش کی جاسکتی ہیں تاکہ زبان کو فطری سانچے میں ڈھالا جاسکے۔ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے غیر زبانوں سے علمی اور سائنسی تراجم اور تالیفات کے کام کو انجام دے کر اردو نثر میں بڑی رنگارنگی پیدا کی ہے اور اس اعتبار سے اس سوسائٹی کے کارنامے ادب کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھنے کے لائق ہیں۔

13.2.6 سائنٹفک سوسائٹی اور سائنسی تراجم

1863ء میں ڈیوک آف آرگائل کے زیر سرپرستی ''سائنٹفک سوسائٹی'' کا غازی پور میں قیام عمل میں آیا۔ انگریز، مسلمان اور ہندوؤں پر مشتمل اس انجمن کے سکریٹری سرسید احمد خان تھے۔ سرسید نے خود اپنے الفاظ میں سوسائٹی کے مقاصد کا اس طرح تذکرہ کیا ہے۔ ''ہندوستان میں علم کو پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرکے چھاپے''۔ سوسائٹی نے صرف سائنسی ترجموں کے کاموں پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ عوامی شعور کی بیداری کے لیے اس کے زیر اہتمام سائنسی تجربات کا عوامی مظاہرہ منعقد کیا جاتا اور علمی جلسے بھی منعقد ہوتے تھے۔

سائنٹفک سوسائٹی کے زیر اہتمام تقریباً سینتیس (37) کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں لیکن وہ سب آج کل نایاب ہیں۔ سوسائٹی نے جن کتابوں کا ترجمہ کرایا ان کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ حواشی کی مدد سے متن کے ایسے اشاروں اور اصطلاحوں کی وضاحت کی جاتی تھی جن سے عام طور پر ہندوستانی ناواقف ہوتے تھے۔ سوسائٹی کے یہ ترجمے عام فہم ہونے کی بنا پر کافی مقبول ہوئے۔ ان ترجموں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مغربی افکار وخیالات اردو کے سانچے میں ڈھل رہے تھے تو دوسری طرف تخلیقات یا طبع زاد تحریریں بھی ان ترجموں کا اثر قبول کر رہی تھیں اور ان کا ایک مزاج متعین ہو رہا تھا۔ سائنٹفک سوسائٹی دراصل علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز تھی۔ سوسائٹی کی جانب سے ترجمہ کردہ چند اہم سائنسی کتابیں یہ ہیں۔ رسالۂ فلاحت، فن کاشت کاری، رسالۂ علم برقی اور رسالۂ جرثقیل وغیرہ۔

13.2.7 طامسن انجینیرنگ کالج رڑکی کی جانب سے سائنسی تراجم کا اہتمام

طامسن کالج خاص طور پر ان انگریز تعلیم یافتہ طلبا کی ضرورت کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا، جو انجینیرنگ کے میدان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے خواہاں تھے۔ یہ کالج 19/ اکتوبر 1847ء کو وجود میں آیا۔ 1870ء میں اس کالج میں ہندوستانی طلبا بھی شریک ہونے لگے۔ ہندوستانی طلبا کی شمولیت کے باعث ہندوستانی زبان میں نصابی کتب کی فراہمی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے نصاب کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے کالج کے پرنسپل کرنل اے ایم برنڈریتھ کی زیر نگرانی ایک ترجمہ کمیٹی مقرر کی گئی اور ایک پریس بھی قائم ہوا۔ محدود مدت تک ترجمے کی خدمات انجام دینے کے باوصف رڑکی کالج ایک آزاد ادارے کی حیثیت سے سائنسی علوم کے ترجمے اور تالیف میں معاون ثابت ہوا۔

رُڑکی کالج کی مطبوعات سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت میں ایک نمایاں اہمیت کی حامل ہیں، کیوں کہ ایسی کتابیں اردو میں نایاب تھیں، جو کتابیں یہاں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں ان میں مندرجہ ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں:

استعمال جرثقیل مصنف طامس ٹیٹ مترجم لالہ منولعل بہاری (مطبوعہ 1856ء)، رسالہ نمبر ہفتم در بابِ پیائش مصنف میجر ایف فائر بریس مترجم شمبھوداس (مطبوعہ 1869ء)، رسالہ در باب فن نجاری مترجم لالہ منولعل بہاری (مطبوعہ 1870ء)، بیان لوکارتم اور استعمال ٹیبل لوگارتم مصنف کیپ مترجم شمبھوداس (1862ء)، مجموعہ سامان عمارت مصنف کرنل اے۔ایم۔ برنڈریتھ مترجم لالہ منولال بہاری ونشی روپ چند وغیرہ (مطبوعہ 1888ء)، قواعدِ حساب متعلقہ فن انجینیرنگ مصنف کرنل اے۔ایم۔ برنڈریتھ۔ مترجم لالہ جگ موہن لال (مطبوعہ 1885ء)، رسالہ نمبر نہم پول کے بیان میں مترجم لالہ بہاری لعل تیسرا ایڈیشن (مطبوعہ 1886ء)۔

13.2.8 قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا سائنسی ترجموں میں رول

قومی اردو کونسل کی تشکیل 1996ء میں عمل میں آئی اور اس نے ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے اردو زبان کے فروغ کے لیے ہمہ جہت پالیسی کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔۔قومی نوڈل ایجنسی کے طرز پر کام کرنے والی اس قومی کونسل کی ذمے داریوں میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے پالیسیوں کا نفاذ شامل ہے۔نیز ایسے اقدامات بھی اس کی ذمے داریوں میں شامل ہیں جن سے اردو زبان میں سائنسی اور تکنیکی علوم کی توسیع ہو سکے۔قومی کونسل نے نئے وژن سے اپنے کام کی ابتدا کی اور اردو کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے، اسے جدید علوم کی کتابوں سے آراستہ کرنے کے لیے اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی سائنسی اور تکنیکی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی غیر معمولی کوششیں کیں۔اردو میں تعلیمی اور تکنیکی مواد فراہم کرنے کی خاطر قومی کونسل نے معیاری نصابی کتب کی اشاعت کی ذمے داری بھی لی۔اس ضمن میں مختلف سائنسی علوم کی کتابوں میں حیاتیاتی سائنس، طبعیاتی سائنس کے علاوہ جدید ریاضیات کے متعلقہ نصابی کتب برائے درجہ ہشتم تا دہم منظر عام پر آچکی ہیں۔

قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتابوں کی تعداد 1150 ہے، جس میں سائنس کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تعداد بھی کافی ہے۔کتابوں کے علاوہ اردو دنیا اور سہ ماہی فکر و تحقیق جیسے معیاری رسائل میں گاہے بہ ماہے سائنسی مضامین کے ترجمے بھی شائع ہوتے ہیں۔

13.2.9 ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ اور سائنسی تراجم

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی علی گڑھ کا قیام 1981ء میں ایک آزاد رجسٹرڈ سوسائٹی کے تحت عمل میں آیا۔دینی اداروں میں اس ادارے کو امتیاز حاصل ہے کیوں کہ یہاں منصوبہ بند طریقے سے ایسے موضوعات پر کام کیا جاتا ہے جن سے عصری مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔اسی لیے ادارے کی جانب سے مختلف ایسے سائنسی موضوعات پر مشتمل کتابوں اور مخطوطات کا ترجمہ کیا جاتا ہے، جن کا تعلق جدید معاشرتی اور تہذیبی مسائل سے ہے۔اس ادارے نے دورِ اسلامی کے سائنسی مخطوطات اور تحقیقی مضامین میں سے اب تک کئی سائنسی مضامین کا ترجمہ کیا ہے جو خود ادارے کی جانب سے بھی شائع ہوا ہے اور دیگر رسائل اور جرائد نے بھی اسے شائع کیا ہے۔

اس ادارے کی تاسیس مشہور عالم دین مولانا صدر الدین اصلاحی نے کی تھی۔ادارے کے موجودہ سرپرست مولانا سید جلال الدین عمری اس ادارے کے زمانۂ تاسیس سے سکریٹری بھی رہے ہیں۔اس ادارے کے علمی تراجم کے شعبے سے وابستہ افراد میں معروف نام ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، مولانا جرجیس کریمی، مولانا محمد فاروق خان اور مولانا سلطان احمد اصلاحی شامل ہیں۔

یہ ادارہ 1982ء سے پوری پابندی اور تسلسل کے ساتھ ایک سہ ماہی مجلّہ تحقیقاتِ اسلامی کے نام سے شائع کر رہا ہے۔ادارے کی بعض مطبوعات و تراجم دیگر مکتبوں سے بھی شائع ہوئے ہیں۔اس ادارے نے اپنے مقاصد میں اس بات کو بھی شامل کیا ہے کہ انگریزی اور ہندی زبانوں میں لٹریچر کی تیاری، ترجمہ اور اشاعت کی جائے۔ادارہ تحقیق کو جو چیز ملک کی دیگر علمی اور اشاعتی اداروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کالجوں،

یونیورسٹیوں اور دینی درسگاہوں سے فارغ طلبا کو تصنیف اور تالیف کے علاوہ ترجمے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ دینی مدارس سے فارغ طلبا کے لیے انگریزی اور کالج و یونیورسٹیوں سے فارغ طلبا کے لیے عربی سیکھنے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا جامع منصوبہ ہے، جس کے ذریعے اردو زبان میں سائنسی مترجمین کی تیاری کا قابل قدر کام انجام دیا جارہا ہے۔

13.2.10 دارالمصنفین، اعظم گڑھ اور سائنسی تراجم

علامہ شبلی نے 1913ء میں اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا۔ جس نے مشرقی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفیوں اور ماہرین نفسیات کی بعض اعلیٰ تصانیف کے اردو میں تراجم کرائے۔ گو دارالمصنفین کی زیادہ تر توجہ مشرقی علوم وفنون اور مذہبی مسائل و دینیات کی طرف رہی لیکن اس ادارے نے مغربی علوم کی کتابوں کے تراجم کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کیا، یہی وجہ ہے کہ 1964ء تک دارالمصنفین سے مختلف علوم وفنون سے متعلق 117 کتابیں تالیف وترجمہ ہوکر شائع ہوئیں۔

عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا حمیدالدین اور پروفیسر نواب علی کو دارالمصنفین میں کیے گئے ترجموں کے باب میں اہمیت حاصل ہے۔ دارالمصنفین کے ترجموں میں انقلاب الامم۔ مبادی علم انسانی مکالمات برکلے، پیام امن، فطرت انسانی اور افکار عصر شامل ہیں۔

13.2.11 ہندوستان میں سائنسی تراجم کا اہتمام کرنے والے دیگر ادارے

ہندوستان میں اوپر بیان کیے گئے اداروں کے علاوہ مزید کئی اداروں نے علمی اور سائنسی تراجم میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔ مثلاً ساہتیہ اکیڈمی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور، شاہ جہاں پور لٹریری انسٹی ٹیوٹ اور مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی وغیرہ۔ این سی ای آر ٹی نے بھی طلبا کے لیے نصابی سائنسی کتب این جی ٹی نے جنرل سائنس کی متعدد کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اور اب انیسویں صدی میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ نے سائنسی تراجم کے میدان میں نئے عزائم کے ساتھ اپنے کاموں کا آغاز کیا ہے، تاحال سرٹی فیکیٹ ان کمپیوٹنگ کی 16 کتابوں کے علاوہ بیچلر آف ایجوکیشن کی 48 ترجمہ شدہ نصابی کتابوں میں سے بعض کتابیں سائنسی علوم کی ہیں اور ڈپلوما ان پرائمری ایجوکیشن کی 32 زیر ترجمہ نصابی کتابوں میں سے بعض کتابیں سائنسی علوم کی ہیں۔

13.2.12 پاکستان میں سائنسی ترجمے

ہندوستان کی آزادی سے پہلے ہی متحدہ ہندوستان کے ان علاقوں میں جو آج پاکستان میں شامل ہیں علمی میدان میں شائع ہونے والی کتابوں کے ترجموں کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن مشرق ومغرب کی بلند پایہ سائنسی کتب کو منتخب کر کے ترجمہ کرنے کا آغاز 1950ء میں مجلس ترجمہ، لاہور نے کیا۔ 1958ء میں حکومت مغربی پاکستان کے محکمۂ تعلیم نے اس ادارے کو نئی شکل بخشی اور اس کا نام مجلس ترقی ادب رکھا گیا۔ 1958ء کے آخر تک مجلس کی جانب سے 241 کتابیں شائع ہوئیں، جن میں مقدمۂ تاریخ سائنس، مادام کیوری اور افکار حاضرہ جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔

سرسید احمد خان اور ان کے جانشینوں کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے متعلق ادارہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی کی بنیاد 1886ء میں سرسید احمد خان نے رکھی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد 1951ء میں اسی نام کے ادارے کا احیا کراچی میں ہوا۔ ریسرچ اکیڈمی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، زبان وادب کی ترویج اور ترقی کے علاوہ علمی اور سائنسی کام کو بھی آگے بڑھا رہی ہے۔

1952ء میں مؤسسۂ مطبوعات فرینکلن، نیویارک لاہور قائم کیا گیا۔ اس ادارے نے خاص طور پر امریکہ میں شائع ہونے والی جدید علوم کی کتابوں کا ترجمہ کر کے شائع کرانے کا اہتمام کیا محتاط اندازے کے مطابق مؤسسۂ فرینکلن کے زیر اہتمام تقریباً 400 کتابیں ترجمہ کی گئیں۔

شعبۂ تصنیف وتالیف اور ترجمہ، کراچی یونیورسٹی کا ایک شعبہ ہے۔ اس شعبے نے درسی کتابوں کی تصنیف وتالیف کے ساتھ تراجم اور فرہنگ کے

علاوہ وضع اصطلاحات کو یکساں اہمیت دی۔ اس ادارے کے ''جریدہ'' نامی تحقیقی مجلّے نے علمی اور سائنسی اصطلاحات سازی میں نمایاں کردار ادا کیا، اس ادارے میں ترجمہ کی گئی اہم کتابوں میں مغربی تعلیم کی تاریخ اور طبعی کیمیا وغیرہ شامل ہیں۔

ادارۂ وزارتِ تعلیمات پاکستان نے 1958ء میں ترقی اردو بورڈ کراچی کا قیام عمل میں لایا۔ بنیادی مقصد تو جامع اردو لغت کی تیاری تھا لیکن بعد میں بورڈ نے اپنے کام کو پھیلایا اور تمام علوم وفنون کی اصطلاحات، الفاظ، محاورات پر مشتمل لغت کے علاوہ ترجمے کے کام کو بھی انجام دیا۔ 1952ء میں قومی تعلیمی کمیشن کی سفارش پر مرکزی اردو بورڈ' لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ بورڈ کے قیام کا ایک اہم مقصد سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں اردو کی ترقی بھی تھا۔ بورڈ نے سائنس کی متعدد مضامین کی کتابیں اردو میں تیار کروائیں۔

حکومتِ پاکستان نے 1979ء میں مقتدرہ قومی زبان کا قیام عمل میں لایا۔ مقتدرہ قومی زبان نے نہایت ہی منصوبہ بند طریقے سے اپنی کارکردگی کا آغاز کیا اور علومِ جدیدہ کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے لیے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ مقتدرہ نے فروغ اردو کے ضمن میں مواد فراہم کرنے کی خاطر کشاف اصطلاحات، نصابی کتب کی تدوین اور علمی وسائنسی کتابوں کے ترجمے جیسے غیر معمولی کام انجام دیے۔

پاکستان میں تراجم کے ان بڑے اداروں کے علاوہ مکتبہ اردو' لاہور، پیوپلز پبلشنگ ہاؤز' لاہور اور مقبول اکیڈمی لاہور ایسے ادارے ہیں' جنہوں نے علومِ جدیدہ سے متعلق کتابوں کے ترجموں میں اپنا رول ادا کیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. انیسویں صدی کو اردو تراجم کا عہد زریں کیوں کہا جاتا ہے؟
2. سائنس کی کتابوں کا قدیم ترین اردو ترجمہ کون سا ہے؟
3. سائنسی تراجم میں شمس الامرا کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
4. شاہانِ اودھ نے سائنسی علوم کی اردو میں منتقلی کے لیے کیا خدمات انجام دیں؟
5. دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں اولین سائنسی مترجمین کون تھے؟
6. پروفیسر وحیدالدین سلیم کے مطابق وضع اصطلاحات کے لیے کون سا طریقۂ کار مناسب ہے؟
7. دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی وضع کردہ اصطلاحات کی مجموعی تعداد بتائیے۔
8. سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا مقصد کیا تھا؟
9. طامسن انجینئرنگ کالج رڑکی کی ترجمہ کردہ سائنسی مطبوعات کون سی ہیں؟
10. قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا سائنسی تراجم میں کیا رول ہے؟
11. ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی نے طلبا کو ترجمے کے میدان میں تربیت دینے کے لیے کیا منصوبہ بندی تیار کی ہے۔
12. دارالمصنفین کی جانب سے مختلف علوم وفنون کی کتنی کتابیں تالیف وترجمہ کی گئی ہیں؟
13. مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ نے سائنسی ترجمے کے میدان میں کیا کیا ہے؟
14. پاکستان میں اردو زبان میں سائنسی تراجم کے میدان میں مصروف اداروں کے نام بتائیے۔
15. مقتدرہ قومی زبان' پاکستان کا جدید علوم کی اردو میں منتقلی میں کیا رول ہے؟

13.3 سائنسی تراجم کی ضرورت واہمیت

انسانی تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ علوم وفنون کی ترقی سارے خطۂ ارض پر کبھی بھی یکساں طور پر نہیں ہوئی۔ مختلف ادوار میں مختلف قوموں نے علم کے میدان میں الگ الگ کارنامے انجام دیے۔ لیکن اس کا دائرہ اس مخصوص قوم تک اس وقت تک محدود رہتا ہے' جب تک کہ ان کے علوم وفنون کا

دوسری زبان میں ترجمہ نہ کیا جائے۔ ترجمے کے ذریعے علوم وفنون کے دروازے سارے انسانوں کے لیے کھل جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف زبانوں مثلاً یونانی، سریانی، سنسکرت اور فارسی وغیرہ میں موجود علوم وفنون کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ اپنی مادری زبان میں منتقلی کے بعد ہی عربوں میں نہایت ہی بلند پایہ علما، مفکرین اور سائنسدان پیدا ہوئے۔ اہل یورپ نے بھی عربوں کی علمی اور سائنسی ترقی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ راجر بیکن نے بغداد اور اسپین میں موجود سائنسی سرمایہ فکر کو یورپ کے دیگر مقامات تک منتقل کیا اور سائنسی میدان میں مسلمانوں کی جانب سے پروان دی گئی تجربی فکر کو یورپی سائنس کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مثال کے طور پر بوعلی سینا کی کتاب القانون یورپی جامعات کے میڈیسن کے نصاب میں تقریباً پانچ سو سال تک شامل رہی۔

ترجمے کے ذریعے سرمایۂ علم ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے۔ تجربات کے باہمی لین دین کے نتیجے میں زبانیں جدید علوم و فنون سے مالا مال ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کی تحقیقات، ایجادات اور اختراعات سے واقفیت حاصل کرتی ہیں۔ ترجمہ ہی وہ اہم ترین ذریعہ ہے، جس کی مدد سے قوموں میں علمی چیلنجس کو قبول کرنے کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں مسابقتی ماحول کو فروغ دیا جاسکتا ہے جو بنی نوانسان کے ارتقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔

جواہر لال نہرو نے ہندوستان کی آزادی کے بعد اس بات پر زور دیا تھا کہ عوام میں سائنسی مزاج اور سوچ کو فروغ دیا جائے۔ سائنسی تراجم اس ضمن میں بنیادی ضرورت ہیں۔ اس سے نہ صرف عوام کی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ ان کے ذہنوں کے دریچے بھی کھلیں گے۔ اور فکر میں وسعت پیدا ہوگی۔ لہٰذا انسانی ذہن سازی کے لیے ترجمے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

بیسویں صدی میں سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں اتنی زبردست ترقی ہوئی ہے کہ اطلاعاتی تکنالوجی نے ساری دنیا کو عالمی گاؤں میں تبدیل کردیا ہے اور حیاتیاتی تکنالوجی نے انسانی وجود کے بنیادی عناصر تک کو سب کے سامنے عیاں کردیا ہے۔ لیکن اس ترقی کا مرکز ومحور دنیا کا مخصوص علاقہ ہی ہے۔ اگر موجودہ ترقی سے متعلق بھرپور معلومات اور فہم وبصیرت میں عمومیت پیدا کرنی ہے اور ساری دنیا میں موجود انسانی صلاحیتوں کو علمی چیلنج کے مقابلے کے لیے تیار کرنا ہے تو نہایت ہی ضروری ہے کہ سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں ہورہی ترقی کو دیگر زبانوں میں منتقل کیا جائے۔

قوموں میں ہورہی سائنسی ترقی کا اندازہ ہم ان کی مادری زبانوں میں تیار کی جارہی سائنسی تصنیفات اور تالیفات سے لگا سکتے ہیں۔ لیکن کتابوں کی تصنیف کوئی آسان کام نہیں ہے، سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں تصنیف کا کام تو اور بھی مشکل ہے۔ سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ نت نئی اصطلاحات وجود میں آرہی ہیں اور ہر وقت انسان کو نئے تجربات سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں اگر سائنس اور تکنالوجی کے مواد کو دیگر زبانوں میں منتقل نہیں کیا جاتا رہے گا تو معلومات محدود دائرے میں ہی رہیں گی۔ ترجمے سے علمی اور سائنسی موضوعات پر کتابوں کی تیاری کے لیے ترقی پذیر قوموں کے افراد کو زبردست تحریک ملے گی۔ اس کے ذریعے علمی آگہی اور سائنسی بصیرت پروان چڑھے گی اور پژمردہ زبانوں میں حرارت پیدا ہوگی۔

کوئی بھی زبان تنہا نشوونما نہیں پاسکتی، اس لیے کہ انسان فی نفسہ اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ دنیا بھر میں ہورہی علمی کاوشوں اور کوششوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرتی رہیں۔ آج بھی ترقی یافتہ ممالک میں اس طرح کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں سائنس اور تکنالوجی کی بے انتہا ترقی کے باوجود دوسری زبانوں کے علوم وفنون خاص طور سے سائنس اور تکنالوجی کی ترقیات کو وہ اپنی زبانوں میں مستقل منتقل کررہے ہیں۔ ترقی یافتہ قومیں ہمیشہ باشعور ہوتی ہیں اور آگہی اور اکتساب کا جذبہ اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد ان قوموں کا شیوہ رہا ہے۔

یورپ میں نہ صرف بڑے بڑے دارالترجمے قائم ہیں بلکہ انٹرنیٹ کے ذریعے ترقی یافتہ زبانوں نے ترجمے کے لیے مشینی ترجمے کی مؤثر تکنیک کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ آج انٹرنیٹ پر ایسی کئی ویب سائٹس موجود ہیں جو معلومات کے خزانے، علمی اور سائنسی رسائل وجرائد اور تحقیقی مضامین وغیرہ کا خودکار ترجمہ فراہم کردیتی ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کی ترقی میں بھی سائنس اور تکنالوجی بنیادی مقام اور اہمیت کی حامل ہیں۔ ترقی پذیر ممالک سائنسی تراجم

کے ذریعے جدید علوم وفنون سے نہ صرف یہ کہ مالا مال ہو سکتے ہیں بلکہ انسانیت کے لیے اس میدان میں درپیش چیلنجوں سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنا رول ادا کر سکتے ہیں۔

علمی اور سائنسی دریافتوں سے واقف ہونے کے بعد ہی کوئی قوم ان سے استفادہ کر سکتی ہے۔ بنی نوع انسان کو ان دریافتوں سے فیض پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف افراد مادری زبانوں میں سائنسی دریافتوں سے متعلق معلومات کو منتقل کریں۔ سائنسی ترقیوں نے انسانیت کے لیے بعض خطرات بھی پیدا کر دیے ہیں اور مختلف ممالک کے درمیان اس سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ ترجمہ مختلف اقوام کے درمیان افہام وتفہیم کا باعث بنتا ہے۔

اردو زبان میں سائنسی تراجم مندرجہ بالا تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اشد ضروری ہیں۔ اگر اردو زبان میں سائنسی ترقی سے متعلق سرمایۂ علم کو بروقت منتقل نہیں کیا گیا تو ہم عالمی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ ہمارے بزرگوں نے نظری سائنس اور اس کے مسائل کو اردو میں منتقل کرنے کی بھر پور کوشش کی تھی، آج زمانہ نظری سائنس سے آگے بڑھ کر اطلاقی سائنس کے دائرے میں داخل ہو چکا ہے۔ نئی نئی دریافتوں کے باعث اصطلاحات کا ڈھیر لگتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں وقت کی ضرورت ہے کہ سائنسی علوم وفنون کی اردو زبان میں تیز رفتاری سے منتقلی کے لیے مناسب، مؤثر اور بروقت اقدامات کیے جائیں۔ اردو زبان نہایت شیریں زبان ہے، اگر سائنسی تراجم کو خشک اور جامد ترجموں کے بجائے ادب کی شیرینی سے مامور پرکشش اور جاذب ترجمے کا پیراہن پہنایا جائے تو اردو میں سائنسی علوم کے فروغ میں مدد ملے گی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ''ترجمے کے ذریعے علوم وفنون کے دروازے سارے انسانوں کے لیے کھل جاتے ہیں''۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
2. کیا عوام میں سائنسی مزاج اور سوچ کو فروغ دینے میں سائنسی تراجم مؤثر رول ادا کر سکتے ہیں؟

13.4 سائنسی تراجم کے مسائل

اردو زبان کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ صرف شعر وادب کی زبان ہے اور علم وتحقیق، سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق مواد کی منتقلی کے لیے متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح کی باتیں اس وقت اور بھی سچی لگتی ہیں جب ہمارے سامنے سائنسی ترجموں کے نام پر ایسا مواد پیش کیا جائے جن کو پڑھنے کے بعد لطف اندوز ہونا تو دور کی بات مفہوم کو اخذ کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ ہو۔ ظاہر ہے جب کسی زبان میں مواد کی ترسیل ترجمے کی شکل میں کی جائے اور اس کی راہ میں آنے والے مسائل پر پوری طرح نگاہ نہ ڈالی جائے تو ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایسی صورت حال میں یا تو اوپر بیان کیا گیا الزام حقیقت پر مبنی ہے کہ اردو زبان میں وہ صلاحیت نہیں ہے کہ ایسے مضامین کو مؤثر طریقے سے پیش کر سکے جن کا تعلق نظری یا عملی سائنسی مسائل سے ہو۔ یا پھر ترجمہ کرنے والوں کے ذہن میں مسائل خود ٹھیک سے واضح نہ ہوں جن کو دور کر کے سائنسی ترجموں کو بھی قارئین کے لیے پرکشش اور جاذب بنایا جا سکتا ہے۔ ایک اور پہلو اس مسئلے کا یہ بھی ہے کہ قارئین کی بڑی تعداد خود اپنی زبان کے استعمال سے اتنی دور ہو چکی ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو استعمال نہ کر کے خود اپنی صلاحیت اور فہم کو گھٹا لیا ہے۔ سائنسی تراجم کے سلسلے میں درج ذیل مسائل اہمیت کے حامل ہیں۔

13.4.1 سائنسی تراجم کے دوران اصطلاح سازی کے مسائل

اصطلاح سازی ایک بہت ہی تکنیکی عمل ہے۔ اور سائنسی اصطلاح سازی میں نزاکت اور بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ اصطلاحات میں بہت ساری اصطلاحات کے بارے میں شدید اختلافات رہے ہیں۔ ایک بڑی تعداد متروک اصطلاحات کی بھی پائی جاتی ہے۔ اور کئی اصطلاحات پر غور وفکر کے لیے مشورے اور رائیں بھی آتی رہتی ہیں۔ اصطلاحات کے نظام کو سائنسی طریقے پر استوار کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ مسائل کی شدت میں مزید اضافہ ہوگا۔ اردو زبان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اردو کا رشتہ محض کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں رہا بلکہ اب اردو دنیا کے وسیع خطے میں تقریباً ہر جگہ بولی جاتی ہے لہٰذا مختلف النوع مسائل بھی ابھر رہے ہیں۔ سائنسی اصطلاحات کے ضمن میں درج ذیل مسائل کا تذکرہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔

عدم یکسانیت: اصطلاح سازی کا عمل نازک عمل ہے۔ اردو زبان پر مختلف علاقائی زبانوں اور بولیوں کے اثرات مرتب ہوئے اور بعض وقت ایک ہی اصطلاح کے مختلف ترجمے ہو جاتے ہیں۔ اور مترجمین کا اصرار ہوتا ہے کہ ان کی وضع کردہ اصطلاح ہی درست ہے۔ مثلاً Acid کے لیے مختلف اصطلاحیں پائی جاتی ہیں جیسے کھٹا، ترشہ، ایسڈ اور تیزاب۔

انتشار: سائنسی اصطلاح سازی کے عمل میں جاری کوششوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور موجودہ انتشار کو دور کرتے ہوئے اردو زبان میں منتشر سائنسی سرمایے کو یکجا کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ تعلیم کے مختلف مرحلوں میں بھی سائنسی اصطلاحات کے استعمال میں دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ مثلاً اسکول کی سطح پر نصابی کتابوں میں اصطلاحات کچھ ہیں اور کالج کی سطح پر کچھ اور، اور یونیورسٹی کے نصاب میں طلبا کو پھر جدید اصطلاح سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس طرح کا انتشار مروجہ سائنسی اصطلاحات میں جا بجا نظر آتا ہے۔ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس کے بغیر نہ تو اس سرمایے سے کلی طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہے اور نہ اردو زبان کو معیاری انداز میں آئندہ کی نسلوں تک منتقل کرتے ہوئے اسے سائنس و تکنالوجی کے جدید میدانوں میں موجود چیلنجس کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا مروجہ اصطلاحات کی تطہیر کرتے ہوئے ان میں سے ادق، غیر معیاری اور گنجلک اصطلاحات کو پاک کرنا نہایت ضروری ہے۔ تطہیر اصطلاحات کا عمل بھی سائنسی ترجمے کے میدان کا ایک بہت بڑا ہدف ہے۔ اس کے لیے واضح منصوبہ بندی کے ساتھ اقدامات کرنا نہایت ضروری ہے۔

جدید ترقیاتی میدانوں میں اصطلاح سازی یا اصطلاحوں کا ترجمہ: جدید سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں نئے نئے الفاظ کا روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور ایسی نئی نئی اصطلاحیں وجود میں آرہی ہیں، جن کا انگریزی زبان و ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں زیادہ تر اصطلاحیں خود ساختہ ہوتی ہیں جو فنی نوعیت کی ہوتی ہیں اور ضروریاتِ زمانہ کے ساتھ مقبول ہوتی ہیں۔ ایسی اصطلاحیں اردو ذخیرۂ کتب میں مدون اور مروج تو ہوتی ہیں لیکن آپ ان کے معانی کسی ڈکشنری میں تلاش کرنا چاہیں تو نہ مل پائیں گے بلکہ جہاں ایسی اصطلاحات موجود ہیں وہاں ان کے مفہوم کو سمجھانے کے لیے تفصیل کے ساتھ مثالیں دیتے ہوئے ایک وضاحتی نوٹ بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ کوئی بہتر طریقہ نہیں، انگریزی میں بھی ایسے کئی لاطینی اور یونانی زبانوں کے بے شمار الفاظ موجود ہیں (مثلاً طبی کتابوں میں یونانی اصطلاحات) جن کو انگریزی زبان میں یا تو ضم کر دیا گیا ہے یا اس کی شکل کو انگریزی کی طرح تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اصطلاح سازی اور ترجمہ دونوں ہی کام بیک وقت اہمیت کے حامل ہیں۔ مناسب ہے کہ سائنسی اور تکنیکی میدان کی اصطلاحات کے الگ الگ میدانوں کے لیے مسودے تیار کیے جائیں اور متعلقہ مضامین کے ماہرین سے استفادہ کرتے ہوئے اہل زبان اور اصحاب مضامین اصطلاحات سازی کے عمل کو تیز تر کر دیں۔ موجودہ رفتار اردو زبان میں علوم جدیدہ کی منتقلی کے لیے قطعاً کافی نہیں ہے۔

طریقۂ کار اور پالیسی کا فقدان: سائنسی اصطلاحات سے متعلق جملہ مسائل میں سے چند مسائل اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ ان تمام مسائل پر غور وفکر کے لیے جامع طریقۂ کار اور پالیسی کا فقدان خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ سائنسی تراجم کے میدان کو قطعاً کسی مخصوص خطۂ ارض سے جوڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس سلسلہ میں عالمی سطح پر ایک طریقہ کار اور پالیسی کو مرتب کرتے ہوئے ہی ان مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں ایسے بے شمار قومی سطح کے ادارے ہیں جو باہمی اشتراک، تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ کوئی ایسا وفاق تشکیل دے سکتے ہیں جس کو عالمی پیمانے پر اعتبار اور قبولیت کا درجہ حاصل ہو۔

13.4.2 سائنسی مترجمین کی عدم دستیابی

سائنسی ترجمے کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ نسبتاً یہ آسان ہوتے ہیں لیکن دور جدید کی تیز رفتار ترقی اور سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں نئے نئے زاویوں کے اضافے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے ساتھ بے اعتنائی اور بے گانگی نے سائنسی تراجم میں بے شمار مسائل پیدا کر دیے ہیں۔

اردو کے عروج کے زمانے میں مملکت آصفیہ کے زیر اہتمام جامعہ عثمانیہ نے سائنس کے میدان کے نہایت لائق، عالم و فاضل اور ماہر افراد سے استفادہ کیا تھا۔ معیاری مترجمین کے تقررات عمل میں آئے تھے اور سائنس کے مضامین (طبیعیات، کیمیا، نباتیات اور حیوانیات) کی انگریزی کتابوں کے

اردو ترجمے کا کام مقامی اور بیرون ریاست کے ماہر مترجمین اور پروفیسروں سے کروایا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ حالات میں سائنس اور تکنالوجی کے معیاری اردو مترجمین کی فراہمی ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کے میدان کے ایسے ماہرین تو تقریباً عنقا ہیں جن کو اصل زبان (Source Language) اور ترجمے کی زبان (Target Language) دونوں پر عبور ہو۔ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہوئے کسی مخصوص سائنسی میدان سے واقفیت رکھنے والے افراد کی تعداد بہت کم ہے۔ پھر کچھ لوگ ایسے ہیں جو مضمون میں تو درک رکھتے ہیں لیکن اصل اور ترجمے کی زبانوں میں سے کسی ایک زبان پر ہی قدرت رکھتے ہیں۔ ایسے حالات میں سائنسی علوم اور تکنالوجی کے ابھرتے میدانوں سے متعلق اہم ترین تصنیفات یا سائنس اور تکنالوجی کی درسی کتابوں کے ترجمے کا حشر اچھا نہیں ہوگا۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ نے اس مسئلے کو اس طرح بیان کیا ہے۔ ''..... ہمارے ایک قومی ادارے نے ساتویں جماعت کی جنرل سائنس کی کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے کسی مترجم کو دی۔ مترجم نے بڑی محنت کی مگر سبجیکٹ سے ناواقف تھا اس لیے جہاں آکسیجن کی تیاری میں ''بی ہائیوشیلف'' کا ذکر آیا تو اس نے اردو میں ''شہد کی مکھیوں کے چھتے کے رکھنے کی جگہ لکھ دیا''۔ قصور اس کا نہیں تھا' بیچارے نے ڈکشنری سامنے کھول رکھی تھی.....''

گذشتہ دو صدیوں سے سائنسی علوم کے اردو ترجمے کا کام ہو رہا ہے اور مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے ہنوز جاری ہے۔ تاہم ابھی تک سائنسی علوم کے لیے ایسے مترجمین کی کھیپ تیار نہیں ہو سکی ہے' جو ان علوم سے وابستہ تمام تقاضوں کو پورا کر سکے۔

پاکستان بھی اس طرح کے مسائل سے دوچار ہے۔ منیر عالم عارفی نے اس مسئلے پر یوں روشنی ڈالی ہے۔ ''ہمارے ادبا، جدید سائنسی تکنالوجی سے بہرہ ور نہیں ہیں اور جو سائنس داں ہمارے ملک میں موجود ہیں وہ قومی زبان سے ناواقف ہیں اس لیے اس میدان میں مخلصانہ کوششوں کی اشد ضرورت ہے''۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. سائنسی تراجم کے دوران درپیش مسائل کون کون سے ہیں؟
2. مختصر نوٹ لکھیں۔ (1) تطہیر اصطلاحات (2) جدید ترقیاتی میدانوں میں اصطلاحات کا ترجمہ
3. سائنسی مترجمین کی عدم دستیابی کے مسئلے کو کیسے حل کیا جائے؟

13.5 خلاصہ

اردو کا شمار مشرق کی نوعمر زبانوں میں ہوتا ہے، تاہم اردو میں سائنسی ادب کی روایات کا آغاز تقریباً دو سو سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں ترجمے کا آغاز مغلیہ دورِ حکومت سے ہوا۔ انیسویں صدی میں اردو تراجم کو ایک نیا موڑ ملا اور مختلف ادارے قائم ہوئے۔ باوجود مشکلات کے اردو کے پاس دیگر زبانوں کے مقابلے میں قابل قدر سائنسی سرمایہ موجود ہے۔ اگر اس سرمائے کو یکجا کیا جائے، پرکھا جائے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے اور مزید ترقی دینے کے لیے واضح منصوبہ بندی کی جائے تو اردو زبان میں علم و تحقیق کے نئے موتی جُو سکتے ہیں۔ سائنسی کتابوں کے قدیم ترین مترجم سید کمال الدین حیدر ہیں جنھوں نے پادری پرکنس کی تالیف کردہ کتاب ''بحرِ حکمت'' کا ترجمہ کیا تھا۔

شمس الامرا نواب فخر الدین کا رول ہندوستان میں سائنسی علوم کی اشاعت و فروغ میں ناقابل فراموش ہے۔ شاہانِ اودھ نے بھی سائنسی علوم کی اردو میں منتقلی اور اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ نواب میر عثمان علی خاں کے عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمے کا قیام دراصل سائنسی علوم و فنون کی اردو میں منتقلی کی منظم اجتماعی کوشش تھی، دارالترجمہ نے سائنس اور تکنالوجی کی 63146 اصطلاحیں وضع کیں، اور دارالترجمہ کی وضع کردہ مجموعی اصطلاحوں کی تعداد 91088 ہے۔ دہلی کالج کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، سائنٹفک سوسائٹی، طامسن انجینیرنگ کالج رڑکی اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے علاوہ دیگر کئی ادارے سائنسی تراجم کی روایات کو تازہ کیے ہوئے ہیں۔ دینی رجحان کے حامل اداروں میں ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی،

علی گڑھ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ نے سائنسی تراجم میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ پاکستان میں بھی کئی ادارے سائنسی کتب کے تراجم میں مصروف ہیں جن میں مقتدرہ قومی زبان قابل ذکر ہے۔ بیسویں صدی میں سائنس اور تکنالوجی کی ترقی نے ساری دنیا کو عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایسے میں اردو زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ دیگر زبانوں کا سرمایۂ علم اردو میں منتقل ہو۔ اس لیے کہ علمی اور سائنسی دریافتوں سے واقف ہونے کے بعد ہی کوئی قوم ان سے استفادہ کر سکتی ہے۔ اگر اردو زبان میں سائنسی ترقی سے متعلق سرمایۂ علم کو بروقت منتقل نہیں کیا گیا تو ہم عالمی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ سائنسی ترجمہ بالکل آسان کام ہرگز نہیں ہے، سائنسی مترجمین کی عدم دستیابی ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ سائنسی ترجمے میں اصطلاح سازی بنیادی مسئلہ ہے۔ اصطلاح سازی سے متعلق مسئلوں میں اصطلاحات میں عدم یکسانیت، پیچیدگی، انتشار، تطہیر کا نہ ہونا، اصطلاح سازی کے طریق کار اور پالیسی کا فقدان جیسے مسائل شامل ہیں۔

13.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1- اردو میں سائنسی تراجم کی روایت پر روشنی ڈالیے۔

2- شمس الامرا نواب فخر الدین کے دارالترجمہ کے سائنسی ترجموں پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

3- دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے سائنسی تراجم کے میدان میں کیا خدمات انجام دیں؟

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1- ہندوستان میں سائنسی تراجم کے میدان میں رول ادا کرنے والے اداروں پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

2- سائنسی تراجم کی ضرورت اور اہمیت پر ایک نوٹ لکھیے۔

3- سائنسی تراجم کے دوران کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بحث کیجیے۔

13.7 فرہنگ

اظہر من الشمس	=	سورج سے زیادہ ظاہر، سورج کی طرح ظاہر اور عیاں
ملمع سازی	=	سونا چاندی چڑھانا
نشاۃ ثانیہ	=	کسی قوم یا ملک کا از سر نو ترقی کرنا، دوبارہ عروج پانا
پیراہن	=	لباس، کپڑا، پوشاک
عنقا	=	سیمرغ، ایک خیالی پرندہ، نایاب شئے
استوار	=	مضبوط، محکم، مستحکم، پائیدار
جامعیت	=	ہمہ گیری، کاملیت، جس میں سب کچھ آ گیا ہو
ادق	=	نہایت مشکل، نہایت باریک
تطہیر	=	پاک کرنا، تزکیہ، پاکی، طہارت
درک	=	سمجھ، عقل، تمیز

13.8 سفارش کردہ کتابیں

-1	ڈاکٹر محمد شکیل خاں	اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
-2	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	مغرب سے نثری تراجم	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان
-3	مرتب ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ، حیدرآباد		مملکت آصفیہ میں اردو زبان کی ترویج و ترقی
-4	ڈاکٹر قمر رئیس	ترجمہ کا فن اور روایت	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
-5	مدیر اعلیٰ، ظہور الدین	ششماہی مجلّہ ''تسلسل''، جموں توی	شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں توی، جموں و کشمیر
-6	ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال	حیدرآباد میں اردو کی ترقی (تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے)	شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد
-7	اصطلاحات سازی		مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان

اکائی 14: اردو میں مذہبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

14.1 تمہید
14.2 اردو میں مذہبی تراجم کی روایت
14.2.1 اردو کا پہلا مذہبی ترجمہ
14.2.2 اردو میں دیگر دو مذہبی تراجم
14.3 مختلف مذاہب کی کتابوں کے ترجمے
14.3.1 قرآن مجید کے تراجم
14.3.2 نمونۂ ترجمہ (سورۃ فاتحہ)
14.3.3 حدیث کی کتابوں کے اردو تراجم
14.3.4 فقہ سے متعلق کتابوں کے اردو تراجم
14.3.5 ہندوؤں کی مذہبی ومقدس کتابوں کے اردو تراجم
14.3.6 سکھ مذہب اور بدھ مت کی مذہبی کتابوں کے تراجم
14.3.7 انجیل کا ترجمہ
14.4 مذہبی تراجم کی اہمیت
14.4.1 ترجمہ برائے معلومات
14.4.2 ترجمہ برائے تبلیغ
14.5 مذہبی تراجم کے مسائل
14.6 خلاصہ
14.7 نمونۂ امتحانی سوالات
14.8 فرہنگ
14.9 سفارش کردہ کتابیں

14.1 تمہید

یوں تو ترجمے کی بے شمار تعریفیں ملتی ہیں۔ مثلاً

1) ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے۔

2) ترجمہ دو زبانوں کے درمیان ایک اہم رابطہ ہے۔

3) ترجمہ ایک زبان کی لفظیات میں پنہاں خیالات، احساسات اور جذبات کو دوسری زبان کی لفظیات میں منتقل کرتا ہے۔

4) ترجمہ ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے متعارف کراتا ہے۔

تاہم آخر الذکر تعریف کے پس منظر میں مذہبی تراجم کی اہمیت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ کسی بھی تہذیب کی بنیاد کچھ خاص قدروں پر رکھی جاتی ہے اور یہ خاص قدریں عموماً مذہب کی دین ہوتی ہیں۔ جب دو تہذیبوں کا آپس میں ملاپ ہوتا ہے تو ان میں سماجی ادبی اور مذہبی قدروں کی ادلا بدلی ہوتی ہے اور ادلا بدلی کا یہ عمل ترجمے ہی کے ذریعے طے پاتا ہے۔ مثال کے طور پر دور قدیم میں بدھ مت کے پیروکاروں نے اپنے صحائف کے کچھ حصوں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے سے ان کا مقصد بدھ مت کی تبلیغ تھا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ہندوستان کی تہذیب، چین کی تہذیب سے یکسر مختلف تھی، اس لیے ان راہبوں نے ترجمے کے لیے اپنے صحائف سے ان ہی حصوں کا انتخاب کیا، جو ہر تہذیب میں مشترک ہوتے ہیں۔ جیسے زہد و تقویٰ، پاکبازی، انسانوں اور جانوروں سے حسن سلوک وغیرہ۔ اس سے ان کا مقصد آسان اور سہل طریقے سے چینی تہذیب میں داخل ہونا تھا اور جب وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے رفتہ رفتہ مذہب کے ان گوشوں کو بھی ترجمے کے ذریعے واضح کرنے کی سعی کی، جو اپنی نوعیت میں ادق اور فسلفیانہ تھے۔

جب مذہب اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تو اہل یورپ کو اس کے بارے میں جاننے کی جستجو ہوئی۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن میں کیا باتیں بتائیں گئی ہیں، جن باوصف مسلمان اسے آسمانی صحیفہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا، پھر فرانسیسی میں اور پھر انگریزی میں۔ وہ مذہب، جو عرب کی سرزمین سے اٹھا تھا، وہ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلتا گیا۔ اس کی تبلیغ و اشاعت میں جو عوامل کار فرما ہیں ان میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ آج قرآن مجید کے ترجمے نہ صرف یورپی زبانوں میں ملتے ہیں بلکہ یہ ترجمے دنیا کی ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔

یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دنیا میں ترجمے کا جس قدر کام ہوا ہے، اس کا نصف سے زیادہ حصہ مذہبی تراجم پر مبنی ہے۔ دنیا کی تاریخ بنانے اور سنوارنے میں مذہبی تراجم نے ایک اہم حصہ ادا کیا ہے۔

14.2 اردو میں مذہبی تراجم کی روایت

اردو میں مذہبی تراجم کی روایت اتنی ہی قدیم ہے، جتنی اردو کی عمر ہے۔ اگر ہم اردو زبان کے ارتقا کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیں، تو ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ دنیا کی دیگر کئی زبانوں کی طرح اردو سماجی ضرورتوں کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی اس قدر مستحکم ہو گئی کہ اس میں علمی اور ادبی کام کرنا ممکن ہو گیا۔ اردو زبان و ادب اور ثقافت کے سفر کے تمام مرحلوں میں ترجموں نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں مسلمان برسرِ اقتدار تھے اور ان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ ان کی فوج میں اور سرکاری محکموں میں مقامی لوگ کام کرتے تھے، جو فارسی سے ناواقف تھے بلکہ وہ اُس دور کی علمی زبان سنسکرت سے بھی نابلد تھے۔ عوام کو حکومت کی پالیسیوں سے واقف کرانے کا کام زیادہ تر ترجمانی سے طے پاتا، مگر یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ ان حالات میں ایک ایسی زبان کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی، جو ہر کسی کو آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ چنانچہ اس احساس اور کوشش کے نتیجے میں اردو نمودار ہوئی۔

14.2.1 اردو کا پہلا مذہبی ترجمہ

اردو کے ابتدائی نثری اور شعری ادب کے مطالعے سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ ادب زیادہ تر عربی اور فارسی کے ادب سے ماخوذ ہے، چناں چہ اس دور میں جو ادبی تحریریں رقم ہوئی ہیں، وہ سب کی سب فارسی اور عربی سے لی گئی ہیں۔ بعض صورتوں میں ان تحریروں کا اردو میں من وعن ترجمہ کر دیا گیا ہے یا ان کے پلاٹ کو لے کر اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے یعنی باز تخلیق کی گئی ہے۔

گرچہ دکن میں نثری ادب کی ابتدا چودھویں صدی کے اوائل سے ہو گئی تھی کیوں کہ (1399ء) میں دلی کے مشہور صوفی حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز شمال سے ہجرت کر کے بغرضِ تبلیغ گلبرگہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ جب آپ کے مریدوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا تو انہوں نے اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے اردو کو وسیلہ بنایا اور کئی کتابیں اسی زبان میں لکھیں، جن میں قابل ذکر ''معراج العاشقین'' ہے۔ یہ کتاب

1422ء سے قبل تحریر کی گئی تھی۔اس کتاب کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ یہ اردو کی سب سے پہلی شائع شدہ کتاب ہے۔اس کتاب میں مذہب اور تصوف سے بحث کی گئی ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ چودھویں صدی کی ابتدا ہی سے اردو میں مذہبی کتابیں لکھی جانے لگی تھیں۔جب کسی زبان میں کتابیں لکھی جانے لگتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب وہ زبان ترجمے کی متحمل ہوسکتی ہے۔

اب ہم اس بات پر غور کریں گے کہ اردو میں ترجمہ شدہ وہ کونسی کتاب ہے، جس کو مذہبی ترجمے کی پہلی کتاب کہا جاسکتا ہے۔اس سلسلے میں ''تمہیداتِ ہمدانی'' کا نام لیا جاتا ہے۔اس کتاب کے مترجم شاہ میراں جی خدانما ہیں۔''تمہیدات ہمدانی'' دراصل عربی زبان کے مشہور و معروف عالم دین ابوالفضائل عبداللہ بن محمد کی کتاب ''تمہیدات عین القضاۃ'' کی فارسی شرح کا اردو ترجمہ ہے۔اس عربی زبان کی کتاب کی فارسی شرح خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے 1421ء میں لکھی تھی۔اس میں تصوف کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ اس اردو ترجمے کا پہلا نسخہ 1603ء میں لکھا گیا تھا۔شاہ میراں جی خدانما بے انتہا عالم و فاضل تھے اور تصوف میں انھیں بدرجہ غایت درک تھا۔ان ہی اوصاف کی وجہ سے انہیں شمس العشاق کہا جاتا تھا۔انہوں نے فارسی اور عربی سے نابلد لوگوں کے لیے اردو میں کئی کتابیں لکھیں جیسے ''شہادۃ الحقیقت''۔''خوش نغز''۔''خوش نامہ'' اور ''شرح مرغوب القلوب'' وغیرہ۔گویا اردو میں مذہبی تراجم کی روایت پندرہویں صدی ہی سے قائم ہوجاتی ہے۔

14.2.2 اردو میں دیگر دو مذہبی تراجم

شاہ میراں جی کے بعد دوسرے مترجم کے طور پر ملا وجہی کا نام لیا جاسکتا ہے جن کا تعلق قطب شاہی دور سے ہے۔ملا وجہی نے شاہ جی نیشاپوری کی فارسی تصنیف ''دستور عشاق'' کا ترجمہ ''سب رس'' کے نام سے 1635ء میں کیا۔''دستور عشاق'' میں تصوف کے مشکل مسائل کو مثالوں اور علامتوں کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔اس کتاب کے ترجمے میں وجہی نے فارسی، عربی اور سنسکرت کے کئی الفاظ استعمال کیے ہیں اور انہیں از روئے اردو قواعد استعمال میں میں لائے ہیں۔

دکن میں قطب شاہی دور کے اختتام کے بعد مغلیہ دور کا آغاز ہوا۔اس دور کے ایک ممتاز ترجمہ نگار شاہ ولی اللہ قادری گزرے ہیں۔انہوں نے 1704ء میں فارسی تصنیف ''معرفت السلوک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔تصوف کی اس کتاب کے مصنف شیخ محمود ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے پہلے مذہبی ترجمے کا نام بتائیے۔
2. معراج العاشقین کس کی کتاب ہے؟

14.3 مختلف مذاہب کی کتابوں کے ترجمے

ہندوستان ایک کثیر آبادی والا ملک ہے۔جس میں بہ لحاظِ تعداد ہندو سب سے زیادہ ہیں اس کے بعد بالترتیب مسلمان، سکھ اور عیسائی۔اسلام، ہندوازم، سکھ ازم اور عیسائیت کے علاوہ کچھ اور مذاہب بھی ہیں، جن کے ماننے والے بھی ہیں، جیسے بدھ مت کے پیرو، یہودی اور پارسی وغیرہ۔ان مذاہب کی مقدس کتابیں ایسی قدیم زبانوں میں ملتی ہیں، جو ہمارے ملک کی عوامی زبانیں نہیں ہیں، جیسے عربی، عبرانی، سنسکرت وغیرہ۔ان تمام مذاہب کی مقدس کتابوں کے ترجمے اردو میں دستیاب ہیں۔

قرآن مجید کی زبان عربی ہے۔وہ علما جن کی مادری زبان اُردو ہے وہ عموماً عربی زبان سے بھی واقف ہوتے ہیں، اس لیے قرآن مجید کے بیشتر ترجمے راست عربی زبان ہی سے کئے گئے ہیں یہی بات حدیث اور فقہ کے تراجم پر بھی صادق آتی ہے۔سب سے پہلے ہم مذہبِ اسلام سے متعلق تراجم کا جائزہ لیں گے

14.3.1 قرآن مجید کے تراجم

شمالی ہندوستان کے مشہور و مستند عالمِ دین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند مولانا شاہ رفیع الدین نے 1776ء میں سب سے پہلے قرآن کا اردو میں ترجمہ کیا۔چوں کہ یہ ترجمہ لفظی تھا اس لیے اردو جملوں کی ساخت عربی جملوں کی ساخت اختیار کرتی گئی، جس کے سبب مفہوم تک رسائی مشکل سے ہو پاتی ہے۔اس ترجمے سے اتنا ضرور ہوا کہ عربی الفاظ کے معنی بیک نظر معلوم ہونے لگے، جیسے انہوں **ذالک الکتاب لاریب فیه** کا ترجمہ یوں کیا۔''یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے''

اس کے علاوہ یہ ترجمہ سلاست اور روانی سے یکسر عاری ہے۔

قرآن مجید کا دوسرا ترجمہ شاہ عبدالقادر کا ہے، جو شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ ترجمہ پہلے ترجمے کے کوئی نو سال بعد 1795ء میں ''مطبع احمدی دہلی'' سے شائع کیا گیا۔ اس ترجمے کی زبان نہایت آسان ہے۔ چنانچہ سورہ فاتحہ کا ترجمہ انہوں نے یوں کیا ہے۔

1) سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا
2) بہت مہربان : نہایت رحم والا
3) مالک انصاف کے دن کا
4) تجھی کو بندگی کریں گے اور تجھی سے مدد چاہیں گے
5) چلا ہم کو راہ سیدھی
6) راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا
7) نہ ان کی جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے

1776ء سے تا حال ہمیں قرآن مجید کے بے شمار تراجم ملتے ہیں۔ جن علماء نے قرآن کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یوں ہیں :

1. مولانا احتشام الدین مرادآبادی
2. مولانا انشاء اللہ خاں
3. مولانا ابوالکلام آزاد
4. مولانا احمد حسن ندوی
5. مولانا احمد سعید
6. مولانا امین احسن گیلانی (1994ء)
7. مولانا ابوالفضل احسان اللہ گورکھپوری
8. مولانا ابراہیم ابن سید مرزا ابوعلی خاں اصفہانی
9. مولانا احتشام الحق تھانوی
10. مولانا ابومحمد مصلح حیدرآبادی (1911ء)
11. مولانا ابراہیم بیگ (1934ء)
12. مولانا افضل محمد اسماعیل قادری (1952ء)
13. مولانا احمد شاہ یادری (1937ء)
14. مولانا احمد شجاع الایوبی
15. مولانا احمد علی لاہوری (1937ء)
16. مولانا احمد عبدالصمد فاروقی چشتی قادری (1968ء)
17. مولانا احمد حکیم نورالدین (1910ء)
18. مولانا احمدی حافظ روشن علی
19. مولانا احمدی عمر میاں معراج الدین
20. مولانا احمدی غلام حسن نیازی پشاوری (1939ء)
21. مولانا احمدی فخرالدین ملتانی (1919ء)
22. مولانا احمدی میر محمد اسحاق
23. مولانا ثناء اللہ امرتسری
24. مولانا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی
25. مولانا خواجہ حسن نظامی دہلوی
26. مولانا سرسید احمد خاں
27. مولانا سید امیر علی
28. مولانا شاہ مراد اللہ انصاری
29. مولانا شاہ مجددی
30. مولانا شمس پیرزادہ
31. مولانا شریف خاں
32. مولانا محمود حسن دیوبندی
33. مولانا محمد علی لاہوری
34. مولانا مرزا حیرت دہلوی
35. مولانا محمد جونا گڑھی
36. مولانا مودودی
37. مولانا عبدالباری فرنگی محلی
38. مولانا عبدالوائم جلالی
39. مولانا عبدالماجد دریابادی
40. مولانا عبدالباری حیدرآبادی
41. مولانا فیروزالدین
42. مولانا کرم شاہ ازہری بریلوی
43. مولانا وحیدالدین خاں
44. مولانا عبدالکریم پاریکھ
45. مولانا محمد ادریس کاندھلوی
46. مولانا عبدالحق دہلوی
47. مولانا فتح محمد جالندھری
48. مولانا محمد احسن
49. مولانا احمد رضا خاں
50. حیرت دہلوی

14.3.2 نمونۂ ترجمہ (سورۃ فاتحہ)

ذیل میں سورۃ فاتحہ کا ترجمہ بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم	ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی	مولانا فیروز الدین	قاری عبدالباری
الحمد للہ رب العالمین (۱)	ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے (جو) تمام جہاں کا پروردگار ہے	سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا سارے جہاں کا	تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں' جو پروردگار ہے سب جہانوں کا	ہر طرح کی تعریف اللہ کے لئے ہے' جو سارے جہان کا پروردگار ہے
الرحمن الرحیم (۲)	نہایت رحم والا' مہربان	بے حد مہربان' نہایت رحم والا	بڑا مہربان' نہایت رحم والا	بے حد مہربان' نہایت رحم والا
ملک یوم الدین (۳)	روز جزا کا حاکم	مالک روز جزا کا	مالک روز جزا کا	جزا و سزا کے دن کا مالک
ایاک نعبدو ایاک نستعین (۴)	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں	تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں	بارالہا ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں	(اے پروردگار) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔
اھدنا الصراط المستقیم (۵)	ہم کو (دین کا) سیدھا راستہ دکھا	بتلا ہم کو راہ سیدھی	دکھا ہم کو راستہ سیدھا	ہم کو سیدھا راستہ چلا
صراط الذین انعمت علیھم (۶)	ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے (اپنا) فضل کیا	راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا	راستہ ان کا کہ انعام کیا تو نے ان پر	ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے (اپنا فضل و کرم) کیا
غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین (۷) ع	نہ ان کا جن پر (تیرا) غضب نازل ہوا اور نہ گمراہوں کا	نہ جن پر تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے	نہ ان لوگوں کا تیرا غضب ہوا جن پر اور گمراہوں کا	نہ ان لوگوں کا راستہ' جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان لوگوں کا جو گمراہ ہوئے

14.3.3 حدیث کی کتابوں کے اردو تراجم

مسلمانوں کے لیے قرآن اور سنت کی بڑی اہمیت ہے۔ سنت پر عمل کا مطلب ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور آپ کی بتائی ہوئی باتوں (احادیث) پر سختی سے عمل کرنا' کیوں خود اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ **ما اتاکم الرسول فخنوہ ومانھکم عنہ فانتھوا** (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے وہ تمہیں منع کریں' اُس سے رک جاؤ)۔ ایک اور جگہ بہت ہی صراحت سے آنحضرت کی اطاعت کی تلقین کی گئی ہے: من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (جو آپ کی اطاعت کرتا ہے گویا وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے)

اس کے علاوہ قرآن کو صحیح معنی میں حدیث ہی کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی قرآن فہمی کے لیے احادیث کا علم ناگزیر ہے۔ احادیث کو مختلف لوگوں نے جمع کیا ان کے بارے میں تصدیق و تحقیق کی اور انہیں کتابوں کی شکل دی۔ جن احادیث کی کتابوں کا ترجمہ عربی سے اردو میں کیا گیا ہے ان کی

تفصیل درج ذیل ہے۔

کتاب کا نام	مصنف کا نام	مترجم کا نام	وضاحت
1. بخاری شریف	ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل	مولانا عبدالحکیم شاہ اختر	
2. تفہیم البخاری	"	1. مولانا ظہور الباری اعظمی 2. مرزا حیرت علی بیگ	یہ بخاری شریف کا سلیس ترجمہ اور تفسیر ہے۔ یہ ترجمہ دس جلدوں پر محیط ہے۔
3. تفسیر الباری	"	علامہ وحید الزماں	صحیح بخاری کا ترجمہ اور تفسیر۔ یہ شرح آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے
4. صحیح بخاری شریف	"	1. مولانا محمد عادل صاحب اور 2. مولانا محمد فاضل صاحب	سلیس اور عام فہم۔ تین جلدیں۔ 2872 صفحات
5. صحیح مسلم	امام مسلم	مولانا نواب وحید الزماں	
6. تفہیم المسلم	"	مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی	
7. سنن ترمذی	ابوعیسیٰ محمد بن ضحاک سلمی	مولانا سید نذیر الحق قادری	
8. جائزۃ الشعوذی	"	مولانا بدیع الزماں بن مسیح الزماں	ترمذی کا لفظی ترجمہ اور امام ترمذی کے اقوال کا ترجمہ
9. شمائل ترمذی	"	1. مولانا کرامت علی 2. شیخ الحدیث مولانا زکریا	انوار محمدی کے نام سے شمائل ترمذی کا ترجمہ کیا ہے خصائل نبوی کے نام سے شمائل ترمذی کا ترجمہ و شرح
10. سنن ابوداؤد	امام سلیمان الاشعث ابوداؤد سنجانی	مولانا وحید الزماں حیدر آبادی	یہ ترجمہ تین جلدوں پر مشتمل ہے
11. نسائی	امام نسائی	مولانا وحید الزماں حیدر آبادی	
12. سنن ابن ماجہ	محمد بن یزین بن ماجہ	علامہ بدیع الزماں و علامہ وحید الزماں	
13. مشکوۃ المصابیح	المصابیح ابومحمد بن مسعود الفراء البغوی	1 مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہجہاں پوری 2. مولانا مرزا حیرت علی دہلوی 3. مولانا محمد اسحاق صدیقی 4. مولانا مفتی یار خاں نعیمی اشرفی	اس میں چودہ کتابوں سے لی گئی حدیثوں کا ذخیرہ ہے یہ جدید اردو طرز تحریر میں با محاورہ ترجمہ ہے۔ مرأت المناجیح کے نام سے مشکوۃ المصابیح کا ترجمہ کیا ہے۔
14. ریاض الصالحین	مولانا محی الدین ابو زکریا	1. مولانا عبدالرسول 2. امتہ اللہ نسیم صاحبہ	
15. مشارق الانوار	امام صنعانی	مولانا خرم علی صاحب	
16. مؤطا مالک	امام مالک	1. علامہ وحید الزماں حیدر آبادی 2. اختر شاہجہاں پوری	
17. مؤطا محمد	امام محمد بن حسن صنعانی	حافظ نذیر احمد	

14.3.4 فقہ سے متعلق کتابوں کے اردو تراجم

آئے دن ہم اپنی سماجی زندگی سے متعلق متعدد مسائل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں اور جب ان مسائل کی نوعیت سنگین ہوتی ہے تو ہمیں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا اٹھایا ہوا قدم کہیں مذہب کے بنائے گئے اصولوں کے خلاف تو نہیں۔ جب ذہن میں اس قسم کا خدشہ پیدا ہوتا ہے تو ہم عالموں سے رجوع کرتے ہیں یا ان مسائل کے حل کے لیے فقہ کی کتابوں کی مدد لیتے ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اجمالی طور پر ہر مسئلے کے بارے میں لکھا ہوتا ہے۔ علماء ان

ہی کتابوں کی روشنی میں فتویٰ بھی صادر کرتے ہیں جس کی رو سے نزاعی مسائل بخسن وخوبی حل کرلیے جاتے ہیں۔فقہ ایسے ہی مسائل سے بحث کرتا ہے۔ فقہ کی کئی مستند کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں جن کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے، جو درج ذیل ہیں۔

کتاب کا نام	اردو میں ترجمے کے بعد کتاب کا نام	مترجم کا نام
1. مختصر قدوری	1) اشرف النوری	مولانا حفیظ صاحب
""	2) اصح النوری	مولانا محمد حنیف گنگوہی
2. ہدایہ	1) عین الہدایہ	مولانا سید امیر علی
""	2) اشرف الہدایہ	مولانا جمیل احمد
""	3) اشرف الہدایہ	مولانا محمد یوسف
3. شرح وقایہ	1) اشرف الوقایہ	مولانا عبدالحفیظ
""	2) نورالہدایہ	مولانا وحیدالزماں
4. درمختار	1) غایۃ الاوطار	مولانا خرم علی ومولانا محمد احسن صدیقی
""	2) کشف الاسرار	مولانا ظفیر الدین
5. فتاویٰ عالمگیری	1) فتاویٰ عالمگیری	مولانا احتشام الدین مرادآبادی
""	2) فتاویٰ عالمگیری	مولانا مفتی کفیل الرحمٰن
6. ہدایہ المجتہد	کتاب النکاح والطلاق	مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی
7. فتاویٰ یوسف القرضاوی	فتاویٰ معاصرہ	مولانا سید زاہد اصغر فلاحی

اس کے علاوہ اردو تراجم میں تفسیر، سیرت، تاریخ اسلام، خلفاء کے خطوط، اخلاقیات وغیرہ کی کتابیں بھی اچھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔

14.3.5 ہندوؤں کی مذہبی ومقدس کتابوں کے اردو تراجم

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں درج ذیل کتابیں اہم ہیں :

1. وید
2. مہابھارت
3. بھگوت گیتا اور
4. رامائن

1. وید

وید تمام ہندوؤں کے لیے ایک مشترک مقدس کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ چناں چہ زمانہ قدیم میں وید کی مناسبت سے ہندوازم کا نام ''ویدنکا دھرما'' تھا۔ وید کی زیادہ تر تحریریں منتروں کی شکل میں ہیں جن کو سادھو اور سنتوں نے وضع کیا ہے۔ منتروں کے تعلق سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ منتر کے شبد (الفاظ) اپنے اندر ایک غیر مرئی قوت رکھتے ہیں، اس لیے ان منتروں کے جاپ (ورد) سے ایک خاص کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے اور اسی خاص قوت سے انسان میں غیر معمولی روحانی قوت پیدا ہوتی ہے، جس سے وہ جو چاہتا ہے کرسکتا ہے۔ وید کے چار حصے ہیں۔

i) سمہیتا : (س۔م۔ہ۔ت) اس حصے کو وید کے مرکزی حصے کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے یہ حصہ بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس میں منتر ہوتے ہیں۔

ii) براہمنا (ب۔ر۔ا۔ہ۔م۔ن) وید کا حصہ یہ بتاتا ہے کہ سمہیتا کے منتروں کو کس طرح کارگر طریقے سے استعمال کر کے اس سے روحانی شکتی

(قوت) حاصل کی جاسکتی ہے۔

iii) آرانیکا iv) اپنشد : ان دو حصوں میں زندگی، آتما (روح) پرماتما (خدا) اور ایسے ہی کئی موضوعات پر فلسفیانہ بحثیں ملتی ہیں اور ان میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ آتما کا پرماتما سے کیا رشتہ ہے۔ وید چار قسم کے ہیں جو درج ذیل ہیں :

1- رگ وید 2- سام وید 3- یجروید 4- اتھروید

ان چار ویدوں کے ترجمے اردو میں ہوئے ہیں۔ ان ویدوں کی تلخیص کا ترجمہ منشی کنہیالال نے ''الکھ پرکاش'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اسی طرح اپنشد کا ترجمہ سوریہ نرائن مہر دہلوی نے کیا ہے۔

2. مہابھارت

مہابھارت دراصل ایک ہی خاندان کے افراد کے درمیان مخاصمت اور جنگ و جدل کی کہانی ہے۔ یہ کئی چھوٹی چھوٹی پیچیدہ کہانیوں سے مل کر بنی ہے۔ جو فلسفہ، شانِ خداوندی، مہم جوئی، شجاعت و بہادری اور بے وفائی کے تانے بانے پر مبنی ہے۔ اس کے سبھی کرداروں کو خوبی سے ابھارا گیا ہے۔ چنانچہ ان کرداروں کی عظمت کی جھلکیاں ہندوستان کے فنون لطیفہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مہابھارت کے کئی اردو ترجمے ملتے ہیں۔

مہابھارت اور سمپورن مہابھارت کے ترجمے پنجابی پستک بھنڈار اور دیہاتی پستک بھنڈار، دہلی نے شائع کیے ہیں۔ اس کے کچھ حصوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

3. بھگوت گیتا

بھگوت گیتا کو مہابھارت کا ایک اہم حصہ (Episode) کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظم دراصل ایک قسم کا طویل مکالمہ ہے، جو ارجن اور کرشن کے درمیان ہوتا ہے۔ ارجن راجا دھشٹر کے بھائی ہیں۔ کرشن بھگوان وشنو کے اوتار ہیں اور وہ ارجن کے رتھ کے ''سارتھی'' یعنی کوچوان ہیں۔ یہ سارا مکالمہ جنگ کے میدان میں ہوتا ہے جہاں کوروؤں اور پانڈوؤں کی فوجیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے جارہی ہیں۔ اردو میں اس کے کئی ترجمے ہمیں ملتے ہیں۔ جیسے :

1.	دل کی گیتا۔	مترجم، خواجہ دل محمد (منظوم)
2.	نغمۂ الوہیت	مترجم، ڈاکٹر حسن الدین احمد
3.	بھگوت گیتا	مترجم، محمد اجمل خاں
4.	شری مد بھگوت گیتا المعروف بہ فلسفۂ الوہیت	مترجم، پنڈت جانکی ناتھ مدن
5.	بھگوت گیتا	مترجم، بھگوان داس بھارگو

4. رامائن

رامائن کا شمار پچھلے دو ہزار برسوں سے جنوبی ایشیا کی سب سے اہم اور دلچسپ کتابوں میں ہوتا ہے۔ اِس رزمیہ نظم نے ہندوستانی تہذیب کے کئی پہلوؤں کو متاثر کیا ہے اور اس کا اثر اب تک سیاست، مذہب اور تہذیب پر دیکھا جاسکتا ہے۔ رامائن کی کہانی، والد کی اطاعت، بھائی سے محبت، بیوی کا پیار اور جلاوطنی کی صعوبتوں سے عبارت ہے۔ رامائن کے اردو میں کئی ترجمے ہیں، جن میں منظوم بھی ہیں۔ رامائن کے ترجمے کے ذکر میں پنڈت برج نارائن چکبست کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ ان ہی کے کیے گئے ترجمے بعنوان کا ایک سین سے کچھ بند نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ رام چندر جی کو چودہ سال کے بن باس کا حکم ہوگیا۔ اس حکم کی تعمیل سے قبل اپنی ماں سے ملتے ہیں۔ اس منظر کو چکبست نے نظم کی صورت میں پیش کیا ہے :

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا اہتمام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

اظہارِ بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اُداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہوگیا ہے' یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو' بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رُخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

ان مقدس کتابوں کے علاوہ ہندو مذہب کے لٹریچر کے ترجمے بھی اردو میں ملتے ہیں جیسے سوامی وویکانند کی کتاب ''بھکتی اور ویدانت'' کا ترجمہ اردو میں شانتی نرائن نے کیا ہے۔ اسی طرح سے کبیر پنتھی' بھگتی' برہموسماج' دیوسماج' ویدسماج کے ترجمے بھی اردو میں کیے گئے ہیں۔

14.3.6 سکھ مذہب اور بدھ مت کی مذہبی کتابوں کے تراجم

ہندوستان میں سکھ اور بدھ مت کے ماننے والوں کی ایک قابل لحاظ تعداد ہے۔ سکھ اور بدھ مت کے ماننے والوں میں اردو ادب کے قابل قلم کار بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنی اپنی مذہبی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ جو نثر اور نظم دونوں میں ہے۔ سکھ مذہب کے بانی گرونانک دیو صاحب کے عارفانہ کلام کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح مخمور جالندھری نے گوپال سنگھ کی کتاب ''گرونانک دیو'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ سکھوں ہی کے ایک اور گرو' گرو گوبند سنگھ گزرے ہیں جنہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کے فارسی کلام ''ظفرنامے'' کا ترجمہ شیخ انور حسین نے کیا ہے۔

گوتم بدھ کی تعلیمات پر ایک مبسوط کتاب ''دھم پدمہاتما'' لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں گوتم بدھ کے طریقۂ تعلیم پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا منظوم ترجمہ منور لکھنوی نے کیا ہے۔

14.3.7 انجیل کا اردو ترجمہ

یہ کہا جاتا ہے کہ کسی مقدس کتاب کے اگر سب سے زیادہ ترجمے ہوئے ہیں تو وہ عیسائیوں کی مقدس کتاب انجیل ہے۔ دنیا میں بولی جانے والی

زبانوں کے بارے میں جمع شدہ اعداد و شمار کے لحاظ سے دنیا میں (6500) زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں سے انجیل کا ترجمہ دو ہزار تین سو پچپن (2355) زبانوں میں ہوا ہے۔ جن کی تفصیل یوں ہے :

ممالک	زبانوں کی تعداد
افریقہ	665
ایشیا	585
بحرالکاہل اور قریبی سمندروں کے جزیرے	414
جزائر غرب الہند اور لاطینی امریکہ	404
یورپ	209
شمالی امریکہ	78

دراصل انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اترا ہوا صحیفہ ہے، مگر عیسائی جو انجیل پڑھتے ہیں اس کے لکھنے والے چار مختلف لوگ ہیں۔

1. متی MATHEW
2. مرقس MARK
3. لوقا LUKE
4. یوحنا JOHN

انجیل کا سب سے پہلا اردو ترجمہ بنجمن شلٹز (Benjamin Schultze) نے ''انجیل مقدس'' کے نام سے کیا۔ شلٹز کا تعلق جرمنی سے تھا۔ اس نے اردو ترجمہ 1723ء میں شروع کیا تھا اور اس کی تکمیل 1748ء میں کی۔ اس کے بعد انجیل کے بے شمار اردو ترجمے ہوئے۔ اردو کے اکثر ترجمے یوحنا کی انجیل سے کیے گئے ہیں۔ ترجمے کا نمونہ انگریزی متن کے ساتھ درج ذیل ہے۔ یوحنا کی انجیل کے درج ذیل ترجمے کو پاکستان بائبل سوسائٹی نے 1992ء میں شائع کیا۔

1.1 *In the beginning was the word, and the word was with God, and the word was God.*

ترجمہ۔ ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔

1.2 *The same was in the beginning with God.*

یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا

1.3 *All things were made through Him, and without Him was not anything made that hath been made.*

سب چیزیں اُسی کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔

1.4 *In Him was life, and the life was light of men.*

اس میں زندگی تھی اور وہ زندگی آدمیوں کا نور تھی۔

1.5 *And the light shineth in the darkness, and the darkness apprehended it not.*

اور نور تاریکی میں چمکتا ہے اور تاریکی نے اسے قبول نہیں کیا۔

1.6 *There came a man, sent from God, whose name was John.*

ایک آدمی یوحنا نام کا آموجود ہوا، جو خدا کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔

1.7 *The same came for witness, that he might bear witness of the light, that all might believe through him.*

یہ گواہی کے لیے آیا کہ نور کی گواہی دے تا کہ سب اس کے وسیلے سے ایمان لائیں۔

1.8 *He was not light, but came that he might bear witness of the light.*

وہ خود تو نور نہ تھا مگر نور کی گواہی دینے آیا تھا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. قرآن کا اردو میں سب سے پہلے کس نے اور کب ترجمہ کیا؟
2. حدیث کی جملہ کتنی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں؟
3. فقہ کی جملہ کتنی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں؟
4. ویدوں کی کل تعداد کتنی ہے؟
5. مہابھارت، بھگوت گیتا اور رامائن کس مذہب کی کتابیں ہیں؟
6. دھم پد مہاتما کس مذہب کی کتاب ہے؟
7. انجیل کا سب سے پہلے اردو میں ترجمہ کس نے کیا؟

14.4 مذہبی تراجم کی اہمیت

دنیا کے بیشتر مذاہب بہت قدیم ہیں۔ان میں ہندو مذہب، بدھ مت، عیسائی اور اسلام مذاہب شامل ہیں اور ان مذاہب کی مقدس کتابیں ان کے دور کی رائج الوقت زبانوں میں ملتی ہیں۔جیسے :

وید: سنسکرت میں

انجیل: پہلے عبرانی اور آرامی زبان میں، بعد میں (Old Testament) یونانی میں اور (New Testament) لاطینی میں اور پھر انگریزی میں،

گوتم بدھ کے پیغامات: پالی میں

قرآن: عربی میں

جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے تہذیبیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور اسی طرح زبانیں بھی۔ان کی جگہ نئی تہذیبیں اور زبانیں لے لیتی ہیں۔ترجمہ مذہبی سرمائے کو ایک تہذیب سے دوسری تہذیب میں منتقل کرتا ہے۔اگر انجیل کا ترجمہ عبرانی اور آرامی زبان سے یونانی اور لاطینی زبان میں نہ کیا جاتا تو شاید ہم انجیل سے ناواقف ہوتے۔

فرض کیجیے قرآن کے ترجمے کا کام صرف قطب شاہی دور کی دکھنی زبان میں ہوتا تو آج اس ترجمے کی زبان کو سمجھنا ہمارے لیے اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا ملا وجہی کی تحریریں سمجھنے میں ہو رہی ہے۔جن کو شرح کی مدد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔کسی زبان کے ارتقا کے مرحلے کسی منزل پر ساکت و جامد نہیں ہوتے بلکہ ان میں مسلسل و متواتر تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔اس لیے زبان کے ارتقا کے ہر دور کے لیے ہمیں ایک نئے ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے۔چناں چہ مذہبی تراجم کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔قرآن کے اردو میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔اتنے سارے ترجموں کی ضرورت محض زبان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے لاحق ہوئی۔کہا جاتا ہے کہ ہر سو سال بعد زبان بدلتی ہے اور یہ بات لسانی حقیقت پر مبنی ہے۔

مگر دنیا کی ساری زبانوں میں عربی زبان ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس زبان میں وسعت تو آئی ہے مگر کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔اس بات کو سمجھنے کے لیے قرآن کی زبان کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جو زائد از چودہ سو سال قبل کی زبان ہے۔اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس زبان

میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔اس حقیقت کو بہتر طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے :

فرض کیجیے قطب شاہی دور کا کوئی انسان ہم سے دکھنی میں بات کرے یا چاسر کے دور کا آدمی انگریزی میں ہم سے گفتگو کرے تو ہم اس کی زبان سمجھ نہیں پائیں گے اور اگر ہم اسے اپنی زبان میں مخاطب کریں تو شاید وہ یہ کہہ بیٹھے **زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم** ۔مگر چودہ سو سال قبل کا کوئی عرب باشندہ اگر آج کے دور کے عرب سے گفت وشنید کرے تو ان کا مکالمہ بحسن وخوبی آگے بڑھے گا اور وہ دونوں بلا کسی دقت کے گفتگو کا مزہ اسی طرح لیں گے جس طرح عام طور پر لیا جاتا ہے۔

14.4.1 ترجمہ برائے معلومات

آج کے دور میں دنیا سمٹ کر ایک عالمگیر گاؤں (Global Village) کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہے۔دنیا کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں پرنٹ میڈیا (Print Media) یعنی روزنامے، جرائد، رسالے، کتابیں اور الکٹرانک میڈیا (Electronic Media) یعنی ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر نے نمایاں اور اہم حصہ ادا کیا ہے۔مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے لوگ ایک دوسرے کے مذاہب اور تہذیبوں سے آگہی ان ہی میڈیا کے ذریعے حاصل کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ترجمہ ایک اہم رابطے کا کام انجام دے رہا ہے۔

14.4.2 ترجمہ برائے تبلیغ

ہر مذہب کے ماننے والے کا یہ ایقان ہوتا ہے کہ اس کا اپنا مذہب دیگر مذاہب کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور اچھا ہے اور وہ یہ سوچتا ہے کہ کسی انسان کی نجات اس کے اپنے مذہب کو اپنانے میں ہے۔لوگوں کو راہ راست پر لانے کا جذبہ ہی تبلیغ کا باعث بنتا ہے۔تبلیغ کے لیے ترجمہ ناگزیر ہے۔دنیا کئی خطوں میں منقسم ہے اور ہر ایک خطے میں کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں ان تک ہماری رسائی محض ترجمے ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مذہبی کتابوں جیسے قرآن اور انجیل کے ترجمے ہزاروں زبانوں میں ملتے ہیں۔اس لحاظ سے ترجمے کی اہمیت مسلم ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. کن دو مقاصد کے تحت مذہبی تراجم کیے جاتے ہیں؟

14.5 مذہبی تراجم کے مسائل

مذہبی تراجم کے مسائل ادبی تراجم کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں۔ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ترجمہ ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں تبدیل کرتا ہے۔ترجمے کے اس عمل (Process) کو درج ذیل خاکے کی مدد سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

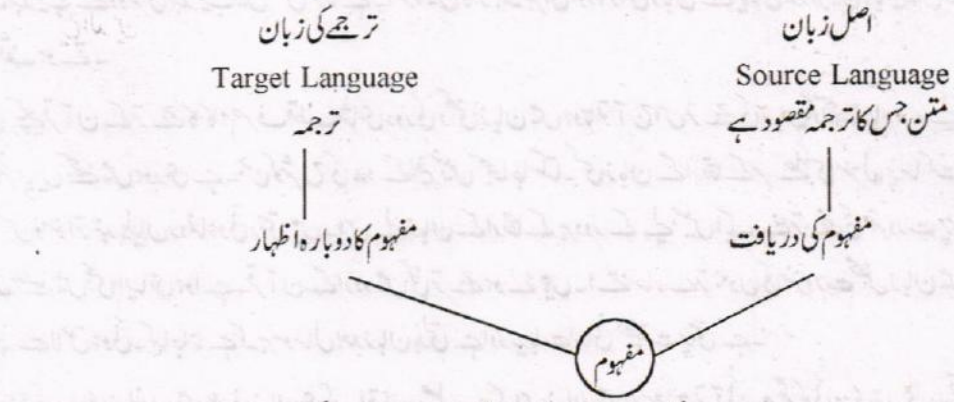

یوں سرسری جائزے سے ترجمے کا عمل بہت آسان لگتا ہے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ترجمہ نگار اس وقت تک ترجمے کا حق ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ اس میں درج ذیل خوبیاں نہ ہوں :

1) اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر عبور ہونا چاہیے۔

2) دونوں زبانوں کی لسانی خصوصیت سے واقفیت ہونی چاہیے۔

3) دونوں زبانوں کے خاندانوں اور معیاتی نظام میں فرق کرنے کا علم ہونا چاہیے۔

4) دونوں زبانوں کے تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر سے آگہی ہونی چاہیے۔

ادبی ترجمے ہی کی طرح مذہبی ترجمے کی سب سے بڑی دشواری مناسب الفاظ کا انتخاب ہے۔ اگر ترجمہ نگار مناسب لفظ اور اصطلاح سے صرفِ نظر کرتا ہے تو وہ بے شک ہدفِ تنقید بن جائے گا۔ مناسب الفاظ سے کیا مراد ہے، اس بات کو حسب ذیل مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ **ضالاً** کے عام معنی گمراہی اور بھٹکنے کے ہیں اس لفظ کا استعمال قرآن مجید کی ایک آیت میں ہوا ہے۔

ووجدک ضالاً فھدیٰ۔ پارہ 30۔ سورۃ الضحیٰ۔ آیت (7)

اس آیت کا ترجمہ مختلف ترجمہ نگاروں نے یوں کیا ہے :

مولانا شاہ عبدالقادر	۔	اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ دی
مولانا شاہ رفیع الدین	۔	اور پایا تجھ کو راہ بھولا ہوا پس راہ دکھائی
مولانا عبدالماجد دریابادی	۔	آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتایا۔
ڈپٹی نذیر احمد	۔	اور تم کو دیکھا راہِ حق کی تلاش میں بھٹکے بھٹکے پھر رہے ہو تو تم کو دین اسلام کا سیدھا راستہ دکھایا۔
مولانا اشرف علی تھانوی	۔	اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو (شریعت سے) بے خبر پایا سو آپ کو شریعت کا راستہ بتلا دیا۔
مولانا احمد رضا خاں بریلوی	۔	اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔

اس آیت کے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی شان مبارک میں عام لفظوں کا استعمال مثلاً ''بھٹکنا''۔ ''راہ بھولا ہوا ہونا''۔ ''بے خبر ہونا''۔ ''بھٹکے بھٹکے پھرنا'' زیب نہیں دیتا۔ **ضالاً** کے لیے ''خود رفتہ پانا'' ایک بہترین اظہار (Expression) ہے، جس میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ حد و ادب کی وہ منزل بھی ہے، جس میں بے انتہا عقیدت کا جذبہ بھی ہے۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے :

ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین ۔ پارہ 9۔ سورۃ الانفال۔ آیت (30)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے :

مولانا شاہ عبدالقادر	۔	اور وہ بھی فریب کرتے تھے اور اللہ بھی فریب کرتا تھا اور اللہ کا فریب سب سے بہتر ہے۔
مولانا شاہ رفیع الدین	۔	اور مکر کرتے تھے وہ اور مکر کرتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نیک مکر کرنے والوں کا ہے۔
مولانا محمود الحسن دیوبندی	۔	وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔
مولوی ڈپٹی نذیر احمد	۔	اور حال یہ ہے کہ کافر اپنا داؤ کر رہے تھے اور اللہ اپنا داؤ کر رہا تھا اور اللہ سب داؤ کرنے والوں سے بہتر داؤ کرنے والا ہے۔
مولانا اشرف علی تھانوی	۔	اور وہ تو اپنی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ میاں اپنی تدبیر کر رہے تھے اور سب سے مستحکم تدبیر والا اللہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت میں مکر یا داؤ کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس لیے مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ سب ترجموں سے بہتر ہے، کیوں کہ انہوں نے ''مکر'' اور ''داؤ'' جیسے معمولی لفظوں سے اجتناب کر کے ان کی جگہ ''تدبیر'' کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔

ان مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مذہبی ترجموں میں آداب و مراتب کو ملحوظ خاطر رکھ کر لفظوں کا انتخاب کرنا چاہیے ورنہ ترجمے کی عظمت داؤ پر لگ جاتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مذہبی تراجم کرتے وقت مترجم کو کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے؟

14.6 خلاصہ

اس اکائی میں اردو میں مذہبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اردو میں مذہبی تراجم کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی اردو کی عمر ہے۔ اردو کے سب سے پہلے مذہبی ترجمے کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔ پھر ان تراجم پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا تعلق ہندو مذہب اور عیسائی مذہب سے ہے۔ اور ہر مذہب کی مقدس کتابوں کے ترجمے بطور نمونے دیے گئے ہیں۔ آخر میں مذہبی ترجموں کی اہمیت اور مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح مناسب لفظوں کا استعمال اور حفظِ مراتب کا خیال مذہبی ترجموں کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔

14.7 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. مذہبی تراجم کی روایت پر نوٹ لکھیے۔
2. مذہبی مواد کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟
3. تفسیر، حدیث اور فقہ کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابیں کون سی ہیں اور یہ کس زبان میں ہیں؟
2. عام اور مذہبی ترجمے کے فرق پر روشنی ڈالیے۔
3. مذہبی ترجمے کی کیا اہمیت ہے؟

14.8 فرہنگ

ادق	=	نہایت مشکل، نہایت باریک	وثوق	=	مضبوطی، اعتبار، اعتماد، بھروسہ
مِن وعَن	=	حرف بحرف۔ مفصل۔ واضح	قالب	=	سانچا، ڈھانچہ
غایت	=	غرض، مطلب	درک	=	عقل، سمجھ، تمیز، واقفیت
عاری	=	قاصر، مجبور	تلقین	=	تعلیم دینا، ہدایت
نزاع	=	جھگڑا، فساد، تکرار	رزمیہ نظم	=	وہ نظم جس میں جنگ کو موضوع بنایا گیا ہو
ایقان	=	یقین ہونا			

14.9 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر محمد حمید اللہ — خطبات بہاولپور
2. المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد (ترتیب) — اردو زبان میں علوم اسلامی کا سرمایہ
3. ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل — بخاری شریف
4. سید احتشام حسین — اردو ادب کی تنقیدی تاریخ
5. ڈاکٹر خلیق انجم — فن ترجمہ نگاری

اکائی 15 : انگریزی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ۔ چند مثالیں

ساخت

15.1 تمہید

15.2 سُدھامورتی کی ایک کہانی : On Human Foibles

15.3 On Human Foibles کا ترجمہ: ''بشری خامیاں''

15.4 Great Poet Mirza Ghalib کے زیرعنوان غالب کی سوانح عمری کا ایک حصہ

15.5 Great Poet Mirza Ghalib کا ترجمہ : ''عظیم شاعر مرزا غالب''

15.6 Philosophy, Education and Their Inter-Dependence
بی۔ایڈ کی کتاب Education and Society کی اکائی 3 کا ایک حصہ

15.7 Philosophy, Education and Their Inter-Dependence کا ترجمہ : ''فلسفہ، تعلیم اور ان کا باہمی انحصار''

15.8 وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کا انگریزی میں صحافتی بیان : "Let's Fight Terror Together"

15.9 وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے صحافتی بیان کا ترجمہ

15.10 मौलाना मुहम्मद अमीन : تزکِ جہانگیری کے ہندی ترجمے کا ایک حصہ

15.11 ''مولانا محمد امین'' کے زیرعنوان ہندی متن کا ترجمہ

15.12 خلاصہ

15.13 نمونہ امتحانی سوالات

15.14 فرہنگ

15.1 تمہید

ایک بہت اہم بات ذہن نشین کرنے کی یہ ہے کہ نظریے کے بغیر عمل بے بنیاد ہوتا ہے اور عمل کے بغیر نظریہ لایعنی ہوتا ہے۔ اس فہم کے پیش نظر زیر نظر کتاب کی پچھلی 14 اکائیوں میں ترجمے کے فن کے مختلف پہلوؤں سے نظری بحث کی گئی ہے اور اکائی نمبر 15 میں انگریزی متن کے چار مختلف قسم کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندی متن کا ایک نمونہ دیا گیا ہے۔ جن کے اردو میں ترجمے کیے گئے ہیں۔ آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ زیر نظر کتاب کی پچھلی اکائیوں میں ترجمے کے فن کے مختلف پہلوؤں سے جو نظری بحث کی گئی ہے اس کی روشنی میں نمونے کے ترجموں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ان کا متعدد بار غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے اندر سوئے ہوئے مترجم کو جگانے کی کوشش کریں گے نیز نمونے کے ترجموں کی طرز پر مختلف قسم کے موضوع و مواد کے ترجمے کی مشق کرنے کی کوشش کریں گے اور ایک معیاری مترجم بننے کی کوشش میں آپ کی کامیابی ہی میں زیر نظر کتاب کی کامیابی مضمر ہے اس کے ساتھ ہی اطلاعاً یہ عرض ہے کہ سالانہ امتحان میں انگریزی اور ہندی کے اقتباسات اردو میں ترجمے کے لیے دیے جاسکتے ہیں۔

ایک اچھا مترجم بننا نہایت مشکل کام ہے' تاہم ہر مشکل کام میں کامیابی از خود عظیم طمانیت اور معاوضہ ہے۔ ایک اچھا مترجم بننے کا مطلب دو زبانوں پر عبور' دو تہذیبوں پر عبور' دو نثری اور شعری روایتوں پر عبور اور اپنی سرشت میں اصل زبان و مواد' تہذیب اور نثری و شعری روایت کو تحلیل کر کے خمیر اٹھانا اور باز تخلیق کرنا ہے۔ ایک معیاری اور مخلص مترجم کو کسی بھی فن پارے یا تصنیف کا کم از کم تین مرتبہ غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔ پہلی مرتبہ شروع سے آخر تک زیر نظر متن کا غائر مطالعہ کرے۔ دوسری مرتبہ غائر مطالعہ کرتا جائے اور مشکل الفاظ کو نشان زد کرتا جائے۔ تیسری مرتبہ غائر مطالعہ کرتے وقت نشان زد کیے گئے مشکل الفاظ کے لغت میں دیے گئے تمام مترادفات کو حاشیے میں درج کرتا جائے۔ بالکل آخر میں غائر مطالعہ کرتے وقت اس بات کا تعین کرتا جائے کہ کون سا معنی موزوں ترین ہے۔ اس کے بعد بسم اللہ کرے۔ زیر نظر اکائی کے تمام حصوں کا ترجمہ متذکرہ بالا باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔

15.2 سُدھا مورتی کی ایک کہانی : On Human Foibles

Many years ago, I was working as a Chief System Analyst. The job involved a lot of travelling for project work, sometimes to a small village, sometimes to a neighbouring city. Often, work compelled me to travel on holidays too.

One particular Friday, I was looking forward to a long weekend. The coming Monday was a holiday for some festival and taking advantage of the long weakend, we sisters had decided to meet at our grandmother's house in our native Shiggaon.

I was waiting for Friday to end. Sunday was a full-moon night and so a special moonlight dinner had been arranged for us. Moonlight dinners are favourite family occasions for the people of north Karnataka. We were all in a hurry to wind up for the day when I heard someone calling out, "Kulkarni! Can you come to my office."

My heart sank. It was my boss (calling me by my maiden name), and judging by his tone, the matter was urgent. Even though I was on my way out of the office, I stopped to enquire what he wanted.

"Sorry for disturbing you, but your service is required urgently," he said, handing over a letter for me to read. It said that I had to visit a project site within the next two days.

"No problem at all, sir, I shall attend to it," I said. I was used to working throughout the day and throughout the week, so cancelling my travel plans didn't bother met at all. My work gave me more happiness than any celebration or outing.

The next morning, I left for the town where the project was based. By the time I reached the town it was already noon, but it looked as though the day had just begun there. It was a small town. The shops were just opening and folks were setting our to work.

As I was walking from the bus stand, a young lad hurried towards me and said, "Sorry, I am late, ma'am. I was supposed to receive you at the bus stop." He was our client's representative and had come to take me to their office.

We reached the office after a few minutes' walk. It was a small office. Though by no means modern, it was neatly furnished with some old but reconditioned furniture, everything in its right place. They were all waiting for me and I felt nice as I sat down. The cool buttermilk they offered me was most refreshing.

Before beginning my work, I was introduced to a neatly dressed young man who was supposed to coordinate with me. He was quite well-mannered and seemed very confident and bright. I was pleasantly surprised to see the good quality of his work. It had a professional touch. I was told that he was the most well-read man in that town.

He had documented his work very well and efficiently. Because of this, our job was completed sooner than expected. I did not forget to compliment him when I was about to leave. He went pink at my appreciation and insisted that I join him for tea at his residence close by.

His house was also well kept. By tea-time, his conversation had taken on a personal note. He talked about his parents, his early job. He introduced his wife and two-year-old son. He spoke with admiration about his wife's cooking, her beautiful voice, her achievements during her school days. Then he called for his son who immediately came in and stood by my side with folded arms, almost as if he was trained to do so. The moment the father asked him to recite a rhyme, he started to do so in his clear, childish voice.

I acknowledged his recitation by nodding my head. The father did not seem satisfied with such nominal recognition of his son's talents. He asked the child to identify all the letters of the alphabet from an old chart hanging on the wall. These are things that children usually hate to do, yet parents go on forcing them. Poor kids!

The display in my host's house went on for nearly half an hour until the child began displaying signs of restlessness and irritability. The mother, wisely, took the child away to the kitchen, hopefully to reward him with a chocolate or a biscuit.

I realized that the father was expecting to hear some compliment from me about his son. "Your child is very bright for his age," I said.

"Naturally! I have trained him like that from childhood, " he said with pride. It sounded like he had been training his two-year-old child from the day of his birth!

"So you feel that it is only by training that a child can become bright like this?" I asked.

"No, no. heredity and genes also play an important role. My son has taken after me." The man's face shone with pride and I was curious to hear more. After all, I had an hour to spare before my bus departed.

"You must have been a good student in your college days?" I probed.

"Yes, I was. I have always been a first ranker in my school and college days," he replied, clearly appreciative of himself.

"Where did you graduate from?" I was eager to hear more.

"I graduated from BVB Engineering College, Hubli."

I became alert. I knew Hubli. I knew the college. "Which year?" I asked.

"In 1972, with the first rank."

"Did you secure the gold medal also?" I persisted.

"Yes, I did obtain the gold medal for that year," he said glowing with self-satisfaction.

"By this time I was able to size him up quite clearly. And what I saw saddened me.

"May I see your gold medal?" I requested.

Suddenly, the mood in the room changed. "Why? Don't you believe me?" His voice was uncertain.

"No, I just want to see the gold medal you secured in 1972," I repeated.

"It is very precious to me and so I have kept it in a bank locker," he said.

I did not give up. "Which bank?"

"Why should I give you such details?" he demanded, annoyed with my persistence.

Everything was clear by now. I think it was clear to him too. The warmth of hospitality was over. It was time for my bus and time for me to go.

While walking towards the door, I told him, "I don't have to know any of the details about your bank or gold medal. It is none of my business. But I am sure that the medal connot be with you."

"How can you say that? And that too so confidently?" He was quite angry by now.

"Because," I told him sadly, "I secured that gold medal in 1972 and only one gold medal is awarded each year."

He was stunned by this revelation and stared blankly at me. I looked at him and asked gently, "You are bright. You are good in your job. Why do you have to lie? What do you gain?"

The click of the front door shutting behind me was the only reply I received.

(A story from the book "Wise and other Wise" written by Suda Murty)

Check Your Progress

1. Did Kulkarni choose partying or work?
2. What were personal qualities in the host of Kulkarni?

15.3 On Human Foibles کا ترجمہ: ''بشری خامیاں''

برسوں پہلے، میں بطور چیف سسٹم انالسٹ کے کام کر رہی تھی۔ اس ملازمت میں، پروجیکٹ کے کام کے لیے اچھی خاصی مسافت شامل تھی، کبھی ایک چھوٹے گاؤں کا، تو کبھی پڑوس کے شہر کا سفر کرنا پڑتا۔ اکثر کام کا دباؤ چھٹیوں میں بھی سفر کرنے کے لیے مجبور کرتا۔

جمعے کے روز ایک لمبے اختتام ہفتہ (Weekend) کے لیے میں تیار ہو رہی تھی۔ آنے والے دوشنبہ کے دن کسی تہوار کی چھٹی تھی۔ اور لمبے اختتامِ ہفتہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم بہنوں نے اپنے آبائی وطن شیگاؤں میں اپنی دادی کے گھر پر ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جمعے کے دن کے اختتام کا میں انتظار کر رہی تھی۔ اتوار پورے چاند کی رات تھی اور اس لیے چاند کی روشنی میں ہمارے لیے ایک خصوصی عشائیے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چاند کی روشنی میں عشائیے کا اہتمام شمالی کرناٹک میں اہل خانہ کے اکٹھا ہونے کا پسندیدہ موقع ہوتا ہے۔ ہم لوگ دن کا کام جلدی جلدی ختم کر ہی رہے تھے کہ میں نے سنا کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔ ''کلکرنی! کیا آپ میرے دفتر میں آ سکتی ہیں۔''

میرا دل ڈوب گیا۔ یہ میرے آجر (Employer) تھے، جو میرے کنوارے نام سے مجھے بلا رہے تھے اور ان کے لہجے کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ معاملہ فوری توجہ کا متقاضی تھا۔ حالانکہ میں آفس سے باہر نکل رہی تھی لیکن میں رک گئی یہ پتا لگانے کے لیے کہ وہ کیا چاہتے تھے۔

''معاف کرنا تمہیں پریشان کر رہا ہوں لیکن تمہیں ایک ضروری کام کرنا ہے'' ایک خط پڑھنے کے لیے میرے حوالے کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ آئندہ دو دنوں کے اندر اندر مجھے ایک پروجیکٹ کے جائے وقوع کو دیکھنے جانا تھا۔

''بالکل کوئی مسئلہ نہیں، حضور والا، میں کروں گی'' میں نے کہا۔ میں پورے دن اور پورے ہفتے کام کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس لیے اپنے سفر کے منصوبے کو رد کرنے سے مجھے قطعاً کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ مجھے کسی جشن یا گھر کے باہر تفریحی پروگرام کے مقابلے میں اپنے کام سے زیادہ خوشی میسر ہوتی تھی۔

اگلی صبح، میں اس قصبے کے لیے روانہ ہوگئی، جہاں یہ پروجیکٹ واقع تھا۔ جس وقت میں قصبے میں پہنچی دوپہر ہو چکی تھی، لیکن ایسا لگا کہ جیسے دن ابھی شروع ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ دوکانیں ابھی کھل رہی تھیں اور عوام الناس اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔

بس اسٹینڈ سے میں پیدل چل رہی تھی کہ ایک نوجوان لڑکا میری طرف جلدی سے بڑھا اور کہا۔ ''معاف کیجیے گا مادام مجھ سے تاخیر ہوگئی۔ مجھے بس اسٹاپ پر ہی آپ کا استقبال کرنا چاہیے تھا۔'' وہ ہمارے گاہک کا نمائندہ تھا اور مجھے اپنے دفتر لے جانے کے لیے آیا تھا۔

کچھ منٹ پیدل چلنے کے بعد ہم دفتر پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا آفس تھا۔ حالانکہ کسی بھی طرف سے ماڈرن نہیں تھا لیکن یہ کچھ پرانے تاہم مرمت کیے ہوئے فرنیچر سے باقاعدگی کے ساتھ آراستہ تھا۔ ہر چیز اپنی صحیح جگہ پر رکھی تھی۔ دفتر کے سبھی لوگ میرا انتظار کر رہے تھے اور وہاں بیٹھتے ہوئے مجھے بڑا بھلا لگا۔ ٹھنڈی لسی جوان لوگوں نے مجھے پیش کی فرحت بخش تھی۔

قبل اس کے کہ میں اپنا کام شروع کروں میرا تعارف صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان سے کرایا گیا جسے میرے ساتھ موثر عمل کے لیے باہم رابطے کا کام کرنا تھا۔ وہ بہت خوش اخلاق تھا اور بہت پراعتماد اور ذہین لگا۔ اس کے معیاری کام کو دیکھ کر مجھے خوش گوار تعجب ہوا۔ اس کے کام میں پیشہ وارنہ مہارت کا احساس ہوتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس قصبے میں وہ سب سے زیادہ وسیع المطالعہ آدمی تھا۔

اس نے اپنے کام کی دستاویز بڑی مہارت سے تیار کی تھی۔ جس کی وجہ سے ہمارا کام توقع کے برخلاف جلدی ختم ہوگیا۔ جب میں الوداع کہنے والی تھی تو اس کی تعریف کرنا نہیں بھولی۔ میری تعریف پر وہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس نے زور دیا کہ میں نزدیک ہی اس کے گھر پر اس کے ساتھ چائے نوش کروں۔

اس کا گھر بھی اچھی حالت میں تھا۔ چائے کے وقت تک اس کی گفتگو ذاتی رنگ اختیار کر چکی تھی۔ اس نے اپنے والدین اور اپنی شروع کی نوکری کے بارے میں بات چیت کی۔ اس نے اپنی شریک حیات اور دو سال کے بیٹے کا تعارف کرایا۔ اس نے اپنی بیوی کے اسکول کے دنوں کی کامیابیوں، اس کی دل کش آواز اور کھانا پکانے کی مہارت کے لیے تعریفی انداز میں بات کی۔ اس کے بعد اس نے اپنے بیٹے کو بلایا جو فوراً اندر آیا اور اپنی بانہوں کو سینے پر باندھ کر میرے بازو میں ایسے کھڑا ہوگیا جیسے اسی طرح کی تربیت دی گئی ہو۔ جوں ہی اس کے باپ نے اس سے نظم سنانے کے لیے کہا اس نے اپنی صاف اور بچکانی آواز میں سنانا شروع کر دیا۔ میں نے اپنا سر ہلا کر اس کی نظم سرائی کا اعتراف کیا۔ باپ اپنے بیٹے کی صلاحیت کے برائے نام اعتراف سے مطمئن نہیں لگا۔ اس نے دیوار سے لٹک رہے پرانے جدول سے تہجی کے تمام حروف کو پہچاننے کے لیے بچے سے کہا۔ یہی چیزیں ہیں جنہیں کرنا بچے عام طور پر سخت ناپسند کرتے ہیں پھر بھی والدین انہیں مجبور کرتے رہتے ہیں۔ لاچار بچے!

میرے میزبان کے گھر میں یہ مظاہرہ تقریباً آدھے گھنٹے تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ بچہ بے چینی اور چڑھ کے آثار ظاہر کرنے لگا۔ ماں ہوشیاری سے بچے کو شاید چوکلیٹ یا بسکٹ بطور انعام دینے کے لیے باورچی خانے کی طرف لے گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ باپ اپنے بچے کے بارے میں مجھ سے کچھ تعریف سننے کی توقع کر رہا تھا۔ ''آپ کا بچہ اپنی عمر کے اعتبار سے کافی ذہین ہے۔'' میں نے کہا۔

''بیشک! میں نے اس کی تربیت بچپن ہی سے اس نہج پر کی ہے۔'' اس نے فخریہ کہا۔ ایسا لگا کہ اس نے اپنے دو سال کے بچے کی تربیت اس کی پیدائش کے دن سے ہی شروع کر دی تھی۔''

''کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ صرف تربیت ہی سے بچے ذہین ہو سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''قطعی نہیں۔ موروثی خصوصیات اور نسبے (Genes) بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ میرا بیٹا مجھ سے مشابہ ہے۔'' اس آدمی کا چہرہ فخر سے چمک اٹھا اور میں مزید سننے کے لیے خواہش مند تھی۔ کیوں کہ میری بس چھوٹنے میں ایک گھنٹے کا وقت تھا۔

''آپ اپنے کالج کے دنوں میں یقیناً اچھے طالب علم رہے ہوں گے؟'' میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں' میں تھا۔ میں نے اپنے اسکول اور کالج کے دنوں میں ہمیشہ پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔'' اس نے جواب دیا' ظاہری بات ہے۔ اس میں اس کی تعریف مضمر تھی۔

''آپ نے ڈگری کہاں سے حاصل کی؟'' میں مزید سننے کی خواہش مند تھی۔''

''میں نے بی وی بی انجینئرنگ کالج ہبلی سے ڈگری حاصل کی۔''

میں چونکی۔ میں ہبلی کو جانتی تھی۔ کالج کو جانتی تھی۔

''کس سال؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی پوزیشن کے ساتھ میں نے 1972 میں ڈگری حاصل کی۔'' کیا آپ نے سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا؟ میں ڈٹی رہی۔

''ہاں' میں نے اس سال کا سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا' خود اعتمادی سے تمتماتے ہوئے اس نے کہا۔

اب میں اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں تھی اور جو میں نے دیکھا اس سے میں دکھی ہوئی۔

''کیا میں آپ کا سونے کا تمغہ دیکھ سکتی ہوں؟'' میں نے گزارش کی۔ اچانک کمرے کا ماحول بدل گیا۔ ''کیوں؟ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں؟'' اس کی آواز غیر یقینی تھی۔

''نہیں۔ میں صرف اس سونے کے تمغے کو دیکھنی چاہتی ہوں جسے آپ نے 1972 میں حاصل کیا تھا۔'' میں نے دہرایا۔

''یہ میرے لیے نہایت بیش قیمت ہے اور اس لیے میں نے اسے بینک لاکر میں رکھ دیا ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے ہار نہیں مانی۔ ''کس بینک میں؟''

''یہ ساری تفصیل میں آپ کو کیوں دوں؟'' اس نے مطالبے کیا' میرے اصرار سے وہ پریشان تھا۔

اب ساری چیزیں واضح ہو چکی تھیں۔ میں سمجھتی ہوں یہ اس پر بھی واضح ہو چکا تھا۔ میزبانی کا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا۔ میری بس کا وقت ختم ہو چکا تھا اور میرے جانے کا بھی وقت ہو چکا تھا۔

دروازے کی طرف چلتے وقت میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے آپ کے بینک یا سونے کے تمغے کے بارے میں کسی تفصیل کو نہیں جاننا ہے۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تمغہ آپ کے پاس نہیں ہو سکتا۔''

''آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ اور وہ بھی اتنی خود اعتمادی کے ساتھ؟'' وہ اب بالکل ناراض تھا۔

''کیوں کہ' میں نے اس سے دکھی ہو کر کہا۔ ''1972 میں اس سونے کے تمغے کو میں نے حاصل کیا تھا اور ہر سال صرف ایک سونے کا تمغہ بطور انعام دیا جاتا ہے۔''

اس انکشاف سے وہ دم بخود رہ گیا اور خالی خالی آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور ملائمت سے کہا۔ ''تم ذہین ہو تم

اپنے کام میں اچھے ہو۔تم جھوٹ کیوں بولتے ہو؟اس سے تمہیں کیا حاصل ہے؟"

میرے پیچھے صدر دروازے کے بند ہونے کی آواز ہی واحد جواب تھا جو مجھے ملا۔

(مذکورہ بالا انگریزی کہانی کا "بشری خامیاں" کے عنوان سے ترجمہ)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. 1972ء میں طلائی تمغہ کسے ملا تھا؟
2. اس کہانی سے آپ نے کیا سبق سیکھا؟
3. کیا ادبی ترجمے پر بامحاورہ ترجمے کی تکنیک کا اطلاق ہوتا ہے؟

15.4 Great Poet Mirza Ghalib کے زیرعنوان غالب کی سوانح عمری کا ایک حصہ

Ghalib is universally acknowledged to be one of the giants of Indian literature and can truly be considered as precursor of Indian renaissance. His poetry depicts the best, the most serene and the most exalted emotions of the humanity in general. It also creates a human characters which have the courage of conviction to stand up to society, the powers that be and above all the God.

Mirza Ghalib was born on 27th December, 1797 in a prosperous family of Akbarabad (Agra). During the reign of Shah Alam, his grandfather was granted the area of Pehnasu as Jagir. His maternal grandfather was having several villages in his Jagir. His father Mirza Abdullah Baig Khan was a swordsman par excellence. For a long time, he served under the rulers of Lucknow and Hyderabad and later he joined the army of Bakhtawar Singh, the Raja of Alwar and was killed in a battle while fighting for him. Mirza Abdullah Baig Khan had two sons, Mirza Asadullah Khan and Mirza Yusfu Khan and a daughter, Chhoti Khanam.

Mirza Asadullah Khan (later known as 'Ghalib') was the eldest. When Ghalib was of five, his father left for heavenly abode. So his uncle, Mirza Naseerullah Baig, the Subedar of Agra took him under his care. Unfortunately, his uncle also died, when Ghalib was nine years old. Thus, he was sent to his maternal grandfather's house who owned substantial property in Agra. In recognition of meritorious, services, rendered by late Mirza Naseerullah Baig, his heirs were awarded pension from the government in which Ghalib's share was seven hundred rupees annually. This pension was stopped after the Sepoy Mutiny of 1857.

At the age of thirteen, Ghalib was married to Umrao Jan Begum, the daughter of a Nawab of Delhi, named Illahi Bakhsh Khan 'Maroof". After his marriage, Ghalib settled in Delhi permanently and was popularly known as 'Mirza Naushah'. Legend has it that he was one of the most handsome youth of Delhi of his time.

Traditionally, Ghalib belonged to a family of warriors, but he earned his name and fame through his writings. He had a flair for poetry since his childhood and started writing poems when he was barely tweleve years old. In the beginning, he followed the

poetic style of 'Bedil'. He himself writes, since the age of fifteen, I have been writing prose and poetry just the way the angel and devil note over deeds and misdeeds (Letter to Qadar Bilgrami). At another place, he writes "I started writing at the age of fifteen and wrote whatever came to my mind upto the age of twenty-five. In ten years it piled up to a collection. Finally when realization dawned upon me, I threw away may entire writings except for ten or fifteen couplets to retain as a specimen of my early writings for the present collection" (Letter to Abdur Razzaq 'Shakir'.)

Though Ghalib came to Delhi from Akbarabad but had no permanent source of income except the government pension. In a sense, this income was sufficient for any person with moderate living standard but his aristocratic way of life found it insufficient. It was very difficult for him to change his extravagant way of life. To add to this, his wife also belonged to a benevolent Nawab family like that of Ilahi Bakhsh. Thus, it was very natural, his pension was grossly inadequate to meet their ends. His younger brother, who came with him to Delhi and was very dear to him suffered bouts of insanity and Ghalib had to bear the burden of responsibilities as well.

While struggling with the complexities of proverbial poverty trap, Ghalib was told that he was not getting the full pension from the government, which was rightfully his. So, he went to Calcutta to file a suit regarding his pension and stayed there for two years. But his efforts bore no fruits.

An often quoted incident bears testimony to his characteristic egoistic nature, his self-esteem and the feudal etiquette, which was so dear to him. It is said that on hearing about Ghalib's intellectual capabilities and his legendary command over Persian language, James Thomson, Secretary to British government at that time decided to appoint him as a teacher of Persian in Delhi College. He invited Ghalib at his residence for this appointment. Ghalib went to his bungalow in a Palki and sent the message about his arrival. Thomson immediately sent the word to let him in. But Ghalib remained at the gate in a hope that Saheb himself would come to receive him personally. Knowing the situation, James Thomson came out and explained that a Ghalib had come there for a job, the protocol of the Governor's Durbar did not apply to him. Ghalib said that he was under the impression that the government's job would add to his stature, but it was contrary to his expectations. Thomson argued that he was bound by the procedures. To which Ghalib replied that in this case, he must be excused from this service. By saying this, he turned down the lucrative job of one hundred rupees per month.

Mirza Ghalib lived in an epoch, which was full of strife and political uncertainties. British influence was systematically increasing and the great Mugal power was on the verge of imminent collapse.

The last Mughal emperor, Bahadur Shah Zafar was a leading poet and patron of art and literature. He entrusted Mirza Ghalib upon the responsibility of writing the history of Mughal dynasty and gave him tiltles of 'Najmuddaulah', 'Debeerul Mulk' and 'Nizam-e-Jung' and also fixed a monthly stipend for him. The first volume of this history

entitled, 'Mehr-e-Neemroz' was published in 1857. In the same year, famous poet Sheikh Ibrahim 'Zauq' who was the emperor's mentor for his poetry and was known as 'Ustad-e-Sheh (King's teacher) died. After his death, this position was also awarded to Ghalib. But the second volume of this history for which Ghalib had proposed the name, 'Mah-e-Neem Mah' could not be written due to the changing political scenario. And then the simmering revolution of 1857 erupted, during which the world famous city of Delhi became 'deceased Delhi' in the words of 'Hali'. Ghalib was then at sixty.

The resulting chaos in the aftermath of the struggle of 1857 posed repeated tragic losses to Ghalib, like the stipend from Durbar of Bahadur Shah Zafar was stopped, his pension stopped due to his closeness with the emperor. So he had to bear the brunt of unending poverty and the horror of a bleak future ahead. His miseries were compounded, when there was massacre and bloodbath everywhere after conquest of Delhi by the rampaging British troops. His wife's ornaments and other family valuables were buried in a safe place that after normalcy these could be retrieved. But the victorious sepoys found the treasure and took away everything.

During this interregnum his younger brother Mirza Yusuf died and the grief-stricken Ghalib could not even attend the funeral due to the incessant bloodbath in the city. In the ensuing chaos and anarchy his only sister's eldest son, Mirza Ashoor Baig with his son adolescent grandson became targets of an English man's bullets. Most of his friends and relatives were killed, some were hanged and others followed in the mass exodus. None were left to share his grief and sorrow.

(A part from brief biography entitled "Great poet Mirza Ghalib" published on the occasion of 200th Birth Anniversary)

Check Your Progress

1. What kind of familial background Ghalib had?
2. Was the age of Ghalib full of strife and political uncertainties?

15.5 Great Poet Mirza Ghalib کا ترجمہ : ''عظیم شاعر مرزا غالب''

مرزا غالب کا شمار بلاشبہ ہندوستانی ادب کی عظیم ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم انہیں ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا نقیب تصور کر سکتے ہیں۔ غالب کا فن نہ صرف یہ کہ بہترین جمالیاتی اقدار کا حامل ہے بلکہ وجدآ گیں صوفیانہ احساسات اور عظیم ترین انسانی جذبوں کا امین بھی ہے ساتھ ہی ساتھ فکرِ غالب ایک ایسے انسانی پیکر کی تخلیق کرتی ہے جس کے اندر نہ صرف سماجی وسیاسی نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے بلکہ خدائی معاملات پر بھی بے باکانہ نظر ڈالنے کا حوصلہ ہے۔

مرزا غالب کی ولادت 27 دسمبر 1797 کو اکبر آباد (آگرہ) کے ایک خوشحال خاندان میں ہوئی۔ ان کے دادا کو شاہ عالم کے زمانے میں پہناسو کا علاقہ جاگیر میں ملا تھا۔ نانا کی جاگیر میں بھی متعدد دیہات تھے۔ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں' صاحب سیف تھے۔ وہ ایک عرصے تک لکھنؤ اور حیدرآباد کی سرکاروں سے متعلق رہنے کے بعد الور کے راجہ بختاور سنگھ کے پاس آ گئے اور ان کی طرف سے ایک جنگ میں مارے گئے۔ عبداللہ بیگ خان کے دو بیٹے (مرزا اسداللہ خان اور مرزا یوسف خان) اور ایک بیٹی (چھوٹی خانم) تھی۔

مرزا غالب بڑے بیٹے تھے۔ والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف پانچ سال تھی لہٰذا ان کی پرورش کی ذمے داری مرزا نصر اللہ بیگ نے قبول کی، جو ان کے حقیقی چچا تھے اور اکبر آباد کے صوبے دار تھے۔ ابھی غالب نو ہی برس کے تھے کہ چچا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ اور وہ اپنی ننھیال میں آ گئے۔ ان کے نانا کی آگرہ میں بھی بڑی املاک تھی۔ چچا کے انتقال پر ان کی خدمات کے صلے میں سرکار سے وارثوں کے لیے جو پنشن مقرر ہوئی اس میں غالب کے حصے میں سات سو روپے سالانہ آئے (اور جو 1857ء میں بند کر دیے گئے تھے)۔

تیرہ برس کی عمر میں غالب کی شادی امراؤ بیگم کے ساتھ ہوگئی۔ جو دہلی کے ایک خاندانی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں۔ شادی کے بعد مرزا غالب مستقل طور پر دہلی آ گئے اور مرزا نوشہ کہلائے۔ کہتے ہیں یہاں ان کا شمار دہلی کے خوبصورت اور وجیہہ نوجوانوں میں ہوا کرتا تھا۔

غالب کا آبائی پیشہ بیشک سپہ گری تھا لیکن ان کی تمام تر عزت اور مرتبہ کا ذریعے خامہ فرسائی ہی تھا۔ شعر گوئی کا شوق انہیں بچپن ہی سے تھا۔ اپنے وطن اکبر آباد میں انہوں نے گیارہ برس کی عمر میں ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ پہلے انہوں نے بیدلؔ کی طرز اپنائی۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ پندرہ برس کی عمر سے کاغذ، نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں (خط بنام قدر بلگرامی)۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس تک کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔ (مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر)۔

غالب اکبر آباد سے دہلی تو آ گئے لیکن پنشن کے علاوہ ان کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ ویسے سوچا جائے تو یہ آمدنی اتنی ضرور تھی جس میں آسانی سے گذر بسر کی جا سکتی تھی۔ لیکن غالب کی پرورش اور ذہنی نشو و نما جس جاگیر دارانہ ماحول میں ہوئی تھی اس میں شاہ خرچی کو بھی بڑا دخل تھا۔ ان موروثی اثرات کا یکلخت زائل ہونا ممکن نہ تھا۔ دوسری طرف ان کی بیوی امراؤ بیگم بھی الٰہی بخش جیسے فیاض نواب کی بیٹی تھیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں صرف پنشن پر گذر اوقات نہیں ہو سکتی تھی۔ شومئی قسمت سے غالب کے چھوٹے بھائی جنہیں وہ اپنے ساتھ دہلی لے آئے تھے اور عزیز رکھتے تھے، دیوانگی کے شکار ہوگئے اور ان کی ساری ذمے داریاں بھی غالب کے سر آ گئیں۔

مرزا غالب اپنی تنگدستی اور مفلسی سے نبرد آزما تھے۔ اسی اثناء میں انہیں یہ پتا چلا کہ گورنمنٹ نے ان کے خاندان کے لیے جو پنشن مقرر کرائی تھی وہ انہیں پوری نہیں ملتی لہٰذا کلکتہ جا کر پنشن کی بابت استغاثہ پیش کیا اور اس سلسلے میں تقریباً دو برس وہاں قیام بھی کیا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

مرزا غالب کی خودداری، عزت نفس اور جاگیر دارانہ اقدار کے پاس ولحاظ کے ضمن میں ایک قصہ بہت مشہور ہے وہ یہ ہے کہ غالب کی علمی استعداد اور فارسی دانی کا شہرہ سن کر حکومتِ ہند کے سیکریٹری جیمس ٹامسن نے دلی کالج میں فارسی مدرس کی اسامی پر تقرر کی غرض سے انہیں طلب کیا۔ مرزا غالب پالکی میں سوار کر ان کی جائے قیام پر پہنچے اور اپنی آمد کی اطلاع کرائی تو ٹامسن نے فوراً ہی بلوالیا مگر یہ اس امید پر باہر ہی ٹھہرے رہے کہ صاحبِ موصوف خود ان کے استقبال کے لیے آئیں گے۔ جب ٹامسن کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ باہر آئے اور سمجھایا کہ اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں لہٰذا دربارِ گورنری والے سلوک کے مستحق نہیں، غالب نے کہا میں تو یہ سمجھا تھا کہ گورنمنٹ کی ملازمت میرے اعزاز و توقیر میں اضافے کا باعث ہوگی لیکن یہاں تو معاملہ ہی اس کے برعکس ہے، صاحب نے کہا "ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔" غالب نے معذرت کی، تو بندے کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر سو روپے ماہوار کی ایک بڑی آسامی سے دستکش ہو کر اپنے گھر چلے آئے۔

مرزا غالب نے ایک ایسے دور میں زیست کی، جو سیاسی اعتبار سے تاریخ ہند کا بے حد نازک اور پر آشوب دور تھا۔ پورے ملک پر انگریزوں کا تسلط دن بدن بڑھتا چلا جا رہا تھا اور عظیم مغلیہ سلطنت دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر اپنے عہد کے ایک اہم شاعر اور علم و ادب کے قدر دان تھے۔ انہوں نے مرزا غالب کو خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کے کام پر معمور کیا۔ اور "نجم الدولہ"۔ "دبیر الملک"۔ "نظام جنگ" کے خطاب سے سرفراز کیا نیز ان کے لیے ماہوار مشاہرہ بھی مقرر کیا۔ اس تاریخ کا پہلا حصہ "مہر نیم روز" نام سے 1857ء میں منظر عام پر آیا۔ اسی سال شیخ ابراہیم ذوق کی وفات ہوئی جو بادشاہ کے اشعار کی اصلاح کیا کرتے تھے اور استاد شاہ کہلاتے تھے۔ ذوقؔ کے بعد یہ مرتبہ بھی مرزا غالب کو حاصل ہوگیا، لیکن مذکورہ تاریخ کا دوسرا حصہ جس کا نام غالبؔ نے "ماہ نیم ماہ" تجویز کیا تھا بدلتے

ہوئے سیاسی حالات میں لکھا نہیں جا سکا۔ اور پھر 1857ء کا انقلاب برپا ہو گیا جس نے عالم میں انتخاب شہر دہلی کو حالی کے لفظوں میں ''دہلی مرحوم'' بنا دیا۔ اس وقت غالب کی عمر ساٹھ برس تھی۔

اس انقلاب نے انہیں پے در پے کئی صدمات و مشکلات سے دوچار کیا۔ ایک تو بہادر شاہ کے دربار سے ملنے والا مشاہرہ بند ہو گیا۔ دوسرے شاہی دربار سے تعلق کی پاداش میں پنشن موقوف ہو گئی جس کے نتیجے میں انہیں بے انتہا پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جب انگریزی افواج کی فتح کے بعد شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو گھر میں بیوی کے جو زیورات اور خاندانی قیمتی اشیا تھیں وہ محفوظ مقام پر اس خیال سے دبا دی گئی تھیں کہ بعد میں کھود کر نکال لی جائیں گی مگر انہیں فتح یاب فوجیوں نے نکال لیا۔

ان ہی دنوں غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا اور غم زدہ غالب اس کے جنازے کو کاندھا بھی نہ دے سکے۔ اسی انقلاب کے دوران غالب کی اکلوتی بہن چھوٹی خانم کا بڑا بیٹا مرزا عاشور بیگ اپنے نوجوان بیٹے سمیت ایک انگریز کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ علاوہ ازیں بے شمار احباب و اقارب مارے گئے، چند ایک پھانسی پر چڑھا دیے گئے اور بہت سے دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ کوئی مونس و غم خوار نہ رہا۔

(عظیم شاعر مرزا غالب کے دو صد سالہ جشن ولادت کے موقعے پر شائع شدہ مختصر سوانح عمری کے ایک حصے کا اردو ترجمہ)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. 1857ء کے انقلاب کا غالب پر کیا اثر پڑا؟
2. غالب کے آخری ایام کس طرح سے گزرے؟

Philosophy, Education and Their Inter-Dependence 15.6

The inter-dependence of philosophy and education is clearly seen from the fact that the great philosophers of all times have also been great educators and their philosophy is reflected in their educational systems. This inter-dependence can be better understood by analyzing the implications of philosophical principles in the field of education. Before analyzing the educational implications of general philosophy, we should know the concept of "Philosophy" and "Education". Each one of us has a personal philosophy, which we apply consciously and unconsciously in our daily life. Each philosophy reflects a unique view of what is good and what is important. In this sense, philosophy is the system of beliefs about life. The literal meaning of philosophy is the love of wisdom which is derived from the Greek word "Philos" (Love) and "Sophia" (Wisdom). Wisdom does not merely mean knowledge. It is a continuous seeking of insight into basic realities - the physical world, life, mind, society, knowledge and values.

Education does not mean mere schooling. To become educated is to learn to become a person. Etymologically, 'education' is derived from "educare" which means 'to lead out' or "to draw out". In a broad sense, education refers to an act or experience that has a formative effect on the mind, character or physical ability of an individual. Education in this sense never ends, we truly learn from experience throughout our lives. Education and philosophy are inseparable because the ends of education are the ends of philosophy i.e. wisdom; and the means of philosophy is the means of education i.e. inquiry, which alone can lead to wisdom. Any separation of philosophy and education inhibits inquiry and frustrates wisdom.

Education involves both the world of ideas and the world of practical activity; good ideas can lead to good practice and good practices reinforce good ideas. In order to behave intelligently in the educational process, education needs direction and guidance, which philosophy can provide. Hence, philosophy is not only a professional tool for the educator but also a way of improving the quality of life because it helps us to gain a wider and deeper perspective on human existence and the world around us.

The chief task of philosophy is to determine what constitutes good life whereas the main task of education is how to make life worth living. So philosophy and education are mutually re-constructive. They give and take from each other. Philosophy deals with the goals and essentials of good life while education provides the means to achieve those goals of good life. In this sense philosophy of education is a distinct but not a separate discipline. It takes its contents from education and its methods from philosophy. The process of philosophizing about education requires an understanding of education and its problems. Hence, we can say that philosophy of education is the application of philosophical ideas to educational problems. It is not only a way of looking at ideas but also of how to use them in the best way. Therefore, it can be said that philosophy is the theory while education is the practice. Practice unguided by theory is aimless, inconsistent and inefficient just as theory which is not ultimately translatable into practice is useless and confusing. In the words of Ross "philosophy is the contemplative side while education is the active side". Philosophy deals with the ends while education deals with the means and techniques of achieving those means. Educational philosophy depends on formal philosophy, because most of the major problems of education are in fact philosophical problems. Like general philosophy, educational philosophy is speculative, prescriptive, critical or analytic.

(A part from the B.Ed. book entitled Education and Society published by IGNOU)

Check Your Progress

1. What is the literal meaning of philosophy?
2. What is the relation between philosophy and education?

15.7 Philosophy, Education and Their Inter-Dependence کا ترجمہ :

''فلسفہ، تعلیم اور ان کا باہمی انحصار''

فلسفے اور تعلیم کا باہمی انحصار اس حقیقت سے بالکل واضح ہوتا ہے کہ ہر زمانے کے عظیم فلسفی عظیم تعلیم و تربیت کار بھی رہے ہیں اور یہ فلسفے ان کے تعلیمی نظاموں میں منعکس ہوئے ہیں۔ اس باہمی انحصار کو ہم تعلیم کے میدان میں فلسفیانہ اصولوں کے ذیلی مفاہیم و اشارے کا تجزیہ کر کے بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ عمومی فلسفے کے تعلیمی ذیلی مفاہیم کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہمیں ''فلسفے اور تعلیم'' کے تصور کا علم ہونا چاہیے۔ ہم میں سے ہر کسی کا ایک ذاتی فلسفہ ہوتا ہے۔ جس کا ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں شعوری یا لاشعوری طور پر اطلاق کرتے ہیں۔ ہر فلسفہ' کیا اچھا ہے اور کیا اہم ہے' کے غیر معمولی خیال کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح سے فلسفہ زندگی کے بارے میں عقائد کا نظام ہے۔ فلسفے کے لفظی معنی عقل و دانش سے محبت ہے' جو یونانی لفظ "Philos" (محبت)

اور "Sophia" (عقل و دانش) سے ماخوذ ہے۔ عقل و دانش سے مراد صرف علم ہی نہیں ہے۔ فلسفہ بنیادی حقیقتوں یعنی طبیعی دنیا' زندگی' دماغ و ذہن' معاشرہ' علم و معلومات اور اقدار میں بصیرت کی مسلسل تلاش کا عمل ہے۔

تعلیم سے مراد صرف اسکولی تعلیم و تربیت ہی نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب ایک شخص بننے کے لیے سیکھنا ہے۔ لفظ کی اصل یا مادے کی رو سے 'تعلیم' (Educare) سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی برآمد کرنے کے ہوتے ہیں۔ وسیع معنوں میں تعلیم سے مراد ایک عمل یا تجربہ ہوتا ہے' جو دماغ و ذہن' کردار یا فرد کی جسمانی اہلیت پر تشکیلی و تربیتی اثر رکھتا ہے۔ اس معنی میں تعلیم کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔ حقیقتاً ہم اپنی پوری زندگی اپنے تجربوں سے سیکھتے رہتے ہیں۔ تعلیم اور فلسفے کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ کیوں کہ تعلیم کے مقاصد فلسفے کے مقاصد یعنی عقل و دانش ہوتے ہیں اور فلسفے کا ذریعہ' تعلیم کا ذریعہ یعنی تحقیق و تفتیش ہیں جو واحد عقل و دانش تک رہنمائی کر سکتی ہے۔ فلسفے اور تعلیم میں کسی بھی طرح کی علاحدگی' تحقیق و تفتیش کے عمل میں حائل ہوتی ہے اور عقل و دانش کو ناکام بناتی ہے۔

تعلیم میں خیال و تصور کی اور عملی سرگرمی کی دونوں دنیائیں شامل ہوتی ہیں۔ اچھے تصورات و خیالات سے اچھی روایتیں شروع ہوتی ہیں اور اچھی روایتیں' اچھے خیالات و تصورات کو تقویت بخشتی ہیں۔ تعلیمی عمل میں ذہانت کے ساتھ برتاؤ کرنے کے لیے تعلیم کو سمت اور رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان ضرورتوں کی تکمیل فلسفے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا فلسفہ تعلیم و تربیت کار کے لیے نہ صرف پیشہ ورانہ آلہ ہوتا ہے' بلکہ معیارِ زندگی کو بہتر کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہوتا ہے' کیوں کہ اس سے انسانی وجود اور گردونواح کی دنیا کے بارے میں وسیع اور گہرا تناظر حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

فلسفے کا اہم ترین کام اس بات کا تعین کرنا ہوتا ہے کہ وہ کون سے تشکیلی اجزا ہیں' جو اچھی زندگی کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں' جب کہ تعلیم کا اہم کام یہ ہے کہ زندگی کو کس طرح سے قابلِ گزار (Worth-living) بنایا جائے۔ اس لیے فلسفہ اور تعلیم باہمی طور پر بازتعمیری (Re-constructive) ہوتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔ فلسفہ اچھی زندگی کے مقاصد اور بنیادی لوازمات سے بحث کرتا ہے۔ جب کہ تعلیم اچھی زندگی کے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ اس معنی میں تعلیم کا فلسفہ مختلف ہوتا ہے لیکن ایک علاحدہ شعبۂ علم نہیں ہوتا۔ بطور شعبۂ علم کے' تعلیم کا فلسفہ اپنا مواد تعلیم سے حاصل کرتا ہے اور اپنا طریقۂ کار فلسفے سے حاصل کرتا ہے۔ تعلیم کو فلسفیانہ رنگ میں رنگنے کا عمل تعلیم اور اس کے مسائل کی تفہیم کا تقاضا کرتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کا فلسفہ' تعلیمی مسائل پر فلسفیانہ خیالات و تصورات کا اطلاق ہے۔ یہ نہ صرف خیالات و تصورات پر غور و فکر کرنے کا ایک زاویہ ہے' بلکہ انہیں بہترین طریقے سے استعمال کرنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فلسفہ نظریہ ہے جب کہ تعلیم عمل ہے۔ نظریے کی رہنمائی سے محروم عمل بالکل اسی طرح سے لایعنی' بے مقصد' غیر مستقل اور بے اثر ہوتا ہے' جیسے وہ نظریہ جو بالآخر عمل میں نہیں بدلا جا سکتا' بیکار اور حیران کن ہوتا ہے۔ بقول راس (Ross) ''فلسفہ ذکر و فکر کا پہلو ہے' جب کہ تعلیم سرگرم پہلو ہے''۔ فلسفہ' مقاصد سے بحث کرتا ہے' جب کہ تعلیم ذرائع اور انہیں حاصل کرنے کی تکنیک سے بحث کرتی ہے۔ تعلیمی فلسفے کا انحصار رسمی فلسفے پر ہوتا ہے کیوں کہ تعلیم کے بیشتر بڑے بڑے مسائل درحقیقت فلسفیانہ مسائل ہیں۔ عام فلسفے کی طرح تعلیمی فلسفہ قیاس آرائی اور روایت پر مبنی ہوتا ہے' نیز تنقیدی یا تجزیاتی ہوتا ہے۔

(اگنو کی شائع کردہ بی۔ ایڈ کتاب ''تعلیم اور معاشرہ'' کے ایک حصے کا اردو ترجمہ)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. کیا علمی ترجمے کی قسم میں فلسفے اور تعلیم کے ترجمے کو رکھا جا سکتا ہے؟
2. کیا علمی ترجمے کے دوران سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کا ہوتا ہے؟

15.8 وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کا انگریزی میں صحافتی بیان : "Let's Fight Terror Together"

Special Correspondent

New Delhi : Prime Minister Manmohan Singh on Thursday asked the members of the

South Asian Association for Regional Cooperation to fight terrorism together.

"We have a collective stake in ensuring peace and security in the SAARC region because no investor will come to this region if there is no assurance of peace and security," he said, inaugurating the first SAARC Business Leaders' Conclave here.

"To imagine that anyone of us can pursue what economists call 'beggar-thy-neighbour' policies and thereby prosper is to delude oneself," Dr. Singh said, underlining that the SAARC business community had a vital stake in regional security and in victory in the war on terror.

"We must join hand to put our collective house in order as peace in the region will benefit all. Terrorism anywhere will hurt us all," he said. Business and trade would flourish in a secure environment.

"Terrorism by whatever name, has no place in civilized societies and its basic goal is to cause insecurity," Dr. Singh said.

In an interconnected region and a globalised world, the consequences of both poverty and insecurity were indivisible. "No country in this region can be secure when others are insecure and no country can insulate itself from the consequences of poverty and terrorism in any other country."

As envisioned at the 13th SAARC summit, the member countries would forge stronger links on the basis of renewed people-to-people ties, to help strengthen the region-wide partnership for prosperity, he said.

The Prime Minister allayed fears that free trade agreement could hurt smaller countries and called upon the SAARC leaders to move rapidly to meet the deadline for the South Asian Free Trade Agreement (SAFTA).

Dr. Singh said the need for implementing SAFTA could not be overemphasized. It was expected that its implementation would enhance trade in the region to $ 14 billion from $ 6 billion in the next two years.

Citing the high growth of bilateral trade between India and Sri Lanka, he said it dispelled fears on both sides that free trade would hurt business in smaller countries.

"This free trade agreement is a win-win agreement for both the countries and could be a model for similar agreements in the region," he said.

The Prime Minister hoped that the free trade agreement would help move towards the eventual goal of the South Asian Economic Union. "I do believe that just as regional integration is not antithetical to globalisation, it also does not hurt the broader interest of any member of a regional group."

Dr. Singh said all the member states were committed to an early resolution of outstanding issues under SAFTA and hoped that the ongoing negotiations would ensure that it was operationalised from January 1 next.

He also focused on the need for expanding the ambit of SAFTA to include trade in services, in addition to widening the scope of trade in goods, for it to emerge as an effective vehicle for growth and regional integration.

Voicing his concern that SAARC had not succeeded in exploiting the immense economic potential of the region, he said that even after two decades, "Intra-SAARC exports are a mere five per cent of the total exports of the region. By comparison intra-E.U. exports are 55.2 per cent, intra-NAFTA exports are 51.7 per cent and intra-ASEAN exports are 20.4 per cent."

Noting that misgivings among corporate entities in each of the member-countries were not rooted in reality and spread out among businessmen, the Prime Minister said change required adaptation and movement from status quo.

Dr. Singh laid emphasis on stepping up investments in the region to build infrastructure and said that as a first step, India had on a reciprocal basis announced measures to move towards an open skies regime and was working for greater liberalization of the visa regime to benefit all areas of cooperative interaction.

India decided to increase the number of visas to leading businessmen of SAARC states, he said and urged the member-nations to extend transit facilities to third countries. This would help to connect the region to the ongoing economic miracle in Southeast and East Asia.

He termed the recent SAARC summit in Dhaka a milestone, saying it showed the continuing relevance of the group.

(A statement of Prime Minister Dr. Manmohan Singh given on the occasion of SAARC summit published in The Hindu on 18-11-2005)

Check Your Progress

1. What is the full form of SAARC and SAFTA?
2. What is the crux of Prime Ministre's press statement?

15.9 وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے صحافتی بیان کا ترجمہ ''اب ہم دہشت کا مقابلہ مل جل کر کریں''

خصوصی نامہ نگار

نئی دہلی: جمعرات کو وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے سارک کے ممبروں سے ایک ساتھ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے کہا۔

انہوں نے سارک ملکوں کے کاروباری قائدین کے پہلے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ'' سارک ممالک میں امن و آشتی اور تحفظ کو یقینی بنانے میں ہمارا اجتماعی مفاد ہے' کیوں کہ اگر امن و آشتی اور تحفظ کی یقینی صورت حال نہیں پیدا ہوئی تو سرمایہ کار اس خطے میں سرمایہ کاری نہیں کریں گے۔''

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ یہ تصور کرنا کہ ہم میں سے کوئی بھی 'خودغرضانہ' (Beggar-thy-neighbour) پالیسیاں اپنا سکتا ہے اور ان کے ذریعے پھل پھول سکتا ہے تو یہ سوچ اپنے آپ کو گمراہ کرنے کے مترادف ہوگی۔ ڈاکٹر سنگھ نے زور ڈالتے ہوئے مزید یہ کہا کہ علاقائی تحفظ اور دہشت کے خلاف جنگ میں کامیابی میں سارک ممالک کی کاروباری برادری کا بھاری مفاد ہے۔

''ہمیں اپنے اجتماعی گھر کو منظم کرنے کے لیے آپس میں ضرور ہاتھ ملانا چاہیے' کیوں کہ اس خطے میں امن و آشتی سے ہم تمام کو فائدہ پہنچے گا۔ انہوں نے کہا کہ جہاں کہیں بھی دہشت گردی ہو اس سے ہم تمام کو نقصان پہنچے گا۔'' کاروبار اور تجارت کا فروغ محفوظ ماحول میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ'' دہشت گردی کو جو بھی نام دیں مہذب معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے اور اس کا بنیادی مقصد معاشرے میں عدم

تحفظ کا احساس پیدا کرنا ہوتا ہے۔'' ایک باہم مربوط خطے اور عالمگیر دنیا میں غربت اور عدم تحفظ دونوں کے نتائج قابل تقسیم نہیں ہیں۔'' اس خطے میں کوئی بھی ملک اس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک کہ دوسرے ممالک عدم تحفظ کے شکار ہوں گے اور کوئی بھی ملک دوسرے ملک میں برپا غربت اور دہشت گردی سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔''

انہوں نے کہا کہ تیرھویں چوٹی کانفرنس میں جیسا کہ وژن تیار کیا گیا تھا کہ سارک ممالک ترقی اور خوش حالی کی خاطر پورے خطے میں باہمی شراکت کو مضبوط کرنے کے لیے اس پورے خطے کے عوام کے درمیان نئے رشتوں کی بنیاد پر مضبوط تعلقات قائم کریں گے۔

وزیراعظم نے اس خدشے کو دور کیا کہ کھلی تجارت کے معاہدے سے خطے کے چھوٹے ملکوں کو نقصان پہنچے گا اور سارک کے قائدین سے جنوبی ایشیائی کھلی تجارت کے معاہدہ (South Asian Free Trade Agreement - SAFTA) کو مقررہ وقت کے اندر اندر مکمل کرنے کے لیے کہا۔

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ SAFTA کے نفاذ پر ضرورت سے زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی ضرورت و اہمیت جگ ظاہر ہے۔ اس بات کی توقع ہے کہ SAFTA کے نفاذ سے آئندہ دو برسوں کے دوران تجارت میں 6 بلین ڈالر سے 14 بلین ڈالر کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ ہندوستان اور سری لنکا کے درمیان باہمی تجارت کی بہت زیادہ ترقی کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس حقیقت سے دونوں ملکوں میں پائے جارہے اس خدشے ' کہ کھلی تجارت سے چھوٹے ملکوں میں کاروبار کو نقصان پہنچے گا' کا ازالہ ہو پائے گا۔

انہوں نے کہا کہ '' کھلی تجارت کا یہ معاہدہ دونوں ملکوں کے لیے یکساں طور پر فائدے مند ہوگا اور جو اس خطے میں اسی طرح کے معاہدوں کے لیے نمونے کا کام کرسکے گا۔''

وزیراعظم نے توقع ظاہر کی کہ کھلی تجارت کا معاہدہ جنوبی ایشیائی معاشی یونین (South Asian Economic Union) کے حتمی مقصد کی طرف گامزن ہونے میں مدد کرے گا۔ وزیراعظم نے کہا کہ '' مجھے پورا یقین ہے کہ ٹھیک جس طرح سے علاقائی ارتباط (Regional Integration) عالم کاری (Globlisation) کے برخلاف نہیں ہے' اسی طرح سے ایک علاقائی گروپ کے کسی ممبر کے وسیع مفادات کو اس سے نقصان بھی نہیں پہنچتا۔''

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ SAFTA کے تحت تمام ممبر ممالک اہم مسائل کے فوری حل کے لیے پابند ہیں اور توقع ظاہر کی کہ معاہدے کے لیے جاری گفت وشنید اس بات کو یقینی بنائے گی کہ آئندہ جنوری سے اس پر عمل آوری ہوسکے۔

انہوں نے ساز وسامان کی تجارت کے دائرے کو وسیع کرنے کے علاوہ خدمات کی تجارت کو شامل کرنے کے لیے ''جنوبی ایشیائی کھلی تجارت کے معاہدے'' (SAFTA) کے دائرے کو وسیع کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا' تاکہ نشوونما و ترقی اور علاقائی ارتباط کے لیے SAFTA ایک موثر ذریعے کے طور پر منظر عام پر آئے۔

اس بات پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہ سارک علاقے کی غضب کی معاشی مضمر قوتوں کا استعمال کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے' انہوں نے کہا کہ دو دہوں کے بعد بھی '' سارک ملکوں کے درمیان برآمدات' علاقے کی بحیثیت مجموعی برآمدات کا صرف پانچ فیصد ہے۔ اس کے مقابلے میں یوروپین یونین کے ملکوں کے درمیان برآمدات 55.2% ہے' شمال امریکی کھلی تجارت معاہدہ (North American Free Trade Agreement - NAFTA) کے ملکوں کے درمیان 51.7% ہے اور اسوسی ایشن برائے جنوبی شمالی ایشیائی ممالک (Association for Southeast Asian Nations - ASEAN) کے درمیان برآمدات 20.4% ہے۔''

اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ ممبر ملکوں کے کاروباری اجتماعی اداروں اور کاروباریوں میں پھیلی ہوئی بدگمانیاں بے بنیاد ہیں' وزیراعظم نے کہا کہ حسب ضرورت تبدیلی اور موجودہ صورت حال سے نکل کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سنگھ نے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے علاقے میں سرمایہ کاری بڑھانے پر کافی زور دیا اور کہا کہ ابتدائی قدم کے طور پر ہندوستان نے کھلے آسمان کے نظام (Open Skies Regime) کی طرف گامزن ہونے کے لیے باہمی تعاون کی بنیاد پر اقدامات کا اعلان کیا ہے۔ اور باہمی تعاون کے تمام تعاملی میدانوں کے فائدے کے لیے ویزا نظام (Visa Regime) کے وسیع کھلے پن کے لیے کام کررہا ہے۔

انہوں نے کہا کہ ہندوستان نے سارک ممالک کے اہم کاروباریوں کے لیے ویزوں کی تعداد میں اضافے کا فیصلہ کیا ہے اور تیسرے ممالک کے لیے نقل وحرکت کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے ممبر ممالک سے گزارش کی ہے۔ اس سے جنوب مشرق اور مشرقی ایشیا میں جاری حیرت انگیز معاشی ترقیوں سے اس خطے کو جوڑنے میں مدد ملے گی۔

انہوں نے حال ہی میں ڈھاکہ میں منعقد سارک چوٹی کانفرنس کو میل کے پتھر کے طور پر تصور کیا' کیوں کہ سارک نے مسلسل اپنی معنویت و افادیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. صحافتی ترجمے کے دوران ترجمے کی کس تکنیک کا عموماً سہارا لیا جاتا ہے؟
2. صحافتی ترجمے میں مفہوم اور وقت کی کیا اہمیت ہے؟

15.10 मौलाना मुहम्मद अमीन : تزکِ جہانگیری کے ہندی ترجمے کا ایک حصہ

मौलाना मुहम्मद अमीन

सव्वाल मास की १ तारीख को मैं मौलाना मुहम्मद अमीन से भेंट करने गया वह शेख महमूद कमानगर (धनुष निर्माता) का एक शिष्य था। शेख महमूद अपने समय का एक महापुरूष था। बादशाह हुमायूं उस पर पूरा भरोसा करता था। यहां तक कि वह महमूद के हाथ धुलाया करता था। उपरोक्त मौलना का स्वभाव उत्तम है। सांसारिक मामलों में व्यस्त रहने पर भी उसका ढंग फकीरों जैसा है। उसकी संगति में मुझे बड़ा आनन्द आया। मैंने उससे कहा कि मेरे मन में कुछ व्यथायें घुसी हुई हैं। मैंने उसकी नेक सलाह और अनुकूल शब्द सुने जिससे मेरे हृदय को बड़ी सांत्वना प्राप्त हुई। मैंने निर्वाह के लिए उसको १000 बीघा भूमि और १हजार नकद देकर उससे विदा ली ।

आगरे की ओर - रविवार को जब एक पहर व्यतीत हो चुका था तो मैं लाहौर से आगरे के लिए रवाना हुआ। मैंने किलिच खां को सूबादार, मीर कलामुद्दीन को दीवान, शेख युसुफ को बख्शी और जमालुद्दीन को कोतवाल नियुक्त किया और प्रत्येक को उसके पदानुकूल खिलअत दी । फिर मैं अपने इष्ट मार्ग की ओर चला। २७ तारीख को सुल्तानपुर के पास नदी पार करके मैं २ कोस आगे जाकर नकोदर ठहरा। मेरे पूज्य पिता ने अबुलफजल को २० हजार रूपये का सोना देकर आदेश दिया था कि इन दो परगनों के बीच एक बांध बनाकर जल प्रपात बनाया जावे। वास्तव में वहां ठहरने का स्थान मझे अत्यन्त सुखद प्रतीत हुआ। मैंने नकोदर के जागीरदार मुइजुल-मुल्क को आदेश दिया कि वहां एक इमारत खड़ी की जाय और इस बांध के

एक ओर बाग लगाया जावे। जिसे देखकर आने-जाने वाले लोग प्रसन्न हो जाएं। रविवार १० जीकदा बजीर-उल-मुल्क जो मेरे राज्याभिषेक से पहले मेरा सेवक था और मेरे लवाजमे का दीवान था अजीर्ण रोग से मर गया। उसके जीवन के अन्तिम समय में उसके एक भाग्यहीन पुत्र हुआ। उसके जन्म के ४० दिन बाद ही उसके माता पिता की मृत्यु हो गई। और वह स्वयं भी २,३ वर्ष का होकर मर गया। मुझे विचार आया कि वजीर उल-मुल्क का खानदान समूल नष्ट नहीं होना चाहिए। मैंने उसके भाई मन्सूर को एक पद प्रदान किया। वास्तव में उसने मेरे प्रति कोई प्रेम प्रकट नहीं किया।

शेर का शिकार - सोमवार तारीख १४ को मैंने मार्ग में सुना कि पानीपत ओर कर्नाल के बीच में दो ऐसे शेर हैं जो यात्रियों को बड़ा दुख देते हैं। मैंने हाथी रवाना किये। जब मैं उन शेरों के स्थान पर पहुँचा तो एक हथनी पर सवार हुआ और आदेश दिया गयाकि हाथियों द्वारा शेर को घेरकर कमारगाह बना दिया जावे। अल्लाह के अनुग्रह से मैंने दोनों शेरों को बन्दूक से मार डाला और इस प्रकार दोनों शेरों को जिन्होंने अल्लाह के बन्दों का मार्ग बन्द कर रखा था समाप्त कर दिया।

दिल्ली में - बृहस्पतिवार तारीख १८ को मैंने दिल्ली में उस स्थान पर ठहरा जो सलीम खां अफगान ने अपने शासनकाल में बनाया था। यह जमुना नदी के बीच में बना हुआ है और सलीमगढ़ कहलाता है। मेरे पूज्य पिता ने यह स्थान मुर्तेजाखां को दे दिया था। जो पहले दिल्ली का ही निवासी था। इस खान ने नदी के तट पर एक चबूतरा बनाया था जो अत्यन्त सुखद और रमणीय प्रतीत था। इस इमारत के नीचे जल के समीप एक चबूतरा या चौखण्डी बनी हुई थी, जिसमें हूमायूं के आदेश से चमकदार और चिकने टाइल लगे हुये थे। ऐसे सुखद वायु वाले स्थान बहुत कम थे। जिन दिनों में स्वर्गीय हुमायूं दिल्ली को सुशोभित करता था तो वहां वह अपने घनिष्ठ मित्रों के साथ जाया करता था और अपने दरबारियों में बैठा करता था। मैंने यहां अपने दरबारियों और मित्रों के साथ ४ दिन व्यतीत किये और मद्य गोष्ठियां की। मोअज्जम खां ने जो दिल्ली को फौजदार था भेंटे प्रस्तुत की। जागीरदार और नागरिक भी भेंटे लाये। मैं पालम के परगने में कमारगाह बनवाकर शिकार करना चाहता था। पालम दिल्ली के निकट है। परन्तु मुझसे कहा गया कि आगरे में प्रवेश करने का समय सन्निकट है। और ऐसा शुभ मुर्हूत दुबारा शीघ्र आने वाला नही है इसलिए मैंने शिकार का इरादा त्याग दिया और एक नाव में बैठकर आगरे के लिए रवाना हो गया इस मास की २० तारीख को चार लड़के तीन लड़कियां जो मिर्जा शाहरूख के थे लाये गये। शाहरूख ने मेरे पिता से इन बच्चों का उल्लेख नहीं किया था। मैंने लड़कों को अपने विश्वसनीय सेवकों के सुपुर्द कर दिया और लड़कियों को अन्तपुर की दासियों के हवाले करके आदेश दिया कि उनकी भली-भांति संभाल की जावे। २१ जीकदा को राजा मानसिंह रोहतास के दुर्ग से मेरे पास आया। यह दुर्ग पटना और बिहार के प्रान्त में है। मानसिंह को मैंने छः सात बार बुलाया तब आया।

मानसिंह भी खान आज़म की भांति एक मिथ्याचारी है और इस राज्य के पुराने भक्षकों में गिना जाता है। इन लोगों ने मेरे साथ क्या किया है और मैंने उनके साथ क्या किया है। इसकों ईश्वर ही जानता है क्योंकि वही सब भेदों का ज्ञाता है। शायद ऐसा दृष्टांत दूसरा नहीं मिलेगा। १०० हाथी मेरे भेंट किये जिनमें एक भी ऐसा नहीं था जो शाही तबेले में रखा जा सके। इस राजा पर मेरे पिता की बड़ी कृपा थी इसलिए मैंने उसके सामने उसके अपराधों का उल्लेख नहीं किया और उसकी पदोन्नति की।

15.11 ''مولانا محمد امین'' کے زیرعنوان ہندی متن کا ترجمہ

یکم شوال کو میں مولانا محمد امین سے ملاقات کرنے گیا وہ محمود کمان گر کا شاگرد تھا۔ شیخ محمود اپنے وقت کا ایک عظیم شخص تھا۔ بادشاہ ہمایوں اس پر پورا بھروسہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ محمود کے ہاتھ دھلایا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا مولانا کا مزاج بہت اچھا ہے۔ دنیاوی معاملات میں مصروف رہنے کے باوجود بھی اس کا ڈھنگ فقیروں جیسا ہے۔ اس کی صحبت میں مجھے بڑا لطف آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے من میں کچھ پریشانیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں نے اس کی نیک صلاح اور موافق باتیں سنی۔ جس سے میرے دل کو کافی راحت ملی۔ میں نے گزر بسر کے لیے اس کو ایک ہزار بیگھا زمین اور ایک ہزار نقد دے کر اس سے وداع لی۔

آگرے کی سمت۔ اتوار کو جب ایک پہر گزر چکا تھا تو میں لاہور سے آگرے کے لیے روانہ ہوا۔ میں نے قلیچ خاں کو صوبیدار، میر کلام الدین کو دیوان، شیخ یوسف کو بخشی اور جمال الدین کو کوتوال مقرر کیا اور ہر ایک کو اس کے عہدے کے مطابق خلعت دی۔ پھر میں اپنے مطلوبہ راستے پر چل پڑا۔ 25 تاریخ کو سلطان پور کے پاس ندی پار کرکے میں نے دو کوس آگے جا کر نکودر میں قیام کیا۔ میرے والد بزرگوار نے ابوالفضل کو بیس ہزار روپے کا سونا دے کر حکم دیا تھا کہ ان دو پرگنوں کے بیچ ایک باندھ بنا کر پانی دستیاب کرایا جائے۔ حقیقت میں وہاں ٹھہرنے کی جگہ مجھے بہت زیادہ راحت بخش لگی۔ میں نے نکودر کے جاگیردار معز الملک کو حکم دیا کہ وہاں ایک عمارت کھڑی جائے اور اس باندھ کے ایک طرف باغ لگایا جائے۔ جسے دیکھ کر آنے جانے والے لوگ خوش ہو جائیں۔ اتوار 10 ذیقعدہ کو وزیرالملک، جو میری تخت نشینی سے پہلے میرا خدمتگار تھا اور میرے لوازمے کا دیوان تھا، بدہضمی سے مر گیا۔ اس کی زندگی کے آخری وقت میں اس کے ایک بدقسمت بیٹا پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے چالیس دن بعد ہی اس کی والدہ اور والد کی موت ہوگئی اور وہ خود بھی دو تین سال کا ہو کر مر گیا۔ مجھے خیال آیا کہ وزیرالملک کا خاندان پوری طرح سے تباہ و برباد نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اس کے بھائی منصور کو ایک عہدے پر فائز کیا۔ حقیقت میں اس نے میرے لیے کوئی محبت نہیں جتائی۔

شیر کا شکار۔ دوشنبہ 14 تاریخ کو میں نے راستے میں سنا کہ پانی پت اور کرنال کے بیچ میں دو ایسے شیر ہیں جو مسافروں کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ میں نے ہاتھی روانہ کیے۔ جب میں ان شیروں کی جگہ پر پہنچا تو ایک ہتھنی پر سوار ہوا اور حکم دیا کہ ہاتھیوں کے ذریعے شیر کو گھیر کر قمرغہ بنا دیا جائے۔ اللہ کے رحم و کرم سے دونوں شیروں کو بندوق سے مار ڈالا اور اس طرح سے دونوں شیروں کو، جنہوں نے اللہ کے بندوں کا راستہ بند کر رکھا تھا، ختم کر دیا۔

دلی میں۔ بدھ وار 18 تاریخ کو میں نے دلی میں اس مقام پر قیام کیا، جسے سلیم خاں افغان نے اپنے دور حکومت میں بنایا تھا۔ یہ جمنا ندی کے بیچ واقع ہے اور سلیم گڑھ کہلاتا ہے۔ میرے والد بزرگوار نے یہ مقام مرتضیٰ خان کو دے دیا تھا، جو پہلے دہلی کا ہی رہنے والا تھا۔ اس خان نے ندی کے کنارے پر ایک چبوترہ بنایا تھا، جو بے حد راحت بخش تھا اور دلکش لگتا تھا۔ اس عمارت کے نیچے پانی کے نزدیک ایک چبوترہ بنایا ہوا تھا، جس میں ہمایوں کے حکم سے چمکدار اور چکنے ٹائل لگے ہوئے تھے۔ ایسے خوشگوار ہوادار مقام بہت کم تھے، جن دنوں میں جنت مکانی ہمایوں دلی میں رونق افروز تھے تو وہاں وہ اپنے عزیز دوستوں کے ساتھ جایا کرتے تھے اور اپنے درباریوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے یہاں اپنے درباریوں اور دوستوں کے ساتھ چار دن گزارے اور محفلِ شراب نوشی آراستہ کی۔ معظم خاں نے جو دلی کا فوجدار تھا تحائف پیش کیے۔ جاگیرداروں اور رعایا نے بھی تحفے پیش کیے۔ میں پالم کے پرگنے میں قمرغہ بنوا کر

شکار کرنا چاہتا تھا۔ پالم دلی کے نزدیک ہے لیکن مجھ سے کہا گیا کہ آگرے میں داخل ہونے کا وقت عنقریب ہے اور ایسی نیک ساعت دوبارہ جلدی آنے والی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے شکار کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک کشتی میں بیٹھ کر آگرے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسی مہینے کی 20 تاریخ کو چار لڑکے اور تین لڑکیاں جو مرزا شاہ رُخ کے تھے لائے گئے۔ شاہ رخ نے میرے والد سے ان بچوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے لڑکوں کو اپنے بھروسے مند خادموں کے سپرد کر دیا اور لڑکیوں کو حرم کی باندیوں کے حوالے کر کے حکم دیا کہ ان کی اچھی طرح دیکھ ریکھ کی جائے۔ 21 ذیقعدہ کو راجہ مان سنگھ روہتاس کے قلعے سے میرے پاس آیا۔ یہ قلعہ پٹنہ اور بہار کے صوبے میں ہے۔ مان سنگھ کو میں نے چھ سات بار بلایا تب وہ آیا۔ مان سنگھ بھی خان اعظم کی طرح دھوکے باز تھا اور اس صوبے کے پرانے بدخواہوں میں گنا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے اور میں نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔ کیوں کہ وہی سبھی بھیدوں کو جاننے والا ہے۔ شاید ایسی نظیر دوسری نہیں ملے گی۔ سو (100) ہاتھی مجھے پیش کیے گئے' جن میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے شاہی اصطبل میں رکھا جا سکے۔ اس راجہ پر میرے والد کی کافی مہربانی تھی۔ اس لیے میں نے اس کے سامنے اس کے جرموں کو بیان نہیں کیا اور اس کے منصب کو بڑھایا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنا کیوں آسان ہے؟
2. ہندی اور اردو میں دو سب سے بڑی مماثلتیں کیا ہیں؟

15.12 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے چار مختلف قسم کے موضوعات سے انگریزی متون کے تراجم کا مطالعہ کیا اس کے علاوہ ایک ہندی متن کا بھی آپ نے مطالعہ کیا۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہاں آپ کو لفظی ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور کہاں بامحاورہ ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور کہاں آزاد ترجمے کی تکنیک کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظی' بامحاورہ اور آزاد ترجمے کی تینوں تکنیکوں کا استعمال ہر قسم کے متن کے ترجمے کے دوران ہوتا ہے۔ لیکن اگر علمی ترجمہ ہو تو غالب تکنیک لفظی تکنیک ہوگی۔ اور اگر ادبی ترجمہ کر رہے ہیں تو بامحاورہ ترجمے کی تکنیک استعمال ہوگی۔ اور اگر صحافتی ترجمہ کر رہے ہیں تو آزاد ترجمے کی تکنیک استعمال ہوگی۔

آخر میں ہندی کا ایک تفصیلی اقتباس دیا گیا ہے۔ جس کے مطالعے کے دوران آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہندی کے متن اور اردو ترجمے میں بہت زیادہ فرق نہیں دکھائی دیتا۔ کیوں کہ دونوں زبانوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ بالخصوص دونوں زبانوں کی نحوی ساخت کم و بیش ایک جیسی ہے اور دونوں کی لفظیات بھی مشترکہ ہیں۔ تیسری مماثلت یہ ہے کہ دونوں زبانیں آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور دونوں کی پیدائش کے علاقے ایک ہیں اور عہد بھی ایک ہی ہے۔ نیز دونوں کے تہذیبی عناصر میں بھی کچھ نہ کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ جن کے باوصف ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنا بامقابل دیگر زبانوں کے کافی آسان ہے۔

15.13 نمونہ امتحانی سوالات (نوٹ: سالانہ امتحان میں انگریزی اور ہندی کے اقتباسات اردو میں ترجمے کے لیے دیے جا سکتے ہیں)

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اپنی پسند کی کسی انگریزی کہانی کا اردو میں ترجمہ کیجیے
2. اخبار کے کسی کالم کا اردو میں ترجمہ کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. کسی علمی کتاب کے اقتباس کا ترجمہ کیجیے۔
2. ہندی کی کسی کہانی کے ایک اقتباس کا ترجمہ کیجیے۔

15.14 فرہنگ

Foibles	=	خامیاں، معمولی نقص
Hurry	=	بڑی عجلت، بڑی جلدی
Clients	=	گاہک
Irritability	=	حساسیت
Revelation	=	انکشاف
Renaissance	=	نشاۃ الثانیہ
Serene	=	پرسکون، تسکین بخش
Exalted	=	ممتاز، اعلیٰ
Extravagant	=	ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، مہنگا، گراں
Etiquette	=	سماجی آداب واخلاق
Stipend	=	بندھا ہوا وظیفہ
Massacre	=	قتلِ عام
Interregnum	=	وقفہ، زمان تعطل حکمرانی
Etymology	=	الفاظ کی اصل، اشتقاق
Conclave	=	اجلاس
Beggar-thy-neighbour Policy	=	خودغرضانہ پالیسی
Delude	=	دھوکا دینا، گمراہ کرنا، بھٹکانا
Antithetical	=	متضاد، متقاضی، مخالف
स्वभाव	=	مزاج
सांत्वना	=	اطمینان۔تسلی۔طمانیت
अनुग्रह	=	رحم وکرم، مہربانی
विश्वसनीय	=	بھروسے مند، قابل اعتماد

اکائی 16 : ابلاغیات اور اُس کی قسمیں

ساخت

16.1 تمہید

16.2 ابلاغیات اور اس کی قسمیں

16.3 عوامی ذرائع ابلاغ کے اجزائے ترکیبی

16.4 ابلاغیات کی ابتدا و ارتقا

16.5 ڈراما

16.6 عوامی ذرائع ابلاغ کا تحریری ذریعہ (صحافت)

16.7 عوامی ذرائع ابلاغ کے برقی ذرائع

16.7.1 ریڈیو

16.7.2 فلم یا سنیما

16.7.3 ٹیلی ویژن

16.8 خلاصہ

16.9 نمونہ امتحانی سوالات

16.10 فرہنگ

16.11 سفارش کردہ کتابیں

16.1 تمہید

آج کا معاشرہ معلوماتی معاشرہ ہے۔ آج کسی ملک کی ترقی کے معیار کا اندازہ اس کے معلوماتی نظام کی ترقی اور بلندی سے لگایا جاتا ہے۔ اور معلوماتی نظام ترسیل و ابلاغ کے نظام پر منحصر ہے۔ خصوصاً عوامی ذرائع ابلاغ ہمیں معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ کسی مسئلے کی تفسیر و تفصیل بھی پیش کرتے ہیں۔ ان سے رائے عامہ ہموار کرنے یا متاثر کرنے کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ یہ مستقبل کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے راستے بھی ہموار کرتے ہیں۔ یہ ہمیں باخبر کر کے نئی فکر، نئے شعور سے ہم آہنگ ہی نہیں کراتے، نئے مسائل کے روبرو ہی نہیں لاتے بلکہ تجربات میں وسعت پیدا کر کے نئے نئے چیلنجز قبول کرنے کے لائق بھی بناتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ تر دانشور اس بات سے متفق ہیں کہ آج دنیا کی سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی میں عوامی ذرائع ابلاغ سب سے اہم رول ادا کر رہے ہیں۔

ذرائع ابلاغ ہماری ہر سرگرمی کی رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ یہ زندگی کے ہر لمحے کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں اور ہر لمحہ ہماری سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ آج ان کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ ہماری روزمرہ کی عادت بن گئے ہیں۔

چنانچہ اس اکائی میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس میں ابلاغ کی تعریف، ذرائع ابلاغ کی اقسام، اس کے اجزائے ترکیبی۔ اس کا مختصر ارتقا اور اہم عوامی ذرائع ابلاغ صحافت، فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور تھیٹر کا تعارف کرایا جائے گا۔

16.2 ابلاغیات اور اس کی قسمیں

ابلاغ و ترسیل دوطرفہ سماجی عمل ہے جو انسانی معاشرے میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں غذا اور پناہ گاہ کے بعد اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مافی الضمیر کی ادائیگی سب سے اہم ہے۔ یہ ہمارے تہذیب یافتہ دور کی ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی وجود کا قائم رہنا مشکل ہے۔ اپنے خیالات، محسوسات اور تجربات کو دوسروں تک پہنچانے کا عمل ابلاغ کہلاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے کمیونیکیشن کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیونیکیشن (Communication) لاطینی زبان کے لفظ ''کمیونیس'' (Communis) سے نکلا ہے جس کے معنی ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ گویا جب ہم اپنے خیالات، محسوسات اور تجربات کو دوسروں سے ہم آہنگ کرتے ہیں تو ابلاغ ہوتا ہے۔

اظہار ذات ایک انسانی جبلت ہے۔ ہر شخص اپنے محسوسات، خیالات اور تجربات کا دوسروں کے سامنے اظہار کر کے فطری طور پر سکون محسوس کرتا ہے۔ انسان جن مشاہدات، خیالات، تجربات اور جذباتی کیفیات سے گزرتا ہے اگر انہیں اپنی ذات تک محدود رکھے تو اس کے اندر ہیجانی کیفیت کے تحت ابلاغ کی مسلسل خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اظہار ذات کی یہی خواہش ترسیل و ابلاغ کی بنیاد ہے۔

ترسیل و ابلاغ کے لفظی معنی سے قطع نظر ہم اپنے مطالعے میں اس سے وہ چیز مراد لیتے ہیں جس میں کسی اہم اور بامعنی اعداد و شمار، خیالات، فکر اور معلومات کے ابلاغ کا دوطرفہ عمل ہو۔ اس عمل کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب مرسل الیہ پیغام حاصل کرنے کا خواہش مند ہو اور پیغام کا تسلی بخش جواب دے۔ اس عمل میں پیغام ایک طرف سے جاتا ہے تو دوسری طرف سے آتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس کے لیے کون سا ذریعہ یا طریقہ استعمال کیا گیا ہے اور یہ کس صورت حال میں عمل پیرا ہوا ہے۔ ابلاغ کے عمل میں پیغام کے یک طرفہ بہاؤ کے نتیجے میں غلط مطلب اخذ ہو سکتا ہے یا کوئی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

ابلاغ کی قسمیں

غیر کلامی ابلاغ (Non Verbal Communication)

یہ ایسا طریقہ ترسیل و ابلاغ ہے جس میں الفاظ کے بجائے چہرے کے تاثرات یا اشارے کنائے اور حرکات و سکنات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ اشارے کنائے شعوری بھی ہو سکتے ہیں اور غیر شعوری بھی۔ ایسے ابلاغ کی اہمیت وہاں بڑھ جاتی ہے جہاں آواز استعمال کرنے کا موقع نہ ہو۔ جہاں زبان پوری طرح ترقی یافتہ نہ ہو۔ اس قسم کے طریقہ ابلاغ نے زبان کی ابتدا سے پہلے یا زبان کے تشکیلی دور میں بہت اہم رول ادا کیا ہوگا۔

درون ذاتی ابلاغ (Intra Personal Communication)

یہ ایسا طریقہ ابلاغ ہے جو ہمارے اندر حیاتی نظام کے ذریعے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ ابلاغ کی سب سے قدیم شکل ہے۔ قدیم انسان اپنے حواس کے ذریعے اپنی ضرورت کی چیزیں چنتا تھا۔ مرکزی اعصابی نظام جب اپنے ماحول سے کوئی تحریک پاتا ہے تو حس کے ذریعے آواز یا بصارت متحرک ہو کر پیغام دماغ (ریسیور) تک پہنچاتی ہے جس کا چینل حس یا عصابی نظام ہے۔ دماغ وہ پیغام، فیڈ بیک کے طور پر حیاتی نظام کے ذریعے رگ پٹھوں تک پہنچاتا ہے جس سے کوئی عمل واقع ہوتا ہے۔

بین شخصی ابلاغ (Inter Personal Communication)

ابلاغ کا یہ ایسا طریقہ ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان دو بدو زبانی یا دوسرے طریقوں سے ابلاغ ہوتا ہے۔ اس میں سورس (Source) اور ریسیور (Receiver) کے اختلاط کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہم بات چیت اور مکالمے کی شکل میں روزانہ کی سرگرمیوں اور کام کاج میں ذاتی ابلاغ کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا راہ چلتے، بات کرتے یا کسی سے ملتے وقت کسی نہ کسی طرح ہم ترسیل کے دائرے میں ہوتے

ہیں۔لیکن یہاں خیالات کا مکمل اظہار یا اس کی صحیح ترجمانی نہیں ہو پاتی اور نہ ہی اس میں مناسب تسلسل وتوازن رہتا ہے۔ چنانچہ خیالات وتجربات اور اطلاعات کو زیادہ ترتیب وار مکمل اور بھرپور طریقے پر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے عوامی ابلاغ کے عمل واصول کا سہارا لیا جاتا ہے۔

عوامی ابلاغ

عوامی ابلاغ میں اطلاعات' خیالات' تجربات' فکر ونظریات' علوم وفنون' تفریحی مواد' حالات حاضرہ' عوامی مسائل اور دیگر بہت سی چیزیں ایک بڑے اور مختلف النوع انسانی گروہ تک بیک وقت کسی ایسے ذریعے سے پہنچائی جاتی ہیں جو اس کے لیے اختراع کی گئی ہوں۔ مختصر یہ کہ ہم ان ہی چیزوں کو عوامی ابلاغ کے ذرائع تسلیم کریں گے جو فنی اور تکنیکی طور پر پیغامات کو عوام کے بڑے گروہ تک بیک وقت پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ صحافت' سنیما' ریڈیو' تھیٹر اور ٹیلی ویژن اس ذیل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ٹیلی گراف' ٹیلی فون' خطوط اور ای میل کا شمار عوامی ذرائع ابلاغ میں نہیں ہوتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- عوامی ذرائع ابلاغ سے کیا مراد ہے؟

2- عوامی ذرائع ابلاغ کی کتنی قسمیں ہیں؟

3- بین شخصی ابلاغ میں کتنے لوگوں کے درمیان ابلاغ کا عمل ہوتا ہے؟

16.3 عوامی ذرائع ابلاغ کے اجزائے ترکیبی

عوامی ذرائع ابلاغ کے اجزائے ترکیبی چھ ہیں:

1- سورس (Source)

2- پیغام (Message)

3- چینل (Channal)

4- ریسیور (Receiver)

5- فیڈ بیک (Feed Back)

6- رکاوٹ (بیریر) (Barrier)

سورس: کسی پیغام کو بنانے والا' تیار کرنے والا' بھیجنے والا سورس ہوتا ہے۔ اسے ''کمیونیکیٹر'' اور ''ڈی کوڈر'' بھی کہتے ہیں۔ عوامی ذرائع ابلاغ کے لیے پیغام تیار کرنے میں جو لوگ شامل ہوتے ہیں' وہ سورس کی حدود میں آجاتے ہیں۔ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو رپورٹر' ادیب' ایڈیٹر' اناؤنسر' کمنٹری کرنے والے' اخبار' رسالے' ریڈیو' ٹیلی ویژن' پریس اسوسی ایشن اور نیوز ایجنسی اہم سورسز ہیں۔ لیکن یہ فہرست یہیں مکمل نہیں ہو جاتی۔ اور بھی بہت سے لوگ اس میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً نیوز فوٹو گرافر' کتاب اور رسالوں کے ایڈیٹر' گریفک کے تخلیق کار' مشتہرین' ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسکرپٹ لکھنے والے' فلم پروڈیوسر وغیرہ۔

تربیت یافتہ سورس اپنے پیغام میں جو کچھ بھیجتا ہے' وہ نہ صرف مختلف چینل کی ضرورت کے مطابق اس میں لچک پیدا کرتا ہے بلکہ اپنے ناظرین و سامعین کی اہلیت وصلاحیت کی جانکاری بھی حاصل کرتا ہے۔ اور ان کی حدود' وسائل اور مسائل کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اچھا سورس اپنے پیغام کا معیار بلند بنانے کے لیے فیڈ بیک یعنی پیغام حاصل کرنے والوں کے ردعمل سے بھی مدد لیتا ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ میں سورس تک فیڈ بیک ذرا مشکل سے پہنچتا ہے۔ لیکن سمجھدار سورس جانتا ہے کہ فیڈ بیک کیسے حاصل کیا جائے' اور اپنے پیغام میں بہتری لانے کے لیے اسے کیسے استعمال کیا جائے۔ آج کل فیڈ بیک خطوط' فون' ای میل' انٹرنیٹ اور سروے کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے پھر ان میں سے قابل امتیاز فیڈ بیک کی شناخت کر کے ان سے تاثر قبول کیا جاتا ہے۔

پیغام : سورس جو کچھ اپنے ریسیور تک بھیجتا ہے وہ پیغام ہوتا ہے۔ پیغام ترسیل وابلاغ کا نہایت ہی اہم جز ہے۔ پیغام' کاغذ پر روشنائی' ہوا میں آواز کی لہر' بجلی کے کرنٹ کی ترنگ۔ ہوا میں لہراتا ہوا ہاتھ یا جھنڈے کی شکل میں ہوسکتا ہے یا کوئی اشارہ جو بامعنی ہو یا جس کے معنی نکالے جاسکیں۔ پیغام کسی زبان' موسیقی' تصویر' رقص یا کسی اور فن کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے۔ مگر یہ زبان یہ فن یہ ہیئت مبہم نہ ہو' کیونکہ وہی پیغام پسندیدہ ہوتا ہے جس کے معنی آسانی سے نکالے جاسکیں۔ پیغام کو سمجھنے اور معنی نکالنے میں جتنی زیادہ محنت کرنی پڑے گی وہ اتنا ہی بے اثر ہوگا۔ پیغام کو بامقصد ہونے کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہونا چاہئے۔ یعنی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پوشیدہ ہوں۔

کسی پیغام کی زبانی ترسیل میں صرف ہماری آواز ہی نہیں ہوتی (گو کہ اس کا بنیادی رول ہوتا ہے) بلکہ اس میں چہرے کے تاثرات' کسی خاص لفظ پر زور' بلکہ اس لفظ سے پہلے ایک ہلکا سا سکتہ بھی معنی خیز ہو جاتا ہے۔ آواز کا دھیما پن' گہرا پن' روکھا پن' اونچا پن بھی معنی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کسی جملے کی ادائیگی میں لہجے کی ہلکی سی تبدیلی اس کے معنی بدل دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اس جملے کو کہ ''یہ آپ نے بہت اچھا کام کیا۔'' لہجے کی تبدیلی سے طنزیہ' استہزائیہ یا شکیہ بنایا جاسکتا ہے۔ پیغام کو موثر بنانے میں اس خلوص' محنت لگن اور کوشش کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے جو اسے تیار کرنے میں کی جاتی ہے۔ یہاں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ترسیل کی تسبیح میں پیغام اس دھاگے کا کام کرتا ہے جو تسبیح کے تمام دانوں کو ایک لڑی میں منسلک رکھتا ہے اسی لیے بعض ناقدین کا خیال ہے کہ پیغام سورس اور ریسیور سے بھی زیادہ اہم ہے۔

برقیاتی ذرائع ابلاغ میں پیغام کو ریسیور تک پہنچانے میں زمین سے سیٹیلائٹ تک کا جو بنیادی ڈھانچہ استعمال ہوتا ہے وہ کتنا قیمتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے' مگر یہ قیمتی بنیادی ڈھانچہ بے معنی ہو جائے اگر سورس کے پاس کوئی بامعنی یا اہم پیغام نہ ہو' چنانچہ ترسیل کے مطالعے میں دو چیزیں بہت اہم ہیں۔ ایک تو اس کے تکنیکی ذرائع' دوسرے پیغام کو موثر بنانے کے لیے تمام دستیاب ذرائع کا بہتر سے بہتر استعمال۔ ولدر شرم ترسیل میں پیغام سے بامعنی ردعمل حاصل کرنے کے لیے چار چیزوں کو ضروری قرار دیتا ہے:

- ☆ پیغام کو اس طرح ترتیب دینا اور پہنچانا چاہئے کہ وہ ریسیور کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے۔
- ☆ پیغام میں ایسے اشارے ہوں جس سے سورس اور ریسیور دونوں واقف ہوں۔
- ☆ پیغام میں ریسیور کی ضرورت کو ابھارنا چاہئے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کا کوئی طریقہ پیش کرنا چاہئے۔
- ☆ پیغام کو اس طرح پیش کرنا چاہئے کہ وہ ریسیور کی صورت حال سے مناسبت رکھتا ہو۔

چینل: جس چیز کے ذریعے پیغام سورس سے ریسیور تک پہنچایا جاتا ہے وہ چینل کہلاتا ہے۔ صحافت' تھیٹر' ریڈیو' سنیما' ٹیلی ویژن' فون' فیکس' ای میل اور انٹرنیٹ کا شمار چینل میں ہوتا ہے۔

ریسیور: کسی پیغام کو حاصل کرنے والا ریسیور ہوتا ہے۔ اسے ڈی کوڈر بھی کہتے ہیں۔ ہر قسم کے ناظرین' سامعین اور قارئین ریسیور ہیں۔ ترسیل کے عمل کو موثر بنانے میں سورس اور ریسیور برابر کے حصے دار ہیں۔ ان میں کسی کو بھی موثر ترسیل سے جدا نہیں کیا جاسکتا' اور یہ بات ہمیشہ دماغ میں رکھنی چاہئے کہ بامعنی اور معیاری ترسیل میں سورس کا وجود اسی وقت تک ممکن ہے جب تک ریسیور کا وجود ہے۔ یہ ریسیور ہی ہے جس کے لیے پیغام تیار کیا جاتا ہے۔ پیغام کی زبان' معیار' طریقہ پیش کش' چینل کا انتخاب' چینل میں فریکوئنسی' پیغام کے تہذیبی عناصر سبھی کچھ ریسیور کی پسند و ناپسند' مزاج' تہذیب' عقل اور سمجھ کے مطابق طے کیے جاتے ہیں۔ اس سے ترسیل میں ریسیور کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ترسیل کے صحت مند عناصر کو بڑھانے کے لیے سورس کو چاہئے کہ وہ ریسیور کا اچھی طرح جائزہ لے اور یہ سمجھنے میں اپنی پوری قوت صرف کردے کہ ان کی قسم کیا ہے' ان کا مزاج کیا ہے' ان کی پسند و ناپسند کیا ہے' تاکہ وہ اپنے پیغام کی ان کے ساتھ مطابقت پیدا کرکے اسے زیادہ بامقصد' بامعنی' کارآمد اور مفید بنا سکے۔

فیڈ بیک : جب دو لوگ آپس میں باتیں کرتے ہیں تو ایک بولتا اور دوسرا جواب دیتا ہے۔ یہ ذاتی یا زبانی ترسیل ہوتا ہے۔ لیکن عوامی ذرائع ترسیل میں بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ سورس کے پیغام پر ریسیور کا ردعمل ایک ضروری امر ہے (بشرطیکہ اس نے پیغام کو سمجھ لیا ہے) یہی ردعمل فیڈ بیک کہلاتا ہے اور یہ ترسیل کے لیے نہایت اہم ہے۔ خواہ منفی ہو' مثبت ہو یا غیر جانب دار۔ یہ علم اطلاع اور خبر کے بہاؤ پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ ترسیلی

برتاؤ کا تانا بانا فیڈ بیک کے ذریعے ہی بُنا جاتا ہے۔ فیڈ بیک منفی بھی ہوتا ہے اور مثبت بھی۔ مثبت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک ہے۔ منفی میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے۔

عمل ترسیل کی تکمیل کے لیے یہ ضروری بھی ہے کہ پیغام ریسیور تک پہنچے اور وہ اسے سمجھ لے اور اس کے ردعمل کی جانکاری سورس کو ملے۔ سورس کے لیے فیڈ بیک کی جانکاری اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ اسے یہ معلوم ہو کہ ریسیور اس کے ساتھ اتفاق کرتا ہے یا نہیں' یا پیغام کو غلط معنی تو نہیں پہنائے گئے ہیں۔ کیا ریسیور کے دماغ میں بھی وہی تصویر بنی جو سورس بنانا چاہتا تھا۔ یہاں ایک اور بات لازمی ہو جاتی ہے کہ ریسیور سورس کی زبان' اشارات' خیالات اور جذبات کو سمجھ سکتا ہو اور اس کا مطلب نکال سکتا ہو۔ اگر کوئی شخص روسی زبان میں پیغام بھیج رہا ہے مگر اس کے ریسیور کو روسی زبان آتی ہی نہیں تو ترسیل کا عمل بے معنی ہو جائے گا۔ اچھا سورس فیڈ بیک کے بارے میں ہمیشہ متجسس رہتا ہے۔ ہر صورت میں اسے حاصل کرتا ہے اور اس پر توجہ دیتا ہے۔ باریک بینی سے اس کا مطالعہ کرتا ہے' پھر اس کی روشنی میں اپنے پیغام کی اصلاح یا ترمیم کر کے اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

بیریر: بعض اوقات پیغام صحیح ڈھنگ سے ریسیور تک نہیں پہنچتا۔ اس میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں۔ انہیں رکاوٹوں کو بیریر کہتے ہیں۔ عوامی ترسیل میں پیغام کو سورس سے ریسیور تک پہنچنے کے لیے مختلف تکنیکی ذرائع اور مختلف افراد سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مختلف النوع رکاوٹوں کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ عوامی ترسیل کے لیے اکثر پیچیدہ مشینوں کا استعمال ہوتا ہے۔ کبھی ان کے استعمال میں غلطی کی وجہ سے رکاوٹ آتی ہے اور کبھی ان مشینوں میں استعمال ہونے والی توانائی میں قدرتی خلل واقع ہونے کی وجہ سے رکاوٹ آتی ہے۔ مثال کے طور پر آواز کی لہروں کو لے جانے والے ترنگوں کا کمزور پڑ جانا۔ یا توانائی کی سپلائی بند ہو جانا وغیرہ۔

گیٹ کیپنگ: گو کہ گیٹ کیپنگ کا تعلق براہ راست عوامی ذرائع ابلاغ کے اجزائے ترکیبی سے نہیں ہے پھر بھی یہ اصطلاح عوامی ذرائع ابلاغ کے سلسلے میں بار بار استعمال ہوتی ہے' اس لیے بہتر معلوم ہوا کہ اس کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

عوامی ذرائع ابلاغ کے لیے کسی پروگرام کو تیار کرنے میں شریک فرد' افراد یا ادارہ گیٹ کیپر ہو سکتا ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ میں اطلاعات' نظریات یا تجربات کو ریسیور تک پہنچانے میں بہت سے پیچیدہ مسائل سامنے آتے ہیں۔ حالات و ماحول کے تحت یا موقع و محل کی نزاکت کے پیش نظر بہت سی چیزوں میں تخفیف یا ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ کوئی پروڈیوسر فلم کے کسی سین (Scene) کو اصل اسکرپٹ سے کاٹ دیتا ہے۔ کوئی ٹیلی ویژن پروڈیوسر کسی سین کو مخرب اخلاق ہونے' یا کسی طبقے کی دل شکنی کے خیال سے رد کر دیتا ہے۔ یا کوئی ڈائریکٹر یہ بہتر سمجھتا ہے کہ ڈاکومینٹری میں کیا چیز ہونی چاہئے۔ یا کوئی اخبار کا ایڈیٹر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کل کے اخبار میں کون سا اداریہ جائے گا۔ گیٹ کیپنگ کے سلسلے میں تین چیزیں بہت اہم ہیں:

☆ گیٹ کیپر کسی بھی پروگرام کو اڈیٹنگ کے ذریعے حد کے اندر رکھتا ہے۔

☆ حاصل ہونے والی اطلاعات میں مزید حقائق و پس منظر کا اضافہ کر کے اُنہیں بڑھا دیتا ہے۔

☆ وہ پیغام یا پروگرام کی پھر سے ترتیب و توضیح کرتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- عوامی ذرائع ابلاغ کے اجزائے ترکیبی کیا کیا ہیں؟

2- گیٹ کیپر کون لوگ ہو سکتے ہیں؟

3- پیغام زیادہ اہم ہے یا ریسیور؟

16.4 ابلاغیات کی ابتدا و ارتقا

ایک لاکھ سال قبل مسیح سے پہلے ایک ایسی غیر ترقی یافتہ زبان (Embryonic) کی ابتدا ہوئی جس کے ذریعے ابلاغ ہو سکتا تھا۔ اس وقت تک اتنی دماغی و جسمانی ترقی ہو گئی تھی کہ زبان کی ایجاد ہو سکے۔ اس سے قبل انسان کسی چیز کو چھو کر اشاروں کے ذریعے ابلاغ کرتا تھا۔ اس کے اشارے' جس

میں صوتی اشارے بھی شامل تھے بہت عرصے تک ذاتی ہوتے تھے۔ کوئی ایک ایسا اشارہ نہیں ہوتا تھا جسے سب سمجھ سکیں۔ پھر دھیرے دھیرے یہ اشارے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے لگے اور ایک گروہ کے لیے مشترک ہونے لگے۔ ان مشترک صوتی اشاروں کی وجہ سے انسان کے اندر یہ اہلیت پیدا ہوئی کہ اب اسے ان چیزوں پر ہاتھ رکھ کر بتانے کی ضرورت نہیں رہی جن کے بارے میں وہ کہہ رہا ہے۔ اب وہ صرف آواز کے اشارے سے ہی اس چیز کے بارے میں اپنے قریب کے کسی انسان کو بتا سکتا تھا اور وہ اسے سمجھ بھی سکتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ زبان کی ایجاد ہوئی۔

لیکن ہم یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ انسان نے بات کرنی کب شروع کی' وہ کون سی قوم ہے جس نے سب سے پہلے بات چیت شروع کی' اور اس نے ترقی کے مراحل کیوں کر طے کیے۔ مگر جب مکمل طور پر بولے جانے والے الفاظ وجود میں آ گئے تو یہ انسان کی ایجاد کردہ چیزوں میں سب سے اہم اور بیش قیمت ثابت ہوئی۔ زبان کے استعمال سے انسان کی اجتماعی زندگی میں نظم وضبط کی مفید و مہذب صورتیں پیدا ہوئیں اور اسے اجتماعی زندگی کے فوائد حاصل ہوئے جو روئے زمین پر دوسرے جانداروں کو حاصل نہ تھے یعنی وہ حیوان سے حیوان ناطق بن گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ زبان خیالات و جذبات کے اظہار کا اولین ذریعہ ہے لیکن چونکہ یہ بہت دور تک نہیں جا سکتی اس لیے یہ ناقص ہے۔ اشاراتی گفتگو بھی تاریکی اور درمیان میں کسی چیز کے حائل ہو جانے کی صورت میں ناممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ زمانہ قدیم میں ہی انسان نے ضروری باتوں کی یادداشت محفوظ رکھنے اور ان کو دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت کے تحت تحریر کی ایجاد کی۔ تحریر نے انسان کے منہ سے نکلی ہوئی آوازوں کو فضا میں گم ہونے سے بچا لیا' تحریر نے زبان کو ایک ایسا منقش علامتی جسم عطا کیا جسے پا کر وہ جاوداں اور متحرک ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور اطالوی عالم ڈاکٹر ڈرنگر نے اسے تہذیب انسانی کی کلید سے تعبیر کیا ہے۔ تحریر کی اصلیت پر غور کریں تو اندازہ ہو گا کہ انسان جن آوازوں کو منہ سے ادا کر سکتا ہے ان کے لیے نشانات مقرر کر دیے گئے ہیں اور انسانوں کے ایک طبقے یا گروہ نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ فلاں نشان فلاں آواز کو ظاہر کرے گا۔ ایسے نشانات کو حروف تہجی کہتے ہیں۔

تیس سے پچیس ہزار سال قبل مسیح کی درمیانی مدت میں جہاں پتھر کے اوزار اور حجری معاشرت کے دیگر ساز و سامان کی نشاندہی ہوتی ہے وہیں یہ بھی سراغ ملتا ہے کہ انسان اپنے اردگرد کی اشیا پر کہیں کہیں لکیریں بھی کھینچنے لگا تھا۔ چونکہ یہ لکیریں غاروں اور چٹانوں کے علاوہ بارہ سنگھے کی سینگھوں' کچھوے کے کھپروں' درخت کی چھال اور سیپ کے گھونگھوں پر مختلف مقامات سے زمین کی کھدائی میں برآمد ہوئی ہیں لہٰذا ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لکیریں انسان نے ارادتاً کھینچی ہیں۔

مصوری کی ابتدا کب ہوئی یہ بتانا مشکل ہے لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مجسم اشیا کی تصویر بنانے کی ابتدا اس طرح ہوئی ہو گی کہ جن چیزوں کا سایہ زمین پر پڑتا ہو گا ان کے سائے کے اردگرد لکیریں کھینچ دیے ہوں گے کیوں کہ کہیں کہیں سایہ کشی یعنی Silhouette کا ذکر ملتا ہے۔ زمانہ قدیم میں تصویر کشی کا تعلق مذہبی رسوم سے تھا۔ اس کے علاوہ آرائش و زیبائش کے لیے بھی اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کا تیسرا مقصد اظہار خیال ہے جس کی سب سے اولین صورت امتیازی نشانات' نشانات ملکیت اور وہ نشانات ہیں جنہیں راہ گیروں کی اطلاع کے لیے راستے میں بنایا جاتا تھا۔

چنانچہ جب ہم دس ہزار سال ق۔م کی ایک بیل کی تصویر کے ساتھ ایک لائن میں چار گول چھوٹے دائروں پر غور کرتے ہیں تو ان کے کچھ معنی نکلنے لگتے ہیں۔ مثلاً چار عدد بیل یا چالیس یا چار سو بیل پکڑے اور سدھائے گئے۔ اس طرح ان تصویروں سے معنی نکلنے لگے اور ان قدیم لکیروں و تحریروں کا رشتہ تحریر کی ابتدا سے منسوب ہوا۔ تصویر سے تصویری خط (Pictorial Writing) کی ایجاد ہوئی۔ یہاں تصویر اور تصویری خط کا فرق سمجھ لینا چاہیے۔ اچھی تصویر وہ سمجھی جاتی ہے جو اصل سے قریب تر ہو لیکن تصویری خط کا مقصد مصوری کا کمال دکھانا نہیں بلکہ کسی خیال کا ناظرین کے دماغ میں منتقل کرنا ہوتا تھا۔ اس لیے کاتب جزئیات میں نہ جا کر تصویر کے صرف اسی حصے کو پیش کرتا جس سے اس کے مقصد کی طرف اشارہ ہو جائے۔ پھر یہ تصویریں مختصر ہو کر آڑی ترچھی لائنوں کا مجموعہ بن گئیں اور اس طرح تصویری خط لکیروں کی لکھائی (Linear writing) میں بدل گیا۔ یہاں تک علامات میں کسی حد تک تصویریت باقی رہا لیکن بعد میں زود نویسی کی ضرورت کے تحت ان کی صورتیں مسخ ہو گئیں اور تصویر کا شائبہ تک باقی نہ رہا مثلاً الف (بہ معنی بیل) جس کے لیے شروع میں بیل کا سر بنایا جاتا تھا تبدیل ہوتے ہوتے صرف ایک عمودی خط رہ گیا۔

کاغذ کی ایجاد

فن تحریر سے ترسیل و ابلاغ کو جو ترقی ملی اس کی بنیادی اہمیت ہے مگر کاغذ کی ایجاد سے قبل اس کا دائرہ عمل محدود تھا۔

کاغذ کی ایجاد کا سہرا چین کے سر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چین نے ایک سو چار عیسوی میں کاغذ تیار کر لیا تھا لیکن سات سو سال تک اس راز کو دنیا سے چھپائے رکھا۔ کاغذ کی ایجاد سے قبل چٹانوں، پتھر کی سلوں، پٹیوں، پیڑ کی چھالوں اور پتوں پر لکھائی ہو رہی تھی۔ پھر گندھی ہوئی گیلی مٹی کی تختیاں زود نویسی میں معاون ہوئیں جنہیں بعد میں آگ میں پکا کر محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ لکڑی کی تختیوں اور پپرس کے مکفوفوں (چٹائیوں) پر بھی بہت دنوں تک لکھائی ہوتی رہی۔ مگر چین میں سب سے زیادہ مقبولیت ریشم پر لکھی کتابوں یا تحریروں کو حاصل ہوئی۔ چین میں اس کا دور 214 ق۔م کے قریب سے شروع ہو کر 105 عیسوی کے بعد تک چلتا رہا۔

دراصل چین کی تہذیب تحریر کے سلسلے میں بھی پوری دنیا میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ گو کہ وہاں دستیاب ہونے والی سب سے قدیم کتاب کا زمانہ 213 ق۔م بتایا جاتا ہے، جو ریشم پر تحریر ہے مگر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ چین میں تحریر کا وجود 3000 ق۔م سے ہی تھا۔ چنانچہ جب وہاں علمی و ادبی تصنیفات کی تعداد بڑھی اور ریشم کم پڑنے لگا تو کسی متبادل شے کی تلاش ہوئی۔ پہلے انہوں نے ریشم کی چندی اور بوسیدہ کپڑوں میں کوئی محلول ملا کر لبدی تیار کی جس سے چادر جیسی چیز بنائی گئی جو لکھائی کے کام آئی۔ لیکن ریشم کی قلت اور گرانی کی وجہ سے یہ صنعت ترقی نہ کر سکی۔ لہٰذا 105 عیسوی میں تسائی لن نامی چینی نے پھٹے پرانے سوتی کپڑے، لکڑی کی چھیلن، بوسیدہ جال اور اسی قسم کی دوسری بہت سی بے کار بے مصرف چیزوں کے ذریعے ایسی لبدی تیار کی جس کے ذریعے کاغذ کا وجود ممکن ہوا۔

چینیوں سے یہ راز حاصل کرنے میں سب سے پہلے عرب کامیاب ہوئے اور آٹھویں صدی عیسوی میں سمرقند میں کاغذ کا پہلا کارخانہ قائم ہوا۔

کاغذ کی ایجاد کے بعد کسی تحریر کو محفوظ رکھنے میں کافی آسانی ہوئی۔ پھر بھی ہاتھ سے تحریریں محدود پیمانے پر ہی لکھی جا سکتی تھیں اور ان کی زیادہ کاپیاں تیار کرنا بہت دقت طلب تھا۔ لہٰذا چھپائی کی ایجاد نے کاغذ کی ایجاد کو ایک وسیع پس منظر عطا کیا۔ کاغذ کی ایجاد کی طرح چھپائی کی ایجاد کا سہرا بھی چین کے سر ہے۔ چین میں لکڑی کے ٹھپوں کے ذریعے چھپائی دوسری یا تیسری صدی میں شروع ہو گئی تھی اور اس بات کے بھی ثبوت موجود ہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی میں چین کے پی شنگ (P. Sheng) نامی شخص نے ٹائپ کے حروف مٹی کے سانچوں میں ڈھال کر تیار کیے۔ ان حروف کو کمپوزنگ کے انداز میں لکڑی کے تختے پر جمایا جاتا، ان پر روشنائی لگا کر اور کاغذ رکھ کر دباؤ ڈالا جاتا۔ اس طرح چھپائی شروع ہوئی بعد کو یہی طریقہ پرنٹنگ پریس کی بنیاد بنا اور وہ بنیاد آج تک قائم ہے۔ یورپ میں اس فن نے سب سے پہلے جرمنی میں ترقی کی اور وہیں سے بقیہ یورپ میں پھیلا۔

چھپائی کے سلسلے میں یک بڑی ترقی اس وقت ہوئی جب آلوئیس سینی فیلڈر نے 1800ء میں پتھروں کی سلوں کے ذریعے چھپائی کا طریقہ ایجاد کیا، جسے لیتھوگرافی کا نام دیا گیا۔ فیلڈر گو کہ جرمنی کا رہنے والا تھا مگر اس نے اپنی ایجاد برطانیہ میں رجسٹرڈ کرائی۔ 1811ء میں اسٹیم انجن کی ایجاد ہوئی تو اسے بھی چھپائی کی مشین میں استعمال کیا گیا اور ایک ہزار اوراق فی گھنٹہ کی رفتار سے چھپائی ہونے لگی۔ لیکن بجلی سے چلنے والے انجن ایجاد ہوئے تو ان کا استعمال پریس کے لیے بھاپ کے انجن کی بہ نسبت زیادہ کیا گیا اور ان سے رفتار میں بھی اضافہ ہوا۔

بیسویں صدی میں فوٹو آفسیٹ کی چھپائی نے ٹائپ حروف کی چھپائی کو شرمندہ کر دیا لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے تقریباً چھ سو سال کا لمبا سفر طے کرنا پڑا۔ اب بہت کم وقت میں کسی تحریر کی بہت زیادہ کاپیاں تیار کی جا سکتی ہیں۔ جس سے یہ آسانی ہو گئی کہ عوام کے لیے جانکاری، اطلاعات اور تفریحی مواد دور دراز قصبوں اور دیہی علاقوں میں بھی بروقت پہنچنے لگا۔ لیکن اس ذریعہ ابلاغ میں یہ کمی تھی کہ اس سے صرف خواندہ طبقہ ہی استفادہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مطبوعہ مواد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں خرچ بھی زیادہ آتا تھا اور وقت بھی زیادہ لگتا تھا۔ چنانچہ سائنسدانوں نے بے وزن، تیز رفتار، جذبات کی شدت سے پُر آواز کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کی طرف توجہ دی۔ اس کی ابتدا ہوئی ٹیلی گراف سے۔ ٹیلی گراف کی ایجاد سے عوامی ذرائع ابلاغ کی تاریخ دو بنیادی خانوں میں بٹ گئی یعنی تحریری ذریعہ ابلاغ اور برقی ذریعہ ابلاغ۔ پھر برقی ذریعہ ابلاغ مزید تین خانوں میں تقسیم ہوا

یعنی سنیما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن۔ موجودہ صورت حال میں ان ذرائع ابلاغ کی وسعت متقاضی ہے کہ ان سب کا الگ الگ جائزہ لیا جائے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان ذرائع ابلاغ کا جائزہ لیا جائے، آیئے ڈرامے کے تعلق سے کچھ باتیں کرتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- سب سے پہلے کس طریقہ ابلاغ کی ایجاد ہوئی؟

2- کاغذ کی ایجاد سے پہلے تحریر کے لیے کن چیزوں کو استعمال کیا جاتا تھا؟

3- کاغذ کی ایجاد کا سہرا کس ملک کے سر ہے؟

16.5 ڈراما

ڈراما عوامی ابلاغ کا ایک قدیم ذریعہ ہے۔

دراصل ڈراما کسی قصے یا واقعے کو اداکاروں کے ذریعے تماشائیوں کے روبرو عملاً پیش کرنے کا نام ہے۔ ڈراما ناول یا افسانے کی طرح صرف تحریری ادب نہیں ہے جو پڑھے یا لکھے جانے کی حد تک محدود ہو۔ بلکہ اس کا لازمی رشتہ اسٹیج سے ہے۔ یہ مکمل اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی اداکاروں کے ذریعے اسٹیج پر نمائش ہو جاتی ہے۔ یعنی پیش کشی کے بغیر اس کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور پیش کش میں عمل کی اہمیت بنیادی ہوتی ہے۔ لیکن ڈرامے کے لیے جس حرکت و عمل کو ضروری قرار دیا جاتا ہے اس کے ساتھ نقل کا تصور بھی جڑا ہوا ہے۔ اور نقل مکمل ہوتی ہے ارادۂ نمائش سے۔ ارسطو اس حرکت و عمل کے لیے ایکشن کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ انگریزی زبان میں ''ایکشن'' کا مفہوم ''کرنا'' لیا جاتا ہے۔ خصوصاً جب ایکشن ڈرامے کے سلسلے میں بولا جا رہا ہو۔ ورنہ حرکت کے لیے Movement بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔

صفدر آہ کا یہ کہنا درست ہے کہ کسی بھی عمل میں ایکشن اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کے پیچھے ارادۂ نمائش موجود ہو۔ صرف عمل یا روزمرہ کے واقعات ایکشن سے خالی ہوتے ہیں۔ آپ کا کرسی پر بیٹھنا ایکشن نہیں مگر شہنشاہ اکبر کی طرح بیٹھنا ایکشن ہے۔ آپ کا باتیں کرنا ایکشن نہیں مگر ایک ماروا ڑی کی طرح باتیں کرنا ایکشن ہے۔ سنسکرت میں اس کے لیے لفظ ''روپک'' استعمال کیا جاتا ہے جو روپ سے لیا گیا ہے۔ اس سے مراد کرداروں اور کیفیات کو مشخص کرنا اور جذبے کے فطری مظاہرات کو پیش کرنا ہے۔ چونکہ اس میں کردار مختلف روپ بھر کر آتے ہیں اس لیے اسے روپک کہا جاتا ہے۔

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی چھ ہیں۔ (1) پلاٹ۔ (2) کردار۔ (3) مکالمہ۔ (4) زبان۔ (5) موسیقی۔ (6) آرائش۔ ان کی اہمیت بھی اسی ترتیب کے مطابق ہے۔

ڈرامے کو بنیادی طور پر دو اقسام میں بانٹا گیا ہے۔ (1) ٹریجڈی (المیہ) (2) کامیڈی (طربیہ)۔ پھر ان عناصر یعنی الم و طرب، دونوں کی شمولیت سے بھی ڈرامے ترتیب دیئے جانے لگے تو اسے ''الم طربیہ'' کا نام دیا گیا۔ اس کے علاوہ ڈرامے کی کچھ اور اقسام بھی ہیں جیسے میلوڈراما۔ فارس۔ ڈریم۔ اوپیرا۔ لیکن مغرب میں ڈرامے کی سب سے اعلیٰ قسم ٹریجڈی ہے۔ وہاں اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کا دوسرا نام ہی ٹریجڈی پڑ گیا۔

ڈرامے کے سلسلے میں ''وحدت ثلاثہ'' کا ذکر بھی اکثر کیا جاتا ہے۔ وحدت ثلاثہ، وحدت عمل۔ وحدت زماں اور وحدت مکاں کو کہتے ہیں مگر ان کی بہت کم ڈراما نگاروں نے پابندی کی ہے۔ ڈرامے میں مصنف اور ناظر کے درمیان کچھ سمجھوتے ہوتے ہیں جس کے تحت کچھ باتیں فرض کر لی جاتی ہیں۔ اس سمجھوتے کو ڈرامائی مفاہمت کہتے ہیں۔ جو اس طرح ہیں:

1- خود کلامی۔ اور یک طرفہ گفتگو۔

2- ڈرامے کے قصہ و کردار کسی خطہ ارض یا کسی تہذیبی روایت سے تعلق رکھتے ہوں مگر اس کی زبان وہی ہوگی جو ناظرین کی ہے۔

3- گانے میں اس وقت تک رکاوٹ نہیں آتی جب تک کہ وہ مکمل نہ ہو جائے۔ کردار جنگل، پہاڑ، دریا کہیں بھی گانا گائے، اور قصے کی صورت حال

اسے تنہا ہی دکھا رہی ہو مگر اس میں موسیقی ضرور موجود ہوگی۔

4- اسٹیج پر جو کمرہ دکھایا جاتا ہے اس کی چوتھی دیوار نہیں ہوتی۔

ڈرامے کے لیے ایسے قصے، کہانی یا واقعات کا انتخاب کرنا چاہئے جس میں کرداروں کو زیادہ سے زیادہ حرکت و عمل کا موقع مل سکے۔ کہانی کا انتخاب کرتے وقت اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس میں غیر متوقع طور پر رونما ہو کر متحیر کر دینے اور دھچکا پہنچانے والی چیزیں بھی ہوں۔ ڈراما لکھتے وقت اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ڈرامے میں کسی قصے یا واقعے کو تماشائیوں کے روبرو صرف بیان نہیں کیا جاتا بلکہ پورا واقعہ عملاً کر کے دکھایا جاتا ہے۔ عمل کرنے والے اور ناظرین دونوں گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں لہٰذا تھکتے ہیں۔ اس لیے ڈراما نگار کے پاس وقت محدود ہو جاتا ہے۔ وقت کی اس محدودیت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر تماشائی نہ ہوں تو کسی چیز کی پیش کش یا نمائش کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تماشائی ڈرامے کا ایک ضروری عنصر ہیں۔ ڈراما لکھتے وقت ان کی نفسیات کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

اسٹیج اور پیش کش کو نظر انداز کر کے کامیاب ڈراما لکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ پہلے ڈراما نگار کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کا ڈراما کس ذریعے (medium) سے پیش کیا جائے گا۔ یہ اسٹیج پر پیش کیا جائے گا۔ ریڈیو سے پیش کیا جائے گا، ٹیلی ویژن ڈراما ہوگا یا سنیما کے ذریعے پیش ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ڈراما، ڈراما ہی رہتا ہے خواہ اسے کسی ذریعے سے پیش کیا جائے۔ البتہ پیش کش کی ضروریات کے مطابق لکھنے کا ڈھنگ بدل جاتا ہے۔ اگر اسٹیج ڈراما ہے تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ اسٹیج کی کیسی سہولیات فراہم ہو سکیں گی۔ آیا یہ فل پراپرٹی اسٹیج ہوگا سیمی پراپرٹی اسٹیج ہوگا یا بغیر پراپرٹی کے نکڑ ناٹک کی قسم کا اسٹیج ہوگا۔ ہر دور کا اسٹیج اور اس کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں جو ڈرامے کی پوری ساخت کو متاثر کرتی ہیں۔ لہٰذا ڈراما نگار کو اور چیزوں کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے اسٹیج اور اس کی ضروریات کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ آج اسٹیج ڈرامے کا ایک طرز ''نکڑ ناٹک'' کافی مقبول ہے۔ نکڑ ناٹک اسٹیج کی ایک ایسی صنف ہے جس تک ناظرین نہیں جاتے بلکہ یہ خود ناظرین تک جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کی پیش کش کے لیے نہ تو کسی اسٹیج کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی اسٹیج پراپرٹی کی اور نہ ہی کسی مخصوص کاسٹیوم کی۔ اس میں ساز و سامان اور کاسٹیوم برائے نام ہوتا ہے۔ اسے کسی صحن میں، کسی چوراہے پر، کسی نکڑ پر، کسی پل کے پھاٹک پر یا کسی آفس کے لان میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ دراصل مدتوں پہلے جرمن ڈراما نگار برتول بریخت اور اس کے دوست بنجامن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سرمایہ دارانہ اجارہ داری نے سبھی ذرائع ابلاغ پر قبضہ جما لیا ہے اور ان کی منظوری کے بغیر ان ذرائع کے تعلق سے عوام تک پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایک نیا عوامی ذرائع ابلاغ قائم کیا جائے جو مہنگا نہ ہو اور جس کا بار آسانی سے عوامی ادارے اٹھا سکیں۔ اسی کوشش نے نکڑ ناٹک کو جنم دیا۔ اس نظریے کے مقبول ہونے میں آسانی یوں بھی ہوئی کہ اس وقت یہ تصور پیدا ہو رہا تھا کہ اسٹیج پر اہم ترین موجودگی انسان کی ہے۔ باقی روشنی، لباس، رنگ برنگے مناظر، ساز و سامان سب اضافی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا جا رہا تھا کہ ڈرامے کا بنیادی کام ناظرین کے تخیل کو بیدار کرنا ہے اور اس لیے ڈراما اس طرح پیش کیا جانا چاہئے کہ دیکھنے والے خود اپنے طور پر تخیل کے ذریعے اشیا، واقعات اور مناظر کو فراہم کر لیں یا ان کی خانہ پری کر لیں۔ مثلاً باغ کا سین پیش کرنا ہے تو پردے کے ذریعے یہ سین پیش کرنے کے بجائے صرف چند پھولوں اور کلیوں کے ذریعے اس طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1- ڈرامے کی تعریف بیان کیجیے؟

2- ڈرامے کی وحدت ثلاثہ کیا کیا ہیں؟

3- نکڑ ناٹک کسے کہتے ہیں؟

16.6 عوامی ذرائع ابلاغ کا تحریری ذریعہ (صحافت)

''صحافت'' عربی زبان کے لفظ ''صحف'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صفحہ، کتاب یا رسالے کے ہیں۔ جدید عربی میں صحیفہ بمعنی جریدہ اور اخبار بھی

ہے۔عبدالسلام خورشید کے مطابق صحیفے سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفے کے بعد شائع ہوتا ہے چنانچہ تمام اخبارات ورسائل صحیفے ہیں۔

صحافت کے ذریعے خبر' اطلاع اور جانکاری ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچائی جاتی ہے۔یہ انسان کی اس خواہش کی تکمیل کرتی ہے جس کے تحت وہ ہر نئی بات جاننے کے لیے بے چین رہتا ہے۔لیکن صحافت صرف اطلاع ہی نہیں دیتی بلکہ کسی مسئلے پر رائے عامہ کی وضاحت وتفصیل بھی پیش کرتی ہے۔اس کے ذریعے رائے عامہ ہموار کرنے اور متاثر کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔صحافت سماج کی بہتر تربیت بھی کرتی ہے۔انتظام اور امن کے قیام میں مدد بھی دیتی ہے اور عوامی رجحانات کے ساتھ ساتھ عوام کے حقوق کی حفاظت بھی کرتی ہے۔

صحافت کی تعریف میں یہ بات بطور خاص شامل ہے کہ جو کچھ دنیا بھر میں ہو رہا ہے اگر وہ لوگوں کی دلچسپی جانکاری اور جوش پیدا کرنے کے لائق ہے تو اسے لوگوں تک پہنچایا جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر صحافی کا یہ فرض بھی ہو جاتا ہے کہ کسی حادثے کی اصل وجہ کیا تھی؟ حادثہ کس طرح اور کیوں ہوا؟ مستقبل میں اس کا کیا اثر ہوگا؟ جیسے سوالوں پر بھی قارئین کو جانکاری فراہم کرائے۔

آج دنیا بھر میں صحافت کو مملکت کے چوتھے ستون کے امتیازی لقب سے موسوم کیا جاتا ہے۔مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ کے بعد چوتھا ستون صحافت ہے۔صحافت نہ ہو تو عوام کو کیسے پتہ چلے گا کہ پارلیمنٹ میں کیا قانون بن رہے ہیں۔ان کا پس منظر کیا ہے؟ پارٹی کے کیا اثرات ہو سکتے ہیں؟ انتظامیہ پر صحافت کی کڑی نظر نہ ہو تو افسران من مانی کرنا شروع کر دیں۔عدلیہ کی منصفانہ سرگرمیاں صحافت کے ذریعے ہی عوام تک پہنچتی ہیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جمہوریت میں صحافت کا کیا مقام ہے۔

اس وقت تحریری صحافت کا مقابلہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ہے۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ترقی کے بعد لوگوں نے سمجھا کہ اب اخبارات کے دن گئے۔یہ دن میں زیادہ سے زیادہ دو تین بار چھپ جائیں گے لیکن ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے چوبیس گھنٹے لگاتار خبریں اور ان پر تبصرے نشر اور ٹیلی کاسٹ کیے جا رہے ہیں۔پھر یہ کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے خواندگی کی شرط بھی نہیں۔اب اخبار فروخت ہوں تو کیونکر!

لیکن تحریر کا اپنا ایک مقام ہے۔اس کے اندر پائیداری ہے۔یہ بولے ہوئے الفاظ کی طرح ہوا میں معدوم نہیں ہو جاتی۔اسے جب فرصت ہو پڑھیے۔جتنی بار جی چاہے پڑھیے۔اسے حوالے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے' دستاویز کے طور پر محفوظ کیا جاسکتا ہے۔آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکتی ہیں۔اسی لیے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود صحافت کی اہمیت نہ کم ہوئی ہے اور نہ کم ہوگی۔

صحافت کی تاریخ طباعت کی ایجاد سے بہت پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ابتدا میں واقعات ہاتھ سے لکھ کر لوگوں تک پہنچائے جاتے تھے۔محمد عتیق صدیقی کے مطابق:

> ''حضرت مسیح سے کوئی 751 برس پہلے رومن راج میں روزانہ ایک قلمی خبر نامہ جاری کیا جاتا تھا۔جس میں سرکاری اطلاعیں نیز میدان جنگ کی خبریں ہوتی تھیں۔اس قلمی خبر نامے کو ''اِکٹا ڈیورینا'' کہتے تھے۔یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے جو ACTA اور DIURNA سے مرکب ہے۔اول الذکر کے معنی ہیں کاروائی اور موخر الذکر کے معنی ہیں روزانہ۔'' (محمد عتیق صدیقی۔ہندستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں' انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ 1957ء۔ص 19)

جدید اخبار نویسی کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔1566ء میں ''وینس'' (Venice) شہر میں یہ طریقہ عام تھا کہ ایک شخص عام شاہراہ پر کھڑے ہو کر بلند آواز میں لوگوں کو دلچسپی کی خبریں ایک قلمی مسودے سے پڑھ کر سناتا تھا۔یہ مسودہ حکومت کی نگرانی میں تیار کرایا جاتا تھا۔جو لوگ ان خبروں کو سنتے تھے ان سے ایک ''گزیٹا'' وصول کیا جاتا تھا جو رائج الوقت سکہ تھا اور اسی کی مناسبت سے گزٹ کا لفظ ایجاد ہوا جو اخبار یا سرکاری اعلان نامے کے معنی میں بولا اور لکھا جاتا ہے۔اس تجربے کے بعد یورپ کے دیگر ممالک میں بھی خبر نامہ کا رواج شروع ہوا۔لہٰذا سولہویں صدی کے انگلستان میں یہ رواج ہو گیا تھا کہ جب کوئی ایسا اہم واقعہ وقوع پذیر ہوتا جس سے عوام کا بھی کچھ تعلق ہو تو حکومت ایک خبر نامہ جاری کرتی اسے نیوز شیٹ کہتے تھے۔یہ بھی قلمی ہوتا تھا۔ان چیزوں کو جدید صحافت کی ابتدا ان معنوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے ذریعے خبروں کو عوام تک پہنچانے کا طریقہ شروع ہوا۔

چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد پہلا مطبوعہ خبر نامہ 1609ء میں جرمنی میں جاری کیا گیا' جس کا نام Avisa relation oderzeitung تھا۔

اس کے دو سال بعد اس طرح کا ایک چھپا ہوا خبر نامہ برطانیہ سے 1611ء میں ''نیوز فرام اسپین'' کے نام سے جاری ہوا۔ لیکن اس کی شکل وصورت اور رنگ ڈھنگ اخباری نہ تھا۔ اس لیے بہت سے لوگ اسے پہلا برطانوی اخبار نہیں مانتے۔ پہلا باضابطہ برطانوی اخبار انگریزی زبان میں 1620ء میں شائع ہوا جس کا نام ''ویکلی نیوز'' تھا۔ اس کے بعد 1631ء میں فرانس سے ''گزٹ ڈی فرانس'' جاری ہوا۔ امریکہ کا پہلا اخبار ''پبلک آکرنسیز'' تھا جو 1690ء میں بوسٹن سے جاری ہوا۔

دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ہندستان میں بھی چھاپے خانے سے پہلے خبر رسانی کے مختلف طریقے مروج تھے۔ یہاں کے ہر راجہ اور بادشاہ کے پاس خبر رسانی کا کوئی نہ کوئی نظام ضرور ہوتا تھا۔ مغلوں کے عہد میں بھی اخبار نویسی اور وقائع نگاری کو کافی فروغ ملا۔ جادوناتھ سرکار کے مطابق مغلوں کی مرکزی حکومت کو جن ذرائع سے خبریں حاصل ہوتی تھیں وہ چار ہیں:

1- وقائع نگار　　2- سوانح نگار

3- خفیہ نویس　　4- ہرکارے

چنانچہ اورنگ زیب کے زمانے میں شاہی محل کے لیے روزانہ ایک اخبار جاری کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ اورنگ زیب کے عہد سے ہی نہیں شروع ہوا تھا بلکہ پہلے سے نکلتا آیا تھا۔ اس کی نقلیں دور دراز کے امرا وغیرہ کے پاس بھی بھیجی جاتی تھیں۔ مغل عہد کے کئی سو قلمی اخبار لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

ہندستان میں مطبوعہ اخبار نکالنے کا خیال سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک برطرف کیے گئے ملازم مسٹر ولیم ایئس کو آیا۔ مگر وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کے بارہ سال بعد ایک اور انگریز جیمس اگسٹس ہکی نے ''ہکیز گزٹ'' یا ''کلکتہ جنرل ایڈورٹائیزر'' کے نام سے ایک اخبار 29/جنوری 1780ء کو نکالا۔ یہ ہندستان کا پہلا مطبوعہ انگریزی اخبار چار صفحات پر مشتمل ہفت روزہ تھا۔ اُردو کا پہلا مطبوعہ اخبار ''جام جہاں نما'' ہے جو 1822ء میں شروع ہوا۔ اخبار کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ''اخبار کا خبری حصہ'' اور ''اخبار کا غیر خبری حصہ''۔ اخبار کے خبری حصے میں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، خبریں ہی خبریں ہوتی ہیں۔ اس سے ''خبر نگاری'' ''خبروں کا ابتدائیہ''۔ ''خبروں کی ادارت'' ''نامہ نگاری'' اور نیوز ایجنسی'' جیسے موضوعات جڑ جاتے ہیں۔

گو کہ اخبار کے غیر خبری حصے سے بھی ہمیں بہت سی خبریں ملتی ہیں مگر یہ مستقل کالم کے تحت ہوتی ہیں اور یہ خبریں مختلف قسم کے قارئین کے لیے الگ الگ دلچسپیوں کی حامل ہوتی ہیں۔ اس کے زمرے میں اداریہ، کالم، فیچر، انٹرویو، قارئین کے خطوط، مضامین، کتب پر تبصرے، کھیل پروگرام۔ اشتہارات۔ میٹری مونیل، رحلت کی خبریں، بازار بھاؤ، موسم کا حال، ریڈیو، ٹیلی ویژن پروگرام، سنیما گھروں کے اشتہارات، بچوں کا صفحہ، کارٹون، ریل اور ہوائی جہاز کے اوقات، مصروفیات اور دیگر مستقل عنوانات آجاتے ہیں۔

اخبار عوام کے لیے ہوتا ہے جس میں مختلف تعلیمی سطح کے لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی زبان کو زیادہ سادہ، آسان، بے تکلف اور دل نشین ہونا چاہئے۔ اخباری تحریر حشو وزائد سے پاک ہو، اس میں جگہ کی کمی کی وجہ سے Economy of word کا اصول برتا جاتا ہے اس لیے مترادفات کی گنجائش نہیں رہتی، ویسے بھی مترادفات کی زیادتی بلاغت کے منافی ہے۔ اخباری تحریر میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی ومفہوم سمو دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ''وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے''۔ کی جگہ ''اُن کی شادی ہوگئی''، ''توقع ہے کہ اس معاہدے پر جلد دستخط ہوجائیں گے''۔ کی جگہ ''اس معاہدے پر جلد دستخط ہونے کی امید ہے''۔ لکھا جائے تو بہتر ہوگا۔

اسی طرح اخباری تحریر میں خیالات والفاظ کی تکرار کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں نامانوس، ادق اور مشکل الفاظ کے استعمال سے ہر صورت میں پرہیز کرنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ جملوں کی ساخت اور ترکیب بھی آسان ہو۔ اضافت کا استعمال کم سے کم ہو اور طویل جملوں کے بجائے مختصر جملے بنائے جائیں۔ اخباری زبان میں قواعد اور صحت الفاظ کی بھی بہت اہمیت رہتی ہے۔ اس کے جملوں کی ساخت درست اور صرف ونحو کے اصول کے مطابق ہو۔ اس میں مبہم الفاظ سے گریز کیا جائے اور مروجہ اصطلاحیں ہی استعمال ہوں۔ عربی فارسی اور انگریزی کے غریب الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔ غیر

معروف نام اور الفاظ کی وضاحت کے لیے اعراب کا سہارا لیا جائے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- ''صحافت'' کے لغوی معنی بتایئے؟

2- مغل بادشاہوں کے یہاں خبریں حاصل کرنے کے چار معروف ذرائع کون کون سے تھے؟

3- ہندستان میں پہلے مطبوعہ انگریزی اخبار کا نام بتایئے؟

4- اُردو کا پہلا مطبوعہ اخبار کون سا ہے؟

16.7 عوامی ذرائع ابلاغ کے برقی ذرائع

ٹیلی گراف، ٹیلی فون، وائرلیس

الیکٹرانک میڈیا کی ابتدا بنیادی طور پر ٹیلی گراف سے ہوئی ہے۔ ٹیلی گراف میں تار کی لائن اور بجلی کے ذریعے صوتی اشارے ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجے جاتے تھے۔ اس کی ایجاد کا سہرا Samuel.F.B Morse کے سر ہے۔ جس میں اس کے دوست الفریڈ ویل (Alfredvail) کی مدد شامل ہے۔ اس کے ذریعے پہلا پیغام 24/مئی 1844ء کو ''واشنگٹن'' سے ''بالٹی مور'' بھیجا گیا اور اس کا جواب بھی موصول ہوا۔ 1866ء میں پہلی بار بحر اٹلانٹک کے آر پار کیبل ڈالا گیا اور امریکہ۔ یورپ کے درمیان ٹیلی گراف کے ذریعے پیغام کا تبادلہ ہوا۔ یہیں سے تیز رفتار عالمی ذریعہ ابلاغ کی ابتدا ہوئی۔

ٹیلی گراف میں اشاراتی پیغام کو لمبے لمبے فاصلے تک بھیجنے کا مظاہرہ ہو گیا تو اسی طرز پر بہت سے ملکوں میں سائنس داں انسانی آواز یا کسی آواز کو ہو بہو بھیجنے میں کوشاں ہو گئے۔ اس میں اسکاٹ لینڈ کے باشندے گراہم بل کو 1876ء میں کامیابی ملی جس نے ٹیلی فون ایجاد کیا۔

ابھی تک جو چیزیں برقی ابلاغ کے لیے استعمال ہو رہی تھیں ان میں وائر یعنی تار کا استعمال ہو رہا تھا۔ اب یہ ایسا طریقہ استعمال ہوا جس میں وائر یعنی تار کا استعمال Less یعنی ترک ہو گیا اور پیغام ہوا کے ذریعے بھیجا جانے لگا۔ میکس ویل نے وائرلیس کی نظریاتی بنیاد فراہم کی، نیرچ ہرٹز نے وائرلیس موجوں کی موجودگی کا عملی مظاہرہ پیش کیا اور اٹلی کے ایک اکیس سالہ نوجوان گوگلیمو مارکونی نے اسے تجارتی فائدہ حاصل کرنے کی حد تک ترقی دے دی۔ اس نے ٹیلی گراف اور اس وقت تک کی تمام تر ایجادات کو ملا کر اس میں اپنی طرف سے کچھ چیزیں شامل کر کے ایک ایسا طریقہ ایجاد کرنے میں کامیابی حاصل کر لی جس سے فضا میں موجود برقی موجوں کے ذریعے آواز کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجا جا سکتا تھا۔

16.7.1 ریڈیو

دراصل وائرلیس کی ایجاد ایک ایسی اہم اور بنیادی ایجاد تھی جس کی وجہ سے ریڈیو، ٹرانسسٹر، ٹیلی ویژن اور ترسیلی سیٹلائٹ کا وجود میں آنا ممکن ہو سکا۔ ریڈیو نشریات سے اُردو میں جو مفہوم ادا کیا جاتا ہے، انگریزی میں اس کے لیے براڈ کاسٹنگ کا لفظ مستعمل ہے۔ بنیادی طور پر یہ زراعت سے متعلق اصطلاح ہے۔ 1922ء سے پہلے تک کی ڈکشنریوں میں اس کے معنی ''بیج کو کھیت میں بونا یا بکھیرنا'' درج ہیں۔ کہیں کہیں اس کے معنی ''بڑے رقبے میں پھیلا ہوا''۔ ''یہاں وہاں بکھرے ہوئے طریقے سے'' یا ''بڑے علاقے میں متعارف کرانا'' بھی ہیں۔ آج یہ لفظ مختلف موقعوں پر مختلف معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ مثلاً اسے بکھیرنا، پھیلانے، عام کرنے، بونے، ابلاغ کرنے، شائع کرنے، نشر کرنے اور تقریر کرنے کے معنی میں بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

وائرلیس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر ابھی تک اس کے ذریعے پیغام کوڈ (Code) میں ہی بھیجے جا رہے تھے۔ وائرلیس کی ترقی کا اگلا قدم ریڈیو ہے جس میں کسی بھی آواز کو ہو بہو سامعین تک پہنچایا جانے لگا۔ وہ بھی فضا میں موجود برقی موجوں کے ذریعے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ ریڈیو کا پہلا

پروگرام کہاں پیش کیا گیا۔ البتہ مجموعی طور پر اس میں برتری امریکہ کو حاصل ہے۔ لہٰذا 1906ء میں فیسنڈن (Fessenden) نے برنٹ راک ماس کے اپنے نجی تجرباتی اسٹیشن سے کرسمس کی شام کو ایک پروگرام نشر کیا جسے بعض لوگ پہلا پروگرام کہتے ہیں۔ باقاعدہ مسلسل ریڈیو نشریات کی شروعات امریکہ میں 2/نومبر 1920ء کو KDKA کمپنی کے پہلے ریڈیو اسٹیشن سے ہوئی۔

ٹائمس آف انڈیا نے اپنے ممبئی آفس میں 1921ء میں پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے اشتراک سے موسیقی کا ایک خصوصی پروگرام نشر کیا۔ یہ ہندستان میں ریڈیو نشریات کا پہلا تجرباتی مظاہرہ تھا۔

1922ء میں کلکتہ میں ریڈیو کلب آف بنگال نے ایک نشریاتی اسٹیشن قائم کیا جس کا پہلا پروگرام نومبر 1923ء میں نشر ہوا۔ 1924ء میں ممبئی ریڈیو کلب ممبئی میں اور 16/مئی 1924ء میں مدراس میں ''مدراس پریذڈینسی ریڈیو کلب'' کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن دو تین سال کے اندر اندر یہ کلب مالی خسارے کی وجہ سے بند ہو گئے۔ پھر انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ایک پرائیویٹ تجارتی ادارہ تھا جسے گورنمنٹ نے لائسنس دیا تھا۔ اس کمپنی نے کلکتہ اور ممبئی میں دو اسٹیشن کھولے۔ مگر 1930ء کے آتے آتے یہ کمپنی دیوالیہ ہو کر بند ہو گئی۔

یکم اپریل 1930ء میں حکومت نے ریڈیو نشریات کا انتظام اپنے ذمہ لے کر اسے نیا نام انڈین براڈ کاسٹنگ سروس دے کر محکمہ صنعت و حرفت کے حوالے کر دیا۔ 1936ء میں اس کا نام بدل کر آل انڈیا ریڈیو رکھا گیا۔ 1957ء میں پھر اس کا نام بدل کر ''آکاش وانی'' رکھا گیا۔ 23/نومبر 1997ء کو ایک خود اختیاری نشریاتی کارپوریشن Broadcasting Corporation of India کی تشکیل ہوئی جس کا نام ''پرسار بھارتی'' ہے۔

ریڈیو کی اہم اصناف اور پروگرام اس طرح ہیں۔ (1) ریڈیو ٹاک۔ (2) انٹرویو۔ (3) مذاکرہ۔ (4) کوئز۔ (5) شاعری۔ (6) ریڈیو ڈراما۔ (7) ڈاکومنٹری۔ (8) فیچر۔ (9) میگزین۔ (10) رپورٹ۔ (11) نیوز ریل۔ (12) خبریں۔ (13) ٹاک شو۔ (14) رواں تبصرہ (آنکھوں دیکھا حال)۔ (15) فلمی گانوں پر مبنی پروگرام۔ (16) فون ان پروگرام۔ (17) ریڈیو برج پروگرام۔ (18) موسیقی پروگرام۔

ریڈیائی تحریر دراصل گفتگو یا بات چیت کا ذخیرہ ہوتی ہے۔ اس کو سامعین پر یہ تاثر قائم کرنا چاہئے کہ اُس سے گفتگو کی جا رہی ہے نہ کہ کوئی تحریر پڑھی جا رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ گفتگو تحریر شدہ ہوتی ہے۔ پھر بھی اسے تاثر یہی قائم کرنا چاہئے کہ یہ فطری گفتگو ہے اور فی البدیہہ پیش کی جا رہی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب فطری اور فی البدیہہ گفتگو کا تاثر ہی قائم کرنا ہے تو پھر اسکرپٹ کی کیا ضرورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ ریڈیو میں کوئی بھی پروگرام خواہ وہ تیس سکنڈ کا ہی کیوں نہ ہو اسکرپٹ کے بغیر آگے کے مرحلے سے نہیں گزر سکتا۔ کیونکہ اسکرپٹ یہ بتاتی ہے کہ ہم کیا کہنے جا رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح رہتا ہے کہ موضوع کے تمام مباحث کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اسے دوسرا شخص بھی پیش کر سکتا ہے، پھر اسکرپٹ کے ذریعے آواز کو ہوا میں معدوم ہو جانے سے بچا لیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ آگے بھی کام آ سکے۔

جب بھی ہم ریڈیو کے لیے کچھ لکھنے کو قلم اٹھائیں تو سب سے پہلے اپنے آپ سے سوال کریں کہ ہمیں کیا کہنا ہے۔ پھر جو کچھ کہنا ہے اس کے اہم نکتوں کی ایک فہرست بنا لیں، پھر ان نکتوں پر مبنی خیالات کو ایک منطقی ربط اور مناسب ترتیب کے ساتھ لکھتے چلے جائیں۔ ریڈیو کے لیے لکھتے وقت سامعین آپ کی نظروں میں ہونے چاہئیں آیا وہ اسکول کے بچے ہوں کہ گھریلو عورتیں۔ کار میں سفر کرتا ہوا کوئی شخص ہو یا زراعت کرنے والے کسانوں کا مجمع۔ سامعین نظر میں نہ ہوں تو اکثر موقع پر کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر سامعین نظر میں ہوں تو دوٹوک فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ترسیل کرنا ہے اور یہ نہیں کرنا ہے۔ اس سے زبان کے استعمال کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے جب سامعین نظر میں ہوں گے تو ان ہی کے مطابق زبان استعمال ہوگی۔ ریڈیو تحریر گفتگو کا ذخیرہ ہوتی ہے اس لیے اس میں اُنہیں الفاظ کو استعمال کرنا چاہئے جو روزمرہ کی فطری گفتگو کا جزو ہیں نہ کہ کتابی زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کا۔ اگر یہ بات سمجھ لی جائے کہ عوامی ذرائع ابلاغ میں سامعین کو متاثر کرنا اہم نہیں ہوتا بلکہ معلومات، اطلاعات یا تجربات کا ابلاغ اہم ہے تو مقصد آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- ہندستان کی ریڈیو نشریات کا نام ''آکاش وانی'' کب پڑا؟

2- ریڈیو کی پیش رو کون کون سی چیزیں ہیں جو ریڈیو کی ایجاد میں معاون ہوئیں؟

3- ریڈیائی تحریر کی دو خصوصیات بیان کیجیے۔

16.7.2 فلم یا سنیما

سنیما دراصل ایک تصویری ابلاغ ہے۔ اس کی تاریخ فوٹو گرافی کی ابتدا و ارتقا سے جڑی ہوئی ہے۔ ابتدا میں تصویریں غیر متحرک ہوتی تھیں۔ دراصل اس کا کارنامہ تصویر کو متحرک کر دینا ہے۔ سنیما کی اساس روشنی اور سائے پر ہے۔ اکثر بچے آگ، لائٹس یا لیمپ کے سامنے ہاتھ کر کے اپنی انگلیوں کو جھکا کر بیٹھتے ہیں اس وقت دیوار پر جو سائے پڑتے ہیں، وہ خرگوش، بلی یا اڑتے ہوئے پرندے کی شکل کے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ہاتھ روشنی کے نزدیک کریں تو سائے بڑے ہو جاتے ہیں۔ بچوں کا یہ سائے کا کھیل ہی سنیما کی ابتدا کا باعث بنا۔

تصویر کو متحرک کرنے کا عمل اس تصویری کتاب سے سمجھا جا سکتا ہے جس کے ہر صفحے پر قریب قریب ایک ہی جیسی تصویریں ہوتی ہیں لیکن ہر تصویر میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ ایک تصویر میں ہاتھ تھوڑا آگے بڑھا ہوتا ہے۔ اگلی تصویر میں اس سے بھی تھوڑا سا آگے۔ اور اسی طرح تصویروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ اگر اس کتاب کے صفحوں کو ذرا جھٹکا دے کر تیزی سے پلٹا جائے تو وہ تصویر متحرک دکھائی دیتی ہے۔ کچھ ایسا ہی عمل سنیما کے پروجیکٹر کا بھی ہوتا ہے۔ جب وہ ٹرانسپیرنٹ فلم پر بنی ڈاک ٹکٹ کے سائز کی نگیٹو تصویروں کو چوبیس تصاویر (فریم) فی سکنڈ کی یکساں رفتار سے پردے پر پھینکتا ہے تو اس سے ایسا تصور ابھرتا ہے کہ یہ تصویریں حرکت کر رہی ہیں۔

سنیما کا لفظ کنیما سے ماخوذ ہے۔ سنیما ایجاد ہوا تو اسے کینیمیٹو گرافی کہا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ لفظ فرانس پہنچا تو فرانسیسی زبان میں اسے سنیمیٹو گراف بولا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ صرف سنیما رہ گیا۔ پردۂ سیمیں پر جب سایوں کی حرکت و عمل کا ردعمل کسی میں پیدا ہو جائے تو ابلاغ کا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے ناظرین اپنی ردعمل ظاہر کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ پیغام و خیال جو فلم ساز عوام تک یا ناظرین تک پہنچانا چاہتا تھا وہ پہنچ گیا ہے۔ یہیں ابلاغ کا عمل مکمل ہوا اور فلم بحیثیت عوامی ذریعہ ابلاغ وجود میں آئی۔

اس مسحور کن اور مقبول ترین ذریعہ ابلاغ کی ابتدا اس وقت ہوئی جب 28/دسمبر 1895ء کو لومیئر برادرس نے اپنے سنیمیٹو گراف کی نقاب کشائی پیرس کے گرانڈ کیفے کے تہ خانے میں کی۔ دراصل اُنہیں خوف تھا کہ ان کی اس ایجاد کی ندرت ختم نہ ہو جائے اور ایسے دیگر لوگ کہیں ان سے پہلے میدان میں نہ آ جائیں جو اس قسم کی ایجاد میں سرگرداں ہیں۔

لہٰذا پیرس کی نمائش کے بعد جلد ہی لومیئر برادرس نے اپنے ایجنٹوں کی ٹیمیں اس ایجاد کے ساتھ مختلف ممالک کے اہم مراکز میں نمائش کی غرض سے بھیجیں۔ دوسرے ملکوں کی طرح ہندستان میں بھی لومیئر برادرس کے ایجنٹوں کی ایک ٹیم نے 7/جولائی 1896ء کو ممبئی کے واٹسن ہوٹل کے ہال میں سنیمیٹو گراف کے ذریعے فلم دکھانے کی ابتدا کی۔ 7/جولائی کو ہی ٹائمس آف انڈیا میں ہندستان میں دکھائی گئی متحرک فلم کا پہلا اشتہار شائع ہوا۔ لومیئر برادرس اچھے تاجر تھے۔ ٹائمس آف انڈیا میں اپنی فلموں کے لیے برابر اشتہار دیتے رہے۔ ابتدا میں ٹکٹ کی در ایک روپیہ ہوا کرتی تھی خواہ کسی بھی درجے کے لیے ہو۔ لیکن جولائی کے آخر میں یہ اعلان کیا گیا کہ ٹکٹ در کم سے کم چار آنہ اور زیادہ سے زیادہ دو روپے ہوگی۔ ہندستان میں فلموں کے ٹکٹ کی قیمت مقرر کرنے کا یہ طریقہ ایک روایت بن گیا۔

15/اگست 1896ء کو ٹائمس آف انڈیا نے ممبئی میں لومیئر کی فلموں کے آخری شو کا اعلان کر دیا کیونکہ ان کی کشش ماند پڑنے لگی تھی۔ ہندستان میں پہلے ہی سے پارسی تھیٹر کے توسط سے تجارتی تھیٹر کی روایت قائم تھی چنانچہ ہندستانیوں کا ان فلموں سے متاثر ہو جانا بالکل فطری تھا۔ چنانچہ ہندستانیوں میں سکھارام بھاٹوڈکر سبقت لے گئے۔ وہ پہلے فوٹو گرافی کے پیشے میں تھے۔ انہوں نے لندن سے عوامی کیمرہ اور پروجیکٹر منگایا اور گھوم گھوم کر کھلی جگہوں پر باہر سے درآمد کی ہوئی فلموں کی نمائش شروع کر دی۔ انہوں نے اپنے کیمرے سے ہینگنگ گارڈن کے ایک کشتی کے مقابلے کو فلمایا بھی، اور لندن بھیج کر اس کی پروسیسنگ کرائی۔

ابتدا میں فلموں کی لمبائی بہت کم ہوا کرتی تھی۔ مگر دھیرے دھیرے اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ ''انڈین فلم'' کے مصنفین ''جیمس ولیم سن'' کی فلموں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 1899ء میں ان کی فلموں کی لمبائی 60 سے 70 فٹ ہوتی تھی۔ مگر 1902ء میں یہ بڑھ کر 280 فٹ تک پہنچ گئی۔ 1907ء سے سنیما نے بڑے بڑے شہروں میں اپنا مستقل مقام بنانا شروع کر دیا یعنی باقاعدہ پکچر ہال تعمیر ہونے لگے۔ 1913ء میں دادا صاحب پھالکے نے اپنی پہلی فلم ''راجہ ہریش چند'' مکمل کی تو یہ اپنے زمانے کی سب سے لمبی فلم 3700 فٹ کی تھی۔ ہندستانی فلمی دنیا میں اس وقت ایک انقلاب سا آ گیا جب 1931ء میں پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' دکھائی گئی۔ اس کے ابتدائی شو میں مجمع کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس کی مدد لینی پڑی۔ چار آنے والے ٹکٹ چار چار روپے میں فروخت ہوئے۔

1930ء تک ہندستانی فلم صنعت میں سب سے زیادہ اہمیت پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کی ہوتی تھی۔ اداکار صرف نوکر ہوتا تھا۔ اس وقت تک زیادہ تر کمپنیوں کا اپنا اسٹوڈیو، اپنی لیبارٹریز اور اپنا عملہ ہوتا تھا۔ مگر 1940ء میں ڈیفنس ڈپارٹمنٹ کی نئی سرمایہ کاری کی وجہ سے نئے نئے پروڈیوسر میدان میں آ گئے۔ جن کے پاس اپنا کوئی ساز و سامان نہیں ہوتا تھا وہ تمام چیزیں کرائے پر لیتے تھے۔ اُنہوں نے اداکاروں، گلوکاروں اور فلم نگاروں سے ایک ایک فلم کے لیے معاہدہ کرنا شروع کیا۔ چنانچہ یہ تمام لوگ فلم کمپنیوں کی نوکریاں چھوڑ کر آزاد پیشہ اختیار کرنے لگے اور 1941ء آتے آتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اچھے اداکار یک ساتھ چار چار فلموں میں کام کرنے لگے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی گورنمنٹ نے جنگی پروپگنڈے پر ڈاکومنٹری اور نیوز ریل بنوانا شروع کیا اور انہیں ہر سنیما گھروں کے ہر شو میں دکھانا ضروری قرار دیا۔ اس سے بھی فلم صنعت کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوا۔ قیاس غالب ہے کہ جنگ کے دوران ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکٹنگ سے کچھ لوگوں کے پاس کافی ناجائز دولت اکٹھا ہو گئی، اس کا استعمال دوسری جگہوں کی بہ نسبت فلم میں زیادہ آسان تھا۔ لہٰذا اس سے بھی ہندستانی فلمی صنعت پر معیار و مقدار کے لحاظ سے مثبت اثرات پڑے۔ 1947ء کے بعد ہندستانی فلم صنعت مختلف نشیب و فراز سے گزرتی رہی۔ کبھی ٹیکس کا بوجھ بڑھا، کبھی سنسر کا شکنجا کسا۔ مگر اس وقت سے آج تک کوئی چیز اس کی مسلسل ترقی کو نہیں روک سکی اور نہ ہی فلموں کی مقبولیت میں کوئی کمی آئی۔ آج بھی یہ عوامی تفریح کا مقبول ترین ذریعہ ہے۔

فلموں کی اقسام میں ''فیچر فلم''۔ ڈاکومنٹری''۔ ''کارٹون فلم'' اور اشتہاری فلمیں شامل ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- لفظ سنیما کس لفظ سے ماخوذ ہے؟
2- ہندستان کی پہلی متکلم فلم کا نام بتائیے؟
3- سنیما کی بنیاد کس اصول پر ہے؟

16.7.3 ٹیلی ویژن

ابلاغ کا نیا طریقہ کار محض کسی خیال، کسی فکر، کسی معلومات یا کسی تجربے کو ترسیل کرنے کا نیا طریقہ ہی نہیں ہوتا بلکہ زندگی گزارنے کا نیا طریقہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ آج کا انسان اپنے ہر دن کا آغاز نئے انداز اور نئے طریقے سے کرتا ہے اور اس میں خصوصاً ٹیلی ویژن تکنیک کی ترقی کا بڑا رول ہے۔

لفظ ٹیلی ویژن دو الفاظ کا مرکب ہے۔ ٹیلی (Tele) اور ویژن (Vision) ''ٹیلی'' ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں بہت دور سے اور ''ویژن'' لاطینی لفظ سے بنا ہے اور جس کے معنی دیکھنا یا دکھائی دینا ہے۔ مجموعی طور پر اس کے معنی ہوئے بہت دور کی چیز کو دیکھ لینا۔

ٹیلی ویژن کی ایجاد سے قبل ریڈیو تر سیلی دنیا کی حقیقت بن چکا تھا۔ خاموش متحرک فلموں کو پردے پر پیش کرنے میں بھی کامیابی مل چکی تھی۔ پھر جلد ہی سائنسدانوں نے تصویر کی حرکت کے ساتھ آواز کو ہم آہنگ کرنے کے طریقے بھی ڈھونڈھ لیے۔ جس کی وجہ سے متحرک فلمیں بیک وقت جنت نگاہ اور فردوس گوش بن گئیں۔ لیکن انہیں کسی مخصوص جگہ پردے پر ہی پیش کیا جا سکتا تھا۔ یعنی انہیں صرف پروجیکٹ کیا جا سکتا تھا، ٹیلی کاسٹ کرنا ممکن نہ تھا۔

ٹیلی ویژن نے اس محدودیت کو توڑا۔

1936ء میں بی۔بی۔سی نے دنیا کی پہلی باقاعدہ ٹیلی ویژن سروس کا آغاز کیا۔اور 1938ء آتے آتے وہ ہر قسم کے پروگراموں کو خواہ وہ اسٹوڈیو کے اندر کے ہوں یا باہر کے' صاف تصویر اور واضح پس منظر کے ساتھ پیش کرنے پر قدرت حاصل کر چکا تھا۔اس وقت کے لحاظ سے یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔لیکن 1939ء میں یکا یک بی بی سی ٹیلی ویژن سروس بند کر دی گئی جو سات جون 1946ء تک بند رہی' شاید دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے ایسا ہوا۔ برطانیہ کے علاوہ دوسرے مغربی ممالک میں بھی اس سمت میں تحقیق و جستجو جاری تھی۔فرانس روس اور جرمنی بھی کسی سے پیچھے نہ تھے مگر بنیادی طور پر اس کے دو مرکز تھے یعنی برطانیہ اور امریکہ۔امریکہ میں 1936ء میں ٹیلی ویژن نشریات کا دائرہ عمل صرف ایک میل تھا۔1937ء میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ پر لگایا گیا اینٹینا عوام کے استعمال کے لیے کھول دیا گیا۔اور "N.B.C" و "R.C.A" کمپنیاں ٹیلی ویژن کو عوام میں لے آئیں۔انہوں نے نیویارک اسٹریٹ پر ایسا انتظام کیا کہ ادھر سے گزرنے والے رک کر اس نئی ایجاد کی کرامات کو دیکھ سکیں۔امریکہ میں 1939ء میں پہلی بار ورلڈ فیر میں ٹیلی ویژن سیٹ فروخت کے لیے رکھے گئے یعنی ٹیلی ویژن عوام کے لیے دستیاب ہو گیا۔اس سال اس کا دائرہ عمل بڑھ کر 160 میل ہو گیا۔1940ء سے 1950ء کے دوران امریکہ میں ٹیلی ویژن کے سلسلے میں اہم ترقیاں ہوئیں ان میں سے ایک رنگین ٹیلی کاسٹ کی ابتدا بھی ہے۔

ہندستان میں ٹیلی ویژن کی ابتدا 15 ستمبر 1959ء میں یونیسکو کے ایک پائلٹ پروجیکٹ سے ہوئی۔اس پروجیکٹ کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ یہاں کہ پسماندہ طبقے کی تعلیم و ترقی میں ٹیلی ویژن کس حد تک مددگار ہو سکتا ہے۔اس پروجیکٹ کی ہمت افزا رپورٹ کی وجہ سے مئی 1961ء میں آل انڈیا ریڈیو نے فورڈ فاؤنڈیشن کی مدد سے ایک اور پروجیکٹ ''اسکول ٹیلی ویژن'' کے نام سے شروع کیا۔اس کے لیے دہلی اور نواح دہلی کے چھ سو اسکولوں کو چنا گیا۔ان تجربات کی کامیابی کی وجہ سے یہاں باقاعدہ ٹیلی ویژن سروس شروع کرنے کے منصوبے کو تقویت ملی۔15 اگست 1965ء کو روزانہ ٹیلی ویژن سروس شروع ہو گئی جس کے لیے دہلی میں پانچ سو واٹ کا ٹرانسمیٹر نصب کیا گیا۔اس کی پہنچ 25 کیلومیٹر تھی۔ہندستان کے پہلے صدر جناب راجندر پرشاد نے وگیان بھون میں اس کا باقاعدہ افتتاح کیا۔1975ء میں ہندستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں وہ اہم موڑ آیا جس نے اس ذریعہ ترسیل کی مقبولیت کو زمین سے اٹھا کر آسمانوں کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور یہ تھا سٹیلائٹ کے استعمال کی ابتدا۔15/اگست 1982ء کا دن بھی ہندستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس دن دوردرشن نے رنگین ٹیلی ویژن نشریات کی ابتدا کی۔چنانچہ اس دن یوم آزادی کی تقریبات کو لال قلعے سے براہ راست رنگین ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔اس سال نومبر میں دوردرشن نے نویں ایشیائی کھیلوں کو جو ہندستان میں منعقد ہو رہے تھے' براہ راست رنگین نشر کیا۔

1976ء میں ٹیلی ویژن کا محکمہ ریڈیو سے الگ ہوا اور دوردرشن کا الگ وجود قائم ہوا۔نیشنل پروگرام 1982ء میں شروع ہوئے۔اس کے بعد سے ٹیلی ویژن کی ترقی کی رفتار کافی تیز ہو گئی۔خصوصاً پچھلی صدی کی آخری دہائی میں اس نے روز افزوں ترقی کی۔

ٹیلی ویژن کی اہم اصناف میں مندرجہ ذیل چیزیں آجاتی ہیں:

1-ڈاکومنٹری 2-فیچر 3-انٹرویو 4-مذاکرہ یا مباحثہ

5-پینل مذاکرہ 6-براہ راست یا رواں پیش کش 7-ٹیلی ویژن ڈراما اور سیریلس 8-سوپ اوپیرا

ٹیلی ویژن کی کسی صنف کو لکھنے سے پہلے ریسرچ کرنا ضروری ہوتا ہے۔اسکرپٹ رائٹر ریسرچ کے ذریعے موضوع سے متعلق معلومات حاصل کر کے انہیں منظم کرتا ہے۔ریسرچ سے اسکرپٹ سے متعلق بہت سی چیزوں کے بارے میں معلومات بڑھتی ہیں۔اچھی ریسرچ کے بعد اسکرپٹ لکھنا آسان ہو جاتا ہے۔تخلیقیت پیدا ہوتی ہے۔اور اس سے لطف حاصل ہوتا ہے۔بغیر ریسرچ کے اسکرپٹ لکھنا اکثر ذہن پر بار ہو جاتا ہے۔جلد اکتاہٹ اور الجھن ہونے لگتی ہے اور وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہے۔لکھنے والا اسی الجھن میں رہتا ہے کہ اسے کیا اور کیسے ترسیل کرنا ہے۔لہٰذا یہ ایک فرحت بخش تخلیقی عمل ہونے کے بجائے ایک پریشان کن مرحلہ بن جاتا ہے۔ان تمام چیزوں سے بچنے کے لیے ریسرچ کے دوران دو قسم کی معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ایک تو یہ کہ پروگرام کو کس طرح ترتیب دیں۔دوسرے موضوع کے بارے میں مکمل معلومات۔ریسرچ کے دوران ناظرین کے تفصیلی تجزیے کے ساتھ یہ معلوم کر لینا بھی مفید ہوتا ہے کہ مجوزہ پروگرام کا مقصد کیا ہے۔اس کے بعد ریسرچ کے ذریعے حاصل شدہ معلومات و اطلاعات کو منطقی ترتیب کے ساتھ منظم

کیا جاتا ہے۔یعنی موضوع کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے۔خاکہ تین حصوں پر منحصر ہوتا ہے۔ابتدا' وسط اور اختتام۔ابتدا میں پورے مسئلے کا تعارف اس طرح کرایا جاتا ہے کہ اس میں بنیادی چیزیں بھی آجاتی ہیں' اور ناظرین کی دلچسپی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔وسط میں موضوع پر گہرائی کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے اور اختتام میں وسط میں دیے گئے مواد یا معلومات سے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن کی کسی بھی صنف کے لیے لکھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں صاف رہنی چاہئے کہ پرنٹ میڈیا اور ویزول میڈیا کی تحریر میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔یہ فرق بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہنا مختلف ہے دکھانے سے۔جب کچھ کہتے یا لکھتے ہیں تو آپ موضوع کی الفاظ کے ذریعے صراحت کرتے ہیں۔اس میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو پڑھنے والے یا سننے والے کے ذہن میں وہی تصور پیدا کرے جو آپ ترسیل کرنا چاہتے ہیں۔لیکن جب کچھ تصویری ذریعے یعنی ٹیلی ویژن کے لیے لکھا جاتا ہے تو لکھنے والا کہنے پر کم توجہ دیتا ہے اور دکھانے پر زیادہ۔یہاں الفاظ ناظر کی قوت متخیلہ کو متحرک کرنے کے کام نہیں آتے۔لہٰذا بصری ہیئت کے اسکرپٹ میں الفاظ صرف آواز اور متحرک تصویر کی وضاحت کے ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔یہاں پیغام کی ترسیل آواز اور تصویر سے ہوتی ہے۔یہاں لکھنے والے کے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہ کاغذ پر کون سے الفاظ تحریر کرے بلکہ اس کے سامنے یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اسکرین پر کون سی تصویر تخلیق کرے۔ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے کے لیے مکالمے اور بیانیہ لکھنے کی اہلیت ضروری ہے۔گو کہ ٹیلی ویژن میں مکالمے اور بیانیے کی اہمیت ثانوی ہوتی ہے کیونکہ اس میں اجسام کو پیش کر دیا جاتا ہے۔انہیں بیان بھی کیا جائے تو صورت حال مکمل ہوجاتی ہے۔پھر بھی مکالمے اور بیانیے کے بغیر کسی صنف کا مکمل ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- ''ٹیلی ویژن'' کن دو الفاظ سے مل کر بنا ہے؟ ان کے معنی بتائیے۔

2- ہندستان میں ٹیلی ویژن کی ابتدا کب ہوئی؟

3- ہندستان میں پہلا رنگین ٹیلی ویژن کب شروع ہوا؟

4- ٹیلی ویژن کی دو اہم اصناف کے نام لکھیے۔

16.8 خلاصہ

اس اکائی میں بتایا گیا ہے کہ عوامی ذرائع ابلاغ کا مفہوم کیا ہے۔اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔اس کی اقسام کیا کیا ہیں۔مختصر طور پر اس کی ابتدا اور ارتقا کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جس میں زبان کی ایجاد' تحریر کی ایجاد' کاغذ کی ایجاد' چھاپے خانے کی ایجاد پر خصوصیت سے گفتگو کی گئی ہے۔لیکن یہ سب تو عوامی ذرائع ابلاغ کا پس منظر تھا۔گرچہ عوامی ذرائع ابلاغ کا باقاعدہ ارتقا سب سے پہلے صحافت سے ہوا۔لیکن ڈراما بھی عوامی ابلاغ کا ایک قدیم ذریعہ ہے اس لیے پہلے ڈرامے پر بات کی گئی ہے۔اس کے بعد صحافت کا ذکر ہے جس میں صحافت کی تعریف' صحافت کی ابتدا ارتقا اور اخبار کے خبری و غیر خبری حصے کے اہم موضوعات کا مختصراً ذکر کر دیا گیا ہے۔پھر عوامی ذرائع ابلاغ کے برقی ذرائع کی باری آتی ہے جس میں سب سے پہلے سنیما پر گفتگو کی گئی ہے پھر ریڈیو پر۔ریڈیو کی ایجاد سے پہلے جو چیزیں اس کی ایجاد میں معاون ہوئی ہیں ان کو بھی اس میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔پھر ریڈیو تحریر کی خصوصیات بطور خاص بیان کی گئی ہیں۔اس کے بعد ٹیلی ویژن کا تعارف اختصار سے کرایا گیا ہے۔

یہ موضوع کافی وسیع ہے۔پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ عوامی ذرائع ابلاغ سے متعلق ضروری چیزوں کا تعارف ہوجائے اور آپ اس کی بنیادی باتوں سے واقف ہوجائیں۔صحافت' ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ پر علاحدہ اکائیوں میں آپ کو ان کی تفصیلات سے واقف کرایا جائے گا۔

16.9 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ابلاغیات اوراس کی قسموں پر ایک مضمون لکھیے۔
2. عوامی ذرائع ابلاغ کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔
3. ابلاغیات کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ہندستان میں ریڈیو کی ابتدا اور ارتقا پر نوٹ لکھیے۔
2. ڈراما لکھتے وقت کن باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے؟
3. ٹیلی ویژن کا میڈیم کیا ہے؟ اس کے لیے لکھتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ واضح کیجیے۔
4. صحافت کی تعریف کرتے ہوئے اس کے اہم موضوعات بیان کیجیے۔
5. کاغذ کی ایجاد سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

16.10 فرہنگ

ارفع واعلیٰ	اونچا، بلند	شعور	سمجھ
سرایت	داخل ہوجانا	گرفت	پکڑ
ہم جنس	ایک ہی طرح کے	اظہار ذات	اپنے خیالات کو ظاہر کرنا
جبلت	فطرت، اصلی طبیعت	تشکیلی دور	بننے کا زمانہ
حسیات	محسوس کرنے کی قوت	وقوع پذیر رہنا	واقع ہونا
بصارت	دیکھنے کی طاقت	پوشیدہ	چھپا ہوا
قاصر	مجبور، ناچار	روئے زمین	زمین پر
ناطق	بولنے والا	منقش	نقش ونگار بنا ہوا
جاوداں	ہمیشگی	کلید	کنجی
زودنویسی	جلد لکھنا۔ تیز لکھنا	مسخ	بگڑی ہوئی
عمودی	لمبی، سیدھی	قارئین	پڑھنے والے
رشتہ ازدواج	شادی کا رشتہ	نامانوس	اجنبی
ادق	مشکل	اعراب	زیر زبر پیش تشدید وغیرہ

16.11 سفارش کردہ کتابیں

1-امداد صابری — تاریخ صحافت اُردو۔ پانچ جلدیں — دہلی 1953ء

2-انور دہلوی — اُردو صحافت (مرتبہ) — دہلی اُردو اکادمی، 1987ء

3-اے۔ کے چٹرجی — عوامی ترسیل — نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی، 1984ء

4-اخلاق اثر	نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	مکتبہ جامعہ نئی دہلی 1982ء
5-انجم عثمانی	ٹیلی ویژن نشریات	مکتبہ جامعہ نئی دہلی 1994ء
6- جمیل اختر	اصطلاحات ذرائع ابلاغ دو جلدیں	انٹرنیشنل اُردو فاؤنڈیشن نئی دہلی 2002ء
7-سید اقبال قادری	رہبر اخبار نویسی	ترقی اُردو بیورو نئی دہلی 1989ء
8-سید ضیا اللہ	اُردو صحافت ترجمہ و ادارت	کرناٹک اُردو اکیڈمی بنگلور 1994ء
9-شافع قدوائی	خبر نگاری	علی گڑھ 1988ء
10-محمد عتیق صدیقی	ہندستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں	انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ 1957ء
11-محمد شاہد حسین	ابلاغیات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2003ء
12-نادر علی خاں	اُردو صحافت کی تاریخ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1987ء

اکائی 17 : اُردو صحافت : اخبارات کا آغاز و ارتقا

ساخت

17.1 تمہید

17.2 اخبارات کی شروعات

17.3 یورپ اور امریکہ میں اخبارات کی ابتدا

17.4 ہندستان میں اُردو صحافت کا آغاز وارتقا

17.4.1 صحافت کی ابتدا

17.4.2 اُردو صحافت کا آغاز

17.4.3 1857ء کے بعد کے اُردو اخبارات

17.4.4 بیسویں صدی کے اخبارات

17.5.5 آزادی کے بعد کے اخبارات

17.5.6 جدید دور

17.5 خلاصہ

17.6 نمونہ امتحانی سوالات

17.7 فرہنگ

17.8 سفارش کردہ کتابیں

17.1 تمہید

اخبارات سماج کا آئینہ ہوتے ہیں۔ کسی بھی ملک میں اخبارات کی ترقی سے وہاں کی سماجی ترقی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سترہویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی یورپ میں اخبار کی بنیاد پڑی۔ ہندستان میں سب سے پہلے انگریزی میں پھر بنگالی اور اس کے بعد اُردو زبان میں صحافت کی شروعات ہوئی۔ بعد میں دیگر ہندستانی زبانوں میں صحافت کا آغاز ہوا۔

اس اکائی میں اُردو صحافت کے آغاز وارتقا سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اخبارات کی ابتدا کیسے ہوئی اور اُردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں اخبارات کب سے شائع ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد اُردو صحافت کا آغاز اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ یہ ذہن نشین ہو جائے کہ انیسویں صدی میں اُردو اخبارات کی شروعات سے اب تک کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ اپنی معلومات کی جانچ کے لیے چند سوالات دیے گئے ہیں۔ نمونے کے طور پر امتحانی سوالات بھی دیے جا رہے ہیں۔ فرہنگ کے تحت مشکل لفظوں کے معنی دیے گئے ہیں۔ صحافت سے متعلق کتابوں کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے جن کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

17.2 اخبارات کی شروعات

کاغذ، قلم، روشنائی اور تحریر کے وجود میں آنے سے پہلے بھی خبریں بنتی اور پھیلتی تھیں کیونکہ خبر رکھنا اور خبر جاننا انسان کا ازلی اور فطری شوق ہے۔ معاشرے کا قیام، تہذیب وتمدن، مدنی زندگی کی شروعات، مشاہدہ اور علم میں اضافہ، تجسس اور جاننے کی خواہش نے علم وعمل کے میدان کو وسعت بخشی اور

اسے پھیلانے کے لیے نئے طریقے ایجاد کیے۔ انسان کہیں بھی رہے اپنے عزیزوں' رشتہ داروں' دوست واحباب' نیز اپنے شہر اور دور دراز کے علاقوں کے حالات کے بارے میں معلومات رکھنا اور اپنے ماحول سے باخبر رہنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسی ضرورت نے خطوط نویسی کی ایجاد کی اور اسی ضرورت نے اخبارات کے لیے بھی زمین ہموار کی۔

پیغام رسانی سے خبروں تک آتے آتے انسان نے حیرت انگیز ترقی کی۔ لیکن یہ دلچسپ کہانی سینکڑوں سال پر محیط ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کو باخبر رکھنے اور سرکاری احکامات واطلاعات پہنچانے کے لیے منادی سے کام لیا جاتا تھا۔ مذہبی مقامات کی بھی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ عبادت گاہوں کے صدر دروازے پر اہم خبریں' حالات حاضرہ اور اعلانات واحکامات کندہ کرادیے جاتے تھے کیونکہ اس وقت عام لوگوں کے جمع ہونے کی یہی سب سے اہم جگہ سمجھی جاتی تھی۔ تربیت یافتہ کبوتروں سے بھی خبر رسانی وخبر گیری کا کام لیا جاتا تھا۔ ویسے چھپے ہوئے اخبارات سے پہلے قلمی اخبارات کا طریقہ بھی رائج تھا۔

اخبارات کے سلسلے میں شعوری طور پر تاریخ میں جن کوششوں کا سب سے پہلے ذکر ملتا ہے ان میں 'رومی ایکٹا' بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ قدیم روم کے ہر شہر میں کاؤنسلیں ہوا کرتی تھیں جنہیں سینیٹ کہا جاتا تھا۔ سینیٹ کے اجلاس کی کارروائیوں کا ریکارڈ رکھنے کے لیے کتاب یا رسالے کی شکل میں ایک روداد تیار کرلی جاتی تھی جس کی بہت سی نقلیں تیار کر کے شہر کے اہم مقامات یا لائبریریوں میں لوگوں کے پڑھنے کے لیے رکھ دی جاتی تھیں۔ اخبار کی طرح اس ابتدائی روداد کا نام تھا ''ایکٹا سینیٹس (Acta Sanatus)۔ اس میں 'ایکٹا' بمعنی 'روداد' اور 'سینیٹس' کا مطلب ہے سینیٹ سے تعلق رکھنے والا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں اس کی شروعات ہوئی۔ اسی طرح سن 60 قبل مسیح میں جولیس سیزر نے ضروری سرکاری اعلانات اور سیاسی خبروں کو عوام تک پہنچانے کے لیے روزانہ ایک پرچہ شروع کیا جس کا نام تھا ''ایکٹا ڈائیورنا (Acta Diurna) اس میں 'ڈائیورنا' کا مطلب ہے 'روزانہ'۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک تختے پر اسے چسپاں کر کے اہم گزرگاہوں پر رکھ دیا جاتا تھا۔ اب تک اسی اطلاعی پرچے کو سب سے پہلا عوامی اخبار کہا جاتا ہے۔ جو تقریباً ساڑھے تین سو سال تک نکلتا رہا۔ آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل چین میں تانگ خاندان کے کسی بادشاہ نے ایک اخبار جاری کیا جس کا نام تھا 'تی پاؤ' (یعنی محل کی خبریں)۔ اس کے ذریعے دور دراز کے علاقوں میں تعینات افسروں کو سرکاری احکام' اطلاعات اور دربار محل کی خبریں پہنچائی جاتی تھیں۔ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کا اخبار سینکڑوں سال تک جاری رہا۔

ہندستان میں مسلمان بادشاہوں نے اپنی خبر رسانی کو مستحکم کرنے کے لیے ہر صوبے میں ''وقائع نویس'' مقرر کر رکھا تھا جو وہاں کے خاص خاص واقعات کی تفصیل جمع کر کے بادشاہ کو بھیجتا رہتا تھا۔ مغل بادشاہوں نے اس نظام کو مزید مستحکم کیا اور بہتر بنایا۔ بعد میں 'وقائع نویس' کے عہدے کے ساتھ ساتھ 'سوانح نویس' اور 'خفیہ نویس' بھی مقرر کیے گئے۔ مغل بادشاہ اکبر کے عہد میں ایک قلمی اخبار ''اخبار دربار معلّٰی'' نکلنا شروع ہوا۔ بہت سے راجے مہاراجے' نواب اور امرا نے مغل بادشاہوں کے دربار میں اپنے وکیل مقرر کر رکھے تھے' جو دربار سے جاری ہونے والے احکام' اطلاعات اور بادشاہ سے وابستہ خبروں کی تفصیل مقررہ وقت پر انہیں بھیجتے رہتے تھے۔ کئی سو سال پہلے جو کام چینی بادشاہوں نے شروع کیا تھا' مغلوں نے بھی اس سلسلے میں تقریباً وہی کام کیا۔ شاہجہاں کے زمانے میں اس کا نام ''اخبار دارالخلافہ شاہجہان آباد'' رکھا گیا۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور تک یہ اخبار کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. پرانے زمانے میں اطلاعات پہنچانے کے کیا کیا طریقے رائج تھے؟
2. رومی ایکٹا کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. مغل بادشاہوں نے خبر رسانی کا کیا طریقہ اپنایا؟

17.3 یورپ اور امریکہ میں اخبارات کی ابتدا

نشاۃ ثانیہ کے بعد جب یورپ میں تجارت کا جال سا بچھ گیا' تعلیمی ادارے کھلنے لگے اور علم اور کتابوں کا چرچا عام ہوگیا' تو اس دوران وہاں

بہترین ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار پیدا ہوئے۔ رہن سہن میں بھی تبدیلیاں آئیں اور یورپ عام طور پر ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ پندرہویں صدی کے آخری حصے میں لوگوں میں خبروں کا رجحان بننے لگا تھا۔ لندن کے بازاروں میں خبریں سنانے والے گھنٹیاں بجا بجا کر لوگوں کو جمع کرتے اور بازی گروں کی طرح کبھی گا گا کر اور کبھی ڈرامے کے انداز میں خبریں سناتے تھے۔ 1566ء میں وینس (Venice) 'جواب اٹلی کا ایک شہر ہے' میں یہ طریقہ رائج تھا کہ حکومت کی نگرانی میں تیار ہونے والا ہاتھ سے لکھا ہوا اخبار شہر میں مختلف جگہوں پر ایک شخص بلند آواز میں پڑھ کر سناتا اور سننے والوں سے وینس کا ایک چھوٹا سکہ "گزٹ" (Gzetta) وصول کرتا تھا۔ بعد میں اسی مناسبت سے 'گزٹ' کا لفظ اخبار کے معنوں میں بولا اور لکھا جانے لگا۔

سولہویں صدی میں یورپ کے ممالک جنگوں میں مصروف تھے لہٰذا لوگ چاہتے تھے کہ انہیں سرحد کی خبریں ملتی رہیں۔ اس زمانے میں جرمنی، ہالینڈ، بلجیم وغیرہ میں کتابوں کا کاروبار کرنے والے لوگ ایسے پرچے یا پمفلٹ چھاپ دیا کرتے تھے جس میں زیادہ تر جنگ کی ہی خبریں ہوتی تھیں، کبھی کبھی سیاسی خبر بھی چھاپ دی جاتی تھی۔ وقتاً فوقتاً پچھلے مہینوں کی کچھ خبریں جمع کر کے ایک کتابچہ تیار کر لیا جاتا تھا۔

یورپ میں سب سے پہلا اخباری پمفلٹ یا خبر نامہ جرمنی میں 1609ء میں جاری ہوا' جواب بھی ریکارڈ میں موجود ہے جس کا نام "Avisa Relation Oderzeitung" ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں بلجیم سے بھی ایسے ہی پرچے نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ یورپ کے تمام ملکوں میں اخباروں کی شروعات اور ان کی توسیع تقریباً ایک جیسی ہی رہی ہے۔

انگلینڈ میں 2 ستمبر 1620ء کو پہلا اخبار چہ نکلا جس کا نام "کورانٹو" (Coranto) تھا اور جس کا مطلب ہے 'دوڑنا'۔ یہ پہلا کورانٹو دس انچ لمبا اور چھ انچ چوڑا تھا۔ اس میں کاغذ کے ایک طرف چھپائی ہوتی تھی۔ آئندہ کچھ برسوں میں بہت سے 'کورانٹو' پابندی سے جاری ہونے لگے اور انگلینڈ میں ایسے چھوٹے اخبارات فیشن بن گئے۔

1665ء میں حکومت کی سرپرستی میں "آکسفورڈ گزٹ" نکلا۔ ایک سال بعد اس کا نام "لندن گزٹ" ہو گیا۔ اسے انگلینڈ کا پہلا باقاعدہ اخبار مانا جاتا ہے اور اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے آج کے اخبار سے ملتا جلتا تھا۔ یہ اخبار بڑے کاغذ پر چھپتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے شروع یعنی 1702ء میں "ڈیلی کورنٹ" (Daily Courant) کے نام سے بڑے کاغذ پر دو کالموں میں پہلا روزنامچہ جاری ہوا۔ جسے برطانیہ کا پہلا کامیاب روزنامچہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد مشہور انگریزی ناول "رابنسن کروسو" کے مصنف اور بابائے صحافت ڈینیل ڈیفو اور اُن کے کچھ ساتھیوں مثلاً جوناتھن سوفٹ ("گلیورس ٹریولیس" کے مصنف) وغیرہ نے مل کر 1719ء میں اخبار "ڈیلی پوسٹ" پھر "لندن پوسٹ" نکالا۔

1769ء میں ولیم ووڈفال نے لندن سے 'مارننگ کرانیکل' جاری کیا۔ اس اخبار کی اشاعت سے برطانوی صحافت کا باقاعدہ آغاز سمجھنا چاہیے۔ ووڈفال خاندان کے سبھی لوگ صحافت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ولیم ووڈفال کو قدرت نے غیر معمولی یادداشت عطا کی تھی اسی وجہ سے ان کا نام ولیم میموری (یادداشت) پڑ گیا تھا۔

کچھ برسوں بعد "دی ٹائمس' وجود میں آیا جس نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی۔ اسے جان والٹر نے 1788ء میں لندن سے شروع کیا۔ ہوا یوں کہ یکم جنوری 1785ء ہی میں جان والٹر نے "ڈیلی یونیورسل رجسٹر (Daily Universal Register) کے نام سے ایک روزانہ اخبار شروع کر دیا تھا۔ اس اخبار کا نام 1788ء میں بدل کر "دی ٹائمس (The Time) کر دیا گیا جو اب بھی اسی نام سے نکل رہا ہے۔ اپنے اخبار کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے جان والٹر نے ملک اور بیرون ممالک بہت سے رپورٹر تعینات کیے۔ ٹائمس ہی نے سب سے پہلے دوسرے ملکوں میں رپورٹر بھیجنے کی شروعات کی۔ طباعت کے مرحلے سے لے کر خبروں کے حصول اور دنیا کی نئی نئی ایجادوں سے استفادہ حاصل کرنے میں ٹائمس ہمیشہ پیش پیش رہا۔

آگے چل کر مزاحیہ اخبارات بھی نکلنے شروع ہو گئے جنہوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ 1841ء میں ہنری مے ہیو (Henry Mayhew) نے لندن سے ایک مزاحیہ اخبار "دی پنچ' (The Punch) نکالا۔ یہ اخبار بہت مشہور ہوا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ سنجیدہ سے سنجیدہ خبروں میں بھی مزاح کا پہلو نکال لیتا تھا۔ ملک کے بہترین لکھنے والے مضمون نگار اور شاعر اس اخبار سے وابستہ تھے۔ بعد میں اسی اخبار کی طرز پر ہندستان میں بھی "اودھ پنچ" کے نام سے ایک اخبار نکالا گیا تھا۔ اسے منشی سجاد حسین نے لکھنو سے اُردو میں جاری کیا تھا۔

الفریڈ ہارمس ورتھ (Alfred Harmsworth) نے 1888ء میں "Answers" کے نام سے ایک ہفتہ وار جاری کیا جو بہت مقبول ہوا۔

اس کے بعد انہوں نے ''کامک کٹس'' (Comic Cuts) کے نام سے آٹھ صفحوں کے ایک کامکس اخبار کی شروعات کی۔ اس کی مقبولیت اس حد تک بڑھی کہ انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں اجلاس کے دوران ایک ممبر کو چھپ کر یہ کامکس پڑھتے دیکھا گیا تھا۔ ہارمس ورتھ نے خواتین اور بچوں کے لیے بھی رسالے اور میگزین جاری کیے۔ بعد میں انہوں نے انگلینڈ کا مشہور زمانہ اخبار ''ٹائمس'' بھی خرید لیا تھا۔

1817ء میں ''اسکاٹس مین'' ایڈنبرا سے جاری ہوا۔ یہ اخبار 1855ء میں روزنامہ ہوا۔ ''گارجین'' اخبار بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ پہلے یہ مانچسٹر گارجین کہلاتا تھا۔ اسی طرح ''ڈیلی ٹیلی گراف'' 1855ء میں جاری ہوا۔ لارڈ بیور بروک نے 1900ء میں ''ڈیلی ایکسپریس'' جاری کیا اور 1912ء میں ''ڈیلی ہیرالڈ'' نکلنا شروع ہوا جو بہت مقبول ہوا اور بعد میں ''دی سن'' (The Sun) کے نام سے نکلنے لگا۔ ''ڈیلی مرر'' 1903ء میں اور ''ڈیلی اسکیچ'' 1909ء میں جاری ہوا۔ انگلینڈ میں آج بہت سے قومی اور علاقائی نوعیت کے اخبارات نکل رہے ہیں جن کا سرکولیشن بہت زیادہ ہوتا ہے۔

امریکہ میں پریس کا داخلہ انگلینڈ ہی کے ذریعے ہوا۔ انگلینڈ میں اخبارات کی شروعات سے تقریباً ستر سال بعد امریکہ میں اخبارات نکالنے کی کوشش کی گئی۔ 1690ء میں بنجامن ہیرس (Benjamin Harris) نے ''پبلک آکرنسیز'' (Public Occurences) کے نام سے امریکہ کا پہلا اخبار بوسٹن شہر سے جاری کیا۔ وہاں کا دوسرا اخبار ''نیوز لیٹر'' کے نام سے 1704ء میں اور تیسرا اخبار فلاڈلفیا شہر سے 1719ء میں ''ویکلی مرکری'' کے نام سے جاری ہوا۔ 1722ء میں اخبار ''نیو انگلینڈ کورنٹ'' بوسٹن سے اور 1725ء میں بریڈفورڈ سے ''نیویارک گزٹ'' شائع ہوا۔ 1733ء میں ''جینٹرس نیویارک ویکلی جرنل'' نیویارک سے جاری کیا گیا۔ 1765ء تک دیگر بہت سے اخبارات نکلنے لگے۔ کتابوں کے پبلشر، بک سیلر اور سرکاری افسران کے علاوہ پوسٹ ماسٹروں نے بھی اخبارات نکالنا شروع کر دیا تھا۔

یہ اخبارات ابتدائی دور کے تھے۔ امریکہ کی آزادی کے بعد ان میں اور تیزی سے اضافہ ہوا۔ بہت سے اخبارات کو دنیا بھر میں شہرت حاصل ہوئی۔ امریکہ کے آج نکلنے والے اخباروں میں نیویارک ٹائمس، نیویارک پوسٹ، واشنگٹن پوسٹ، وال اسٹریٹ جرنل، نیویارک نیوز، میامی نیوز، لاس اینجلس ٹائمس، شکاگو سن ٹائمس، شکاگو ٹریبون، ڈیلاس نیوز، بالٹی مورسن، بوسٹن گلوب، شکاگو نیوز وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اخبارات کی اشاعت میں امریکہ آج سرفہرست ہے اور ان کی تعداد اشاعت بھی بہت زیادہ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جرمنی سے پہلا اخبار کب شائع ہوا؟ اس کا نام بتائیے۔
2. انگلینڈ کے ابتدائی اخبارات کون کون سے ہیں؟
3. لندن کے اخبار ''دی ٹائمس'' کا نام پہلے کیا تھا؟
4. ولیم وڈفال کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
5. ہنری مے ہیو اور الفریڈ ہارمس ورتھ نے لندن سے کون سے مزاحیہ اخبارات نکالے؟
6. امریکہ کے ابتدائی اخبارات کے نام بتائیے۔

17.4 ہندستان میں اُردو صحافت کا آغاز وارتقا

17.4.1 صحافت کی ابتدا

ہندستان میں سب سے پہلا اخبار 29 جنوری 1780ء کو جیمس آگسٹس ہکی (James Augustus Hicky) نے ''کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر (Calcutta General Advertiser) یا ''ہکی کا بنگال گزٹ (Hicky's Bengal Gazette) کے نام سے انگریزی زبان میں جاری کیا جو عام طور پر ''ہکی گزٹ (Hicky's Gazette) کے نام سے مشہور ہے۔ اس اخبار کے بیالیس سال بعد ہندستان میں اُردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' کے نام سے جاری ہوا۔ اس وقت تک کئی اخبارات نکل چکے تھے۔ مثلاً بنگال پریسڈنسی سے ''انڈیا گزٹ'' (1780ء) ''کلکتہ گزٹ''

(1784ء) بنگال جرنل (1785ء)' انڈین ورلڈ (1791ء) بنگال ہرکارو (1795ء)' ایشیاٹک مرر' مارننگ پوسٹ' ٹیلی گراف اور اورینٹل اسٹار (سبھی 1799ء)' مدراس پریسیڈنسی سے مدراس کوریئر (1785ء)' مدراس گزٹ (1795ء)' انڈیا ہیرالڈ (1795ء)' اسی طرح بمبئی پریسیڈنسی سے ''بامبے ہرالڈ'' (1789ء)' بمبئی گزٹ اور بامبے کوریئر (1790ء) جیسے اخبارات نکل رہے تھے۔

17.4.2 اُردو صحافت کا آغاز

'جام جہاں نما' اُردو کا اولین مطبوعہ اخبار ہے' جو 27 مارچ 1822ء کو کلکتہ سے جاری کیا گیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ مرزا پوری اور مالک ہری ہردت تھے اور یہ ولیم ہوپکنس پیٹرس کے مشن پریس سے چھپتا تھا۔ یہ ایک ہفتہ وار اخبار تھا۔ شروع میں 8x11 انچ تقطیع میں چھ صفحات پر مشتمل تھا۔ اخبار کے ہر صفحے پر دو کالم اور ہر کالم میں عام طور پر 22 سطریں ہوا کرتی تھیں۔ یہ اخبار فارسی ٹائپ میں چھپتا تھا۔

اخبار میں مذہبی' سیاسی' معاشی اور معاشرتی خبروں کے علاوہ جدید علوم وفنون سے متعلق مضامین اور خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ شعر و شاعری کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔

انیسویں صدی کے نصف حصے یا پہلی جنگ آزادی 1857ء سے قبل تک ہندستان کے مختلف شہروں سے متعدد اخبارات جاری ہو چکے تھے۔ چنانچہ 1834ء میں بمبئی سے ''آئینہ سکندری'' اُردو میں جاری ہوا۔ حالانکہ فارسی زبان میں یہ اخبار 26 اپریل 1822ء ہی سے جاری تھا۔ یہ ایک نیم سرکاری اخبار تھا اور بمبئی کے گورنر کی ایما پر جاری ہوا تھا۔ یہ اخبار ٹائپ میں چھپتا تھا۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جو سب سے بڑا اخبار سامنے آیا وہ ہے ''دہلی اُردو اخبار'' جسے اُردو کے مشہور انشا پرداز مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے 1836ء میں جاری کیا تھا۔ ایک زمانے تک اسی اخبار کو اردو کا پہلا اخبار سمجھا جاتا رہا۔ یہ اخبار 11×8 کی تقطیع میں اور چار صفحات میں چھپتا تھا۔ ہر صفحے پر دو کالم اور ہر کالم میں 33 سطریں ہوتی تھیں۔ یہ اخبار اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا تھا۔ قوموں کے عروج وزوال کی داستان سے یہ اخبار پُر ہے۔ انگریزوں کی مخالفت اور جدوجہدِ آزادی میں مولوی محمد باقر پیش پیش تھے۔ بالآخر اس کی پاداش میں انہیں موت کی سزا دی گئی۔ ان کا اپنا چھاپہ خانہ اور ایک بڑی لائبریری بھی تھی جو 1857ء کی لڑائی میں تباہ ہوگئی۔ جنگ آزادی کے پہلے دن کی جو مفصل رپورٹ مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار میں شائع کی تھی ویسی جامع رپورٹ ہندستان کے کسی دوسرے اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔

اس دوران ایک اور اخبار ''خیر خواہ ہند'' مرزا پور سے جاری ہوا۔ اتر پردیش کا یہ پہلا اُردو اخبار ہے۔ اسے ایک پادری نے 1837ء میں جاری کیا تھا۔ یہ ایک مذہبی اخبار تھا اور اس کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ کرنا تھا اخبار میں مختلف علوم وفنون سے وابستہ مضامین بھی چھپتے تھے۔ اخبار کا اسلوب نگارش بہت بہتر اور مقبول تھا۔

چوتھی دہائی میں مزید کئی اخبارات سامنے آئے۔ 1841ء میں دلی سے ''سید الاخبار'' جاری ہوا۔ اسے سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے جاری کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید عبدالغفور تھے۔ 1841ء ہی میں ''آئینۂ گیتی نما'' سیدا ولاد علی کی ادارت میں جاری ہوا۔ یہ ایک ہنگامہ خیز صحافی تھے۔ دہلی اُردو اخبار اور دیگر اخبارات سے معاصرانہ چشمکیں رہتی تھیں' اگر چہ اسی سال مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں وقائع نگار کی ادارت میں دلی سے ''سراج الاخبار'' بھی جاری ہوا تھا لیکن یہ فارسی زبان میں تھا۔ اس میں کبھی کبھی اُردو غزلیں وغیرہ شائع ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد مدراس سے 1842ء میں ''جامع الاخبار'' جاری ہوا۔ اسے جنوبی ہند کا پہلا اردو اخبار تسلیم کیا جاتا ہے۔ سید رحمت اللہ اس کے ایڈیٹر تھے۔ اخبار سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور اُس زمانے میں یہ ایک بہتر اخبار تھا جو انگریزی اخبارات کے طرز پر شائع ہوتا تھا۔ یہ اپنے عہد کا دلچسپ مرقع اور دلکش ترجمان تھا۔ ہندستان کے دور دراز شہر اور مقامات کی خبریں اس میں شائع ہوتی تھیں۔ زبان ٹکسالی اُردو کے بجائے مدراس کے مقامی الفاظ' محاورات اور اصطلاحات سے مزین ہوتی تھی۔ اسلوب نگارش میں کہیں کہیں لکھنو کی تقلید ہوتی تھی۔

جدید علوم کے فروغ میں ''قدیم دلی کالج'' کی بیش بہا خدمات رہی ہیں۔ اسے قدیم وجدید کے سنگم کی حیثیت حاصل ہے۔ ہندستان کی نشاۃ ثانیہ میں اس کالج کا بہت اہم رول رہا ہے' جہاں نادر روزگار شخصیات موجود تھیں۔ 1845ء میں اس کالج سے بارہ صفحات پر مشتمل ہفتہ وار اخبار ''قران

السعدین'' جاری ہوا۔اس کے پہلے ایڈیٹر پنڈت دھرم نارائن بھاسکر تھے جو غیر معمولی استعداد رکھتے تھے اور شائستہ ذوقِ صحافت کے مالک تھے۔اخبار میں سائنس، ادب اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔اپنی علمی افادیت، مضامین کے تنوع اور حسن ترتیب کے اعتبار سے ہندستان کے ممتاز اخباروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔23 مارچ 1845ء کو قدیم دلی کالج ہی سے ''فوائد الناظرین'' منظر عام پر آیا۔اس کے ایڈیٹر ماسٹر رام چندر تھے جو متنوع کمالات اور علمی انکشافات کی وجہ سے انیسویں صدی کی ممتاز شخصیت تصور کیے جاتے تھے۔سائنس اور ریاضیات میں ماہر ہونے کے علاوہ انہوں نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ بیش بہا خدمات انجام دیں۔مغربی علوم و فنون کا ذوق عام کرنے اور انسانی شعور کو بیدار کرنے کی غرض سے ہی انہوں نے یہ رسالہ جاری کیا جو پندرہ روزہ تھا اور باتصویر شائع ہوتا تھا۔1847ء میں ماسٹر رام چندر ہی نے ''خیر خواہ ہند'' کے نام سے ایک اور اخبار جاری کیا تھا۔اس کے دو ہی شمارے شائع ہوئے تھے کہ ماسٹر رام چندر کو پتہ چلا کہ اس نام سے ایک اخبار مرزا پور سے شائع ہو رہا ہے لہٰذا انہوں نے اس کا نام تبدیل کر کے ''محبِّ ہند'' کر دیا اور بعد میں اسی نام سے نکلتا رہا۔اخبار میں متفرق نوعیت کے تاریخی، سیاسی، سوانحی، ادبی، سائنسی اور سماجی موضوعات کا احاطہ کیا جاتا تھا۔

1847ء میں لکھنؤ کا پہلا اخبار ''لکھنو اخبار'' کے نام سے جاری ہوا اس کے ایڈیٹر لال جی تھے۔اس کے علاوہ اسی سال میرٹھ سے ''جام جمشید'' بابو شیو چندر ناتھ کی ادارت میں اور بریلی سے مولوی عبدالرحمٰن کی ادارت میں ''عمدۃ الاخبار'' جاری ہوا۔بنارس سے بھی ''اخبار سدھاکر'' پنڈت رتن ایشور تیواری کی ادارت میں جاری ہوا۔اس کا رسم الخط دیوناگری تھا لیکن زبان اُردو استعمال کی جاتی تھی۔بنارس کا یہ پہلا اخبار ہے، اسی طرح آگرہ سے منشی قمر الدین کی ادارت میں ''اسعد الاخبار'' اور شیخ خادم علی کی ادارت میں ''مطلع الاخبار'' جاری ہوئے۔اگرچہ ''صدر الاخبار'' کو آگرہ میں اُردو کا پہلا اخبار تصور کیا جاتا ہے جو 1846ء میں جاری ہوا تھا۔1848ء میں مدراس سے ایک اور اخبار ''اعظم الاخبار'' نواب غلام غوث خاں اعظم کی ایما پر جاری ہوا۔ان کے تخلص کی مناسبت سے اس کا نام ''اعظم الاخبار'' رکھا گیا۔ان کا سرکاری نشان بھی اخبار کے سرورق پر چھپتا تھا۔اسی سال دلی سے ''فوائد الشائقین'' پربھو دیال کی ادارت میں شائع ہوا جو گورنمنٹ گزٹ کا اُردو ترجمہ ہوتا تھا۔اس کے علاوہ منصفی کے امتحان میں شامل ہونے والے طلبہ کے لیے مفید مضامین بھی شامل کیے جاتے تھے۔1848ء کے اواخر میں منشی محمد امیر خاں کی ادارت میں آگرہ سے ''قطب الاخبار'' جاری ہوا جو آٹھ صفحات پر مشتمل عام خبروں کا پرچہ تھا۔اسی طرح آگرہ ہی سے اُردو کا پہلا ادبی گلدستہ ''معیار الشعرا'' جاری ہوا جو پندرہ روزہ تھا اور سید مدد علی تپش کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔اس سال بنارس سے دو ماہانہ رسالوں کے اجرا کا ذکر ملتا ہے۔یعنی رسالہ ''مراۃ العلوم'' جس کے ایڈیٹر ہرنس لال اور مالک بابو بھیروں پرشاد تھے اور دوسرا ''باغ و بہار'' جس کے ایڈیٹر بابو کیدار ناتھ گھوش اور کالی پرشاد تھے۔

1849ء میں مدراس سے ایک اور قابل ذکر اخبار ''آفتاب عالمتاب'' جاری ہوا۔اس کی خبروں کا حوالہ مشہور ریاضی داں ماسٹر رام چندر کے اخبار فوائد الناظرین میں پایا جاتا ہے۔اسی سال آگرہ سے ''اخبار النواح'' جاری ہوا۔اس کا پورا نام ''نزہت الارواح و اخبار النواح'' تھا اس کے ایڈیٹر اور مالک حکیم جواہر لال تھے۔اس کے علاوہ مولوی حسن بخش کی ادارت میں ''گورنمنٹ گزٹ'' جاری ہوا جو سرکاری گزٹ کا اردو ترجمہ ہوا کرتا تھا۔1849ء کے اواخر میں آگرہ سے ایک اور ادبی گلدستہ ''معیار الشعرا'' کے نام سے بنسی دھر کی ادارت میں جاری ہوا۔

1850ء میں ''کوہ نور'' لاہور سے جاری ہوا۔اس کے ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے تھے جو جام جمشید میرٹھ کی ادارت کر چکے تھے۔یہ اُردو زبان اور فارسی رسم الخط میں پنجاب سے جاری ہونے والا پہلا اخبار ہے۔اسی سال بنارس سے ''زائرین ہند'' جاری ہوا۔اخبار 'مراۃ العلوم' بند ہو جانے کے بعد ہرنس لال نے اپنا ذاتی مطبع قائم کیا اور وہیں سے اپنی ادارت میں اسے جاری کیا۔1851ء میں بنارس سے ایک اور اخبار 'بنارس ہرکارہ' سید احمد علی کی ادارت میں جاری ہوا۔اس میں عام دلچسپی اور کچھ خاص اہمیت کی خبریں ہوتی تھیں۔اسی سال امرتسر سے ''باغ نور'' اور لدھیانہ سے اخبار ''نور علیٰ نور'' اس کے علاوہ سیالکوٹ سے ''ریاض نور'' جاری ہوا جو بعد میں ملتان منتقل ہو گیا۔1852ء میں ''آفتاب ہند'' جاری ہوا اسے بنارس سے بابو کاشی داس مترنکالتے تھے۔آٹھ صفحات پر مشتمل یہ اخبار کاشی پریس سے چھپتا تھا۔معاصر اخبارات میں یہ بہتر طرزِ تحریر کا حامل اور ذی اثر اخبار تھا۔1853ء میں غلام نصیر الدین کی ادارت میں ملتان سے اخبار ''شعاع الشمس'' اور سیالکوٹ سے ''چشمۂ فیض'' جاری ہوا۔اس کے مالک دیوان چند تھے۔اسی سال دلی سے جمیل الدین خاں ہجر نے ''صادق الاخبار'' جاری کیا۔1857ء سے قبل تک اس نام سے کئی اخبار نکلتے تھے۔

1854ء میں کئی اور اخبارات جاری ہوئے۔بنارس سے گووند رگھوناتھ کی ادارت میں ''بنارس گزٹ'' اندور سے پنڈت دھرم نارائن بھاسکر کی

ادارت اور مہاراجہ ہولکر نیز این سی ہملٹن کی سرپرستی میں ''مالوہ اخبار'' اور مرزا نصر اللہ بیگ کی ادارت میں جاورہ سے ''محتشم الاخبار'' جاری ہوئے۔ اسی طرح پنجاب کے پشاور اور بٹالہ' گرداسپور سے'' اخبار مرتضائی'' اخبار ''مطلع الانوار'' اور ''نیر اعظم'' منظر عام پر آئے۔

1855ء میں بمبئی سے ''کشف الاخبار کاشف الاسرار'' منشی امان علی لکھنوی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کے بعد مدراس سے شاہ محمد صادق شریف چشتی نے اخبار ''صبح صادق'' جاری کیا۔ 1856ء میں لکھنو سے کئی مشہور اخبارات نکلے۔ خانوادہ فرنگی محل کی ممتاز شخصیت اور رجب علی بیگ سرور کے دوست مولوی محمد یعقوب انصاری نے ''اخبار طلسم لکھنؤ'' جاری کیا۔ اس کے علاوہ امیر مینائی اور رگھوبیر پرساد عیاش نے ''سحر سامری'' ''عہد شہنشاہی کے وقائع نگار بنی پرشاد نے ''اعجاز لکھنؤ'' اور عبداللہ نے ''مخزن الاخبار'' لکھنو سے جاری کیے۔ مارچ 1857ء میں ''معدن الاخبار'' اور ''عیار الاخبار'' بھی یہیں سے جاری ہوئے۔ ان اخبارات میں لکھنوی طرزِ فکر' تہذیب وتمدن اور اپنے عہد کی ہو بہو عکاسی ملتی ہے۔ ساتھ ہی معاشی بحران' سیاسی آویزش' بدحالی' بے انتظامی اور خستہ حالی کا دلدوز انداز میں تجزیہ بھی ملتا ہے۔ لکھنؤ کے ان اخبارات کی زبان مقفیٰ' رنگین اور اسلوب نگارش پر تکلف ہوا کرتی تھی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ہندستان کا پہلا اخبار کب جاری ہوا؟
2. اُردو کا اولین مطبوعہ اخبار کون سا ہے؟
3. پہلی جنگ آزادی 1857ء سے قبل اُردو کے کون کون سے اخبارات نکل رہے تھے؟

17.4.3 1857ء کے بعد کے اُردو اخبارات

ان ابتدائی اُردو اخبارات کی شکل وصورت' ان کی تعداد اشاعت اور خبروں کی نوعیت اور حصول کے سلسلے میں یاد رہے کہ یہ روزانہ اخبارات نہیں تھے بلکہ پندرہ روزہ' ہفت روزہ یا زیادہ سے زیادہ سہ روزہ اخبارات ہوا کرتے تھے۔ سائز کے اعتبار سے بھی آج کے روزناموں کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہوتے تھے۔ خبروں کے لیے یہ اخبارات زیادہ تر انگریزی اخبارات پر انحصار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دیسی ریاستوں کی جانب سے نکلنے والے قلمی اخبارات سے بھی مواد حاصل کرتے تھے۔ کچھ اچھے اخبارات کے نامہ نگار بھی تھے۔ مثلاً مولوی محمد باقر نے اپنے ''دہلی اُردو اخبار'' کے لیے کچھ نامہ نگار مقرر کر رکھے تھے۔ اس زمانے میں بڑی بڑی سرخیوں کا رواج نہیں تھا۔ اداریے بھی اس وقت نہیں لکھے جاتے تھے۔ کبھی کبھی خبر کے ساتھ ہلکا پھلکا تبصرہ کر دیا جاتا تھا۔ اسی کو اس زمانے کا ایڈیٹوریل تصور کیا جاسکتا ہے۔ اخباروں کی اشاعت بہت کم تھی۔ مثال کے طور پر'' دہلی اُردو اخبار'' کی صرف 69 کاپیاں چھپتی تھیں۔ لاہور کے اخبار'' کوہ نور'' کی سب سے زیادہ یعنی تقریباً ساڑھے تین سو کاپیاں چھپتی تھیں گویا کہ یہ اپنے وقت کا بہت بڑا اخبار تھا۔ اشاعت کی اس کمی کا سبب تعلیم کی کمی بھی تھی اور اس کے علاوہ تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی اخبار پڑھنے کا شوق ابھی عام نہیں ہوا تھا۔

11 مئی 1857ء کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کی شروعات ہوئی۔ اس وقت دلی پر کیا گزری اس کا مفصل احوال اس وقت کے کچھ اخباروں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً دہلی اُردو اخبار' صادق الاخبار اور کوہ نور میں اس کی تفصیلی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ 20 ستمبر 1857ء کو یعنی چار مہینے دو دن بعد دہلی میں یہ بغاوت لارڈ کیننگ کے ذریعے کچل دی گئی۔ اس مدت میں دہلی اور نواحی علاقوں میں انگریزی حکومت ختم بھی ہوئی اور بہادر شاہ ظفر کو ایک بار پھر دہلی کا بادشاہ بنایا گیا مگر یہ کامیابی چند دن کی تھی۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد بادشاہ گرفتار ہوئے اور انہیں رنگون بھیج دیا گیا۔ بغاوت کی یہ کہانی ایک الگ اور دل دہلا دینے والی داستان ہے۔ صحافتی نقطۂ نظر سے بھی بہت سے اخبارات کے ایڈیٹروں اور مالکوں کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں۔

بغاوت کے بعد لارڈ کیننگ نے ہندستان کے سارے اخباروں پر سخت پابندیاں لگادیں۔ اخباروں کے لیے لائسنس لینا اور سینسر کرانا ضروری ہوگیا۔ نتیجتاً اخباروں نے دم توڑنا شروع کر دیا۔ بہت سے اخبار بند ہوگئے جو بچے رہے وہ انگریزی حکومت کے ہو رہے۔ بغاوت کے بعد کچھ دنوں تک تو اخباروں پر سناٹا چھایا رہا لیکن جلد ہی یہ خاموشی ٹوٹی اور ایک نئے حوصلہ' نئی امید اور نئے عزم کے ساتھ اخباروں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر تک ہندستان کی تقریباً سبھی زبانوں میں بہت سے اخبار اور رسالے دوبارہ نکلنے شروع ہوگئے۔ یہ دور اب روزناموں کا تھا۔

اُردو' عربی کتابوں کی طباعت میں گراں قدر خدمات انجام دینے والے منشی نول کشور نے 1858ء میں لکھنو سے ''اودھ اخبار'' شروع کیا۔ یہ اخبار

پہلے ہفتہ وار تھا پھر سہ روزہ ہوا اور 1877ء میں روزنامہ ہوگیا۔ اپنے وقت کا یہ اُردو کا بہت بڑا اخبار تھا۔ ایک زمانے میں یہ اخبار چالیس سے اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ انگریزی اخباروں کو چھوڑ کر یہ پہلا ایسا اخبار تھا جس کے رپورٹر مختلف صوبوں کی راجدھانیوں میں تعینات تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ہندستان کی مختلف راجدھانیوں میں حکومت کے نمائندے رہتے ہیں یا منشی نول کشور کے۔ اُردو کے بہترین ادیب، شاعر، مضمون نگار، مثلاً مولانا عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، شیو پرشاد، یاس یگانہ چنگیزی، شوکت تھانوی وغیرہ اس اخبار سے وابستہ تھے۔

1859ء میں ڈاکٹر مکند لال نے ''تاریخ بغاوت ہند'' کے نام سے ایک ماہنامہ آگرہ سے اور منشی ایودھیا پرشاد نے 1860ء میں ایک ہفت روزہ ''خیر خواہ خلق'' اجمیر سے جاری کیا۔ 1861ء میں رائے گنیش لال نے میرٹھ سے اخبار ''جلوۂ طور'' نکالا۔ جس کے ایڈیٹر سید ظہور الدین طور تھے۔ یہ اُردو کے مشہور شاعر شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد بھی تھے۔

اس درمیان سرسید احمد خاں نے نئی تہذیب کی روشنی پھیلانے کے لیے علمی و ادبی صحافت کو اپنا وسیلہ بنایا اور ان کی کوششوں سے اخبار ''سائنٹفک سوسائٹی'' کا اجرا مارچ 1866ء میں عمل میں آیا۔ اخبار کے صفحات دو کالم میں تقسیم ہوتے تھے اور دوسرے کالم کے مضامین انگریزی میں ہوتے۔ پہلے یہ ہفت روزہ تھا پھر پندرہ روزہ ہوگیا۔ اخبار کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں۔ ''کم سے کم شمالی ہند میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوتی ہے''۔ 32 سال تک یہ اخبار باقاعدگی کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے ایک خالص علمی، اصلاحی رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' شروع کیا جس نے نہ صرف لوگوں کو بے حد متاثر کیا بلکہ اُردو زبان کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہ رسالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے آج بھی جاری ہے۔ 1872ء میں منشی محمد شریف نے بنگلور سے ''منشور محمدی'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جو تحریک آزادی کی حمایت اور انگریزوں کے سامراجی ارادوں اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کرتا تھا۔

1877ء میں لکھنو سے ایک اور بڑا اخبار ''اودھ پنچ'' منظر عام پر آیا جسے منشی سجاد حسین نے ''لندن پنچ'' کی طرز پر جاری کیا تھا، جو بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بعد مختلف شہروں سے ''پنچ'' اخباروں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ مثلاً، سرپنچ ہند۔ لکھنو، پنجاب پنچ۔ لاہور، کلکتہ پنچ، انڈین پنچ، بنگال پنچ، کشمیر پنچ وغیرہ۔ اودھ پنچ 35 سال یعنی 1912 تک جاری رہا۔ اس کے لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق، احمد علی کسمنڈوی اور اکبر الہ آبادی قابل ذکر ہیں۔ دوسرے اخباروں، خاص طور پر منشی نول کشور کے ''اودھ اخبار'' سے اس کی نوک جھونک بھی چلتی رہتی تھی۔

لاہور سے جاری ہونے والا پنڈت قلندر رام کے اخبار ''اخبار عام'' (اجرا 1871ء) کے بعد انیسویں صدی کے آخری حصے میں ایک اور بڑا اخبار ''پیسہ اخبار'' جاری ہوا۔ اسے منشی محبوب عالم نے 1887ء میں پنجاب کے گوجرانوالہ شہر اور بعد میں لاہور سے ایک ہفتہ وار اخبار کے طور پر شروع کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ منشی محبوب عالم کی ہمت، قابلیت اور انتظامی صلاحیت کے سبب اخبار نے تیزی سے ترقی کی۔ شروع میں اس کی صرف سو کاپیاں چھپتی تھیں بعد میں اس کی اشاعت دس ہزار سے بھی زیادہ ہوگئی اور دس بارہ سال بعد یہ اخبار روزانہ چھپنے لگا۔ منشی محبوب عالم نے اسے اخبار کے بالکل صحیح صحیح اصولوں پر نکالنے کی کوشش کی۔ خبروں کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جاتی تھی، مضمون کم اور شعر و شاعری تقریباً نہ ہونے کے برابر۔ انہوں نے اس اخبار کو خالص تجارتی اصولوں پر چلایا۔ لہٰذا اشتہاروں کو بھی خاصی جگہ دی جاتی تھی۔

محبوب عالم اور ''اودھ اخبار'' کے بانی منشی نول کشور کو اخبارات کی دنیا میں تقریباً وہی مقام حاصل ہے جو انگلینڈ میں جان والٹر اور ہارمس ورتھ کو حاصل تھا۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اخبارات کی ترقی کے لیے وقف کردی۔ منشی محبوب عالم نے کئی اخبارات اور رسالے جاری کیے جن میں عورتوں اور بچوں کے رسائل بھی شامل تھے۔ 1902ء میں اپنی ادارت میں ایک ماہانہ رسالہ ''بچوں کا اخبار'' کے نام سے جاری کیا تھا۔ اُردو زبان میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایسے رسائل پر وہ بہت زور دیتے تھے۔ منشی محبوب عالم نے پنجاب کو کئی نامور اخبار نویس دیے۔ ان میں بابو دینا ناتھ بھی تھے جنہوں نے بعد میں مشہور اخبار 'ہندستان' جاری کیا تھا۔

صدی کے آخر تک ملک کے تقریباً تمام حصوں سے اُردو اخبارات اور رسائل نکل رہے تھے۔ اس عرصے میں اخبارات کی زبان بھی صاف ستھری ہوتی گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. انیسویں صدی کے اواخر تک جاری رہنے والے اُردو اخباروں کی ایک فہرست تیار کیجیے۔
2. ''اودھ اخبار'' کس نے جاری کیا؟
3. اخبارات کی ترقی میں منشی محبوب عالم کی کیا خدمات ہیں؟
4. انیسویں صدی میں بنگلور اور آگرہ سے کون کون سے اخبارات نکل رہے تھے؟
5. اُردو کے مزاحیہ اخبارات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
6. سرسید احمد خاں نے کون کون سے رسالے نکالے؟

17.4.4 بیسویں صدی کے اخبارات

بیسویں صدی تک آتے آتے بہت کچھ بدل چکا تھا۔ سیاسی بیداری اور آزادی کی تحریک تیز ہو چکی تھی۔ دنیا بھر کے حالات میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اُردو اخبارات بھی تمام آزمائشوں سے گزر چکے تھے۔ مذہبی، سیاسی، ادبی، ثقافتی، طنزیہ و مزاحیہ ہر طرح کے اخبارات و رسائل نکل چکے تھے۔ منشی محبوب عالم کا ''پیسہ اخبار'' اور 1895ء میں امرتسر سے جاری ہونے والا شیخ غلام محمد کا اخبار 'وکیل' ابھی نکل رہا تھا۔ اس اخبار سے مولانا ابوالکلام آزاد بھی وابستہ رہے۔

بیسویں صدی کی شروعات یعنی 1901ء میں شیخ عبدالقادر نے لاہور سے ''مخزن'' جاری کیا جس نے اُردو ادب کی بہت خدمت کی۔ اُردو کے مشہور شاعر اور تحریک آزادی کے سپاہی مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے 1903ء میں ''اُردوئے معلیٰ'' نکالا۔ یہ ایک ادبی رسالہ تھا لیکن سیاسی مضامین بھی چھپتے تھے۔ رسالے کا مقصد انگریزی حکومت کی مخالفت اور اس کے ظلم و استبداد کے خلاف آواز اٹھانا تھا۔ سیاسی معاملات میں مولانا کے باغیانہ رجحانات کی وجہ سے انہیں بار بار جیل جانا پڑا جہاں انہیں سخت مشقت سے گزرنا پڑا۔ وطن کی آزادی کے لیے انہیں جیل خانے میں چکی تک پیسنی پڑی۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

مولانا سے بار بار ضمانتیں طلب کی گئیں۔ بالآخر ان کا پریس بھی ضبط ہو گیا، کتب خانہ نیلام ہوا اور آخر کار 'اردوئے معلیٰ' کو 1913ء میں بند کرنا پڑا۔ اس دوران جو سب سے اہم اخبار نکلا وہ ''زمیندار'' تھا۔ اسے بے انتہا شہرت حاصل ہوئی۔ ایک ہفتہ وار اخبار کی حیثیت سے منشی سراج الدین احمد نے اسے لاہور سے جاری کیا تھا لیکن بعد میں یہ کرم آباد منتقل ہو گیا اور 1911ء میں اس کا دفتر دوبارہ لاہور آ گیا۔ منشی سراج الدین احمد کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مولانا ظفر علی خاں نے اس اخبار کی ادارت سنبھالی اس کے بعد ہی اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ 'زمیندار' نے لوگوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا کیا۔ اُردو اخبارات میں اسی نے سب سے پہلے ''رائٹر'' اور ''ایسوسی ایٹیڈ پریس'' جیسی عالمی خبر رساں ایجنسیوں کی خدمات حاصل کیں جس کی وجہ سے اس نے ہم عصر اخبارات کو کافی پیچھے چھوڑ دیا۔ مولانا ظفر علی خاں ایک ہنگامہ خیز صحافی تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، شعلہ بیان مقرر، بے مثل نثر نگار اور بے بدل شاعر تھے۔ وہ ہر موضوع پر بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ لکھتے تھے۔ اسی وجہ سے حکومت نے اُن سے بار بار ضمانتیں طلب کیں۔ مولانا نے اخبار کو جن بلندیوں تک پہنچایا اور اسے جو شہرت حاصل ہوئی وہ 1947ء تک کسی دوسرے اخبار کو نصیب نہ ہو سکی۔ اخبار کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سرحدی علاقے میں پٹھان ایک آنہ دے کر اخبار خریدتے اور ایک آنہ اخبار کی پڑھوائی کے لیے دیتے تھے۔ اس کی روزانہ اشاعت تیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

1904ء میں ہفتہ وار ''ہندستان'' بابو دینا ناتھ نے لاہور سے جاری کیا۔ وہ پہلے مولوی محبوب عالم کے ''پیسہ اخبار'' سے وابستہ رہ چکے تھے اور انگریزوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ 1907ء میں باغیانہ رجحان کا ایک اور ہفتہ وار اخبار ''سوراجیہ'' منظر عام پر آیا۔ شانتی نارائن بھٹناگر نے اسے الٰہ آباد سے جاری کیا تھا جس کا ہر مضمون بغاوت کی دعوت دیتا تھا۔ اخبار کا جو بھی ایڈیٹر رہا اسے کم سے کم دس سال کی سزا ہوئی۔ اس کے ایڈیٹر بننے کے لیے

یہ شرط رکھی جاتی تھی کہ اسے عیش و آرام پر جیل خانے کو ترجیح دینی ہوگی۔ یہ اخبار تین سال بعد بند ہو گیا۔

خواتین میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے اور سماجی اصلاحات کی غرض سے خواتین کا رسالہ ''عصمت'' دلی سے 1908ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر شیخ محمد اکرام اور پھر علامہ راشد الخیری رہے۔ اس درمیان مولانا برکت اللہ بھوپالی نے ''اسلامک فریٹرنٹی'' کے نام سے ایک اُردو رسالہ 1910ء میں ٹوکیو (جاپان) سے بھی جاری کیا۔ جو برطانوی حکومت کے خلاف نبرد آزما تھا۔ اور اسے دور دور تک بھیجا جاتا تھا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی نے اُردو صحافت کو دو عظیم شخصیتیں دیں۔ یعنی مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر۔ یہ دونوں عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا آزاد نے 1912ء میں کلکتہ سے ''الہلال'' جاری کیا۔ یہ اخبار ٹائپ میں چھپتا تھا اور اس میں تصویروں کو بھی رواج دیا گیا۔ مولانا نے اس اخبار کے ذریعے صحافت میں ایک نئی طرح ڈالی۔ مولانا تحریک آزادی کے عظیم قائدین میں سے تھے۔ انہوں نے اخبار کے ذریعے وطن پرستی کی جو شمع روشن کی اور جو شعوری بیداری پیدا کی وہ انقلابی نوعیت کی تھی۔ ان کی تحریروں نے حکومت کو بدحواس کر دیا۔ جس کی وجہ سے مولانا سے بار بار ضمانت طلب کی گئی اور بالآخر 1914ء کو اخبار بند کر دینا پڑا۔ 1927ء میں الہلال دوبارہ جاری کیا لیکن صرف چھ ماہ کی مدت تک زندہ رہ سکا۔ بعد میں انہوں نے ''البلاغ'' بھی جاری کیا۔ ویسے مولانا کی صحافتی زندگی بہت پہلے شروع ہو چکی تھی اور وہ مختلف ادوار میں مختلف اخبارات ''نیرنگ عالم'' (گلدستہ) ''المصباح''۔ ''احسن الاخبار''۔ ''خدنگ نظر''۔ ''لسان الصدق''۔ ''الندوہ''۔ ''وکیل''۔ ''دارالسلطنت'' وغیرہ سے وابستہ رہے۔

1912ء میں مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے اخبار ''ہمدرد'' جاری کیا۔ یہ اخبار حکومت کا سخت نکتہ چیں تھا۔ بالآخر اسے سنسر کا سامنا کرنا پڑا جس کے سبب 1915ء میں یہ بند ہو گیا اور پھر دوبارہ 1924ء سے 1926ء تک نکلا۔ مولانا کی ساری زندگی جدوجہد آزادی میں گزری۔ انہوں نے اخبارات کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق بھی مرتب کیا تھا جو آج کے ضابطۂ اخلاق سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ 1912ء ہی میں حامد انصاری کی ادارت میں بجنور سے 'مدینہ' جاری ہوا جس نے ملکی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ 1913ء میں پٹنہ سے حاجی ساجد احمد کی ادارت میں ''پٹنہ اخبار'' نکلا اور اس کے بعد 1916ء میں مولانا عبدالباری نے لکھنو سے اخبار ''ہمدم'' شروع کیا۔ اسی سال لاہور سے روزنامہ ''سیاست'' شروع ہوا جس کے ایڈیٹر سید حبیب تھے۔ 1920ء میں لالہ لاجپت رائے نے ایک کثیر سرمایہ کے ساتھ لاہور ہی سے ''بندے ماترم'' شروع کیا۔ 1921ء میں شاہ امان اللہ کی ادارت میں نگینہ' بجنور سے ہفتہ وار ''الامان'' نکلا۔ بعد میں یہ دہلی منتقل ہوا اور کچھ دنوں میں روزنامہ ہو گیا۔ اس سے قبل 1919ء میں لاہور سے مہاشے کرشن نے ''پرتاپ'' جاری کیا یہ اخبار دلی سے اب بھی نکل رہا ہے۔ اسی سال لکھنو سے روزنامہ ''حقیقت'' انیس احمد عباسی نے شروع کیا جو بعد میں ہفتہ وار ہو گیا۔ یہ اخبار لکھنو سے اب بھی جاری ہے۔ 1923ء میں مہاشے خوش حال چند نے اخبار ''ملاپ'' کی بنیاد ڈالی' اس سے قبل وہ ''آریہ گزٹ'' نکالتے تھے۔ اسی سال سوامی شردھانند نے دہلی سے روزنامہ ''تیج'' شروع کیا۔ یہ دونوں اخبارات دلی سے اب بھی نکل رہے ہیں۔ حیدرآباد سے ''رہنمائے دکن'' 1921ء میں شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ اس کے بعد 1924ء میں دہلی سے سردار دیوان سنگھ مفتون کا اخبار ''ریاست'' منظر عام پر آیا۔ یہ ایک ہنگامہ خیز اخبار تھا۔ سردار مفتون نے دیسی رجواڑوں' نوابوں اور جاگیرداروں کے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی۔ اسی سال کشمیر سے ''رنبیر'' جاری ہوا۔ 1925ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''سچ'' جاری کیا۔ اس کا نام بعد میں ''صدق'' ہوا اور پھر ''صدق جدید'' کے نام سے نکلا۔ اسی سال جمعیۃ العلما ہند نے مولانا عرفان کی ادارت میں 'الجمعیۃ' نکالا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا پھر روزنامہ ہوا۔ اس اخبار سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی' بلال احمد زبیری' مولانا وحید احمد صدیقی' مولانا عثمان فارقلیط وابستہ رہے۔ 1927ء میں مدراس سے ''مسلمان'' اور لاہور سے ''انقلاب'' منظر عام پر آیا۔ 1928ء میں حیدرآباد سے ''نظام گزٹ'' اور دلی سے روزنامہ ''وحدت'' جاری ہوا۔ 1931ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں کلکتہ سے ''پیغام'' اور پھر ''ہند'' جاری ہوا جو بعد میں ''آزاد ہند'' ہو گیا اور یہ آج بھی کلکتہ سے شائع ہو رہا ہے۔ 1934ء میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی سرپرستی میں لاہور سے ''احسان'' شائع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مرتضیٰ احمد خاں میکش اور مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔ اُردو کا یہ پہلا ایسا روزنامہ تھا جس نے اپنے دفتر میں ٹیلی پرنٹر لگوایا۔

1938ء میں پٹنہ سے نذیر حیدر نے ''صدائے عام'' اور سہیل عظیم آبادی نے روزانہ ''ساتھی'' جاری کیا اور 1942ء میں ''صدائے عام'' شروع ہوا۔ 1939ء میں لاہور سے روزنامہ ''شہباز'' اور 1940ء میں ''نوائے وقت'' جاری ہوئے۔

آزادی سے قبل سب سے اہم اُردو اخبار ''قومی آواز'' ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی اور حیات اللہ انصاری کی ادارت میں 1945ء میں

لکھنو سے جاری ہوا۔ اس اخبار نے اُردو میں جدید صحافت کی بنیاد ڈالی اور بہت سے معیارات قائم کیے۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس میں صحافتی اصولوں کے ساتھ ساتھ کتابت، طباعت، سرخی اور تزئین کے ضابطے مقرر کیے گئے۔ چنانچہ بعد کے اخبارات نے تقریباً اسی طرز کو اپنایا اور اسی معیار پر چلنے کی کوشش کی جسے ''قومی آواز'' نے قائم کیا تھا۔ اس کے دہلی، پٹنہ اور سری نگر ایڈیشن بھی جاری ہوئے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. آزادی سے قبل کے اُردو اخبارات کی ایک فہرست تیار کیجیے۔
2. مولانا ابوالکلام آزاد کن اخبارات سے وابستہ رہے؟
3. مولانا حسرت موہانی اور محمد علی جوہر نے کون سے اخبارات جاری کیے؟
4. پنڈت جواہر لال نہرو نے اُردو میں کون سا اخبار شروع کیا تھا؟
5. کس اُردو روزنامے نے اپنے دفتر میں سب سے پہلے ٹیلی پرنٹر لگوایا؟

17.4.5 آزادی کے بعد کے اخبارات

1947ء میں ملک کو آزادی ملنے کے بعد اخبارات کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور اخبارات نے تیزی سے ترقی کی۔ ملک کے مختلف حصوں سے بہت سے اخبارات نکلنے لگے۔ 10 اگست 1949ء کو حیدرآباد سے میر عابد علی خاں نے روزنامہ ''سیاست'' جاری کیا۔ اس کے علاوہ 1976ء میں روزنامہ ''منصف'' شروع ہوا جسے بعد میں نئے انتظامیہ نے حاصل کر لیا اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ حیدرآباد سے جدید سہولیات کے ساتھ ایک اور اخبار ''اعتماد'' 19 دسمبر 2005ء کو جاری ہوا۔ یہ اخبارات حیدرآباد سے بڑی آب و تاب کے ساتھ نکل رہے ہیں۔

اتر پردیش سے ''آگ''، لکھنو (1963ء) ''غبارِ راہ'' رام پور (1960ء) ''آزاد'' وارانسی (1948ء) ''سیاست جدید'' کان پور (1957ء) جاری ہوئے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں لکھنو سے تین اہم اخبارات 'صحافت'، 'ان دنوں'، 'راشٹریہ سہارا' (اُردو) نکلے۔ ان میں راشٹریہ سہارا سرفہرست ہے جو صدی کے ختم ہوتے ہوتے جاری ہوا۔ یہ اخبار دلی اور اتر پردیش کے گورکھپور شہر سے بھی نکل رہا ہے۔ دلی سے ''قومی آواز'' کے علاوہ ''دعوت'' (1953ء) ''عوام'' (1965ء) ''ملک وملت (1965ء) ''سویرا'' (1960ء) نکل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ''تیج''۔ ''ملاپ'' اور ''پرتاپ'' بھی پہلے ہی کی طرح مسلسل نکل رہے ہیں۔ پٹنہ سے قابل ذکر اخبار ''سنگم'' 1953ء میں جاری ہوا اس کا رانچی ایڈیشن بھی نکلتا ہے۔ جموں و کشمیر سے ''آفتاب'' سری نگر (1957ء) ''عمارت'' جموں (1964ء) مزدور، سری نگر (1957ء) ''اجالا'' جموں (1953ء) نکل رہے ہیں۔ پنجاب سے بھی یوں تو کئی اخبارات شائع ہو رہے ہیں لیکن جس اخبار نے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ ہے روزنامہ ''ہند سماچار''۔ جدید سہولیات سے آراستہ اس اخبار کا سرکولیشن ایک زمانے میں 73 ہزار تک پہنچ گیا تھا۔ مغربی بنگال میں کلکتہ سے ''امروز'' (1951ء) ''آبشار'' (1955ء) ''غازی'' (1962ء) اور ''اخبار مشرق'' جاری ہوئے۔ اس کے علاوہ ''آزاد ہند'' بھی جاری ہے۔ مدھیہ پردیش سے جاری ہونے والے اخبارات میں ''افکار'' بھوپال (1951ء) ''سفیر مالوہ'' اندور (1963ء) اور ''ندیم'' شامل ہیں۔ اسی طرح مہاراشٹر کے قابل ذکر اُردو اخباروں میں روزنامہ ''انقلاب''، ممبئی اور روزنامہ ''اُردو ٹائمز''، ممبئی جدید سہولتوں کے ساتھ نکل رہے ہیں۔ کرناٹک کے بنگلور سے ''سالار'' (1964ء) ''سلطان'' اور ''نوائے شام'' (1966ء) اور کرناٹک ٹائمس''، ہبلی سے شائع ہو رہے ہیں۔

ملک کے مختلف مقامات سے آج بہت سے اردو اخبارات نکل رہے ہیں جن کی فہرست بہت طویل ہے اوپر جن اخبارات کا ذکر کیا گیا وہ رجحان ساز نوعیت کے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. آزادی کے بعد کون سے اہم اردو اخبارات جاری ہوئے؟

2. حیدرآباد کے اہم روزنامے کون کون سے ہیں؟
3. دلی سے جاری ہونے والے اہم روزنامے کون سے ہیں؟
4. لکھنواور پٹنہ کے اخبارات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
5. مغربی بنگال، ممبئی اور بنگلور کے خاص خاص اخبارات کی فہرست تیار کیجیے۔

17.4.6 جدید دور

آج ہم اکیسویں صدی میں پہنچ چکے ہیں۔ جدید دور سائنس کا دور ہے۔ سائنسی ایجادات کے سبب جہاں زندگی کے ہر شعبے میں بے شمار ترقیاں ہوئیں وہیں اخبارات کی دنیا بھی اب کافی بدل چکی ہے اور اس شعبے میں تیزی سے ترقی ہوئی ہے۔ کمپیوٹر اور اطلاعاتی ٹکنالوجی کے دیگر ذرائع نے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس شعبے میں بے پناہ ترقی اور لامحدود امکانات نے اخبارات کو خاصا متاثر کیا۔ اخبارات ان بے پناہ ترقیوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ طباعت نے بھی اب بہت ترقی کر لی ہے۔ کتابت کی جگہ اب کمپیوٹر کمپوزنگ نے لے لی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اب اخبارات کی صفحہ سازی کا کام بھی کمپیوٹر سے لیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ کمپیوٹر کی وجہ سے طباعت کے شعبے میں بھی انقلاب آیا۔ سٹیلائٹ کے توسط سے اخبارات کے کئی کئی ایڈیشن مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں کی راجدھانیوں سے بیک وقت شائع ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے اخبارات کے انٹرنٹ ایڈیشن بھی ہیں اور کچھ اخبارات تو صرف انٹرنٹ پر نکلتے ہیں۔ انگریزی اور دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے اخبارات جدید سائنسی ایجادات اور ترقیات سے بخوبی استفادہ کر رہے ہیں۔ ہندستان میں بھی انگریزی اور دیگر زبانوں کے اخبارات ان جدید وسائل سے فائدہ حاصل کر رہے ہیں لیکن اُردو اخبارات ابھی پیچھے ہیں۔ صرف چند اخبارات ہی ان جدید سہولیات سے آراستہ ہیں۔ اُردو صحافت کے اپنے مسائل ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. اکیسویں صدی تک آتے آتے اُردو اخبارات میں کیا تبدیلیاں آئیں؟
2. اخبارات کی ترقی میں سائنسی ایجادات کا کیا رول رہا ہے؟
3. اطلاعاتی ٹکنالوجی کے شعبے میں آئے انقلاب کی وجہ سے اخبارات کو کیا سہولتیں دستیاب ہوئیں۔

17.5 خلاصہ

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو زبان کی ترقی میں اُردو صحافت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ دراصل جس طرح انگلینڈ میں ابتدائی دور کے اخبارات سے وہاں کے بڑے بڑے شاعر، ادیب اور انشاپرداز وابستہ تھے اسی طرح اُردو اخبارات سے بھی شروع ہی سے بلند پایہ شاعر، ادیب، مضمون نگار اور انشاپرداز وابستہ رہے بلکہ انہیں کی کوششوں سے اُردو صحافت پروان چڑھی۔ منشی سدا سکھ مرزا پوری سے لے کر مولوی محمد باقر، منشی نول کشور، منشی محبوب عالم، منشی سجاد حسین، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، حیات اللہ انصاری صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر، ادیب اور مضمون نگار تھے۔ اُردو صحافت کی عہد بہ عہد ترقی میں ان حضرات کا بہت اہم رول رول رہا ہے۔ قابل قدر شخصیات کے علاوہ جدید تکنالوجی سے استفادے کے سبب بھی اُردو صحافت نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔

17.6 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. یورپ اور امریکہ میں اخبارات کے آغاز پر روشنی ڈالیے۔
2. اُردو اخبارات کی شروعات کب ہوئی؟ 1857ء سے قبل اُردو اخبارات کا جائزہ لیجیے۔

3. بیسویں صدی میں اُردو اخبارات کی ترقی پر روشنی ڈالیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. 1947ء کے بعد اُردو اخبارات کا جائزہ لیجیے۔
2. انیسویں صدی کے اہم اخباروں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. ہندستان میں اخبارات کی شروعات کب ہوئی؟ ابتدائی اخبارات کون کون سے ہیں؟

17.7 فرہنگ

مدنی زندگی	شہری زندگی	پیغام رسانی	پیغام پہنچانا
قلمی اخبارات	بغیر چھپے ہوئے ہاتھ سے لکھے اخبارات	شعوری	جان بوجھ کر
اسلوبِ نگارش	لکھنے کا طرز	قدیم	پرانا
متنوع	مختلف قسم کے	اخبار چہ	چھوٹا اخبار
استعداد	صلاحیت	ریاضیات	حساب
رومی ایکٹا	ایکٹا نام سے نکلنے والے روم کے اخبارات	نشاۃ ثانیہ	علمی اور تہذیبی بیداری
سرکولیشن	تعدادِ اشاعت	مطبوعہ	چھپا ہوا
تقطیع	سائز	کمپوزنگ	کمپیوٹر سے لکھنے کا عمل
انشا پرداز	لکھنے والا	رسم الخط	کسی زبان کو لکھنے کا طریقہ
نواحی	آس پاس کے	اثاثہ	سامان

17.8 سفارش کردہ کتابیں

1. نادر علی خاں — اُردو صحافت کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ
2. گربچن چندن — اُردو صحافت پر ایک نظر، دہلی اُردو اکیڈمی، دہلی
3. انور علی دہلوی — اُردو صحافت، دہلی اُردو اکیڈمی، دہلی
4. کیول جے۔ کمار — ماس کمیونی کیشن ان انڈیا
5. احمد ابراہیم علوی — اُردو صحافت کا جائزہ۔ ناشر مصنف، لکھنو
6. غلام حیدر — اخبار کی کہانی، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی
7. جے نٹراجن — ہسٹری آف انڈین جرنلزم، پبلی کیشنز ڈویژن دہلی
8. محبوب الرحمٰن فاروقی / محمد کاظم — آجکل اور صحافت، پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی

اکائی 18: اخبارنویسی کے اصول

ساخت

18.1 تمہید

18.2 اخبار کسے کہتے ہیں

18.2.1 اخبار کی اہمیت وافادیت 18.2.2 اخباری مواد

18.3 خبرنگاری

18.3.1 خبر کے عناصر 18.3.2 خبروں کی فراہمی کے ذرائع

18.3.3 خبر کی تحریر

18.4 اداریہ نگاری

18.5 کالم نگاری

18.6 فیچر

18.7 تصویری صحافت

18.8 اخبار کی تزئین

18.9 اخبار کے دفتر کا عملہ

18.9.1 ادارتی عملہ 18.9.2 تجارتی عملہ

18.9.3 فنی عملہ

18.10 خلاصہ

18.11 نمونہ امتحانی سوالات

18.12 فرہنگ (اصطلاحات)

18.13 سفارش کردہ کتابیں

18.1 تمہید

برصغیر میں طباعت کی ابتدا پرتگالیوں نے کی۔انھوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے 1550ء میں گوا میں پہلا چھاپہ خانہ قائم کیا۔ممبئی میں پہلا چھاپہ خانہ 1674ء میں قائم کیا گیا۔پھر ملک کے مختلف علاقوں میں چھاپے خانے قائم ہونے لگے۔برصغیر کا پہلا مطبوعہ اخبار جیمس آگسٹس ہکی نے 29/ جنوری 1780ء کو ہکز گزٹ یا کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر کے نام سے جاری کیا۔اس کے بعد ملک کے مختلف حصوں سے مختلف زبانوں میں اخبارات جاری ہونے لگے۔

اُردو کا پہلا اخبار 'جامِ جہاں نما' 27/ مارچ 1822ء کو کلکتہ سے جاری ہوا جس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے جب کہ طابع وناشر ولیم پٹرسن ہاپ کنس

اینڈ کمپنی تھی۔ اخبار کے مالک ہری ہردت تھے۔ یہ اخبار چار صفحوں کو محیط تھا اور ہر صفحے پر صرف دو کالم ہی ہوا کرتے تھے۔ جس میں زیادہ تر خبروں کو جگہ دی جاتی تھی اور کبھی کبھی ایک آدھ غزل بھی چھاپ دی جاتی تھی۔ پھر اس کے بعد ملک کے طول وعرض سے اردو اخباروں کا ایک سیلاب امڈ آیا جن میں ہفتہ وار' سہ روزہ' روزنامے' ماہنامے سب شامل ہیں۔ آج بھی اردو کے ہزاروں اخبار ورسائل شائع ہو رہے ہیں اور ان کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اخبار میں صرف خبریں ہی نہیں ہوتی ہیں بلکہ دیگر مواد بھی شامل اخبار ہوتا ہے جن میں ادارے' کالم' فیچرز' رپورتاژ' مضامین' خاکے اور بہت کچھ اخباری مواد اخبار کے صفحات کی زینت بنتا ہے۔ اخباری مواد کی پیش کش کے کچھ بندھے ٹکے اصول ہیں۔ جن پر اگلے سطور میں گفتگو کی جائے گی۔

18.2 اخبار کسے کہتے ہیں

ذرائع کے اعتبار سے صحافت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مطبوعہ صحافت دوسری برقیاتی صحافت۔ ! مطبوعہ صحافت کے تحت روزنامے' سہ روزہ' ہفتہ وار' پندرہ روزہ' ماہنامے' سہ ماہی' ششماہی اور سالانہ مجلّے شامل ہیں۔ جبکہ برقیاتی صحافت ریڈیو' ٹیلی ویژن' نیوز ریل وفلم اور انٹرنیٹ اخبار کو محیط ہے۔

''خبر'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کی جمع اخبار ہے۔ یعنی مختلف خبروں کے مجموعے کو اخبار کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی لیے اخبار کا تین چوتھائی حصہ خبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لوگ بھی اخبار اس لیے خریدتے ہیں کہ خبروں کا مطالعہ کر سکیں۔ ابتدا میں 'اخبار' قلمی خبرناموں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو ایران کے شہنشاہوں کے دور میں رائج تھے۔

اخبار کے تحت روزنامے' سہ روزہ' ہفت روزہ کا شمار ہوتا ہے کچھ پندرہ روزہ بھی اخبار کے دائرے میں آتے ہیں۔ روزنامے کے لیے یہ لازم ہے کہ ہفتہ میں کم از کم پانچ شمارے جاری ہوں۔ روزناموں میں علاقائی' قومی اور بین الاقوامی حالات وواقعات شائع کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین روزانہ رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ ہو سکیں۔ چونکہ اردگرد کے حالات سے واقف ہونا انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اس لیے وہی اخبار ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگا جو زیادہ سے زیادہ خبریں شائع کرتا ہے۔ آج کا دور روزناموں کا دور ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں روزنامے جاری ہو رہے ہیں لیکن اردو اخباروں کا سرکولیشن دیگر زبان کے روزناموں کے مقابلے میں کم ہے۔

سہ روزہ اخبار کسی زمانے میں بہت مقبول تھے۔ آج کل اس کا رواج کم ہے جبکہ ہفت روزہ اخباروں میں مرچ مسالا ہوتا ہے اور ان میں سنسنی خیز خبروں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ لیکن ان اخباروں سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ایسے قارئین جن کے لیے روزانہ مکمل اخبار کا مطالعہ کرنا دشوار ہوتا ہے انھیں ہفتہ بھر کی اہم خبریں ہفتہ وار میں مل جائیں گی۔ ہفتہ وار میں خبروں سے زیادہ خبروں پر رائے یا تبصرہ ہوتا ہے۔ یہ اخبار اپنے قارئین کی ذہنی آسودگی کا مکمل لحاظ رکھتے ہیں۔ معمولی واقعات کو بھی سنسنی خیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔

18.2.1 اخبار کی اہمیت وافادیت

اخبار خواہ وہ روزنامہ ہو کہ سہ روزہ یا ہفتہ وار اس کا مقصد فنِ ابلاغ ہے۔ عوام کو حالات اور واقعات سے آگاہ کرنا اور سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے واقف کرانا' ہر اخبار کا فرض ہے۔ اخبار ایک سماجی ادارہ ہے جو سماج کو نہ صرف آئینہ دکھاتا ہے بلکہ اس کی تعمیر وتشکیل میں غیر معمولی کردار نبھاتا ہے۔ عوام میں سماجی اور سیاسی شعور بیدار کرنا' مثبت رجحانات کو فروغ دینا' نیک اور صالح معاشرے کو تیار کرنا' سماج کے مختلف طبقات کے درمیان محبت والفت کے جذبات کو پروان چڑھانا ہر اخبار کی ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ عوام کو بہترین تفریح فراہم کرنا اور اس تفریح سے ان کی ذہنی تربیت کرنا بھی اخبار کا بنیادی کام ہے۔

صداقت اخبار کی جان ہے اور راست بازی اس کا بنیادی وصف ہے اسی لیے جارج ہشتم نے اخبار کی غیر معمولی قوت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا تھا کہ ''اخبار ٹائمز (لندن) دریائے ٹیمز سے زیادہ خطرناک ہے۔'' جمہوریت پسند اخباروں کا جائزہ لیتے ہوئے تھامس جیفرسن نے کہا تھا:

''اگر مجھ سے یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہا جائے کہ آیا حکومت کے بغیر اخبارات یا اخبارات کے بغیر حکومت تو میں مواخر الذکر ترجیح دوں گا''

ایک ذمہ دار اور بے باک اخبار کا رعب سارے سماج پر پڑتا ہے اخباروں کی بدولت ہی مملکتیں ٹوٹتی بھی ہیں اور بنتی بھی ہیں۔ یہ ایک جادو ہے جس کے لفظ لفظ میں خیر و شر کی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ کسی شخص کو شہرت عطا کرنا یا کسی کو ذلیل کرنا ہو' حکومت اور عوام کے درمیان دوستی یا نفرت کا جذبہ پروان چڑھانا ہو تو اخبار سے بہتر اور موثر ذریعہ کوئی اور نہیں ہے۔ اخبار کی بے پناہ طاقت کا اندازہ کرتے ہوئے نپولین نے کہا تھا:

''میں سو فوجی دستوں کے مقابلے میں ایک اخبار سے زیادہ ڈرتا ہوں۔''

18.2.2 اخباری مواد

اخبار کے قارئین کے دو بڑے گروہ ہوتے ہیں۔ ایک گروہ میں ایسے افراد ہوتے ہیں جو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ یہ قارئین مقامی اور علاقائی خبروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہندو پاک امن دوستی کے بجائے راشن کارڈ کی ضرورت پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی ضروریات' مسائل اور مقامی حالات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان قارئین کو اخباروں میں تصاویر اچھی لگتی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ تصاویر دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ تصویروں کے ذریعے خبروں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے ان اخباروں میں مقامی خبروں کے علاوہ مقامی ضروریات' مسائل اور حکومت کی مختلف اسکیمات پر فیچرز' مضامین اور اداریے شائع کیے جاتے ہیں۔

قارئین کا دوسرا بڑا گروہ دانشور طبقہ کہلاتا ہے۔ وہ نہ صرف مقامی اور قومی بلکہ بین الاقوامی حالات اور واقعات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ ان کے لیے بین الاقوامی سیاسی اتھل پتھل' شیئر مارکٹ' صنعت و حرفت' مارکٹنگ میں خصوصی دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسے قارئین کے لیے معیاری مضامین' فیچرز اور مقالے شائع کیے جاتے ہیں۔ مغربی اور دوسرے ممالک کے اخبارات کے اداریے اور شذرات کے ترجمے شائع کیے جاتے ہیں۔

اردو اخبارات اسی بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دونوں قسم کے قارئین ان کے اخبار سے مطمئن ہوں اور حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے کہ اخباری میک اپ' کمپوزنگ اور طباعت پر خصوصی توجہ دی جائے اور اخباری مواد جیسے خبریں' اداریے' مضامین' مقالے' فیچر' کالم' تصاویر' کارٹون اور خصوصی ایڈیشنوں کی بہتر سے بہتر ترتیب ہو سکے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. برصغیر میں طباعت کی ابتدا کس نے کی؟
2. اُردو کے پہلے اخبار کا نام کیا تھا؟ وہ کب اور کہاں سے جاری ہوا؟
3. اخبار کی اشاعت کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

18.3 خبر نگاری

کہا جاتا ہے کہ اگر کتا انسان کو کاٹے تو وہ خبر نہیں البتہ انسان کتے کو کاٹے تو یہ خبر ہے۔ یہ جملہ مزاح سے پُر ہے لیکن خبر کی تعریف بھی بیان کرتا ہے۔ یعنی ایسا واقعہ جو غیر معمولی ہے وہ خبر ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں News کے معنی نئی اطلاع یا تازہ واقعات کی رپورٹنگ ہے۔ اردو انسائیکلوپیڈیا میں خبر کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے: ''خبر ایسے دلچسپ تازہ اور مصدقہ واقعات کا بیان ہے جو رونما ہو چکے ہوں' یا ہونے والے ہوں یا امید کے مطابق وقوع پذیر نہیں ہو رہے ہوں اور نہ ہونے کی امید ہو۔''

پروفیسر رحم علی ہاشمی جو 'فنِ صحافت' کے مصنف ہیں' کا کہنا ہے کہ News دراصل New کی جمع ہے اور New کے معنی ہیں نیا' تازہ یعنی

تازہ واقعات کو خبر کہتے ہیں۔'What is News' کا مصنف جیرالڈ ڈبلیو جانسن خبر کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''خبر ایسے واقعات کا بیان ہے جن کو لکھنے اور شائع کرنے میں ایک اعلیٰ پایہ کا اخبار نویس اطمینان محسوس کرے۔'' جبکہ برطانوی صحافی جیرالڈ ڈی بلیو میسفیلڈ کا کہنا ہے کہ:

> ''خبر سے میری مراد حقائق ہیں یعنی ایسی چیزیں جو واقع ہوئی ہوں یا ہونے والی ہوں۔ ایسے واقعات اور حوادث جو اخبار پڑھنے والوں کی دلچسپی کا باعث ہوں یا جن کے متعلق وہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں یا جن کے متعلق انھیں معلومات بہم پہنچائی جانی چاہئیں۔ جاپان کا کوئی زلزلہ' دنیا کی کوئی ایجاد' کسی بڑے آدمی کا قتل' کسی بینک کا دیوالیہ ہونا' کسی کابینہ میں اختلاف' جانور خانہ سے کسی شیر کا چھوٹ جانا' طوفان و بادو باراں' ڈربی کے کسی مشہور گھوڑے کا کھانسی میں مبتلا ہونا۔ یہ ساری چیزیں خبریں ہیں۔ خبر میں ایک عہد آفریں واقعہ سے لے کر راستے کا ایک معمولی واقعہ بھی داخل ہے بشرطیکہ وہ واقع ہوا ہے اور صحیح ہو۔ افواہ یا کسی واقعہ کے متعلق قیاس آرائی بھی خبر ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ صحیح اطلاعات پر مبنی ہو اور محض گپ نہ ہو۔''

واقعات خواہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں جب تک دیکھے نہ جائیں اور انہیں قلمبند نہ کیا جائے خبر کا رتبہ حاصل نہیں کر پاتے۔ بہترین خبر وہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ افراد دلچسپی لیں۔

خبر کا بنیادی وصف اس کی صحت یا معروضیت ہے۔ کسی واقعہ کا بے لاگ اور غیر جانبدارانہ بیان خبر کہلاتا ہے۔ اخبار نویس کا فرض ہے کہ وہ قارئین تک خبر کو پوری صحت اور سچائی کے ساتھ پہنچائے۔ خبروں کو دلچسپ بنانے کے لیے اعداد و شمار میں الٹ پھیر کرنا یا رنگ آمیزی کرنا بددیانتی ہے۔ غیر مصدقہ اطلاعات کو خبر کا حصہ نہ بنایا جائے۔ مشہور صحافی جوزف پولیٹزر کا کہنا ہے کہ ''کسی بھی صحافی کے لیے خبر کی درستی اسی طرح اہم ہے جس طرح کسی دوشیزہ کے لیے اس کی عصمت یعنی ہر خبر کی ایک آبرو ہوتی ہے' عصمت ہوتی ہے اور اسے ٹھیس نہیں لگنی چاہیے۔''

کسی واقعہ کو بیان کرتے وقت یہ لحاظ رکھا جائے کہ وہ اہم اور ممکنہ حد تک ڈرامائی لگے اور اس کے واقعیت میں فرق نہ پڑے۔ نامہ نگار کا کوئی تبصرہ یا رائے خبر میں شامل نہیں ہونی چاہیے۔ اور اپنی جانب سے کسی بات کا اضافہ بھی نہیں ہونا چاہئے۔

18.3.1 خبر کے عناصر

کوئی واقعہ جو 'چھے کاف' کے اصول پر کھرا اترتا ہے تو وہ اخبار کے صفحات کی زینت بنتا ہے۔ یعنی کیا' کب' کہاں' کیوں کس نے اور کیسے؟ ان چھے کاف کے جوابات اگر کسی واقعہ میں موجود ہوں تو پھر وہ خبر ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر واقعہ میں چھے کاف کے جوابات موجود ہوں۔ اس طرح سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہر واقعہ 'خبر' نہیں کہلاتا ہے۔ بلکہ ایسے منتخب واقعات جن میں خبریت کا پہلو پوشیدہ ہو وہ اخبار میں شائع ہوتے ہیں۔

ہر واقعہ میں کچھ عناصر ایسے ہوتے ہیں جن کے بل بوتے پر وہ واقعہ خبر کہلاتا ہے۔ مختلف نقادوں نے اپنے اپنے طور پر خبر کے عناصر یا لوازم بیان کیے ہیں۔ جیسے تازگی خبر کا بنیادی عنصر ہے۔ موجودہ دور میں خبریں بجلی کی رفتار سے پہنچتی ہیں۔ اس لیے صبح کی خبر شام تک خبر برقرار نہیں رہتی۔ قرب مکانی کی بدولت خبروں میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ عوام اپنے اردگرد کی خبروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ غیر معمولی پن خبر کا ایک اہم عنصر ہے۔ اسی طرح مشہور شخصیتوں سے بھی خبریں بنتی ہیں۔ آج کل عظیم ہستیوں پر کیمروں کی نظریں رہتی ہیں۔ رشوت' گھوٹالہ اور کوئی جنسی اسکینڈل بھی خبر کا موضوع بنتا ہے اور بہت دنوں تک ایسی خبروں کا چرچا رہتا ہے۔ انسانی دلچسپی کے تمام لوازمات خبر کا حصہ بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ مذہب' تفریح' موسم اور آفات' سائنسی ایجادات اور صحت عامہ جیسے عناصر کسی بھی واقعہ کو خبر بنانے میں اہم رول نبھاتے ہیں۔

جرم' ایسا عنصر ہے جو نہ صرف اخبار بلکہ ریڈیو ٹیلی صحافت میں بھی خبروں کو دلچسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہر شخص جرائم کی خبروں میں دلچسپی لیتا ہے تاکہ وہ مجرموں سے چوکسی اختیار کر سکے۔

غرض چند ایسے ہی عناصر واقعہ کو خبر کا درجہ عطا کرتے ہیں۔

18.3.2 خبروں کی فراہمی کے ذرائع

اخبار کے دفتر کو روزانہ کئی ایک ذرائع سے خبریں موصول ہوتی ہیں۔خبروں کی فراہمی کا سب سے بڑا اور انفرادی ذریعہ اخبار کا رپورٹر ہوتا ہے۔ان کے اپنے اپنے علاقے (Beats) ہوتے ہیں۔بعض رپورٹر اپنے مخصوص میدان کی خبریں ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔دیگر مقامات سے خبریں ارسال کرنے والے کو نامہ نگار کہتے ہیں۔اس کی ذمہ داری بھی رپورٹر جیسی ہوتی ہے۔رپورٹر ہو کہ نامہ نگار وہ معاشرے کا ایک باشعور اور باریک بین شاہد ہوتا ہے جن کا مقصد خبریں جمع کرنا اور انہیں ایمانداری سے تحریر کرنا ہے۔ہر اخبار کے دفتر میں کئی ایک رپورٹر کام کرتے ہیں جیسے چیف رپورٹر، اسٹاف رپورٹر، کرائم رپورٹر، اسپورٹس رپورٹر، سائنسی نامہ نگار، نمائندہ خصوصی، ضلعی نامہ نگار، سیاسی وقائع نگار، غیر ملکی نامہ نگار وغیرہ۔

خبر رساں ایجنسیاں خبروں کی فراہمی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔بیشتر اخبارات کی 80% فیصد سے زائد خبریں ان ہی ایجنسیوں سے حاصل ہوتی ہیں۔پریس ٹرسٹ آف انڈیا (PTI) اور یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا (UNI) ہندستان کی دو بڑی نیوز ایجنسیاں ہیں۔جبکہ رائٹر بین الاقوامی نیوز ایجنسی ہے۔ہندستان سماچار ہندی رسم الخط میں خبریں ارسال کرنے والی ایجنسی ہے۔یو این آئی اردو زبان میں بھی خبریں فراہم کرتی ہے۔

ریڈیو خبروں کے حصول کا اہم ذریعہ ہے چوں کہ ریڈیو سے وقفہ وقفہ سے خبرنامے نشر ہوتے ہیں جو تازہ اور اہم خبروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔مختلف ملکوں کے مختلف ریڈیو سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ٹیلی ویژن بھی خبروں کی فراہمی کا بہترین ذریعہ ہے۔آج کل نیوز چینل کا دور دورہ ہے مختلف نیوز چینل سے ڈھیر ساری خبریں حاصل کی جاسکتی ہیں۔اس کے علاوہ انٹرنیٹ خبروں کی فراہمی کا بے حد اہم ذریعہ ہے۔کمپیوٹر کے ذریعے مختلف سائیٹ سے خبریں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

18.3.3 خبر کی تحریر

کسی واقعہ کا وقوع پذیر ہونا ہی خبر نہیں کہلاتا بلکہ اس واقعہ کو لفظوں میں بیان کرنا یا ضبط تحریر میں لانا بھی ضروری ہے۔خبر کی تحریر کا انداز عام بیانیہ نثر کے انداز سے مختلف ہوتا ہے۔تکنیکی اعتبار سے خبر کے دو اہم حصے ہوتے ہیں یعنی ابتدائیہ اور متن۔!

خبر کی ابتدا میں چند جملے یا ایک جملہ ایسا ہوتا ہے جس میں خبر کا خلاصہ یا اہم حصہ بیان کیا جاتا ہے۔اسی کو ابتدائیہ Intro یا Lead کہتے ہیں۔ابتدائیہ واقعہ کے اہم ترین عنصر کے بے لاگ بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔یہ خبر کی جان ہوتا ہے کیوں کہ اسی کی بدولت قاری کی دلچسپی قایم رہتی ہے اور وہ پوری خبر پڑھنے کی طرف راغب ہوتا ہے۔ابتدائیہ کو پر کشش ہونا چاہیے۔لفظوں کی مدد سے واقعے کی تصویر کھینچی جائے۔ابتدائیہ کو خبر کے متن سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ابتدائیہ کی کئی قسمیں ہیں۔جن میں تحیر آمیز ابتدائیہ، سوالاتی ابتدائیہ، اقتباساتی ابتدائیہ، تضمینی ابتدائیہ اور مکالماتی ابتدائیہ قابل ذکر ہیں۔

خبر کے متن کی ترتیب کے کچھ اصول مقرر ہیں۔تبھی تو ایک ہی واقعہ جب مختلف انداز سے لکھا جاتا ہے اس کی دلچسپی میں فرق آجاتا ہے۔خبر کی تحریر کے کئی انداز ہیں۔جیسے زمانی ترتیب میں واقعات ظہور پذیری کے مطابق ترتیب دیے جاتے ہیں۔یعنی یہ آغاز سے انجام تک جس ترتیب میں ظہور پذیر ہوئے ہیں، اسی ترتیب سے لکھے جاتے ہیں۔جبکہ تدریجی ترتیب میں واقعہ کے اہم نکات کو پہلے بیان کیا جاتا ہے۔بیانیہ نوعیت کی خبریں مکانی ترتیب میں لکھی جاتی ہیں۔یعنی مقام واقعہ کا محل وقوع میں ایک خاص ترتیب کا خیال رکھا جاتا ہے۔صعودی ترتیب کے تحت اہم حصہ یا کلائمکس کو ابتدا میں ہی ظاہر کر دیا جاتا ہے۔الٹا اہرام (Inverted Pyramid) کی ترتیب اردو اخباروں کا مشہور انداز ہے جس میں خبر کا آغاز واقعہ کا سب سے اہم عنصر پھر قدرے غیر اہم پھر غیر اہم عناصر کو بیان کیا جاتا ہے۔اہم حصے کو زیادہ جگہ دی جاتی ہے۔یہ طریقہ سب سے قدیم اور مستعمل طریقہ بتایا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. خبر کسے کہتے ہیں؟
2. خبر کا بنیادی عنصر کیا ہوتا ہے؟
3. ہندستان کی دو بڑی خبر رساں ایجنسیوں کے نام بتائیے۔

18.4 اداریہ نگاری

اخبار میں خبروں کے علاوہ اور بھی مواد شامل رہتا ہے۔ جس میں اداریہ کی اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔ اداریہ، مدیر یا اداریہ نویس کے اظہارِ خیال کو کہتے ہیں۔ یہ وہ صحافتی مقالہ ہے جس سے اخبار کی پالیسی ظاہر ہوتی ہے۔ اسے انگریزی میں Editorial یا Lead Editorial کہا جاتا ہے۔ اداریہ کو مقالہ افتتاحیہ بھی کہتے ہیں۔ جس صفحہ پر اداریہ شائع ہوتا ہے اسے اداراتی صفحہ کہا جاتا ہے۔ صحافتی اصطلاح میں اداریہ سے مراد وہ مضمون ہے جو اخبار یا رسالے کے اداراتی صفحہ پر اخبار کے نام کی تختی کے نیچے چھپتا ہے۔ Carl G. Miller کہتا ہے کہ:

> ''اداریہ اس مضمون کو کہتے ہیں جو کسی ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہے اور جس میں قاری کی سوچ ایسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جو مضمون نگار کے خیال میں صحیح راہ ہے۔ اداریہ نویس قاری کو اپنے نقطہ نظر سے متفق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی باتیں لکھتا ہے جس سے قاری قائل ہو جائے اور موافق ردعمل ظاہر کرے۔ اداریہ نویس مختلف ترغیبی طریقوں سے کام لے کر قاری کے جذبات و احساسات کو جائز طور پر متاثر کرتا ہے۔''

اداریہ کسی اہم واقعہ کی تشریح اور تفہیم کا نام ہے۔ جس میں کسی اہم واقعہ کا پس منظر، تجزیہ اور دلائل کی روشنی میں اس کا پیش منظر بھی بیان کیا جاتا ہے۔ یہ آئینہ ہوتا ہے۔ محض اداراتی صفحہ کی بنیاد پر ہی ہم کسی بھی دو اخباروں میں فرق محسوس کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہر اخبار میں خبریں چھپتی ہیں اور اسّی فیصد سے زائد خبروں میں یکسانیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ خبریں مختلف خبر رساں اداروں کی بھیجی ہوئی ہوتی ہیں اس لیے اداراتی صفحہ ہی اخبار اور اس کے مزاج کا تعارف کرواتا ہے۔ نٹراجن کے بقول ''دو اخباروں کو ایک دوسرے سے جو چیز ممتاز اور جدا کرتی ہے وہ اداراتی صفحہ ہے۔''

اداریہ نگاری کا مقصد اہم مسائل کی تشریح و توضیح کرنا، صالح اور ترقی پسند رجحانات کو فروغ دینا، رائے عامہ کی تشکیل کرنا، بہتر سماج کی تعمیر کرنا اور قارئین کو غور و فکر کی عادت ڈالنا ہے۔

اردو صحافت کے ابتدائی دور میں اداریہ نویسی کے کوئی اصول و ضوابط مقرر نہیں تھے۔ مدیر یا رپورٹر خبروں کے درمیان جہاں ضروری سمجھتا وہاں اپنی رائے لکھ دیتا اور خبر کے مشکل پہلوؤں کی تشریح کرتا چلا جاتا۔ اس طرح سے خبر نما اداریہ یا اداریہ نما خبریں لکھی جانے لگیں۔ تحریک آزادی کے دوران اردو اخبارات نے ان ہی خبروں یا اداریوں کی بدولت عوام میں آزادی کی روح پھونک دی تھی اور ہر ایک کے سینے میں انقلاب کی چنگاریاں سلگ اٹھی تھیں تبھی تو لارڈ کیننگ نے کہا تھا:

> ''اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔''

اصولی طور پر اداریہ تحریر کرنے کی ذمہ داری ایڈیٹر پر عائد ہوتی ہے۔ ابتدائی دور میں ایڈیٹر ہی اداریہ تحریر کیا کرتے تھے لیکن آج کے موضوعات کا دائرہ کافی وسیع اور متنوع ہے اور کسی بھی موضوع پر اداریہ لکھنے کے لیے مضمون پر مہارت درکار ہوتی ہے۔ اس لیے ہر اخبار میں سب ایڈیٹر یا اداریہ نویس یا دیگر کسی حیثیت سے کام کرنے والے افراد مقرر ہوتے ہیں جو اپنے اپنے موضوعات پر عبور رکھتے ہیں۔ ان اداریہ نویسوں کو کئی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ اداریہ نگار محقق ذہن کا مالک ہو۔ وہ جو بھی اعداد و شمار دے پوری دیانت داری سے دے۔ حقائق سے چشم پوشی کرنا اداریہ نگار کی شان کے خلاف ہے۔ اداریہ نویس کو مختلف علوم و فنون سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ اس میں تخلیقی و تنقیدی صلاحیتیں بہ درجہ اتم ہونا چاہئیں۔ وہ اداریہ نگاری کے فن سے واقف ہو۔ اداریہ کے اصول، ہیئت اور اس کے لکھنے کے آداب سے واقف ہو۔ اُسے تو ہم پرستی، فرقہ پرستی، فرقہ پروری، علاقہ واریت اور لسانی تعصب سے گریز کرنا چاہیے۔ اداریہ نویس کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ اس کی تحریر یا اس کی آواز، فردِ واحد کی آواز نہیں ہے بلکہ ایک ادارہ، اخبار یا ایک معاشرے کی آواز ہے۔ اس لیے اسے متوازن، معاملہ فہم اور دُور اندیش ہونا چاہیے۔

اداریہ کسی اہم یا غیر معمولی موضوع پر لکھا جاتا ہے۔ اداریہ کے آغاز میں واقعات یا حقائق کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے پھر واقعہ کے اہم پہلو کی تشریح وتوضیح کی جاتی ہے۔ واقعہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور ٹھوس دلائل کی روشنی میں کوئی رائے قائم کی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں چونکہ مسائل زیادہ ہیں اس لیے اخبارات میں ایک سے زائد اداریے لکھے جاتے ہیں۔ پہلا مضمون اداریہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد لکھا جانے والا مضمون شذرہ کہلاتا ہے۔ اس طرح ادارتی صفحہ پر اداریہ کے علاوہ شذرہ، کالم، قارئین کے خطوط، کارٹون وغیرہ شائع کیے جاتے ہیں۔ اس صفحہ پر اشتہار اور خبروں کو شائع کرنے سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ گو کہ اداریہ بہت ہی کم لوگ پڑھتے ہیں لیکن قارئین کا یہ طبقہ، دانشور طبقہ کہلاتا ہے۔

18.5 کالم نگاری

عام طور پر کالم Pillar کو کہا جاتا ہے۔ لیکن صحافتی اصطلاح میں کالم اخباری صفحہ کا عمودی حصہ ہوتا ہے اور اس کی لمبائی اخباری صفحے کے برابر ہوتی ہے۔ اخباری مواد کو ان ہی کالموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگر یہی مواد مستقلاً کسی موضوع کے تحت شائع کیا جائے اور اخبار کے صفحے پر اس کی جگہ متعین ہو تو اسے بھی کالم کہتے ہیں۔ پروفیسر سید اقبال قادری کے بموجب ''کالم ایک ایسا صحافتی فیچر ہے جس میں کالم نویس منتخب موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کسی بھی معاملے کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔''

کالم، جدید صحافت کا اہم عنصر ہے۔ یہ انفرادی یا شخصی صحافت کی بہترین مثال ہے۔ اس لیے کالم نویسوں کو دانشور طبقہ کہا جاتا ہے جب کہ مغربی ممالک میں انہیں تیل چھڑک، ہرفن مولا، قصیدہ گو، روشن دان، نقاب کشا، جرح باز جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور امریکہ میں کالم نویس کو سیاسی پنڈت (Political Pandit) کہتے ہیں۔

اردو صحافت کا ابتدائی دور شخصی صحافت کا دور کہلاتا ہے۔ اخبار اپنے ایڈیٹر یا مالک کے نام سے فروخت ہوتے تھے۔ موجودہ دور میں ایڈیٹر یا مالک کی شخصیت کہیں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کمی کو کالم نگار پورا کرتے ہیں۔ گویا شخصی صحافت کا نیا روپ کالم نویسی ہے۔ کالم نویس پوری ذمہ داری اور یقین کامل کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں کبھی وہ اشاروں اور کنایوں سے اپنی بات رکھتے ہیں اور کبھی واضح طور پر اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں کالم کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ مسلمہ ہے تبھی تو آج کوئی بھی اخبار ایک دو کالم کے بغیر شائع نہیں ہوتا بلکہ بعض اخبار محض کالموں کی بدولت ہی پڑھے جاتے ہیں کیونکہ کالم نگار نہایت چابکدستی سے موضوع کے شش جہات کو پیش کرتا ہے۔ بہترین اشیا میں سے خامی ڈھونڈتا ہے اور بے کار چیزوں کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی سوچ قارئین کو بہت پسند آتی ہے۔ قارئین کی سوچ وفکر میں توازن پیدا کرنا کالم کا اہم مقصد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عوام کی آواز خدا کی آواز ہے اور اس آواز کو کالم کے توسط سے قارئین تک بہتر طور پر پہنچایا جا سکتا ہے۔

زبان وبیان کے اعتبار سے کالم کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ سنجیدہ کالم اور مزاحیہ کالم۔ موضوعاتی اعتبار سے اطلاعاتی کالم، اشتہاری کالم اور مستقل کالم ہوتے ہیں۔ اطلاعاتی کالم کے تحت موسم کا حال، اجناس کی نرخ، مختلف ممالک کی کرنسی، سونے کا بھاؤ، انتقال، نماز کے اوقات اور رمضان کے مہینے میں سحر و افطار کے اوقات بھی دیے جاتے ہیں۔ ایک ہی موضوع کے تحت مختلف اشتہارات کو یکجا کیا جاتا ہے۔ انھیں اشتہاری کالم کہہ سکتے ہیں۔ ان میں برائے فروخت، برائے رہن، ضرورت رشتہ شامل ہیں۔ گو کہ یہ کالم کسی کالم نگار کے زور قلم کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ انھیں سب ایڈیٹر یا شعبۂ ادارات کے ارکان ترتیب دیتے ہیں۔ البتہ مستقل کالم کے تحت مذہبی کالم، طبی کالم، قانونی کالم، مختلف النوع کالم اور ذاتی کالم، کالم نگار کے تحریر کردہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سنڈیکیٹ اداروں سے موصولہ کالم بھی ہوتے ہیں جو اخبار کی زینت بنتے ہیں۔

اُردو میں مزاحیہ کالم نگاری کا پلڑا ابتدا ہی سے بھاری رہا ہے بلکہ اردو میں کالم کو فروغ دینے میں مزاح نگاروں کا بڑا رول رہا ہے۔ آج بھی یہ کالم بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ اس کالم کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ موضوع کے مثبت پہلوؤں سے ہٹ کر منفی پہلوؤں پر کچھ اس ڈھنگ سے روشنی ڈالی جاتی ہے کہ پڑھنے والوں کو تفریح کا بہترین سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ مزاحیہ کالم نگاروں میں منشی سجاد حسین، سرشار، ظریف، اکبر الہ آبادی، منٹو، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، ابن انشا، ملا رموزی، مجید لاہوری، خواجہ احمد عباس، کنھیا لال کپور، مشفق خواجہ، انتظار حسین، انجم رومانی، محسن بھوپالی،

عبدالمجید سالک، فکر تونسوی، حیات اللہ انصاری، میاں نمک پاش، خواجہ احمد عباس اور مجتبیٰ حسین قابل ذکر ہیں۔

کالم ایک تخلیقی فن ہے۔ کالم نگار میں جتنی تخلیقی صلاحیتیں ہوں گی کالم اتنا ہی زیادہ دلچسپ اور مزے دار ہوگا۔ ادق اور خشک موضوعات کو بھی کالم نگار پرکشش اور دلچسپ بنا سکتا ہے۔ چوں کہ کالم عام قارئین کے لیے لکھا جاتا ہے اس لیے عام فہم، سادہ سلیس زبان اور دلچسپ و دلکش اندازِ بیان ضروری ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں سمجھانے کے فن سے کالم نگار کو واقف ہونا چاہیے۔ کیونکہ کالم کی شان اس کی آسان زبان اور دلچسپ بیان سے ظاہر ہوتی ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا اور ہنساتے ہوئے چٹکیاں لینا کالم نگار کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کالم کی تحریر کو جامع اسی وقت کہا جاتا ہے جب اسے ادق الفاظ، مبہم فقرے، ناقابل فہم تراکیب سے پاک کیا جائے۔ موضوع خواہ کتنا ہی ثقیل اور سنجیدہ کیوں نہ ہو۔ کالم کی چٹخارے والی زبان خشک اور بنجر موضوع کو سرسبز بنا دیتی ہے۔

کالم نگار کو معاملہ فہم اور متوازن شخصیت کا حامل ہونا چاہیے کیوں کہ اس کی اپنی رائے سے سماج کا بہت بڑا طبقہ متاثر ہوتا ہے۔ اعتدال پسندی، ضبط و تحمل اور مذہبی رہنماؤں کا احترام کرنا اس پر لازم ہے۔ چونکہ وہ عوام کا سچا دوست ہوتا ہے اس لیے عوام کے جذبات، احساسات اور اعتقادات کا اسے پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔

18.6 فیچر

اخبارات میں صرف خبریں ہی نہیں بلکہ اداریے، کالم، مضامین کے علاوہ فیچرز بھی ہوتے ہیں۔ فیچر کے لغوی معنی چہرہ مہرہ، نمایاں نقوش، ہیئت، وضع قطع اور خدوخال کے ہیں۔ صحافتی اصطلاح میں فیچر کسی واقعہ یا کردار پر ڈرامائی اور افسانوی انداز میں لکھا جانے والا مضمون ہے۔ فیچر میں ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کی جاتی ہے۔ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ تحریر بوجھل یا خشک نہ ہونے پائے۔ Scholastic Journalism کے مصنف ایچ کلارنس فیچر کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "فیچر صحافتی تحریروں میں ایسا منفرد اسلوب نگارش ہے جو اخبارات کو شہرتِ دوام بھی بخش سکتا ہے۔ اس کے بل بوتے پر ایک فیچر نگار مستقبل کا بہترین مبصر بھی بن سکتا ہے اور راوی کے انداز میں اپنے زمانے کے مسائل کا ترجمان بھی۔"

فیچر دلچسپ اور شگفتہ انداز میں لکھا گیا مضمون ہوتا ہے جو ادب اور صحافت کا بہترین امتزاج ہوتا ہے۔ اس میں صرف مضمون پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ زیادہ سے زیادہ تصاویر کے ذریعے مواد کو پرکشش انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ فیچر کے لیے موضوع کا انتخاب ضروری ہے۔ اداریہ اور کالم کے لیے موضوع کا انتخاب مشکل مرحلہ ہوسکتا ہے مگر فیچر کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ ہر موضوع پر فیچر لکھا جاسکتا ہے۔ کسی شخصیت پر فیچر لکھنا ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مشہور شخصیت ہو۔ کسی بھی معمولی شخص، جس میں زندگی کی چمک دمک ہے۔ جس کے نقوش واضح طور پر اجاگر کیے جاسکتے ہیں تو اس عام شخص پر فیچر لکھا جاسکتا ہے۔ اتفاقی حادثات، ذاتی تجربات، مشغلے، سماجی و فلاحی ادارے، سمینار و سمپوزیم، تعلقاتِ عامہ، گھر، کھیل کا میدان، تفریح کے پارک، تاریخی عمارات، مختلف کیلنڈر، کتابیں، اخبار و رسائل غرض کہیں سے بھی فیچر کا موضوع ڈھونڈا جاسکتا ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے فیچر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ کسی معاشرتی موضوع پر لکھا جانے والا فیچر معاشرتی فیچر کہلاتا ہے۔ جب کہ کسی شخص پر فیچر لکھا گیا ہو تو اسے شخصی فیچر کہتے ہیں۔ سائنسی ایجادات، تحقیقات اور معلومات پر لکھا جانے والا فیچر سائنسی فیچر کہلاتا ہے۔ اگر کسی خبر کو موضوع بنا کر فیچر لکھا گیا ہو تو اسے نیوز فیچر کہتے ہیں۔ تاریخی واقعات، عمارات، قصبہ و شہر پر لکھا گیا فیچر تاریخی فیچر کہلاتا ہے۔

فیچر کی زبان انتہائی سادہ و سلیس ہونی چاہیے۔ مشکل الفاظ، پیچیدہ تراکیب اور مبہم علائم سے فیچر کی جان نکل جائے گی۔ وہی فیچر دلچسپی سے پڑھا جائے گا جس کی ابتدا بڑی دلچسپ اور دلکش ہوگی۔ ابتدائیہ آسان اور دلچسپ پیرائے میں تحریر کرنا چاہیے۔ مشہور صحافی آرنلڈ ولیم سن کا کہنا ہے کہ اچھا فیچر لکھنے کا راز فیچر کے پہلے پیرا میں ہے۔ ایک اچھے ابتدائیہ کے بغیر قارئین کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا ایسے ہی ہے جیسے کانٹے پر چارا لگائے بغیر مچھلی پکڑنے کی کوشش کرنا۔ فیچر مختصر ہوتے ہیں۔ اپنی بات کو منوانے کے لیے اسے طول دینا حماقت ہے۔ سرخیاں، لے آؤٹ، تصاویر، خاکے، نقشے ایسے لوازمات

ہیں جن سے فیچر میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

18.7 تصویری صحافت

کہا جاتا ہے کہ ایک اچھی تصویر ایک ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے۔ کیونکہ تصویر میں ایک حسّی اثر ہوتا ہے۔ تبھی تو ہر انسان تصاویر میں دلچسپی لیتا ہے۔ اخباری اصطلاح میں تصویری صحافت سے مراد اخبار میں تصویر کی پیش کشی کا طریقہ اور سلیقہ تصویری صحافت کہلاتا ہے۔

آج کا دور مصور صحافت کا دور کہلاتا ہے۔ کیوں کہ تصویر سے خبر کا اہم حصّہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ قاری صرف سرخی اور تصویر دیکھ کر خبر کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ واقعات تصویری سلسلے چاہتے ہیں۔ جس سے خبر اور اس کے متعلق تمام واقعات منظر عام پر آتے ہیں۔

تصویر کے بغیر اخبارات بے رنگ اور سپاٹ نظر آتے ہیں۔ تصویروں سے اخباری میک اپ کیا جاسکتا ہے۔ صحافت کے ابتدائی دور میں تصویریں شائع کرنا محال تھا۔ چوں کہ اخبار لیتھو پریس پر چھپتے تھے اس لیے تصاویر کا پہلے بلاک بنایا جاتا پھر اس کا چربہ نکالا جاتا' جس کا نقش کبھی صاف اور کبھی غیر واضح ہوتا۔ پھر تصویریں چھاپنے کے لیے دوہری طباعت لازمی ہوتی جس سے اخباری لاگت میں اور اضافہ ہو جاتا۔ آفسٹ طریقہ طباعت نے تصاویر کو چھاپنے میں آسانی پیدا کر دی جس نے اخبار کو رنگین' پرکشش' مصور اور جاذب نظر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو میں تصویری صحافت کا آغاز' الہلال سے ہوا جس کے مدیر مولانا آزاد تھے۔

ہر اخبار کے دفتر میں فوٹو گرافر ہوتے ہیں جو رپورٹر جیسا کام کرتے ہیں۔ رپورٹر کسی بھی واقعہ کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں جب کہ فوٹو گرافر واقعہ کو کیمرے میں قید کر لیتے ہیں۔ فوٹو گرافر کو خبر سونگھنے کا درک ہونا چاہیے۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون سی تصویر اخبار کے لیے ضروری ہے؟ ویسے کئی ایک ذرائع سے اخبار کے دفتر کو کئی ایک تصاویر بغرضِ اشاعت موصول ہوتی ہیں۔ وہی تصویر اخبار میں جگہ پاتی ہے جس میں خبریت کا پہلو پوشیدہ ہو۔ تکنیکی طور پر بھی تصاویر میں کچھ خوبیاں ہونی چاہئیں مثلاً تصویر کا Focus درست ہو۔ تصویر میں سپید و سیاہ کا فرق واضح ہو اور اس کا پرنٹ اخبار کے طریقہ طباعت میں استعمال کرنے کے لیے تکنیکی طور سے کامل اور چمکدار ہو۔ وہی تصویریں قابل اشاعت ہوتی ہیں جن میں وحدت' توازن' زور احساس' تناسب اور حرکت ہو۔ اصلی تصویر میں فوٹو گرافی کی ترکیبوں کی مدد سے ردوبدل کرنا بددیانتی اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔

تصویروں کے انتخاب کے بعد ان کی ادارت بھی کی جاتی ہے۔ کہیں کوئی فنی خامی رہ گئی ہو تو اسے آرٹ ایڈیٹر کی مدد سے Re-touch کرایا جاتا ہے اور اسے اخبار میں چھپنے کے لائق بنایا جاتا ہے۔ تصویر کے ساتھ اس کا عنوان بھی دینا لازم ہے جسے کیپشن (Caption) کہا جاتا ہے۔ کیپشن تصویر کی لمبائی سے چھوٹا ہونا چاہیے۔ یہ جتنا مختصر ہوگا اتنا ہی جاذب نظر ہوگا۔ کیپشن دینے میں احتیاط لازم ہے۔ کبھی کبھی کیپشن اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں اور شادی کی تقریب کی تصویر کے نیچے کسی جنازے والی تصویر کا کیپشن چھپ جاتا ہے۔

تصویری صحافت کا اخلاقی پہلو یہ ہے کہ تصویر صداقت پر مبنی ہو۔ فاحشہ عورتوں کی تصاویر شائع نہ کی جائیں۔ کم سن مجرموں کی تصویر شائع کرنے سے گریز کیا جائے۔ نیم برہنہ تصاویر شائع نہ کی جائیں۔ اس سے بچوں کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. اخبار میں خبروں کے علاوہ اور کیا مواد شامل رہتا ہے؟
2. ''اداریہ'' کی مختصر ترین تعریف کیا ہو سکتی ہے؟
3. زبان و بیان کے اعتبار سے کالم کی کتنی اور کون کون سی قسمیں ہیں؟
4. کیپشن کسے کہتے ہیں؟

18.8 اخبار کی تزئین

اخبار کی تزئین وآرائش سے مراد اخبار کی صفحہ بندی' کالم بندی اور مواد کی ترتیب وتہذیب ہے۔یعنی اخباری مواد کو اخبار کے صفحات پر اس طرح بکھیرنا کہ وہ خوبصورت اور متناسب معلوم ہوں۔اخباری مواد میں خبریں' فیچر' کالم' اداریہ' تصاویر' کارٹون اور اشتہارات شامل ہیں۔

اخبار کی تزئین کا بنیادی مقصد اخبار کے صفحات کو خوبصورت بنانا ہے تا کہ قاری اخبار کی طرف متوجہ ہو لیکن یہ یاد رہے کہ محض اخباری گٹ اپ کی بنیاد پر قارئین کو مستقلاً متوجہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اخباری مواد کا معیار اور اس کی خوبصورت پیش کش قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔

آج کا دور مسابقت اور مقابلہ کا دور ہے۔ہر شخص دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔الکٹرانکس میڈیا کے دور میں پرنٹ میڈیا کو بہتر سے بہتر طور پر پیش کرنا لازم ہے۔آج وہی اخبار معروف ومقبول ہوگا جو مواد میں تنوع اور پیش کشی میں دلکش ہوگا۔مسابقت کی فضا نے اخبارات کو نہ صرف معنوی اعتبار سے بلکہ ظاہری اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ پرکشش اور جاذب نظر بنانے پر مجبور کر دیا ہے۔

اخبار کے قارئین دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک وہ طبقہ ہے جو بہت زیادہ پڑھا لکھا ہوتا ہے جنھیں دانشور طبقہ کہا جاتا ہے۔یہ لوگ اپنے طور پر اخبار کے معیار قائم کرتے ہیں۔یہ مواد پر زیادہ دھیان دیتے ہیں۔ظاہری چمک دمک ان کی رائے بدل نہیں سکتی۔ایسے قارئین والے اخبار شوخ وشنگ نہیں ہوتے بلکہ وہ سادگی میں حسن کو تلاش کرتے ہیں۔اور اخباری مواد کی بہتر ترتیب وتہذیب پر زور دیتے ہیں۔اخبار کے قارئین کا ایک اور طبقہ کم پڑھے لکھے عام قارئین پر مشتمل ہوتا ہے۔ایسے قارئین کو اخباری صفحات کی چمک دمک اور عام موضوعات پر مبنی مواد کافی متاثر کرتا ہے۔وہ سنسنی خیز خبروں میں دلچسپی لیتے ہیں۔رنگین تصاویر ان کا دل موہ لیتی ہیں۔اخبارات کے زیادہ تر قارئین اسی قسم کے ہوتے ہیں۔اس لیے اخبارات اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دونوں قسم کے قارئین ان کے اخبار سے جڑے رہیں اور وہ اخبار کو رنگ وروغن کرنے کے علاوہ اخباری مواد کو بہتر انداز سے ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اخبارات کو خوب سے خوب تر بنانے کی ذمہ داری آرٹ ایڈیٹر کی ہوا کرتی ہے۔ہر بڑا اخبار آرٹ ایڈیٹر رکھتا ہے۔ایڈیٹر یا سب ایڈیٹرز' اخباری مواد کو صفحات کے اعتبار سے ترتیب دے کر آرٹ ایڈیٹر کے حوالے کرتے ہیں۔شعبہ اشتہارات اخباری صفحات کا لے آؤٹ تیار کرتا ہے اور اپنے اشتہارات کی نشاندہی کر کے آرٹ ایڈیٹر کے حوالے کر دیتا ہے۔آرٹ ایڈیٹر اشتہارات کے بعد جو جگہ باقی رہتی ہے اس پر متعلقہ اخباری مواد کو ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہے۔اشتہارات اور مواد کو بہتر سے بہتر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

تزئین وآرائش ایک فن ہے اور ہر فن تخلیقی صلاحیتوں سے نکھرتا ہے۔اس لیے آرٹ ایڈیٹر میں بھی تخلیقی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہونی چاہئیں۔اخبار کے پہلے صفحہ کی تزئین پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔گو کہ تزئین وآرائش کے کوئی حتمی اصول نہیں لیکن آرٹ ایڈیٹر کا تجربہ اور مشاہدہ اخبار کے صفحات کو خوب تر بناتا ہے۔اخبار کے پہلے صفحہ کے علاوہ اندرونی صفحات' ادارتی صفحہ اور مختلف خصوصی ایڈیشن کی ترتیب وتہذیب اور پیش کش میں جدت ضروری ہے تا کہ اخباری میک اپ میں نکھار آئے اور ہر اخبار اپنے ہم سر اخباروں سے بہتر نظر آئے۔

18.9 اخبار کے دفتر کا عملہ

ہر اخبار کے دفتر میں تین بڑے شعبہ جات ہوتے ہیں۔تینوں شعبوں کے عملہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی بلکہ تینوں کے درمیان باہمی ربط اور تعاون سے ہی اخبار کی ترقی ممکن ہے۔

18.9.1 ادارتی عملہ

ادارتی عملہ' اخباری مواد کی ادارت' ترتیب اور تہذیب کا ذمہ دار ہوتا ہے۔اس کا سربراہ چیف ایڈیٹر ہوتا ہے۔اکثر چیف ایڈیٹر تمام شعبہ جات کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے کیونکہ اردو اخبارات میں عموماً مالکِ اخبار ہی چیف ایڈیٹر ہوتے ہیں۔اخبار کو معیاری بنانے کی ساری ذمہ داری چیف ایڈیٹر پر

عائد ہوتی ہے۔ادارتی بورڈ ٹرسٹ کے اراکین اور مالکین کے مختلف تجاویز اور مشوروں کو ہی روبہ عمل لاتا ہے اور اخبار کو اخبار کی پالیسی کے مطابق ڈھالنے کی مکمل کوشش کرتا ہے۔

چیف ایڈیٹر کے تعاون کے لیے کئی ایڈیٹرز مقرر ہوتے ہیں۔جن میں جوائنٹ ایڈیٹر' نائیٹ ایڈیٹر' ریذیڈنٹ ایڈیٹر' نیوز ایڈیٹر اور آرٹ ایڈیٹر قابل ذکر ہیں۔جوائنٹ ایڈیٹر کم وبیش چیف ایڈیٹر کی ذمہ داریاں نبھاتا ہے۔اخبار کی ترقی وتوسیع اور ادارتی عملہ کے درمیان باہمی ربط اور تعاون پیدا کرنے میں جوائنٹ ایڈیٹر کا کردار اہم ہوتا ہے۔بعض اخبارات کئی شہروں سے بہ یک وقت شائع ہوتے ہیں۔ان تمام اشاعتوں کا انچارج چیف ایڈیٹر ہی ہوتا ہے مگر متعلقہ شہروں کے ایڈیٹر کو ریذیڈنٹ ایڈیٹر کہتے ہیں۔مقامی شمارے کا وہ مکمل انچارج ہوتا ہے۔رات دیر گئے اشاعت کے دوران ایڈیٹر کے فرائض نبھانے والے کو نائیٹ ایڈیٹر کہتے ہیں جبکہ مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی خبروں کی چھان پھٹک کے بعد خبروں کا انتخاب کرنے والے کو نیوز ایڈیٹر کہتے ہیں۔

ادارتی عملہ صرف چیف ایڈیٹر یا مختلف ایڈیٹرز پر مبنی نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کا تعاون کرنے کے لیے سب ایڈیٹر بھی ہوتے ہیں۔سنیئر سب ایڈیٹر کو چیف سب ایڈیٹر بنا دیا جاتا ہے جس کا کام تمام سب ایڈیٹروں کو ان کی صلاحیت کی بنا پر کام دینا ہوتا ہے۔اخباری مواد کا سارا دارومدار سب ایڈیٹر پر ہی ہوتا ہے۔وہی خبروں کو منتخب کرتا ہے' وہی نوک پلک سنوارتا ہے' وہی اخبار کے صفحے کا تعین کرتا ہے۔سرخی بناتا ہے۔ابتدائیہ لکھتا ہے' ترجمہ کرتا ہے' فیچرز' کالم اور اداریے تحریر کرتا ہے۔غرض سب ایڈیٹر کے بغیر اخبار کا جاری ہونا محال ہو جائے گا۔یہ تمام کام ایڈیٹر کی رہنمائی اور نگرانی میں طے پاتے ہیں۔مواد کے حصول اور اشاعت سے قبل کے تمام مراحل Subbing کہلاتے ہیں اور Subbing کی ذمہ داری سب ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔سب ایڈیٹروں کو مختلف صفحات کی ترتیب وتہذیب کی ذمہ داری دی جاتی ہے جیسے مقامی خبروں کا صفحہ' قومی یا بین الاقوامی صفحہ' غیر ملکی خبروں کا صفحہ' کھیلوں کا صفحہ' خصوصی ایڈیشن غرض ہر صفحہ کی ترتیب کے لیے ایک دو سب ایڈیٹر ہوتے ہیں۔

اردو اخبارت میں ترجمے کا کام بھی سب ایڈیٹر ہی انجام دیتے ہیں یا مترجم کو بھی سب ایڈیٹر کہا جاتا ہے۔سب ایڈیٹر اور مترجم کو کریڈ پڑھنے کے فن سے واقف ہونا چاہیے۔کامیاب ترجمے کے اصول وضوابط سے بھی واقف ہونا چاہیے۔غرض سب ایڈیٹر ہر فن مولا ہوتا ہے۔ہر ڈیسک پر کام کرنے کی اہلیت اس میں ہونی چاہیے۔

ادارتی عملہ کے تحت چیف رپورٹر' رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی ہوتے ہیں۔انہیں پریس رپورٹر اور پریس فوٹو گرافر کہا جاتا ہے۔رپورٹر کا اپنا ایک علاقہ (Beat) ہوتا ہے۔جس میں وقوع پذیر واقعات کی اسے رپورٹنگ کرنی ہوتی ہے۔جبکہ پریس فوٹو گرافر ان واقعات کو اپنے کیمرے میں قید کر لیتا ہے۔چیف رپورٹر اپنے رپورٹرز کو ان کی صلاحیتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کام لیتا ہے۔سینئر رپورٹر کو سیاسی وقائع نگاری کا کام دیا جاتا ہے۔کھیل کے واقعات کو قلمبند کرنے والے اسپورٹس رپورٹر' اسمبلی اور پارلیمنٹ کی کاروائی قلمبند کرنے والے کو پارلیمانی رپورٹر اور لابی رپورٹر کہتے ہیں جبکہ جرائم کی رپورٹنگ کرنے والے کو کرائم رپورٹر کہا جاتا ہے۔

پروف ریڈر بھی ادارتی عملہ کا ایک رکن ہوتا ہے۔وہ کتابت شدہ یا کمپوز شدہ مواد کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔جس سے اخبار میں کتابت کی غلطیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

18.9.2 تجارتی عملہ

جنرل منیجر عموماً تجارتی عملہ کا سربراہ ہوتا ہے۔یہ اخبار کو ترقی دینے اور آمدنی بڑھانے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کرتا ہے۔اس کے تحت منیجر شعبہ اشتہارات' سرکولیشن منیجر اور دفتری انتظامی عملہ ہوتا ہے۔

اشتہارات' اخبار کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں۔آج اخبار ایک صنعت بن گیا ہے۔اس لیے ہر اخبار یہ چاہتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ اشتہارات ملیں اور اس کی صنعت دن بہ دن ترقی کرتی جائے۔اس کے لیے منیجر اشتہارات ہر ممکنہ اقدام اٹھاتا ہے۔مختلف اشتہاری ایجنسیوں سے رابطہ رکھتا ہے اور اپنے طور پر ایسے نوجوانوں کا انتخاب کرتا ہے جو دوڑ دھوپ کر کے اشتہارات لے آتے ہیں اور انہیں معقول کمیشن دیا جاتا ہے۔

سرکولیشن منیجر بھی تجارتی عملہ کا اہم رکن ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اخبار کی توسیع اور تعدادِ اشاعت میں اضافہ کرنے کی تدبیریں کرتا ہے بلکہ عملی طور پر بھی حصّہ لیتا ہے۔ یہ مختلف ایجنسیوں سے رابطہ رکھتا ہے۔ نئے نئے شہروں میں اپنے ایجنٹ مقرر کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ اخبار زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع ہو۔ کیوں کہ اشتہارات کا راست تعلق سرکولیشن سے ہوتا ہے۔ اگر اخبار کا سرکولیشن زیادہ ہے تو ہر کوئی اپنا اشتہار دینا چاہے گا اور اشتہار کے نرخ میں بھی اضافہ کی گنجائش رہتی ہے۔ دفتر انتظامی شعبہ کے تحت کلریکل اسٹاف ہوتا ہے۔ دفتر کا خرچ' عملہ کی تنخواہوں کا حساب کتاب رکھنے کے لیے اکاؤنٹنٹ بھی ہوتا ہے۔ خریداروں اور شعبہ ایجنسی کے مسائل حل کرنے کے لیے کئی ایک کارکن ہوتے ہیں جو اسی شعبہ کے تحت کام کرتے ہیں۔

8.9.3 فنی عملہ

فنی عملہ کے تحت ایک ٹکنیکل آفیسر ہوتا ہے جو طباعت کی مشینوں کا انچارج ہوتا ہے۔ اس کے تحت کئی ٹکنیشینس اور دیگر ملازم کام کرتے ہیں۔ آج ہر ایک اخبار کی کمپوزنگ کی جاتی ہے۔ اس لیے کمپیوٹر شعبہ کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک سسٹم انچارج بھی ہوتا ہے اور اس کے ماتحت کئی ڈی ٹی پی آپریٹر ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف مواد کو کمپوز کرتے ہیں بلکہ گرافک کا استعمال کرتے ہوئے آرٹ ایڈیٹر کی رہنمائی میں اخباری صفحہ کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی اخبار بیک وقت کئی شہروں سے شائع ہوتا ہے تو قومی اور بین الاقوامی اور ادارتی صفحہ سب ہی اشاعتوں کا کم وبیش ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اخبار کے صدر دفتر میں یہ صفحات تیار کر لیے جاتے ہیں پھر متعلقہ ریذیڈنٹ ایڈیٹر کمپیوٹر کی مدد سے اس مواد کو حاصل کرتے ہیں۔ البتہ مقامی خبروں کے صفحہ کے لیے مقامی شہر کی خبروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

یہ تینوں شعبے ہر اخبار میں ہوتے ہیں اور ان تینوں کے درمیان زبردست تال میل ہوتا ہے۔ ان تینوں کی مشترکہ کوششوں سے ہی اخبار کی ترقی ممکن ہوتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. اخبار کی تزئین سے کیا مراد ہے؟
2. کسی اخبار میں چیف ایڈیٹر کے علاوہ کئی ایڈیٹرس ہوتے ہیں۔ کسی چار کے عہدے بتایئے۔
3. کیا پریس فوٹوگرافر کو اخبار کے ادارتی عملہ میں شمار کیا جاتا ہے؟
4. اخبار کے تجارتی عملہ میں کون لوگ شامل ہوتے ہیں؟

18.10 خلاصہ

اخبار کا بنیادی مقصد فن ابلاغ ہے۔ اخبار ایک سماجی ادارہ ہے جو سماج کو نہ صرف آئینہ دکھاتا ہے بلکہ اس کی تعمیر وتشکیل میں غیر معمولی کردار نبھاتا ہے۔ اخبار کا بیشتر حصّہ خبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ خبروں کے علاوہ اداریے' مضامین' مقالے' فیچر' کالم' تصاویر' کارٹون جیسا اخباری مواد بھی اخبار کی زینت بنتا ہے۔ ایک اخبار نویس کو اخباری مواد کی پیش کشی سے واقف ہونا چاہیے۔

خبر ایسے واقعات کا بیان ہے جن کو لکھنے اور شائع کرنے میں ایک اعلیٰ پایہ کا اخبار نویس اطمینان محسوس کرے۔ خبر کا بنیادی وصف اس کی صحت یا معروضیت ہے۔ کسی واقعہ کا بے لاگ اور غیر جانبدارانہ بیان خبر کہلاتا ہے۔ تازگی' قرب مکانی' شہرت' صحت عامہ' موسم' انوکھا پن' غیر معمولی پن' مذہب' تفریح' سائنسی ایجادات' جرائم اور انسانی دلچسپی خبر کے عناصر ہیں۔ خبریں نہ صرف نامہ نگار سے بلکہ مختلف خبر رساں ایجنسیوں سے بھی حاصل ہوتی ہیں۔ خبروں کی ادارت لازمی ہے۔ ابتدائیہ اور متن خبر کی تحریر کے دو بنیادی حصّے ہیں اور ان کو لکھنے کے کچھ آداب مقرر ہیں۔

ادارتی صفحہ پر اخبار کے نام کی تختی کے نیچے چھپنے والا مضمون اداریہ کہلاتا ہے۔ اداریہ کو مقالہ افتتاحیہ یا Lead Editorial کہا جاتا ہے۔

یہ اخبار کے قارئین کی ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔ اداریہ نگاری کا مقصد اہم مسائل کی تشریح وتوضیح، صالح رجحانات کا فروغ، رائے عامہ کی تشکیل، بہتر سماج کی تعمیر اور قارئین کو غور وفکر کی عادت ڈالنا ہے۔ اصولی طور پر مدیر ہی اداریہ لکھتا ہے لیکن آج موضوعات کی بہتات اور تنوع کی وجہ سے کئی اداریہ نویس جو اپنے اپنے میدان میں ماہر ہوتے ہیں اداریے لکھتے ہیں۔

کالم ایک ایسا صحافتی فیچر ہے جس میں کالم نویس منتخب موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کسی بھی معاملے کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ کالم جدید صحافت کا اہم عنصر ہے۔ یہ انفرادی اور شخصی صحافت کی بہترین مثال ہے۔ کالم نگار کو معاملہ فہم، دوراندیش، محقق، نقاد اور بہترین شخصیت کا حامل ہونا چاہیے۔ اردو میں مزاحیہ کالم نگاری کا پلڑا ابتدا ہی سے بھاری رہا ہے۔

فیچر کسی واقعہ یا کردار پر ڈرامائی اور افسانوی انداز میں لکھا جانے والا مضمون ہے۔ یہ دلچسپ اور شگفتہ انداز میں لکھا جاتا ہے۔ اسے الفاظ کے علاوہ تصاویر اور خاکوں کی مدد سے بھی پیش کیا جاتا ہے۔ فیچر کی زبان انتہائی سادہ وسلیس ہونی چاہیے۔

اخبار کی تزئین کا بنیادی مقصد اخبار کے صفحات کو خوبصورت بنانا ہے تاکہ قاری اخبار کی طرف متوجہ ہو۔ اخباری میک اپ سے مراد اخبار کی صفحہ بندی، کالم بندی اور مواد کی ترتیب وتہذیب ہے۔ اخبار کو خوب سے خوب تر بنانے کی ذمہ داری آرٹ ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ تزئین وآرائش ایک فن ہے اور ہر فن تخلیقی صلاحیتوں سے نکھرتا ہے اس لیے آرٹ ایڈیٹر میں تخلیقی صلاحیتیں بدرجہ اتم ہونی چاہئیں۔ اخبار کے پہلے صفحہ کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر بنانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔

ایک اچھی تصویر ایک ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے۔ کیوں کہ تصویر میں ایک حسّی اثر ہوتا ہے اور تصویر واقعہ کے اہم پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہے۔ تصویر کے بغیر اخبار بے رنگ اور سپاٹ نظر آتے ہیں۔ وہی تصویر قابل اشاعت ہوتی ہے جس میں خبریت کا پہلو پوشیدہ ہو اور اس میں وحدت، توازن، زور احساس، تناسب اور حرکت ہو۔

ہر اخبار کے دفتر میں تین بڑے شعبے ہوتے ہیں۔ ادارتی عملہ کے تحت چیف ایڈیٹر، ریذیڈینٹ ایڈیٹر، نائٹ ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر، آرٹ ایڈیٹر، سب ایڈیٹر، مترجم اور پروف ریڈر کام کرتے ہیں۔ تجارتی عملہ میں جنرل منیجر، سرکولیشن منیجر، منیجر اشتہارات اور دیگر کلریکل اسٹاف شامل ہوتا ہے۔ فنی عملہ کے تحت ٹکنیکل آفیسر، کمپیوٹر آپریٹر اور مختلف ٹکنیشینس ہوتے ہیں۔

18.11 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. اخبار نویسی کے اصول پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔
2. خبر نگاری کے مختلف مدارج بیان کیجیے۔
3. تصویری صحافت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ اخبار کی تزئین کیسے کی جاتی ہے؟
4. اداریہ نگاری اور کالم نگاری پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. اخبار کی تعریف کرتے ہوئے اس کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالیے۔
2. خبر کسے کہتے ہیں اور اس کے حصول کے ذرائع کون کون سے ہیں؟
3. اداریہ اور کالم میں فرق بیان کیجیے۔
4. ادارتی عملہ میں کون شامل ہوتے ہیں۔ اُن کے کام کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟

5. فیچر کے بارے میں ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

18.12 فرہنگ (اصطلاحات)

صحافتی دنیا میں بے شمار مخصوص اصطلاحیں رائج ہیں۔ان اصطلاحات سے نہ صرف صحافی بلکہ صحافت میں دلچسپی رکھنے والے تمام افراد کو واقف ہونا ضروری ہے۔لہٰذا اس اکائی میں فرہنگ کے ذیل میں ''الفاظ و معنی'' کی جگہ چند اہم اصطلاحیں اور ان کی مختصر تشریح دی جارہی ہے۔

1. A.B.C. Audit Bureau of Circulation۔ایک سرکاری ادارہ ہے جو اخبارات و رسائل کی اشاعت کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد (تعداد اشاعت سے متعلق) سرٹیفکیٹ دیتا ہے۔
2. آف دی ریکارڈ انٹرویو کے دوران کئی ایک باتیں ایسی ہوتی ہیں جو شائع یا نشر نہیں کی جاتیں انھیں آف دی ریکارڈ کہا جاتا ہے۔
3. ایمبارگو کسی مضمون یا تقریر کو وقت سے پہلے جاری کیا جاتا ہے اور ایمبارگو لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ فلاں تاریخ کو ہی شائع یا نشر ہو۔
4. اداریہ ادارتی صفحہ پر اخبار کے نام کی تختی کے نیچے شائع ہونے والی تحریر۔
5. بائی لائن وہ سطر جو کسی رپورٹ کے اوپر یا درمیان میں دی جاتی ہے اور جس پر متعلقہ صحافی کا نام لکھا ہوتا ہے۔
6. پروف ریڈر کتابت یا کمپوز شدہ مواد کی اصلاح کرنے والا۔
7. پیشانی وہ جگہ جہاں اخبار کا نام درج ہوتا ہے جسے Flag بھی کہتے ہیں۔
8. پریس نوٹ حکومت کی جانب سے جاری کی جانے والی اطلاع یا خبر
9. پریس ریلیز حکومت، ادارہ، نیم سرکاری و خانگی اداروں کی جانب سے بیک وقت تمام اخباروں کے لیے جاری کی جانے والی کوئی اطلاع یا مضمون
10. ڈیٹ لائن خبر کے متن کے شروع میں دی گئی تاریخ کو Date Line کہا جاتا ہے۔
11. کیپشن تصویر کے نیچے یا اوپر شائع ہونے والی تحریر
12. ٹیبلائڈ پانچ کالم کا اخبار جو چھوٹے سائز کا ہوتا ہے
13. ٹرن اسٹوری (Turn Story) ایسی خبر جو ایک کالم کے آخر سے دوسرے کالم کو جاتی ہے۔
14. ہائی لائٹ کسی خبر یا مضمون کے اہم نکات کو نمایاں طور پر شائع کرنا۔
15. جمپ خبر ایک صفحے سے دوسرے صفحے پر جاتی ہو تو اسے Jump کہتے ہیں۔
16. جمپ سرخی دوسرے صفحہ پر مضمون کے بقیہ حصے کی سرخی
17. جمپ لائن خبر کا وہ حصہ جو ایک صفحہ سے ''باقی'' کے تحت دوسرے صفحہ پر جاتا ہے۔
18. باکس اہم خبر جو چوکھٹے میں دی جاتی ہے۔
19. ڈیڈ لائن Dead Line سے مراد وقت کی آخری حد، جس کے بعد کوئی خبر اشاعت کے لیے نہیں لی جاتی۔
20. بیٹ رپورٹر کا علاقہ Beat کہلاتا ہے۔
21. کِل کسی خبر یا مضمون کو شامل اشاعت ہونے سے روک دینا Kill کہلاتا ہے۔
22. ڈمی کاپی کا خاکہ

23. شہ سرخی — پہلے صفحہ پر سب سے بڑی سرخی۔ اسے Banner بھی کہتے ہیں۔

24. زاویہ — خبر یا فیچر کا کوئی مخصوص زاویے سے تحریر کرنا Angle کہلاتا ہے۔

25. زرد صحافت — سنسنی خیز جرائم کی خبریں جسے Yellow Journalism کہتے ہیں۔

26. سنڈیکیٹ — ایسا ادارہ جو مختلف اخباروں کو فیچر تصاویر یا مضامین ارسال کرتا ہے۔

27. سٹنگر — نو آموز رپورٹر کو Stinger کہتے ہیں۔

28. فری لانسر — آزاد صحافی جو کسی بھی اخبار سے وابستہ نہیں ہوتا ہے free lancer کہا جاتا ہے۔

29. کوراسٹوری — پہلے صفحہ پر شائع ہونے والی اہم خبر

30. کالم — اخبار کے صفحہ کو کالموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر کالم عموماً دو انچ چوڑا ہوتا ہے۔

31. کالم رول — کالم کے درمیان کھینچی گئی لکیریں۔

32. کریڈٹ لائن — خبر کے حصول کا ذریعہ مثلاً پی ٹی آئی' یو این آئی' رائیٹر وغیرہ کا خبر کے ساتھ تذکرہ/حوالہ

33. ہاٹ نیوز — اہم اور تازہ خبر

34. ائیر پینل — اخبار کے پہلے صفحہ پیشانی کے دونوں جانب اشتہاری گوشے

35. رپورتاژ — کسی واقعہ کا ایسا بیان جس میں لکھنے والے کے تاثرات شامل ہوں۔

36. پلے اپ — کسی خبر یا مضمون کو واضح یا نمایاں طور پر شائع کرنا Play up کہلاتا ہے

37. رپورٹر — جس شہر سے اخبار نکلتا ہے وہاں خبریں جمع کرنے والا۔

38. نامہ نگار — دوسرے شہر یا اضلاع سے خبریں بھیجنے والا

39. نیوز روم — وہ کمرہ جہاں پر سب ایڈیٹرز اپنا کام کرتے ہیں

40. نیوز پرنٹ — اخباری کاغذ

41. توازن — اخبار کے صفحات کی تزئین میں سرخیوں اور تصویروں میں خاص تناسب ہو۔

42. ہینگر — شہ سرخی کے نیچے کی سرخی

43. مسطر — وہ کاغذ جس پر کتابت شدہ مواد کو جوڑ کر کاپی تیار کی جاتی ہے۔

44. اسٹینڈ بائی — Stand by سے مراد وہ مضمون' کالم یا فیچر یا اداریہ ہے جو پہلے سے لکھا ہوتا ہے اور ہنگامی ضرورت کے وقت شائع کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی یونین کی ہڑتال پر اداریہ لکھا گیا ہے اور رات دیر گئے ہڑتال ختم کر دی گئی ہو تو ایسی صورت میں Stand by کے تحت محفوظ اداریہ شائع کیا جاتا ہے۔

45. چوتھا ستون — ہر مملکت میں مقننہ' عدلیہ اور انتظامیہ تین ستون ہوتے ہیں۔ چوتھا ستون صحافت ہے۔

18.13 سفارش کردہ کتابیں

ڈاکٹر محمد شاہد حسین	ابلاغیات	سید اقبال قادری	رہبر اخبار نویسی
شافع قدوائی	خبر نگاری	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	فن صحافت

اکائی 19: انٹرویو کی تکنیک

ساخت

19.1 تمہید

19.2 اخباری انٹرویو

19.3 انٹرویو کی اقسام

19.3.1 شخصیتی انٹرویو (Personality-interview)

19.3.2 خبری انٹرویو (News-interview)

19.3.3 تجارتی انٹرویو (Business-interview)

19.3.4 تحقیقاتی انٹرویو (Investigative interview)

19.3.5 انٹرویو برائے رائے

19.3.6 انٹرویو برائے حقائق

19.3.7 تفریحی انٹرویو

19.3.8 اطلاعاتی انٹرویو (Informational interview)

19.4 انٹرویو کی تکنیک

19.5 انٹرویو کی زبان

19.6 انٹرویو کی تحریر

19.7 خلاصہ

19.8 نمونہ امتحانی سوالات

19.9 فرہنگ

19.10 سفارش کردہ کتابیں

19.1 تمہید

انٹرویو ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم کسی شخصیت کے مختلف زاویوں کا عکس دیکھتے ہیں۔ عموماً کسی شخص کو دیکھ کر ہم کسی نہ کسی حد تک اس کے مزاج کا اندازہ کر لیتے ہیں مگر ہمارا یہ اندازہ اس کے ظاہری بناؤ، ڈھب اور شکل وصورت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے باطن یعنی ذہنی رویے، نفسیاتی عمل، فکر و تصور، حاضر جوابی اور ذہانت کا اصل اندازہ اس سے گفتگو کے بعد ہی ہو پاتا ہے۔ اس باہمی گفتگو کے عمل میں جب مقصد شامل ہو جاتا ہے تب ہم اسے انٹرویو کا

نام دے دیتے ہیں۔ انٹرویو اخبارات میں شائع کرنے یا ریڈیو، ٹیلی ویژن پر نشر کرنے کے لیے، لیے جاتے ہیں۔ ملازمت کے لیے بھی انٹرویو لیے جاتے ہیں لیکن اس کا تعلق صحافت سے نہیں ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے انٹرویو کی تکنیک مشینی تقاضوں اور پیش کش کے مختلف انداز کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے البتہ مواد اور مقصد کے اعتبار سے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے انٹرویو میں کافی حد یکسانیت اور مماثلت ہوتی ہے۔ صحافتی انٹرویو کا آغاز اخباری انٹرویو سے ہوا۔ زیر نظر اکائی میں اخباری انٹرویو ہی کے پیش نظر گفتگو کی گئی ہے۔

19.2 اخباری انٹرویو

سب سے پہلا اخباری انٹرویو شائع کرنے کا سہرا مشترکہ طور پر امریکہ کے دو صحافیوں کے نام ہے۔ ان میں پہلا نام ہوریس گریلے (Horace Greeley) کا ہے جو دی نیو یارک ٹریبیون (The New York Tribune) کے ایڈیٹر تھے اور دوسرا نام جیمس گارڈون بینٹ (James Gordon Bennet) کا ہے جو دی نیو یارک ہیرالڈ (The New York Herald) کے مالک تھے۔ انھوں نے مارمن چرچ لیڈر (Mormon Church leader) جناب بریگھم ینگ (Brigham Young) کا انٹرویو اگست 1859ء میں شائع کیا۔ جس میں ''ینگ'' نے اپنے اوپر لگے بہت سے الزامات کی تردید کی۔

اس انٹرویو سے یہ بات واضح ہے کہ اس کا آغاز کسی امر کی تردید یا تائید یا خبر کی اصلیت معلوم کرنے سے ہی ہوا ہے۔ کیونکہ جب بھی کہیں کوئی سانحہ، واقعہ یا حادثہ وقوع پذیر ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ نامہ نگار وہاں پر موجود ہی ہو۔ لہٰذا صحافی زیادہ تر واقعات میں واقعہ ہو جانے کے بعد ہی جائے حادثہ پر پہنچتا ہے۔ اور اگر کسی صحافی نے خود اپنی آنکھوں سے کوئی حادثہ دیکھا ہے تب بھی وہ خیالات کے تبادلے کے طور پر اپنے آس پاس کھڑے لوگوں سے کچھ نہ کچھ سوالات یا خیالات کی تردید و تائید کے لیے گفتگو کرتا ہی ہے۔

نامہ نگار کے کام کی ابتدا کیا، کیوں، کیسے؟ جیسے لفظوں سے ہوتی ہے یعنی نامہ نگار جب تک سوال نہیں کرے گا، خبر حاصل نہیں ہوگی۔ سوالات اور انٹرویو سے بہت سی ایسی کارآمد باتیں حاصل ہو جاتی ہیں، جن کا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انٹرویو کی اہمیت بالخصوص اخباری انٹرویو کی اہمیت ٹی وی اور ریڈیو کے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ ہم اسے ریکارڈ (Record) کے طور پر محفوظ کر سکتے ہیں اور وقت آنے پر ثبوت کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ انٹرویو کو ہم اردو میں اخباری ملاقات کہہ سکتے ہیں مگر انٹرویو کا لفظ اس قدر رائج اور عام فہم ہے کہ اسی کا استعمال زیادہ موزوں ہے۔ انٹرویو کی تعریف Sunny Thomas نے اپنی کتاب Writing for the media میں یوں کی ہے:

"An interview is an intelligent question and answer dialogue between two or more persons for a purpose."

یعنی ''انٹرویو دو یا دو سے زیادہ لوگوں کے درمیان کسی مقصد کے لیے کیا گیا عقلی مکالمہ ہے''

انٹرویو میں مقصد کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب تک پہلے سے طے شدہ مقصد نہیں ہوگا، انٹرویو کی بات غیر موزوں ہوگی۔ مقصد ہی سے یہ طے ہوتا ہے کہ انٹرویو سیاسی، سماجی، اقتصادی، خواتین کے مسائل اور ان کے حقوق یا کسی اور موضوع پر ہوگا۔ سید اقبال قادری اپنی کتاب ''رہبر اخبار نویسی'' میں لکھتے ہیں:

> ''صحافت میں ''انٹرویو'' کے معنی ہیں کسی منتخب شخص سے رسمی طور پر سوالات پوچھ کر جوابات حاصل کرنا۔ ایک دوسرے سے بات چیت تو ہمیشہ ہوتی رہتی ہے مگر پہلے سے طے شدہ وقت پر، طے شدہ طور پر مل بیٹھ کر روبرو سوال و جواب کا سلسلہ جاری رکھ کر معلومات حاصل کرنے کا عمل صحافتی اصطلاح میں ''انٹرویو'' یا ''بھینٹ'' کہلاتا ہے۔''

درج بالا تعریف میں جب تک موضوع کو شامل نہیں کیا جائے گا تب تک انٹرویو کی یہ تعریف مکمل نہیں ہوگی۔ کسی شخصیت سے انٹرویو کے لیے جب رابطہ قائم کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ موضوع کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ اس لیے، ہمیں ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ موضوع کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔

19.3 انٹرویو کی اقسام

آج زمانہ ہر میدان میں تخصص (Specialization) کا ہے۔ جس طرح زندگی کے مختلف پیشوں میں مختلف ماہرین کی ضرورت تسلیم کی جاتی ہے۔ اسی طرح انٹرویو میں بھی تخصص کی ضرورت ہے۔ مثلاً سیاسی امور، سماجی امور، انسانی حقوق اور خواتین کے امور پر ایک ہی نامہ نگار ضروری نہیں کہ مہارت کے ساتھ شخصیات کا انٹرویو لے سکے۔ مقصد کی بنیاد پر انٹرویو کی بہت سی اقسام ہیں۔ جیسے شخصی انٹرویو (Personality interview)، خبری انٹرویو (News interview)، تجارتی انٹرویو (Business interview)، ملازمتی انٹرویو (Job interview)، تحقیقاتی انٹرویو (Investigative interview)، انٹرویو برائے رائے اور حقائق، تفریحی انٹرویو، اطلاعاتی انٹرویو وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ آج کل ریڈیو ٹیلی ویژن پر طرح طرح کے انٹرویو آتے رہتے ہیں مگر ہماری گفتگو یہاں اخباری انٹرویو تک ہی محدود رہے گی۔ لہٰذا ہم مذکورہ بالا انٹرویو کے اقسام کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

19.3.1 شخصیتی انٹرویو (Personality-interview)

اہم شخصیتوں کا انٹرویو خواہ ان کا تعلق سماج کے کسی شعبے سے ہو، روزناموں، ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہانہ رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اخباروں میں اس کے لیے ہفتے وار کالم متعین ہوتے ہیں جنھیں قاری کافی پسند کرتے ہیں۔ ایسے انٹرویو شخصیت کی دیدہ زیب تصویر کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں۔ ایسی شخصیتوں کے انٹرویو میں قاری کی دلچسپی، خاص طور سے اس کی ذہانت، مہارت، فنکارانہ اور جذباتی زندگی کے بارے میں ہوتی ہے۔ جس میں شخصیت کے طرّہ امتیاز (Personality traits) کامیابی، ناکامی اور ذاتی زندگی بالخصوص توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔

بڑے شہروں میں جہاں صدرِ جمہوریہ، وزیراعظم، وزیراعلیٰ، گورنر اور دوسرے ملکوں کے سربراہوں کی آمد ہوتی ہے تو اخبارات ان کے خصوصی انٹرویو شائع کرنے کے مشتاق ہوتے ہیں۔ وزراء بیرونِ ملک کے سفر سے واپس آتے ہیں تو ان کے بھی انٹرویو لیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی ایسا شخص اچانک شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے جو کل تک گمنامی کے اندھیروں میں گم تھا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جاننے کے لیے قارئین بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ کوئی اہم معرکہ سر کرنے والے، کھلاڑی، نوبل انعام یافتہ، سائیکل سے دنیا کا چکر لگانے والے شخص، 60 گھنٹے لگاتار دوڑنے والے شخص، سانپوں کے ساتھ رہنے والے شخص یا اسی طرح کے حیرت انگیز کارنامے انجام دینے والوں کے بارے میں انٹرویو شائع کرنا اور فلمی ستارے، ڈرامہ فنکار وغیرہ کے انٹرویو قارئین کی خاص دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔

19.3.2 خبری انٹرویو (News-interview)

اس طرح کے انٹرویو کسی اہم خبر، متنازعہ مسئلہ یا تازہ ترین واقعے کی تصدیق، توضیح اور تفصیل کے لیے پارٹی کے ترجمان، اداروں کے سربراہ، وزیر اور افسران سے لیے جاتے ہیں۔ اس میں یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ زیرِ بحث مسئلہ پر ان کی کیا رائے ہے یا جو خبر آئی ہے اس میں سچائی کا کتنا عمل دخل ہے یا کسی متنازعہ مسئلہ کی وضاحت دریافت کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں حقیقت کی بازیافت بھی ہوتی ہے اور مسئلے کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے انٹرویو خبروں کو بنیاد بنا کر لیے جاتے ہیں اسی لیے ہم انھیں خبری انٹرویو کہتے ہیں۔

اس طرح کے انٹرویو کے لیے وقت اور مقام کا تعین نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے نامہ نگار پارلیمان کے باہر، وزیروں کی رہائش پر ان کے باہر آتے ہی، ہوائی اڈوں، پلیٹ فارموں پر سرسری طور سے چلتے چلتے ان کی آرا یا مسئلے کی وضاحت طلب کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے سرسری انٹرویو میں نامہ نگار کی حاضر دماغی، ذی فہمی، تیز دماغی اور مستعدی کا رول کافی اہم ہو جاتا ہے۔ اس میں سوالات جس قدر to the point ہوں گے اسی قدر جواب حاصل کرنا آسان ہو جائے گا۔

19.3.3 تجارتی انٹرویو (Business-interview)

اس قسم کے انٹرویو کم اہمیت رکھتے ہیں۔ بڑے کاروباری گھرانوں کے انٹرویو کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب ان کا کسی بڑی کمپنی کے ساتھ انضمام (Merger) ہونے والا ہو۔ ہندستان کے بڑے تجارتی گھرانے جیسے ٹاٹا' برلا' ہندستان لیور لمیٹڈ' امبانی گروپ کے Business Executive کے انٹرویو اس وقت لیے جاسکتے ہیں جب ان کا کوئی نیا پروڈکٹ بازار میں آنے والا ہو۔ ورنہ صحافت میں ان کا کوئی خاص مطلب نہیں۔

19.3.4 تحقیقاتی انٹرویو (Investigative interview)

عموماً اس طرح کے تحقیقاتی انٹرویو تحقیقاتی ایجنسیاں (investigative agencies) جیسے سی بی آئی' سی آئی ڈی اور پولس کی جرائم شاخ (Police crime branch) کرتی ہے جس میں ایذا رسانی اور کبھی کبھی بغیر ایذا رسانی کے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ تحقیقی نامہ نگار جب اس قسم کے انٹرویو لیتا ہے تو اسے اس بات کا کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ سچائی معلوم کرنے کے لیے کسی کو مجبور کرے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کچھ اس طرح کے سوالات کرے جس سے سچائی تک بالواسطہ اس کی رسائی ہو جائے۔

19.3.5 انٹرویو برائے رائے

کسی نئی تبدیلی' نئی پالیسی' نئے فیصلے' نئی ایجاد' نئے افسر کا تقرر' سیاسی جماعتوں کے نئے لائحہ عمل پر ماہرین کی رائے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ مذکورہ تبدیلیوں کی خبر عوام کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن اس سے انھیں تسلی نہیں ملتی اور وہ ماہرین کی رائے جاننا چاہتے ہیں۔ اس کا مقصد اصلیت سے آگاہی اور مستقبل میں اس کے ہونے والے مثبت یا منفی اثرات کا اندازہ کرنا ہوتا ہے۔ آج کل کسی تبدیلی' نئی چیز' نئے فرمان' نئے مسئلے پر اہم شخصیتوں کے ساتھ ہی ساتھ عوام الناس کی رائے بھی انٹرویو کے ذریعے جاننے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے اخبار میں ہر طبقے کی نمائندگی ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی مخصوص مسئلے پر سماج کے کس طبقے کی کیا رائے ہے۔ ضلع/ شہر میں جب کوئی ایس پی' (Superintendent of Police)' ڈی ایم' (District Magistrate) کمشنر' یونیورسٹی کا وائس چانسلر یا کوئی اہم افسر اپنا عہدہ سنبھالتا ہے تو اس کے منصوبے' اس کی پالیسیاں اور پچھلے عہدے دار (پیش رو) سے فرق وغیرہ کو جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔

19.3.6 انٹرویو برائے حقائق

ایسا تو شاذ و نادر ہی کبھی ہوا ہوگا کہ کوئی صحافی جہاں موجود ہو وہاں کوئی حادثہ ہو جائے۔ غرض جب بھی کہیں کوئی سانحہ ہوتا ہے صحافی وہاں نہیں ہوتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ سانحے کی خبر ملتے ہی جائے واردات پر پہنچ جاتا ہے۔ پہنچتے ہی اس کا سب سے پہلا کام سانحے کی جانکاری حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جسے وہ کیا' کیوں اور کیسے ہوا؟ جیسے سوالوں سے جائے واردات پر موجود لوگوں' عینی شاہدوں سے جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے موقعوں پر مختلف لوگوں سے ایک ہی قسم کے سوال پوچھے جاتے ہیں تاکہ جوابات کے تجزیے سے حقیقت تک پہنچا جاسکے کہ واقعی میں کیا اور کیسے ہوا؟

یہاں ایک بات غور کرنے کی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جن لوگوں سے سوالات کر رہے ہیں ان کے نام' پتے اور ٹیلی فون نمبر لینا بھول جائیں۔ ایسے لوگوں سے ان کے نام شائع کرنے کی رسمی اجازت بھی لے لی جائے تو بہتر ہے۔ اگر وہ اپنی پہچان چھپانا چاہیں تو ان کی منشا کا خیال رکھیں۔ خبر تحریر کرتے وقت ''ایک عینی شاہد کا کہنا ہے'' لکھ کر اپنا کام چلائیں۔ جرائم کے عینی شاہد خاص طور سے اپنا نام اور پتہ دینے سے گھبراتے ہیں۔ سنگین حادثے/ سانحے کے وقت بھیڑ جمع تو ہوتی ہے مگر بہت جلد چھٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات میں صحافی کو مناسب قسم کے لوگوں کو ڈھونڈتے وقت صبر سے کام لینا چاہیے۔ متنازعہ مسئلوں میں دونوں فریقوں سے ملنا ضروری ہے تاکہ ان کے نقطہ نظر حاصل کیے جاسکیں اور قارئین کی رسائی اصل مسئلے تک ممکن ہو سکے۔ ایسا کرنے سے یک طرفہ مواد یا معلومات سامنے نہیں آتیں بلکہ قارئین یا ناظرین کو دو طرفہ اور متوازن مواد حاصل ہوتا ہے۔

19.3.7 تفریحی انٹرویو

اس طرح کے انٹرویو کے لیے فلمی ستارے' گلوکار' موسیقار' وغیرہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ جنھیں اخبارات اپنے ہفتہ وار خصوصی ایڈیشن میں جگہ

دیتے ہیں۔ان میں ہلکی پھلکی سرسری باتیں تفریح طبع کے لیے شامل کی جاتی ہیں۔اس کی فہرست میں کھلاڑی، رقاصہ،ٹی وی اداکار کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔آج کل ماڈلس کا بڑا چلن ہورہا ہے۔انھیں بھی بعض اخبارات فیشن وغیرہ کے لیے شامل کررہے ہیں۔اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہفتے بھر کی بھاگ دوڑ کی زندگی سے ذرا سا الگ قارئین کو چند ہلکی پھلکی چیزوں سے ان کی تفریح کا سامان فراہم کیا جائے جس سے ان کی زندگی میں ذرا سی مسکان آسکے۔

19.3.8 اطلاعاتی انٹرویو(Informational interview)

قارئین کی معلومات میں اضافے کے لیے اس قسم کے انٹرویو لیے جاتے ہیں۔اس گوشے میں ماہرِ تعلیم، ماہرِ فلکیات، قانون داں، انسانی حقوق کے ماہر وغیرہ کو دعوت دی جاتی ہے۔اس سے قارئین کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ انہیں مختلف چیزوں کی صحیح جانکاری حاصل ہوجاتی ہے۔اس طرح کے انٹرویو کی آج کل خاص ضرورت ہے تاکہ سماج میں بیداری لائی جاسکے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1۔ انٹرویو کی تعریف بیان کیجیے۔

2۔ اخباری انٹرویو کا آغاز کس سن عیسوی میں ہوا؟

3۔ سب سے پہلے اخباری انٹرویو لینے والے صحافی کا کیا نام تھا؟

4۔ تحقیقاتی انٹرویو میں سب سے زیادہ اہمیت کسے دی جاتی ہے؟

5۔ انٹرویو برائے رائے کی تعریف بیان کیجیے۔

6- انٹرویو کی پانچ قسموں کے نام بتائیے۔

19.4 انٹرویو کی تکنیک

کسی اہم مسئلے پر، کسی شخصیت کو اس ہماہمی کے دور میں انٹرویو کے لیے تیار کرلینا بڑا مشکل کام ہے۔انٹرویو کے لیے سائنسی فارمولوں کی طرح کوئی ایسا فارمولہ نہیں ہے جسے صحافیوں کو ذہن نشین کرادیا جائے کہ وہ انٹرویو کے فن میں ماہر ہوجائیں۔اس میدان میں صحافی کی اپنی ذہانت، حالاتِ حاضرہ سے آگاہی، قومی اور بین الاقوامی امور سے دلچسپی، سماجی اور انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ حاضر جوابی سے بھی مزین ہونے کی بیک وقت ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ برمحل سوالات کرکے اپنے کام اور مقصد سے پوری طرح انصاف کرسکے۔انٹرویو کے میدان میں ہر صحافی کا اپنا اپنا جداگانہ طریقہ کار ہوتا ہے۔ٹھیک اسی طرح، جس طرح ایک ہی خبر کو دو نامہ نگار جب تیار کرتے ہیں تو دونوں کا طریقہ الگ الگ ہوتا ہے۔بالکل یہی کیفیت انٹرویو کی بھی ہے۔ چونکہ انٹرویو میں صحافی کا واسطہ ایسی شخصیتوں سے پڑتا ہے جن کا تعلق مختلف شعبہ ہائے زندگی سے ہوتا ہے۔مثلاً ان کا تعلق کبھی سیاست سے، کبھی سماجیات سے، کبھی اقتصادیات سے، کبھی طب سے، کبھی کھیل سے، کبھی گلوکاری یا رقص سے تو کبھی فلمی اداکاری سے ہوتا ہے۔اس لیے صحافی کے لیے لازم ہے کہ وہ شخصیت کو دیکھتے ہوئے اپنا ہوم ورک (Home work) کرے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ انٹرویو کے لیے کوئی بندھا ٹکایا پہلے سے متعین فارمولہ نہیں ہے۔اس کے لیے صحافی کو شخصیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنی تیاری کرنا پڑتی ہے۔پھر بھی یہاں چند ایسے نکات کی نشاندہی کی جارہی ہے جنھیں ذہن نشین رکھنے سے صحافی کی الجھنیں کم ہوتی ہیں اور انٹرویو میں بھی خاطر خواہ سہولت پیدا ہوجاتی ہے۔

1. کسی بھی شخصیت کے انٹرویو سے پہلے جہاں تک ممکن ہوسکے زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرلی جائیں۔کوشش کرکے اس کا Resume بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

2. دفتر یا کسی ماتحت سے اس کے مزاج، اخلاق وغیرہ کی جانکاری لی جاسکتی ہے۔ملنسار آدمی ہے یا سخت گیر مزاج ہے۔اس کے معلوم ہوجانے سے

انٹرویو کے وقت آسانی رہتی ہے۔

3. شخصیت جس میدان کی ہے صحافی کو اس میدان کا خاطر خواہ علم ہونا چاہیے۔ مثلاً شخصیت اگر سیاسی ہے، فلمی ہے، رقاصہ کی ہے، ڈرامہ کی دنیا سے ہے تو ہمیں اس کے پچھلے حالات و واقعات کا پورا علم ہونا چاہیے۔ تاکہ اگر وہ کسی سوال کے جواب سے کترا کر نکلنا چاہے تو آپ اسے پچھلے بیان کی یاد تازہ کرا کے وضاحت طلب کر سکیں۔

4. انٹرویو لیتے وقت اس بات کا خاص خیال رہے کہ آپ لکھنے میں اس طرح محو نہ ہو جائیں کہ گفتگو کا مزہ جاتا رہے۔ بات چیت کا انداز دوستانہ رہے تو بہتر ہے۔

5. انٹرویو میں شخصیت کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع فراہم کرنا چاہیے۔ اس بات کا لحاظ رہے کہ صحافی کا کام انٹرویو لینا ہے، دینا نہیں۔

6. صحافی کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ سننے میں ہی مصروف نہ ہو جائے۔ سوالات پوچھنے کے بعد جوابات کے بیچ بیچ میں کچھ کچھ فقرے بولتا رہے تاکہ انٹرویو میں شگفتگی باقی رہے ورنہ لگاتار بولتے بولتے آدمی اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔

7. ایسے سوالات سے گریز کرنا چاہیے جس کا جواب ہاں یا نہ میں مل سکتا ہو۔ سوالات ایسے ہوں کہ مخاطب اپنی بات کھل کر کر سکے۔

8. شخصیت پر کبھی بھی اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔ اگر بات موضوع سے خارج ہو رہی ہو تو اپنی ہوش مندی اور حاضر دماغی سے اسے موضوع پر لانے کی ہر ممکنہ کوشش کرنی چاہیے۔

9. انٹرویو کے لیے جانے سے پہلے ہی پوری طرح ذہن بنا کر جانا چاہیے۔ سوالنامہ تیار ہونا چاہیے۔

10. صرف پہلے سے تیار سوالنامے سے سوالات پوچھنے پر انٹرویو Monotonous یعنی اکتاہٹ بھرا معلوم ہونے لگتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ صحافی کے اپنے ذہن میں بھی سوال ہو اور سوالات کے جواب سے جو سوالات ابھر رہے ہوں ان کی بنیاد پر بات چیت آگے بڑھائی جائے تو ایک خوش آئند بات نکل کر سامنے آئے گی۔

11. مذکورہ تمام نکات سے قبل شخصیت سے ٹیلی فون یا خط و کتابت کے ذریعے مقام اور وقت کا تعین کر لیں اور مقررہ وقت پر ضرور حاضر ہو جائیں۔

12. انٹرویو لے لینے کے بعد شخصیت کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولیں۔

13. انٹرویو لینے والے کو چاہیے کہ وہ تعارفی کارڈ اور شناختی کارڈ (Visiting card and Identity card) ساتھ رکھے۔

14. شخصیت سے سوالات پوچھتے وقت گھبرانا نہیں چاہیے۔ پورے اعتماد کے ساتھ بے خوف ہو کر انٹرویو لینا چاہیے۔

15. انٹرویو چونکہ ریکارڈ کیے جاتے ہیں اس لیے آج کل لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، پھر بھی صحافی کو اپنے ہاتھ میں کاغذ قلم رکھنا چاہیے اور کچھ کلیدی نکات لکھتے رہنا چاہیے۔ اس سے انٹرویو میں اس کی دلچسپی اور لگن ظاہر ہوتی ہے اور مخاطب پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔

16. اگر انٹرویو منشا کے مطابق نہیں ہو رہا ہے تو بے چینی یا اکتاہٹ کا اظہار نہیں کرنا چاہیے بلکہ کسی طرح مخاطب کو موضوع کی طرف لانا چاہیے۔

17. سوالات چست اور مختصر ہوں تو اچھا ہے۔ ساتھ ہی یہ دھیان رہے کہ ''میں اخبار کا نمائندہ ہوں'' جیسا کوئی جملہ کہہ کر اپنی اہمیت جتانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا منفی اثر پڑ سکتا ہے۔

18. شخصیت اشاعت سے قبل اگر مسودہ دیکھنا چاہے تو صحافی کو خندہ پیشانی سے اس کی بات مان لینی چاہیے اور وعدہ پورا کرنا چاہیے۔

19.5 انٹرویو کی زبان

صحافت ایک ایسا پیشہ ہے جس میں صحافی کا واسطہ سیاست داں، افسر، کسان، مزدور، اداکار، کھلاڑی، موسیقار، فلم ساز، ہدایت کار، جرائم پیشہ، پنڈت، پادری، مولوی، خواتین، غرض کہ تمام شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں سے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور پڑتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ صحافی کو کثیر الجہات ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں ایک بات خاص طور سے ذہن میں رکھنے کی ہے کہ قدرتی طور پر بعض لوگوں کو سیاسی امور سے دلچسپی ہوتی ہے تو بعض کو فلمی امور سے۔

کسی کو کھیلوں کی دنیا سے رغبت ہوتی ہے تو کسی کو کسانوں اور مزدوروں سے۔ کسی کو رقص و موسیقی سے لگاؤ ہے تو کسی کو مذہبی امور سے۔ مذکورہ تمام امور سے ایک شخص پوری طرح آگاہ ہو، تمام پیشوں کی اصطلاحوں اور لفظیات سے واقف ہو، ایسا ممکن نہیں۔ اس لیے ہمیں قدرت کے بنائے ہوئے معاملات کو مدنظر رکھتے ہوئے جس صحافی کو جس میدان (field) سے دلچسپی ہو، اس کو اسی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیت کے انٹرویو پر مامور کرنا چاہیے۔ ایسے میں صحافی اپنے فرائض کی ادائیگی پوری طرح کر پائے گا۔ اس سے انٹرویو بھی خوش آئند ہوگا اور اخبار کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ صحافی اور مخاطب کا تعلق جب ایک ہی میدان سے ہوگا تو قوی امکان ہے کہ دونوں کو آپس میں بات چیت کرنے میں سہولت ہوگی۔ ایک ہی میدان سے تعلق رکھنے کے باعث دونوں کی زبان، اصطلاحات اور لفظیات ایک جیسی ہوں گی۔ اس سے انٹرویو میں آسانی رہے گی۔ مخاطب کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ ''اس سے آپ کا مطلب کیا ہے''؟ یا ''اس سوال کو دوبارہ کیجیے''۔

زبان اور لفظیات کے ساتھ ہی ساتھ لب ولہجہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس کا بھی لحاظ رہنا چاہیے۔ آپ کا جو برتاؤ جرائم پیشہ لوگوں سے ہوگا ویسا ہی لب ولہجہ پارلیمنٹ کے ایک ممبر سے نہیں ہوگا۔ ایک فلمی اداکار سے جو برتاؤ ہوگا وہ کسان مزدور کے ساتھ نہیں ہوگا۔ خواتین سے جو لب ولہجہ اختیار کرنا پڑے گا وہی کھلاڑی یا کسی پیشے کے فن کار سے نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے سامنے جیسی شخصیت ہوگی اسے دیکھ کر آپ کو اپنا لب ولہجہ تبدیل کرنا پڑے گا یعنی جیسا تخاطب ویسا لب ولہجہ اور زبان۔

19.6 انٹرویو کی تحریر

انٹرویو کے سلسلے کا یہ آخری مرحلہ ہے۔ آخری ہونے کے ساتھ ہی ساتھ یہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل بھی ہے۔ انٹرویو ریکارڈ کر کے لایا گیا ہو یا تحریر کر کے۔ اب وقت ہے اپنی تمام تر محنت کو آخری شکل دینے کی۔ اس مرحلے میں پوری مستعدی اور ذہنی ارتکاز کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ اتنی بات یاد رہے کہ گفتگو کی زبان اور تحریری زبان میں ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ بعض چیزیں جو بات چیت میں چل جاتی ہیں یا راہ پا جاتی ہیں تحریر میں آنے پر معیاری نہیں معلوم ہوتیں۔ اس لیے انٹرویو تحریر کرتے وقت اس کا خیال رہے کہ کہیں کوئی ایسا جملہ راہ نہ پا جائے جو قواعد (Grammer) کی رو سے غیر معیاری ہو۔

بات چیت میں کئی ایسی چیزیں درمیان میں آ جاتی ہیں جنھیں تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ انھیں نکال دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ دورانِ گفتگو جو بات جس معنی میں ادا کی گئی ہے تحریر میں آنے کے بعد بھی اس سے وہی معنی مراد ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تحریر میں آنے پر کسی جملے سے یا بین السطور سے کوئی ایسے معنی نکال لیے جائیں جن کا کہ دور دور تک کہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔

تحریر کے وقت سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ انٹرویو کی ترتیب کیسی ہو؟ یہ ضروری نہیں کہ جس طرح بات چیت کی گئی ہے، اسی طرح تحریر میں بھی لائی جائے۔ کوشش یہ رہے کہ انٹرویو جب تحریر میں آئے تو اس میں ابتدا، ارتقا اور نقطۂ عروج (Climax) ہو تا کہ قارئین کی دلچسپی ابتدا تا انتہا برقرار رہے۔

مسودہ مکمل ہو جانے کے بعد اگر متعلقہ شخصیت نے دیکھنے کے لیے کہا ہے تو مناسب ہے کہ اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے مسودہ فراہم کر دیا جائے۔ مسودہ دیکھنے کے بعد اگر کسی ترمیم و اضافے کا مشورہ ملتا ہے تو اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہیے۔ یہ نامہ نگار اور اخبار دونوں کے حق میں آگے چل کر بہتر ثابت ہوتا ہے۔ متعلقہ شخصیت کے مسودہ دیکھ لینے کے بعد صحافی کا کام مکمل ہوا اور اب بغیر کسی شش و پنج کے انٹرویو شائع کیا جا سکتا ہے۔ (ویسے عملی طور پر مسودہ دکھانے کا چلن نہیں ہے۔)

اپنی معلومات کی جانچ

1۔ انٹرویو کی زبان الگ الگ موقع پر مختلف کیوں ہوتی ہے؟

2۔ صحافی کا واسطہ کن کن لوگوں سے پڑتا ہے؟

3۔ انٹرویو کے سلسلے کا آخری مرحلہ کسے کہا جاتا ہے؟

19.7 خلاصہ

انٹرویو صحافت کا ایک اہم حصہ ہے۔اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اخبارات اپنے خصوصی نمبرات یا سنڈے میگزین میں اس کے لیے اپنا کالم مختص کرتے ہیں۔آج کل زیادہ تر انٹرویو ریکارڈ کیے جاتے ہیں جس سے وقت کی بچت ہوتی ہے۔جدید تکنالوجی کے سبب فی الوقت ٹیلی فون سے بھی مختصر انٹرویو لیے جانے کی سہولت دستیاب ہے۔اس کے علاوہ ٹیلی کانفرنسنگ (Tele-conferencing) کا استعمال بھی آج کل میڈیا میں کافی رواج پا چکا ہے۔ٹیلی فون کی سہولت کی وجہ سے آپ ملک کے کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے کسی شخص سے کسی بات کی وضاحت طلب کر سکتے ہیں۔

انتخابات کے زمانے میں ووٹروں کے رجحان کا جائزہ لینے کے لیے عام آدمیوں سے بھی مختصر انٹرویو کا چلن ہو گیا ہے۔اس میں سماج کے ہر طبقے سے انٹرویو لے کر یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کون سا امیدوار فتح یاب ہو سکتا ہے۔اسی طرح کے مختصر انٹرویو اس وقت لیے جا سکتے ہیں جب کہیں کوئی نوجوان لڑکی کی خودکشی کی خبر ہو۔ایسے میں پاس پڑوس کے لوگوں سے، رشتے داروں سے مختصر انٹرویو لے کر لڑکی کے چال چلن کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کی جا سکتی ہے۔

آپ کو انٹرویو کی تکنیک، انٹرویو کی اقسام، انٹرویو کے اصول، زبان اور تحریر کے تحت تمام تر مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان تمام امور کو اگر ملحوظ رکھا جائے گا تو امید کی جاتی ہے کہ صحافت کے پیشے میں آنے والے صحافیوں کو خاطر خواہ فائدہ ضرور حاصل ہوگا۔

19.8 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. انٹرویو کی تکنیک سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ اپنی رائے تحریر کیجیے۔
2. انٹرویو کی قسموں پر روشنی ڈالیے۔
3. انٹرویو کی زبان اور انٹرویو کی تحریر سے کیا مراد ہے؟ اپنی رائے دیتے ہوئے وضاحت کیجیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. انٹرویو کی تعریف کرتے ہوئے شخصی انٹرویو کی وضاحت کیجیے۔
2. اخباری انٹرویو کی تعریف کرتے ہوئے صحافی کی ذمہ داریوں کا احاطہ کیجیے۔
3. انٹرویو برائے رائے اور انٹرویو برائے حقائق پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
4. ایک صحافی کو انٹرویو لیتے وقت کس طرح کی زبان کا استعمال کرنا چاہیے؟ اپنا نظریہ پیش کیجیے۔

19.9 فرہنگ

زاویوں	:	زاویہ کی جمع، گوشہ	ڈھب	:	طریقہ، طرز، روش
باطن	:	اندرونی حصہ	تائید	:	حمایت، طرف داری
تخصص	:	خصوصیت	پیشوں	:	پیشہ کی جمع (Profession)، ہنر، فن، کام
متعین	:	مقرر کیا ہوا، کسی کام پر لگایا ہوا	قاری	:	پڑھنے والا
دیدہ زیب	:	دلکش، خوبصورت	طرّہ امتیاز	:	امتیازی وصف، خصوصیت
مشتاق	:	آرزومند، خواہش مند	معرکہ	:	لڑائی کا میدان، رزم گاہ
متنازعہ	:	وہ چیز جس کے لیے جھگڑا ہو	توضیح	:	کھول کے بیان کرنا، واضح کرنا

آرا	:	رائے کی جمع' مشورہ' خیالات	ذی فہمی	:	سمجھ' دانش مندی
مستعدی	:	تیاری' آمادگی' طراری' چستی	انضمام	:	ملنا' وصل ہونا' شمولیت
تحقیق	:	اصلیت معلوم کرنا' دریافت کرنا	لائحہ عمل	:	دستورالعمل' پروگرام' اصل مقصد
شاذونادر	:	بہت کم' کبھی کبھی' اتفاقاً	جائے واردات:		واردات کی جگہ' حادثہ کی جگہ
عینی شاہد	:	چشم دید گواہ' آنکھ سے دیکھنے والا	منشا	:	خواہش' ارادہ' مطلب
مختص	:	مخصوص کیا گیا' خاص کیا گیا	برمحل	:	برجستہ' اچھے موقع پر
کثیرالجہات	:	مختلف جہت والا' پہلودار	مامور	:	مقرر' متعین
تخاطب	:	مخاطب ہونا' سامنے ہوکر باتیں کرنا	ارتکاز	:	ایک مرکز پر جمع ہونا' ایک نقطے پر ہونا
بین السطور	:	سطروں کے درمیان	ترمیم واضافہ:		حذف واضافہ
شش وپنج	:	گھبراہٹ' فکروواندیشہ			

19.10 سفارش کردہ کتابیں

1. سید اقبال قادری : رہبرِ اخبارنویسی' ترقی اردو بیورو' نئی دہلی 2000ء
2. ڈاکٹر شاہد پرویز : عوامی ذرائع ابلاغ' ترسیل اور تعمیر وترقی (ترجمہ) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' نئی دہلی 2002ء
3. رفعت سروش : براڈ کاسٹنگ' لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاوس دریا گنج' نئی دہلی 2000ء
4. گرو بچن چندن : جامِ جہاں نما۔اردو صحافت کی ابتدا' نئی دہلی
5. ڈاکٹر شاہد پرویز : آف دی ریکارڈ' آئیڈیا پبلی کیشنز' نئی دہلی

6. Thomas, Sunny. Writing for the media, Vision Books Pvt.Ltd. Lajpat Nagar, New Delhi, 1997
7. Teel, Leonard & Taylor Ron. Into the News Room, The Globe Pequot Press, Chester Connecticut, 1988

اکائی 20 : ریڈیو : آغاز و ارتقا

ساخت

20.1 تمہید

20.2 تکنالوجی کی ترقی

20.2.1 ریڈیو۔یورپ اور امریکہ میں

20.2.2 ہندستان میں ریڈیو

20.2.3 جنگ کے دوران ریڈیو کی سروس

20.2.4 آزادی کے بعد نشریات

20.2.5 پہلے، دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبوں میں ریڈیو کی ترقی

20.2.6 A.I.R کوڈ

20.2.7 1968ء میں ریڈیو کی توسیع

20.2.8 چوتھا پنج سالہ منصوبہ

20.2.9 ٹیلی ویژن کا آغاز

20.2.10 کمرشیل براڈ کاسٹنگ

20.2.11 نیوز سروس ڈویژن (NSD)

20.2.12 بیرونی نشریات کا ڈویژن (ESD)

20.2.13 تعلیمی نشریات

20.2.14 کسانوں کے لیے پروگرام

20.2.15 پانچواں پنج سالہ منصوبہ

20.2.16 الیکشن براڈ کاسٹ

20.2.17 مقامی ریڈیو (Local Radio)

20.2.18 یووانی (نوجوانوں کے لیے)

20.2.19 قومی پروگرام

20.2.20 چھٹا منصوبہ

20.2.21 F.M. ریڈیو

20.2.22 پرسار بھارتی

20.3 ہندستان میں ریڈیو کی ترقی۔ بہ یک نظر

20.3.1 پنج سالہ منصوبوں کے اختتام پر ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد

20.4 خلاصہ

20.5 نمونہ امتحانی سوالات

20.6 فرہنگ

20.7 سفارش کردہ کتابیں

20.1 تمہید

ریڈیو براڈ کاسٹ کا آغاز تقریباً ایک سو سال قبل ہوا تھا۔ اس کے بعد ریڈیو کے نظام نے بتدریج ترقی کے مراحل طے کیے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو کی ترقی تکنالوجی کی ترقی کی مرہون منت ہے۔ لہٰذا جیسے جیسے تکنالوجی نے ترقی پائی اسی مناسبت سے ریڈیو کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ریڈیو کے فروغ کا پیمانہ زیادہ سے زیادہ علاقوں تک اس کی رسائی اور اس میں نت نئے موضوعات کی شمولیت ہے۔ زیرِ نظر اکائی میں آپ مطالعہ کریں گے کہ تکنالوجی نے کس طرح ریڈیو کے فروغ میں معاونت کی۔ پہلے امریکہ اور یورپ میں ریڈیو کی شروعات ہوئی اور پھر ہندستان میں ریڈیو نے رواج پایا۔ اس اکائی میں آپ AIR Code اور مختلف پروگراموں کی اہمیت کے بارے میں بھی پڑھیں گے۔ آپ کو ریڈیو کی موجودہ صورت حال سے بھی واقفیت حاصل ہوگی۔

20.2 تکنالوجی کی ترقی

ریڈیو کی ابتدا تکنالوجی کی ترقی سے جڑی ہوئی ہے۔ 1875ء میں تھامسن (Thomson) نے وائرلیس سگنل بھیجنے شروع کیے۔ ایک سال بعد بیل (Bell) نے ٹیلیفون ایجاد کیا۔ 1886ء میں Oberlin Smith نے مقناطیسی ریکارڈنگ (Magnetic recording) کا نظریہ پیش کیا۔ 1887ء میں جرمن ماہر طبیعیات ہرٹز (Hertz) نے ریڈیائی لہروں (Radio Waves) کو خلا میں بھیجا۔ دو سال بعد ایڈیسن (Edison) نے کیمرہ ایجاد کیا۔ 1895ء میں مارکونی نے ریڈیو ٹرانسمیٹر اور ریسیور (Transmitter & Receiver) ایجاد کیا۔

1900ء میں ریگی نالڈ فیسنڈن (Reginald Fessenden) نے آواز کو بغیر کسی وائر کے ترسیل کیا۔

نشریات کا آغاز

مارکونی نے بین الاقیانوسی سگنل (Transatlantic Signals) بھیجنے میں کامیابی حاصل کی۔ 1909ء میں ہیرالڈ نے سان جوز (San Jose) میں کامیاب ریڈیو براڈ کاسٹ کیا۔ 1917ء میں ماڈی سن (Madison) میں یونیورسٹی آف وسکانسن (University of Wisconsin) نے پہلا ریڈیو نشریہ پیش کیا۔ 1919ء میں ریڈیو کارپوریشن آف امریکہ کا قیام عمل میں آیا۔

20.2.1 ریڈیو۔ یورپ اور امریکہ میں

1920 میں KDKA نے امریکہ میں پٹسبرگ (Pittsburgh) سے پہلا مقررہ (شیڈول) پروگرام پیش کیا۔ 1921ء میں، امریکہ میں، گھروں میں استعمال کے لیے چھوٹے چھوٹے ریڈیو سیٹ تیار کیے گئے۔ 1922ء میں نیویارک میں ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا۔ برطانیہ میں پہلی باقاعدہ سروس نومبر 1922ء میں شروع ہوئی۔ 1927ء کو یہ کمپنی کارپوریشن میں تبدیل ہوگئی۔

ریڈیو کا آغاز جرمنی میں 29 نومبر 1923ء اور اٹلی میں 27 اگست 1924ء میں ہوا۔ امریکہ میں نیشنل براڈ کاسٹنگ کمپنی کا وجود عمل میں آیا اور 1928ء میں فیڈرل کمیشن قائم کیا گیا۔

20.2.2 ہندستان میں ریڈیو

اس دوڑ میں ہندستان کچھ پیچھے نہیں رہا۔ 1921ء میں ممبئی سے ممبئی اسٹیٹ کے گورنر کو پونے میں موسیقی کا ایک پروگرام سنایا گیا۔ تجرباتی طور پر نشری پروگرام شہروں میں شروع کیے گئے۔ اس میں ریڈیو کلبوں کا بڑا دخل رہا۔ 1923ء میں کلکتہ ریڈیو کلب نے اور 1924ء میں ممبئی ریڈیو کلب نے پروگرام پیش کیے۔ یہ دونوں نشریاتی کلب مارکونی سے حاصل کیے گئے جو چھوٹے ٹرانسمیٹر پر چلتے تھے۔ انڈین براڈ کاسٹنگ سروس (Indian Broadcasting Service) کا 1926ء میں قیام عمل میں آیا۔

1927ء میں ممبئی اور کلکتہ میں باقاعدہ اسٹیشن قائم کیے گئے۔ ممبئی کا 23 جولائی 1927ء کو افتتاح ہوا۔ وائسرائے لارڈ اِرون نے اس کا افتتاح

کیا۔ اگست میں کلکتہ اسٹیشن کا افتتاح ہوا۔ کلکتے کا یہ پروگرام رنگون میں سنا گیا۔ ممبئی اور کلکتہ کے دونوں ٹرانسمیٹر خانگی ٹرانسمیٹر تھے اور جب یہ معاشی مشکلات سے دوچار ہونے لگے تو 1930ء میں حکومت نے ان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس سروس کو انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کا نام دیا گیا۔ 1927ء میں ریڈیو لائسنس (Licenses) کی تعداد 3 ہزار تھی تو 1929ء میں 6 ہزار تک پہنچ گئی۔ ممبئی اسٹیشن نے 1933ء میں مراٹھی، گجراتی، کنڑ میں پروگرام نشر کرنا شروع کر دیا۔ ملک کا پہلا کمیونٹی سیٹ ضلع تھانہ کے بھیونڈی قصبے میں لگایا گیا۔

مدراس کارپوریشن نے مدراس ریڈیو کلب سے مدراس اسٹیشن کو 1927ء میں اپنی تحویل میں لیا۔ جب کلب مالی مشکلات سے دوچار ہوا تو پھر 1938ء میں کارپوریشن سے حکومت نے اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ BBC سے وہاں کے مشہور پروڈیوسر فیلڈن (Lionel Fielden) ہندستان بھیجے گئے۔ وہ کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ مقرر ہوئے۔ ان ہی کی ایما پر Lord Linlithgow نے انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کا نام آل انڈیا ریڈیو منظور کیا۔ 1936ء میں دلی اسٹیشن کا آغاز ہوا۔ فیلڈن اور ان کے چیف انجینئر نے سارے ملک میں Short Wave Coverage کا جال بچھا دیا۔ حکومت نے تیس لاکھ روپے نشریات کے لیے منظور کیے۔ 1936ء میں آل انڈیا ریڈیو جینوا کے Union International Radio کا ممبر بنا۔

1930ء سے 1999ء تک یعنی تقریباً 70 سال نشریات حکومت ہند کا ایک محکمہ رہا۔ پہلے پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے تحت، پھر انڈسٹریز (Industries) کے تحت اور پھر وزارت اطلاعات ونشریات کے تحت۔ ایک بات قابل غور ہے کہ 1924ء سے 1930ء تک نشریات کو مختلف ریڈیو کلب، YMCA کارپوریشن، یونیورسٹی اور صوبائی حکومت چلاتے رہے۔ قابل ذکر ہے کہ حکومت کے وہ محکمے جو براڈ کاسٹنگ چلاتے رہے تھے، وہ تھے P&T اور انڈسٹریز۔ وہ دونوں اس بات کے قائل تھے کہ براڈ کاسٹنگ پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہ رہے۔ وہ لائسنس فیس کے قائل تھے اور اسی سے مجموعی پروگراموں کے اخراجات کی پابجائی کرنا چاہتے تھے۔

20.2.3 جنگ کے دوران ریڈیو کی سروس

دوسری عالمی جنگ کے دوران جرمن پروپیگنڈے کے اثر کو زائل کرنے کی غرض سے بیرونی نشریات اور نیوز سروس کا آغاز کیا گیا۔ 1937ء میں Central News Organisation کا قیام عمل میں آیا اور 1939ء میں External Services سے پشتو نشریات شروع ہوئیں۔ عوام زیادہ سے زیادہ خبریں سننا چاہ رہے تھے۔ تلگو، تمل، گجراتی، مراٹھی، پشتو میں خبرنامے شروع کیے گئے۔ 1939ء میں فوج نے پروپیگنڈے کے اثر کو زائل کرنے کے لیے Monitoring Unit شروع کیا۔ 1940ء میں جرمنی نے ہندستانی زبانوں میں ہندستانیوں کے لیے نشری پروگرام شروع کیا۔ نیتا جی نے اسی ٹرانسمیٹر سے ہندستانی عوام کو خطاب کیا تھا۔

1947ء میں ہندستان کے حوالے 6 ریڈیو اسٹیشن (ممبئی، دلی، مدراس، کلکتہ، لکھنو، ترچناپلی) کیے گئے۔ اور پشاور، لاہور اور ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشنس پاکستان کے حوالے کیے گئے۔ تقسیم کے موضوع پر دلی اسٹیشن سے 1947ء میں پنڈت نہرو، محمد علی جناح، لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mount Batten) نے تقریریں کیں۔ 14-15 اگست کی رات کو پنڈت نہرو نے حصول آزادی کے تعلق سے تقریر کی، جو راست نشر ہوئی۔

20.2.4 آزادی کے بعد نشریات

1947ء میں تقسیم کے بعد، دو لاکھ 6 ہزار لائسنس یافتہ ریڈیو سیٹ تھے۔ آبادی کے تناسب کے حساب سے بارہ ہزار افراد پر ایک سیٹ تھا۔ اس وقت ہماری شرح تعلیم صرف 30% تھی۔ شرح تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ہمارے پلانرز نے ایک آٹھ سالہ ترقیاتی اسکیم شروع کی جس کے لیے 36 ملین روپے مختص کیے گئے۔ ایک کیلوواٹ کے Pilot-station شروع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ دسمبر میں جموں اسٹیشن قائم کیا گیا جس کے ڈائرکٹر راجندر سنگھ بیدی بنائے گئے۔ پھر 1950ء تک، پٹنہ، کٹک، گوہاٹی، کوزی کوڈ، ناگپور، وجے واڑہ، سری نگر، الہ آباد، احمد آباد، جالندھر، دھارواڑ اسٹیشن قائم کیے گئے۔ 1950ء تک 25 ریڈیو اسٹیشن تھے اور ساٹھ ہزار گھنٹوں کے پروگرام سالانہ نشر ہوتے تھے۔ ان پروگراموں کو آبادی کے 12% لوگ سن سکتے تھے اور آبادی کا 12% رقبہ نشریات کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. وائرلیس سگنل کب اور کس نے بھیجنا شروع کیا؟
2. ممبئی اور کلکتے میں باقاعدہ ریڈیو اسٹیشن کب قائم کیے گئے؟
3. 1947ء میں لائسنس یافتہ ریڈیو سیٹ کی تعداد کتنی تھی؟
4. راجندر سنگھ بیدی کس ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر تھے؟

20.2.5 پہلے، دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبوں میں ریڈیو کی ترقی

پہلے منصوبے میں تقریباً پانچ کروڑ کی رقم نشریات کی ترقی کے لیے رکھی گئی۔ پونے، راج کوٹ، اندور، بنگلور، جے پور، شملہ میں اسٹیشن کھولے گئے اور ٹرانسمیٹرز کی طاقت بڑھادی گئی۔ 1952ء میں وادیہ ورندا (Vadya Vrinda) نیشنل آرکسٹرا کے نام سے شروع کیا گیا۔ روی شنکر اس کے ڈائرکٹر تھے۔ 23 اکتوبر کو پہلا ریڈیو سنگیت سمیلن نشر ہوا۔ لکھنو اور ناگپور سے علاقائی خبریں شروع کی گئیں۔ 1953ء میں تقریروں کا قومی پروگرام (National Programme of talks) نشر ہوا۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں کل چھے نئے اسٹیشن کھولے گئے۔ 1955ء میں سردار پٹیل میموریل لیکچرس، ریڈیو نیوز ریلز، اوپیراز (Operas) کے نیشنل پروگرام، ڈرامے اور فیچرس شروع کیے گئے۔

پہلے پنج سالہ منصوبے کے اختتام پر آل انڈیا ریڈیو کو ملک کے تقریباً 46% لوگ سن سکتے تھے اور 31% آبادی کی ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں۔ سارے ہندستان میں Licenses کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ تھی اور سالانہ ایک لاکھ گھنٹوں کے پروگرام نشر ہوتے تھے۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے کی لاگت 8 کروڑ روپے تھی۔ اس دور میں شمال مشرقی علاقوں میں قبائلی پروگرام شروع کیے گئے۔ 1957ء کا سب سے اہم واقعہ وودھ بھارتی کی شروعات۔ یہ پروگرام سوکیلوواٹ پر ممبئی اور مدراس سے نشر ہوتے تھے۔ 1959ء کے دو اہم واقعات تجرباتی ٹیلیویژن پروگراموں کا آغاز اور کسانوں کے لیے Radio Rural Forum ہیں۔ 1960ء میں آل انڈیا ریڈیو نے Commonwealth Broad Casting Conference کی میزبانی کی۔ 1960ء ہی میں اقوام متحدہ جنرل اسمبلی سے پنڈت نہرو کی تقریر نیویارک سے راست نشر ہوئی۔ 1961ء میں دلی سے اُردو مجلس کے پروگرام شروع کیے گئے۔

تیسرے پنج سالہ منصوبے مین میڈیم ویو (Medium Wave) کی توسیع کے منصوبہ کے تحت کئی ضمنی اسٹیشنس قائم کیے گئے۔ مثلاً:

بیکانیر (Bikaner)	ترونیل ویلی (Tirunelveli)
ویزاگ (Vishakpatnam)	کڑپہ (Cuddapah)
رائے پور (Raipur)	سمبلپور (Sambalpur)
گوالیار (Gwalior)	سانگلی (Sangli)
جبلپور (Jabalpur)	جے پور (Jey pur)
جودھپور (Jodhpur)	بھدراوتی (Bhadravati)
کوئمبٹور (Colmbatore)	گلبرگہ (Gulbarga)

1967ء میں کوہیما، امپھال، پورٹ بلیر میں ایسے اسٹیشنس قائم کیے گئے۔

تیسرے منصوبے کے اختتام پر ملک میں آل انڈیا ریڈیو کے 54 سینٹرز، 28 شارٹ ویو اور 82 میڈیم ویو سنٹرس (medium wave centres) تھے۔ یہ ملک کی ستر فیصد آبادی کی ضرورتوں کو پورا کر رہے تھے۔ اور آبادی کے 52% لوگ اس سے استفادہ کر رہے تھے۔ 1967ء میں ممبئی، پونے اور ناگپور سے سلسلہ وار (Chain) اشتہارات شروع کیے گئے۔ فیملی پلاننگ کے پروگرام 22 اسٹیشنوں سے نشر ہونے لگے۔

20.2.6 AIR کوڈ

1967ء کا سب سے اہم واقعہ AIR Code ہے جس کو حکومت نے کلکتہ کے اسٹیشن ڈائرکٹر اور CPI کے وزیر کے مابین اختلاف کی وجہ سے نافذ کیا تھا۔ کوڈ کچھ ایسا ہے:

ان باتوں کی اجازت نہیں دی جائے گی:

1. ایسے ملک پر تنقید، جس کے ساتھ دوستانہ مراسم ہیں۔
2. مذہب یا فرقہ پر تنقید۔
3. فحش یا ہتک آمیز چیز کا مظاہرہ۔
4. کسی اشتعال کا اظہار۔
5. جس سے عدالت کی توہین ہو۔
6. جس سے صدر جمہوریہ، گورنر، عدلیہ، کی ساکھ متاثر ہو۔
7. کسی سیاسی پارٹی پر راست حملہ۔
8. مرکزی اور صوبائی حکومت پر مخاصمانہ تنقید۔
9. آئین کے تحت کسی تبدیلی پر پابندی نہیں لیکن کوئی ایسی بات۔

الف۔ جو ملک کے آئین کی بے حرمتی کرتی ہو۔ اور

ب۔ تشدد کے ذریعے اس میں تبدیلی کے لیے ورغلاتی ہو۔

ایسے لوگ جو کوڈ کی پابندی نہیں کرتے، ڈائرکٹر ان کو نشریہ سے روک سکتا ہے۔

20.2.7 1968ء میں ریڈیو کی توسیع

(1) 1968ء میں کمرشیل براڈ کاسٹ کی کلکتہ اسٹیشن تک توسیع۔

(2) انگریزی اور ہندی خبروں کے بلیٹن کے اوقات میں تبدیلی۔

(3) 21 جولائی، کودلی میں اندرا گاندھی نے یووانی پروگرام کا افتتاح کیا۔

(4) کلکتہ میں میگاوٹ ٹرانسمیٹر کا قیام عمل میں آیا تا کہ مشرقی پاکستان اور برما کے لوگ سن سکیں۔

20.2.8 چوتھا پنج سالہ منصوبہ

(1) اس پنج سالہ منصوبہ کا مقصد یہ تھا کہ ملک کی آبادی کے 80 فیصد لوگ ریڈیو کی آواز سن سکیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے 40 کروڑ روپے کی خطیر رقم مختص کی گئی۔

(2) لیہ (Leh) اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. پہلے منصوبے میں نشریات کی ترقی کے لیے کتنی رقم مختص کی گئی تھی؟
2. AIR کوڈ سے کیا مراد ہے؟
3. چوتھے پنج سالہ منصوبے میں ملک کی کتنی آبادی تک ریڈیو کی آواز پہنچانے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا؟

4. اُردو مجلس کے پروگرام کب اور کہاں شروع کیے گئے؟

20.2.9 ٹیلی ویژن کا آغاز

15 ستمبر 1959ء کو دلی میں دوردرشن قائم کیا گیا۔ تجرباتی پروگرام ہوتے رہے۔ 1965ء تک دلی سے ہفتے میں ایک گھنٹے کا پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا جاتا رہا۔ 15 اگست 1965ء سے پروگرام کی مدت روزانہ ایک گھنٹہ کر دی گئی۔ اکتوبر 1972ء میں ممبئی اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا۔ 26 رجنوری 1973ء کو سری نگر سے پروگرام نشر ہونے لگے۔ امرتسر میں بھی اسٹیشن تقریباً ایک ساتھ ہی قائم کیا گیا۔

1975ء میں SITE کے ٹی وی پروگراموں کی وجہ سے کرناٹک' آندھراپردیش' بہار' مدھیہ پردیش' اڑیسہ' راجستھان کے 2400 دیہاتوں میں مخصوص Sets پر ٹی وی پروگرام دکھائے گئے۔ پہلی اپریل 1976ء کو ریڈیو' ٹی وی سے الگ کر دیا گیا۔

20.2.10 کمرشیل براڈ کاسٹنگ

چندا کمیٹی کی سفارشات کو قبول کرتے ہوئے حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ وودھ بھارتی میڈیم ویو چینل پر یکم نومبر 1967 سے ممبئی' پونے' ناگپور سے تجارتی اشتہارات بھی پیش کیے جائیں۔ بعد میں یہ سلسلہ کلکتہ' دلی' مدراس' ترچناپلی' چنڈی گڑھ' جالندھر' بنگلور' دھارواڑ' احمد آباد' راج کوٹ' حیدرآباد' وجے واڑہ تک وسیع کر دیا گیا۔

تجارتی نشریات کا وقت وودھ بھارتی کی مجموعی نشریات کا 10% تھا۔ اشتہارات ایجنسیوں کے ذریعے حاصل کیے جاتے۔ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا کہ جو بھی ریڈیو پر پیش ہو' وہ مذاق سلیم کے خلاف نہ ہو۔ اس کا بھی خیال رکھا گیا کہ نشری اشتہارات' ملک کے دوسرے قوانین سے ہم آہنگ ہوں۔ خاص طور پر ان اشتہارات کی وجہ سے کسی طبقے کی اخلاقی' تہذیبی' مذہبی' احساسات کو دھکہ نہ پہنچے۔ اشتہارات کو دستور ہند کے مقاصد' اصولوں اور قاعدوں کے مطابق بھی ہونا ضروری تھا۔

20.2.11 نیوز سروس ڈویژن (NSD)

اگرچہ ہندستان کی ساری نشریات علاقائی طور پر ہوتی ہیں جن میں قومی اور بین الاقوامی دونوں خبریں شامل ہیں' یہ خبریں ہندستان کی ساری زبانوں میں نشر کی جاتی ہیں۔ ان خبروں کا مرکز دلی ہے جہاں یہ خبریں تشکیل دی جاتی ہیں۔

1935ء تک دن میں دو مرتبہ خبرنامے نشر کیے جاتے تھے جن میں سے ایک انگریزی میں ہوتا تھا' دوسرا متعلقہ علاقائی زبان میں۔

1947ء میں آل انڈیا ریڈیو' 74 نیوز بلیٹن نشر کرتا تھا جن میں 43 ہوم سروس کی جانب سے اور 31 بیرونی نشریات (ESD) کی جانب سے پیش کیے جاتے تھے۔ 55-1954ء کے دوران جب علاقائی خبروں کی یونٹ قائم کی گئی تو آل انڈیا ریڈیو نے ریڈیو نیوز ریل کا آغاز کیا۔ جو اب انگریزی' ہندی میں دلی سے ہر روز نشر ہوتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کا نیوز سروس ڈویژن' مختلف ریاستوں سے موصولہ نیوز لیٹر (News letter) بھی پیش کرتا ہے۔

20.2.12 بیرونی نشریات کا ڈویژن (ESD)

بیرونی نشریات کا مقصد بین الاقوامی سطح پر ہندستانی نقطہ نظر سے ایک خاص قسم کی سوجھ بوجھ پیدا کرنا اور اس کو فروغ دینا ہے۔ باہر کے ممالک میں جو ہندستانی عوام ہیں' ان کی تہذیبی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ انہیں ہندستانی ترقیاتی صورت حال سے آگاہ کرنا ہے۔ پروگراموں کی صورت گری کچھ اس طرح کی جاتی ہے: حالات حاضرہ پر تبصرہ' اخباری اداریوں کی تلخیص' نیوز ریل' انٹرویوز' مباحث' تقاریر' موسیقی کے پروگرام (ہلکی عوامی علاقائی کلاسیکی موسیقی) قومی اور بین الاقوامی تہوار۔

ہندستانی موسیقی کی مقبولیت بین الاقوامی سطح پر ہے۔ پشتو' دری' روسی' سواحلی کے لیے بھی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔

20.2.13 تعلیمی نشریات

تعلیمی نشریات کے سلسلہ میں نومبر 1937ء سے کلکتہ میں ہفتہ میں' آدھ آدھ گھنٹے کا پروگرام' اسکولوں کے لیے شروع کیا گیا۔ اسکولوں کے لیے نشریات کا باقاعدہ پروگرام ممبئی' کلکتہ' دلی اور مدراس سے دسمبر 1938 میں شروع ہوا۔ مدراس میں ہر ہفتہ پرائمری اسکولس کے لیے تمل زبان میں پانچ پروگرام پیش کیے جانے لگے جو مدراس کارپوریشن کی خواہش پر شروع کیے گئے تھے۔ ان پروگراموں میں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھی گئی تھی کہ یہ نشری پروگرام اسکولوں کی تدریسی سرگرمیوں کی جگہ نہ لیں بلکہ ان سرگرمیوں کے ساتھ ایک ضمنی خدمت انجام دیں۔ پالیسی یہ تھی کہ نشریاتی پروگراموں کے ذریعے' تعلیمی ذوق شوق بڑھایا جائے اور اس طرح اسکول کے ماحول میں ایسی دلکشی پیدا کی جائے کہ بچوں میں اسکول چھوڑ کر بھاگنے کا رجحان کم ہو جائے۔ یہ پالیسی بنیادی طور پر پرائمری اسکولوں کی سطح پر روبہ عمل لائی گئی۔ اس میں ایک اصول یہ کارفرما تھا کہ پرائمری اسکولوں میں تفریحی طریقوں سے تعلیم سرگرمیاں بڑھائی جائیں۔

تعلیمی نشریاتی پروگراموں کا دوہرا مقصد تھا۔ ایک مقصد تو یہ تھا کہ نصاب تعلیم کی تدریس طالب علم تک راست پہنچے اور اسکول میں پڑھائے جانے والے نصاب کو واضح طور پر سمجھنے میں مددگار ہو۔ خاص طور پر ثانوی اسکولوں کے لیے جو نشری پروگرام ہوئے تھے' وہ زیادہ تر نصاب تعلیم کے مطابق ہوا کرتے تھے۔

نشریاتی پروگرام یا تو سیدھی سادی تقریر پر مبنی ہوتے ہیں یا پھر ایسی ہی تقریروں کو ڈرامائی عناصر سے آراستہ کر کے پیش کیا جاتا تھا۔ اور یہ ڈرامائی پیش کش' کسی بھی نصابی متن سے متعلق ہوتی تھی۔ اس میں طالب علم آپس میں مکالموں کے ذریعے موضوع کو واضح کرتے یا اسکول کی جانب سے ایک سوال بند (کویز) پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔

20.2.14 کسانوں کے لیے پروگرام

ریڈیو نے زراعت کی نئی تکنالوجی کو کسانوں کے دروازے تک پہنچانے میں اور کسانوں کو مختلف انداز کی ٹریننگ فراہم کرنے میں اور ساتھ ہی وزارت زراعت اور تعلیم کے مختلف پروگراموں سے ان کو واقف کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ 1966ء سے جب آکاشوانی کے 'کھیت اور گھر' اکائیوں نے اپنا نشری پروگرام شروع کیا تو اس کی وجہ سے حیرت ناک بیج اور بڑھتی ہوئی پیداوار دیکھنے میں آئی۔ جنوب میں یہ پروگرام اتنے مقبول ہوئے اور کسانوں نے ان کو اتنا اپنایا کہ اس کو Radio Rice سے موسوم کیا گیا۔

1935ء کی بات ہے کہ شمال مغرب میں پشاور اسٹیشن قائم کیا گیا جس کے لیے مارکونی کمپنی نے ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر مستعار دیا تھا جس کے نتائج امید افزا پائے گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی اور نینی تال نے بھی لگ بھگ اسی زمانہ میں ایک مقامی نشری خدمات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک ریڈیو ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکا ہے۔ یہ پروگرام مقامی زبانوں میں نشر کیے جاتے تھے جس میں مزاح' دوسری دلچسپیوں والے عناصر ملاتے ہوئے ایسے پروگرام بھی پیش کیے جاتے تھے جس میں دیہاتیوں کے لیے زرعی' صنعتی' حیوانی افزائش سے متعلق معلومات ہوا کرتی تھیں۔ چھوت چھات اور دوسری سماجی برائیوں کے خلاف بھی پروگرام پیش کیے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ عوامی دلچسپی کے حامل ڈرامے اور بالواسطہ طور پر ماہرین کے خیالات عوامی تربیت کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔

1965ء سے وزارت اطلاعات ونشریات نے وزارتِ زراعت وتعلیم کے مشورے سے ایک نئی خدمت کا آغاز کیا جسے ''کھیت اور گھر یونٹ'' (Farm & Home Unit) کہا جاتا ہے۔ یہ یونٹ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں بسنے والے کسانوں کے مسائل اور ان کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خصوصی پروگرام پیش کرتے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ زراعت کے بارے میں سائنٹفک اور تکنیکی معلومات پر راست تربیتی پروگرام کسانوں تک پہنچنے لگے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ہندستان میں ٹیلی ویژن کا آغاز کب ہوا؟

2. NSD سے کیا مراد ہے؟
3. تعلیمی نشریات شروع کرنے کا کیا مقصد تھا؟
4. کس پروگرام کو Radio rice سے موسوم کیا گیا؟

20.2.15 پانچواں پنج سالہ منصوبہ

پانچویں پنج سالہ منصوبے (78-1974) کے اختتام تک 84 براڈ کاسٹنگ سینٹرز تھے۔ میڈیم ویو کے 124 اور شارٹ ویو کے 32 ٹرانسمیٹر تھے۔ ایک FM ٹرانسمیٹر بھی تھا۔ کل ملا کر 157 ٹرانسمیٹر کام کر رہے تھے۔ ملک کے 78% رقبہ پر ریڈیو کی گونج تھی اور 90% عوام ریڈیو سن سکتے تھے۔

پانچویں پنج سالہ منصوبے کے دوران آل انڈیا ریڈیو نے تقریباً 238 ملین روپے خرچ کیے۔ پہلے دو سال میں پچاس، پچاس ملین اور اگلے دو سالوں میں 80-80 ملین خرچ ہوئے۔ 1976ء میں میتھلی بولنے والے عوام کے لیے دربھنگہ (بہار)، مدھیہ پردیش کے بندیل کھنڈ کے لیے چھتر پور، مرہٹواڑہ عوام کے لیے اورنگ آباد، جنوبی خطے کے عوام کے لیے منگلور، ریاست ہریانہ کے لیے روہتک اسٹیشن کھولے گئے۔ 1977ء میں کونکن علاقے کے لیے رتنا گیری، مدھیہ پردیش کے باگیل کھنڈ علاقے کے لیے ریوا اسٹیشن کھولے گئے۔ 1977ء ہی میں مدراس میں FM اسٹیشن قائم کیا گیا۔

20.2.16 الیکشن براڈ کاسٹ

الیکشن کے دوران سیاسی جماعتوں کو اپنی اپنی پارٹیوں کی پالیسیوں کی تشہیر کا موقع دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا الیکشن براڈ کاسٹ، دس صوبوں کے اسمبلی الیکشن میں 1977ء میں ہوا جب جنتا پارٹی کی حکومت تھی۔ ہر سیاسی جماعت کو جسے الیکشن کمیشن کی منظوری رہی ہو، پندرہ پندرہ منٹ کے دو راؤنڈ دیے گئے۔ دو راؤنڈ ریڈیو میں، اور ایک راؤنڈ دوردرشن پر۔

20.2.17 مقامی ریڈیو (Local Radio)

مختلف تجربوں سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ مقامی براڈ کاسٹنگ سروس میں یہ خاص فائدہ ہے کہ سامعین اور نشر کرنے والوں میں بڑا قریبی رابطہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے سامعین کے احساسات کو سمجھنے کی اور ضروریات کو پورا کرنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے اور سہولت کی وجہ سے مقامی سامعین کے اندر ذہنی تبدیلی لانے کے امکانات سہل ہو جاتے ہیں۔ مختلف علاقائی ضروریات کا جائزہ لیتے ہوئے مقامی ریڈیو اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسے علاقے جہاں درج فہرست اقوام اور قبائل آباد ہوں ان کی ضروریات اور ان کا ردِ عمل بہت مختلف ہوتا ہے۔ ان سب کا لحاظ کرتے ہوئے مقامی ریڈیو ان کی خصوصی ضروریات کے مطابق پروگرام پیش کرتے ہیں۔

20.2.18 یووانی (نوجوانوں کے لیے)

جولائی 1969ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے، نوجوانوں کے لیے یووانی، یعنی 'نوجوانوں کی آواز' کے نام سے نشریاتی پروگرام کا افتتاح کیا۔ یہ 6 گھنٹے کا پروگرام، صبح شام، دو ٹرانسمیشن میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے پیچھے خیال یہ تھا کہ ملک میں 60% آبادی ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کی عمریں 20 سال سے کم ہیں۔ ان نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ خصوصی پروگرام بنایا گیا۔ یہ خصوصی پروگرام پہلے 35 اسٹیشنوں سے نشر کیا جاتا تھا۔ اس پروگرام کے تحت نوجوانوں کا ایک ایسا فورم تشکیل دیا گیا، جو نوجوانوں کے دل و دماغ کی نمائندگی کر سکے اور زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو اس پروگرام میں شرکت کے لیے راغب کر سکے۔ یہ پروگرام نوجوانوں میں اپنے ملک کی تاریخ و تہذیب کا شعور اس طرح پیدا کرنے کے لیے بنایا گیا تھا کہ ان کا ذہن عالمی تہذیب کے لیے کھل سکے۔

ان پروگراموں کے ذریعے اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ نوجوانوں میں اس بات کا احساس پیدا ہو کہ وہ اپنی زندگی کا کوئی ایسا مقصد طے

کریں جو قوم کی تعمیر جیسے عظیم الشان کام کا ایک حصہ بن جائے۔ نوجوانوں میں سائنسی نقطہ نظر پیدا ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ ہندستانی اقدار کی اہمیت کو پہچان سکیں۔ حال ہی میں Vocational Guidance کورسوں پر بھی زور دیا گیا۔

1969ء میں رمادا مودرن کا پروڈکشن Echoes of a Generation نے ABU انعام حاصل کیا۔

20.2.19 قومی پروگرام

قومی پروگراموں کو تشکیل دیتے وقت، قوم کے مزاج کے مختلف پہلوؤں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ 85-1980ء کے دوران چھٹے منصوبے میں ناگپور میں 100 میگاواٹ کا ایک چینل قومی پروگراموں کے لیے مخصوص کیا گیا۔

20.2.20 چھٹا منصوبہ

اس منصوبے (85-1980) کے 4 بنیادی مقاصد تھے۔ پہلا یہ کہ موجودہ علاقائی خدمات کو توسیع دی جائے۔ دوسرا یہ کہ بیرونی خدمات کو مضبوط بنایا جائے، تیسرا یہ کہ قومی براڈ کاسٹنگ چینل کو ترقی دی جائے اور چوتھے مقامی براڈ کاسٹنگ کو متعارف کرایا جائے۔

20.2.21 FM ریڈیو

ہمارے پانچویں منصوبہ میں FM براڈ کاسٹنگ کی شروعات ہوئی۔ یہ سہولت، مدراس، ممبئی اور کلکتہ تک محدود رہی اب تو FM اسٹیشنوں کی کثیر تعداد ہے۔ آندھرا پردیش میں مارکاپورم، کرنول، انت پور، تروپتی، ورنگل، کوتہ گوڑم اسٹیشن ہیں۔ حیدرآباد کے 6 کیلوواٹ کا وودھ بھارتی بھی FM اسٹیشن ہے۔

20.2.22 پرسار بھارتی

پرسار بھارتی براڈ کاسٹنگ کارپوریشن آف انڈیا کا خودمختار ادارہ ہے۔ اسے حکومت ہند کے کنٹرول سے نکال کر ایک آزاد الیکٹرانک میڈیا کی حیثیت سے قائم کیا گیا ہے۔ 1977ء میں ورگیز کمیٹی تشکیل دی گئی۔ 1978ء میں ورگیز کمیٹی نے رپورٹ پیش کی۔ مئی 1979ء میں پرسار بھارتی بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ اگست 1990ء میں ترمیم شدہ پرسار بھارتی ایکٹ، پارلیمنٹ میں منظور ہوا۔ اکتوبر 1997ء میں پرسار بھارتی ایکٹ میں آرڈیننس کے ذریعے تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔

23 نومبر 1997ء کو پرسار بھارتی کا آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن پر کنٹرول ہو گیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. الیکشن براڈ کاسٹ کب شروع کیا گیا؟
2. یووانی پروگرام کا افتتاح کس وزیراعظم نے کیا تھا؟
3. قومی پروگراموں کی تیاری کے وقت خصوصی توجہ کس بات پر دی جاتی ہے؟
4. پرسار بھارتی نے آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کو کب اپنے کنٹرول میں لیا؟

20.3 ہندستان میں ریڈیو کی ترقی۔ بہ یک نظر

1926..... انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کا قیام

1927..... ممبئی اور کلکتہ اسٹیشنوں کا قیام

1935..... فیلڈن کا کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ کی حیثیت سے تقرر

1936.....فیلڈن کی ایما پر انڈین براڈ کاسٹنگ سروس بدل کر آل انڈیا ریڈیو ہو گیا۔

1937.....سنٹرل نیوز آرگنائزیشن کا قیام

1939 External Service میں پشتو نشریات کی شمولیت

1947.....ہندستان کے حوالے 6 اور پاکستان کے حوالے تین ریڈیو اسٹیشن تقسیم

پنڈت نہرو، محمد علی جناح، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقاریر۔ فسادات پر ریڈیو سے گاندھی جی کا خطاب

14-15 اگست کی رات پنڈت نہرو کی تقریر راست نشر ہوئی

1952.....آل انڈیا ریڈیو سے پہلا نیشنل پروگرام آف میوزک براڈ کاسٹ

1953.....نیشنل پروگرام آف ٹاکس (تقاریر)

1954.....ریڈیو سنگیت سمیلن

1956.....نیشنل پروگرام آف پلے (ناٹکوں کا قومی پروگرام)

1957.....وودھ بھارتی

1959.....آل انڈیا ریڈیو کے تحت ٹی وی اسٹیشن کا قیام

1967.....وودھ بھارتی پر کمرشیل اسپاٹ

جولائی 1969.....دلی سے یووانی سروس کی شروعات

اگست 1969.....کلکتہ میں 1000 کیلوواٹ سوپر پاور میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کا قیام

1971.....راج کوٹ میں 1000KW سوپر پاور ٹرانسمیٹر کا قیام

1974.....آکاشوانی سالانہ ایوارڈ کا انعقاد

1976.....ریڈیو اور ٹی۔وی۔ الگ ہو گئے

1977.....سیاسی جماعتوں کے لیے راست براڈ کاسٹ کی شروعات

1977.....مدراس سے FM سروس کی شروعات

1983.....آکاشوانی بروڈہ کو CBS اسٹیشن بنایا گیا

1984.....علیگڑھ میں دو ہائی پاور (250 کیلوواٹ) شارٹ ویو ٹرانسمیٹر کا افتتاح

1984.....ناگرکوئل میں لوکل اسٹیشن کا قیام

1985.....پرائمری چینل پر کمرشیل کی شروعات

1985.....ہر گھنٹہ کے وقفے سے نیوز بلیٹن کی شروعات

1988.....نیشنل چینل کی شروعات

1989.....Northeast Service کی شروعات

1990.....آل انڈیا ریڈیو کا 100 واں اسٹیشن ورنگل کا افتتاح

1990.....دو سو پر پاور ٹرانسمیٹر (شارٹ ویو) کا بنگلور میں افتتاح

1990.....قومی یکجہتی پر آل انڈیا ریڈیو نے لاساکول ایوارڈ کا انعقاد کیا

1993.....برھمپور (اڑیسہ) کا اسٹیشن 150 واں اسٹیشن بن گیا

1997.....پرسار بھارتی کا قیام

1998.....لوک سبھا میں پرسار بھارتی بل پاس ہوگیا

2001.....آکاشوانی اور دوردرشن کے میوزیم کا افتتاح

12 نومبر کو پبلک براڈ کاسٹنگ ڈے قرار دیا گیا

2002.....براڈ کاسٹنگ کے 75 سال مکمل

2004.....بنگلور سے کلاسیکی موسیقی چینل شروع

20.3.1 پنج سالہ منصوبوں کے اختتام پر ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد

-1	پہلا پنج سالہ منصوبہ	31.3.56	26
-2	دوسرا پنج سالہ منصوبہ	56-61	30
-3	تیسرا پنج سالہ منصوبہ	61-66	66
-4	چوتھا پنج سالہ منصوبہ	69-74	71
-5	پانچواں پنج سالہ منصوبہ	74-78	86
-6	چھٹا پنج سالہ منصوبہ	80-85	97
-7	ساتواں پنج سالہ منصوبہ	85-90	126
-8	آٹھواں پنج سالہ منصوبہ	92-97	187
-9	نواں پنج سالہ منصوبہ	97-2002	208
-10	دسواں پنج سالہ منصوبہ	2003-4	215

اپنی معلومات کی جانچ

درج ذیل واقعات کس سنہ عیسوی میں رونما ہوئے:

1. انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کا قیام
2. آل انڈیا ریڈیو کے تحت ٹی وی اسٹیشن کا قیام
3. ریڈیو اور ٹی وی کی علاحدگی
4. نیشنل چینل کی شروعات
5. پرسار بھارتی کا قیام

20.4 خلاصہ

ریڈیو کی ابتدا تکنالوجی سے مربوط ہے۔ ہندستان کا سب سے پہلا ریڈیو اسٹیشن ممبئی اور دوسرا کلکتہ میں قائم ہوا۔ یہ اسٹیشن انڈیا براڈ کاسٹنگ سروس کے تحت قائم ہوئے۔ 1935ء میں فیلڈن انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کے کنٹرولر بنے۔ دوران جنگ حکومت نے ریڈیو کو پروپیگنڈہ کے لیے استعمال کیا اور بیرونی نشریات کا آغاز کیا۔ آزادی کے فوری بعد بہت سے اسٹیشن کھولے گئے۔ پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے پنج سالہ منصوبوں میں کافی ریڈیو اسٹیشن کھولے گئے۔ 1959ء میں ٹیلی ویژن کی شروعات ہوئی۔ 1967ء میں وودھ بھارتی چینل قائم کیا گیا۔ نیوز سروس ڈویژن مقامی، علاقائی قومی، بین الاقوامی زبانوں میں خبریں نشر کرتا ہے۔ بیرونی نشریات کے تحت بھی خبریں نشر ہوتی ہیں۔ بیرونی نشریات میں، بیرون ملک کے ہندستانی باشندوں اور ہندستانی تہذیب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مختلف پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ 23 نومبر 1997ء کو ایک خودمختار ادارے پرسار بھارتی براڈ کاسٹنگ

آف انڈیا کا آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن پر کنٹرول ہوگیا۔

20.5 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ریڈیو کے آغاز وارتقا پر ایک مضمون لکھیے۔
2. کن مراحل سے گزر کر ریڈیو نے پرسار بھارتی تک کا سفر طے کیا؟
3. تعلیمی نشریات اور کسانوں کے لیے پروگرام کے خصوصی حوالے سے ''ریڈیو کی افادیت'' پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. یورپ اور امریکہ میں ریڈیو نشریات کی شروعات کب اور کیسے ہوئی؟ ہندستان میں تکنالوجی کی ترقی نے ریڈیو کی شروعات میں کس طرح مدد کی؟
2. ہندستان میں کلکتہ اور ممبئی ریڈیو اسٹیشنوں کے قیام اور اُن کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالیے۔
3. آزادی کے بعد پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے پنج سالہ منصوبوں میں ریڈیو کی ترقی کا جائزہ لیجیے؟
4. مقامی ریڈیو اور یووانی کے پروگرام کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
5. AIR Code، NSD اور ESD کا تعارف کرائیے۔

20.6 فرہنگ

رسائی	پہنچ	پروپیگنڈہ	تشہیر، ڈھنڈورا
معاونت	مدد	ہتک آمیز	جس سے توہین ہو، بے عزتی سے بھرا ہوا
مابین	درمیان	متن	کتاب کی اصل عبارت، Text
قوانین	قانون کی جمع	مختص	مخصوص کیا گیا

20.7 سفارش کردہ کتابیں

U.L.Baruah : This is All India Radio

Luthra : Indian Broadcasting

اکائی 21 : ریڈیائی نشریات اوران کی قسمیں

ساخت

21.1 تمہید

21.2 پروڈیوسر کا کام اوراس کی ذمہ داریاں

21.3 نشریات کی قسمیں

21.3.1 خبریں اور حالاتِ حاضرہ

21.3.2 تقریریں (Talks)

21.3.3 ڈراما

21.3.4 ڈاکومنٹری اور فیچر پروگرام

21.3.5 موسیقی پروگرام

21.3.6 ''فون اِن'' پروگرام (Phone-in programme)

21.3.7 کمرشیل پروگرام

21.3.8 متفرقات

21.4 خلاصہ

21.5 نمونہ امتحانی سوالات

21.6 فرہنگ

21.7 سفارش کردہ کتابیں

21.1 تمہید

ریڈیو ایک انتہائی طاقتور ذریعہ ابلاغ (میڈیم) ہے۔ ابلاغ کے تحریری ذرائع یعنی پرنٹ میڈیا (Print Media) اور ریڈیو میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کتابیں، رسالے اور اخبارات کو کسی بھی ملک کی سرحد تک محدود کیا جاسکتا لیکن ریڈیو نشریات کسی سرحد کی پابند نہیں ہوسکتیں۔ نہ تو انہیں پہاڑوں کی بلندیاں روک سکتی ہیں اور نہ ہی وسیع تر سمندر کی لہریں ان کی راہ میں حائل ہوسکتی ہیں۔ ریڈیو کے توسط سے وہ لوگ ایک دوسرے کے بہت قریب آسکتے ہیں جو جغرافیائی اور قومی حد بندیوں کے باعث ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے ہیں۔ یہاں ہم ریڈیو کی تاریخ اور اس کے پھیلاؤ پر بحث نہیں کریں گے۔ اس کے بارے میں آپ دوسری اکائیوں میں بہت کچھ پڑھ چکے ہیں۔ اس اکائی میں نشریات کی مختلف قسموں کے بارے میں بات ہوگی۔

ریڈیو کو ایک ایسا ''اندھا میڈیم'' کہا گیا ہے جو تصویریں یا مناظر تو نہیں دکھاتا لیکن سننے والا اپنے تخیل کے سہارے تصویریں بنالیتا ہے۔ جیسے ہی ریڈیو سے آواز نکلتی ہے، سامع اپنے ذہن میں براڈ کاسٹر کی ایک تصویر بنالیتا ہے۔ پھر جو کچھ وہ سناتا ہے اس کے بارے میں بھی سامعین کے ذہن میں تصویریں ابھرتی رہتی ہیں۔ اس بات کو یہاں بطورِ خاص ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ریڈیو میں سارا کھیل آوازوں کا ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن کی طرح یہاں مناظر اور کردار سامنے نہیں ہوتے بلکہ آواز ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ خوشی ہو یا غم، ہر طرح کے جذبات کو آوازوں ہی کے وسیلے سے ابھارا جاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ ریڈیائی ڈرامہ سن رہے ہیں تو اس کے کردار آوازوں ہی کے ذریعہ اپنی شناخت قائم کرتے ہیں اور آپ کے ذہن کے پردے پر ان کرداروں کی تصویریں

ابھرتی ہیں۔ یہ بات آپ جانتے ہی ہیں کہ تحریری مواد صرف تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ہوتا ہے جب کہ ریڈیو سے سماج کا ہر طبقہ مستفید ہوتا ہے اور تعلیم یافتہ، نیم خواندہ اور ناخواندہ..... ہر طبقے کے لوگ اس کی نشریات سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس کی پہنچ شہر شہر اور گاؤں گاؤں تک ہے۔ ریڈیو دوسرے ذرائع کے مقابلے سستا بھی ہے۔ ریڈیو سٹ کے علاوہ بڑے اور چھوٹے سائز کے ٹرانزسسٹر بھی ہر جگہ ملتے ہیں جنہیں غریب اور کم آمدنی کے لوگ بھی خرید سکتے ہیں۔

ریڈیو نشریات کے ذریعے سامعین کو نہ صرف اطلاعات اور معلومات فراہم کی جاتی ہیں بلکہ مختلف مسائل کے تعلق سے ان میں بیداری بھی لائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تفریحی پروگرام اور موسیقی بھی پیش کی جاتی ہے جس سے سامعین اپنی اپنی دلچسپی کے مطابق محظوظ ہوتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ریڈیو سے کئی طرح کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ مثلاً خبریں، حالاتِ حاضرہ پر تبصرے، تقریریں (ٹاک) ڈرامے، فیچر، مباحثے اور انٹرویو وغیرہ۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ریڈیو انسان کی تنہائی کا بہترین رفیق ثابت ہوتا ہے۔ یہ تنہائی کے احساس کو دور کر کے یگانگت اور قربت کا احساس پیدا کرتا ہے۔

21.2 پروڈیوسر کا کام اور اس کی ذمہ داریاں

نشریات کی قسموں پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس شخص کے کام اور ذمہ داریوں کا مختصراً جائزہ لیا جائے جو پروگرام کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور اسے پیش کرتا ہے۔ اس شخص کو ریڈیو کی زبان میں پروڈیوسر (Producer) کہتے ہیں۔

پروڈیوسر خواہ کوئی بھی پروگرام پیش کرے، بنیادی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک خیال کو لے کر آگے بڑھتا ہے مثلاً اگر وہ موسیقی کا کوئی آئٹم پیش کر رہا ہے یا انٹرویو کی تیاری کر رہا ہے یا مباحثہ کے لیے کوئی موضوع طے کر رہا ہے تو اس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے خیال کی اختراع کرے جس میں سامعین بے ساختہ دلچسپی لے سکیں۔ جو خیال اس کے ذہن میں آتا ہے وہ ضروری نہیں کہ پرانے یا عام خیال سے قطعی مختلف ہو۔ اصل چیز یہ ہوتی ہے کہ اس میں تازگی کا احساس پیدا ہوتا ہے یا نہیں؟ خیال کی تازگی ہی سامع کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے لہٰذا پروڈیوسر کو نشریات سے متعلق صرف اپنی ضابطہ بند ذمہ داریوں ہی سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے بلکہ جس حلقے کے لوگوں کے لیے وہ پروگرام پیش کرتا ہے اس سے رابطہ قائم کر کے اور حلقے کے لوگوں کا حصہ بن کر ان کے حالات اور ترجیحات بھی اسے معلوم کرنے چاہئیں۔ پروگرام سے متعلق خیالات کی جڑیں سامعین کی ضروریات میں پیوست ہونی چاہئیں اور اس میں سامعین کی زبان کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ اگر ایسی زبان استعمال کی جائے جو سامعین کو بوجھل لگے یا پروگرام کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جائے جو سامعین کو اپیل نہ کر سکے تو قدرتی طور پر ان کی دلچسپی پروگرام کے تئیں کم ہو جائے گی اور یہ پروڈیوسر کی سب سے بڑی ناکامی ہوگی۔ اسی لیے پروڈیوسر کو وقتاً فوقتاً ان علاقوں کا رُخ کرنا چاہیے جہاں کے لوگوں کے لیے وہ پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس حلقے کے لوگوں کی گفتگو سننی چاہیے۔ ان کے عادات واطوار کا جائزہ لینا چاہیے اور ان کی دلچسپیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی ان خطوط کا بھی گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہیے جو سامعین لکھتے ہیں کیوں کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں پروگرام کس حد تک پسند آتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ کیا تبدیلی چاہتے ہیں اور کیا کچھ اور سننا چاہتے ہیں۔ اگر پروڈیوسر ان ذمے داریوں کو بخوبی نبھائے گا تو یقیناً وہ پروگرام سے متعلق اچھے آئیڈیا کو فروغ دے سکتا ہے اور اس طرح پروگرام میں تازگی پیدا ہو سکتی ہے۔ یاد رہے کہ پروگرام میں تازگی پیدا کرنے کے لیے پروڈیوسر کا ذہن بھی تازہ کار ہونا چاہیے کیوں کہ کسی بھی پروگرام کی کامیابی اور مقبولیت کا دارومدار پروڈیوسر کی محنت پر ہوتا ہے۔ ریڈیو کے جو پروگرام سامعین میں بہت زیادہ مقبول ہوتے ہیں ان کی مقبولیت کے پیچھے پروڈیوسر کی محنت، ذہانت اور پیش کش کا انداز کارفرما ہوتا ہے۔ تاہم پروڈیوسر کو وسائل اور لاگت پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ یعنی اگر وہ کوئی پروگرام ترتیب دے رہا ہے تو اسے اس بات کو بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے کہ اسے مطلوبہ رقم مہیا کرائی جاتی ہے یا نہیں؟ پھر پروگرام سے متعلق دوسری مطلوبہ چیزیں آسانی سے دستیاب ہیں یا نہیں! اگر وسائل کم ہیں تو اسے اسی دائرے میں رہ کر منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. پروڈیوسر کسے کہتے ہیں؟
2. پروڈیوسر کی بنیادی ذمہ داری کیا ہوتی ہے؟

21.3 نشریات کی قسمیں

جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ ریڈیو سے کئی طرح کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً خبریں اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرے نشر کیے جاتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر تقریریں (Talks) نشر کی جاتی ہیں۔ مباحثے اور انٹرویو ہوتے ہیں' موسیقی کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں' ڈرامے اور ڈائیلاگ ہوتے ہیں' تعلیمی پروگرام نشر کرنے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے نیز ڈرامے اور فیچرز وغیرہ بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف انداز کے تفریحی پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ ان تمام پروگراموں کے انداز مختلف ہوتے ہیں اور ان کے پروڈیوسر بھی عموماً الگ الگ ہوتے ہیں۔ مثلاً خبروں کے شعبے سے جو لوگ وابستہ ہوتے ہیں ان کا موسیقی کے پروگرام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کیوں کہ کام کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح ڈرامے اور فیچر پیش کرنے والا عملہ عموماً تقریروں اور مباحثے یا انٹرویو براڈ کاسٹ کرنے والے عملے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں ہم نشریات کی مختلف قسموں پر بات کریں گے۔

21.3.1 خبریں اور حالاتِ حاضرہ

خبروں کا شعبہ عموماً دوسرے ریڈیو پروگراموں سے الگ ہوتا ہے۔ ''خبر'' (نیوز) کی بہترین مختصر تعریف یہ کی گئی ہے کہ ''نئی ہو' دلچسپ ہو اور صحیح ہو'' موٹے طور پر یہ کہا جائے گا کہ خبر سے مراد واقعات کی وہ تفصیل ہوتی ہے جسے سامعین نے اس سے پہلے نہ سنا ہو۔ خبر کو دلچسپ ان معنوں میں ہونا چاہیے کہ جو چیز پیش کی جائے اس کا کچھ جواز بھی ہو اور کسی نہ کسی طور پر سامع کو متاثر بھی کرے۔ خبر کا صحیح ہونا اس لیے ضروری ہے کہ لوگ اصل صورت حال سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ جہاں تک خبر کے ''تازہ'' ہونے کا تعلق ہے تو اگر اس طور پر دیکھا جائے تو ایک خبر کو ایک بار سے زیادہ نشر نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ بعض اہم خبریں بار بار سنائی جاتی ہیں تا کہ عوام کے بڑے حلقے تک پہنچ سکیں۔ بہت سے لوگ کسی وجہ سے ایک خبر نامہ (Bulletin) نہیں سن پاتے تو وہ دوسرا خبر نامہ سن کر حقیقت حال سے واقف ہوتے ہیں۔

خبروں کے تعلق سے اگر بات کی جائے تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سامع کیا چاہتا ہے؟ ایک حقیقی جمہوری معاشرے میں اسے یہ حق حاصل ہے کہ اس کے آس پاس جو کچھ ہو رہا ہے اس سے وہ باخبر رہے اور اس پر بحث و مباحثہ بھی کرے۔ البتہ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن سے عام سامعین کو کوئی خاص سروکار نہیں ہوتا۔ مثلاً قومی سلامتی سے متعلق کوئی معاملہ ہو یا کاروباری اور نجی نوعیت کی کوئی ایسی بات ہو جو حکومت وسیع تر مفاد میں عام نہ کرنا چاہتی ہو اسے عام طور سے نشر نہیں کیا جاتا۔ قانون اور ضابطے بنا کر اس نوعیت کی خبریں نشر کرنے پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ لہٰذا براڈ کاسٹر چاہے بھی تو ایسی خبروں کو نشر نہیں کر سکتا۔ اب یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی خاص معاملے میں کیا حکومت کی جانب سے عائد کردہ پابندی واقعی مناسب ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حکومت نے اپنے وضع کردہ ضابطے کے تحت عوام کو کسی ایسی بات کی جانکاری حاصل کرنے سے روک دیا جو ان کا حق تھا؟ اس طرح کے تنازعات اکثر پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اس بنیاد پر حکومت اور اپوزیشن کے درمیان کبھی کبھی محاذ آرائی بھی ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں براڈ کاسٹر کیا کر سکتا ہے؟ وہ دو پاٹوں کے بیچ پسنے لگتا ہے۔ وہ اخلاقی طور پر تو یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے سامع کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ پوشیدہ حقیقت کو جان سکے۔ لیکن وہ ضابطے کا پابند ہوتا ہے اس لیے اپنی مرضی سے خبر نشر نہیں کر سکتا۔

جو براڈ کاسٹر سرکاری قبضے کے ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہوتے ہیں وہ کوئی منتخب نمائندے نہیں ہوتے کہ من مانی کر سکیں۔ لہٰذا انہیں ضابطوں کی پابندی کرنا ہی پڑتی ہے۔ وہ اپنی نجی رائے کو ریڈیو کے توسط سے ظاہر نہیں کر سکتے۔ لیکن ایسی صورت حال شاذ و نادر ہی پیش آتی ہے۔ براڈ کاسٹر کو ضابطے کی پابندی کرنا ہی پڑے گی۔ جہاں تک سامع کا' اطلاع حاصل کرنے کے حق کا سوال ہے' تو یہ حق تو اسے حاصل ہے لیکن کچھ معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں اطلاع حاصل کرنے کی اسے پوری آزادی نہیں ہوتی۔

بہر حال مجموعی طور پر یہی کہا جائے گا کہ خبروں کا شعبہ سامعین کو تازہ خبروں کی تفصیل سے آگاہ کرتا ہے۔

حالات حاضرہ پر تبصرے بھی عموماً خبروں ہی کے شعبے سے نشر کیے جاتے ہیں جن کے تحت عوامی دلچسپی کے تازہ ترین موضوعات پر تبصرہ نگار اظہارِ خیال کرتا ہے۔ خبریں ہو یا حالاتِ حاضرہ پر تبصرے' سامعین کی توقع یہ ہوتی ہے کہ ان کے سامنے غیر جانبدارانہ رائے پیش کی جائے۔ براڈ کاسٹر کا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ عائد کردہ ضابطوں کی پابندی کرتے ہوئے ممکنہ حد تک غیر جانبدارانہ رائے پیش کرے۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے مختلف ریڈیو

اسٹیشن اور براڈ کاسٹنگ کارپوریشنوں کی ساکھ مختلف ہے۔ بعض کو دنیا بھر کے سامعین میں اعتبار اور وقار حاصل ہے جب کہ بعض پر کھلی ہوئی جانبداری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کون سا معاشرہ کتنی آزادی اور جمہوریت عطا کرتا ہے۔

جہاں تک خبریں پیش کرنے کا تعلق ہے تو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ خبریں پیش کرنے والے کا انداز کچھ ایسا ہو کہ لوگ بے ساختہ اس کی آواز کی جانب متوجہ ہوں۔ مواد خواہ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو اگر نیوز ریڈر کی آواز، لہجہ اور انداز پر کشش نہیں ہوگا تو سامعین کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ اس لیے خبروں کے شعبے میں نیوز ریڈر کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔

21.3.2 تقریریں (Talks)

مختلف ریڈیو اسٹیشن سے آپ ٹاک (Talk) سنتے ہوں گے۔ ٹاک کو آپ اردو میں تقریر کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ریڈیو اور دوسرے ذرائع ابلاغ کا کام عوام کی معلومات میں اضافہ کرنا اور ان میں بیداری لانا ہے، لہٰذا مختلف موضوعات پر تقریریں اسی مقصد کے تحت نشر کی جاتی ہیں۔ بیشتر ریڈیو اسٹیشنوں سے سلسلہ تقاریر (Series of Talks) بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک عنوان طے کیا جاتا ہے اور پھر ذیلی عنوانات کے تحت یکے بعد دیگر کئی تقریریں پیش کی جاتی ہیں۔ اس طرح کے سلسلے کے تحت جو تقریریں پیش کی جاتی ہیں وہ ہفتہ وار بھی ہو سکتی ہیں اور پندرہ روزہ بھی!۔ اس کا تعین متعلقہ ریڈیو اسٹیشن کے طے کردہ اوقات اور گنجائش کے مطابق ہوتا ہے۔ ان تقاریر میں عام لوگوں کی دلچسپی کی چیزیں پیش کی جاتی ہیں جن کا مقصد بیداری لانا بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی ریڈیو اسٹیشن ''بچیے اور بچایئے'' کے عنوان سے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کر سکتا ہے۔ اس کے تحت کئی تقریریں پیش کی جائیں گی جن کے ذیلی عنوانات ہوں گے:

1. بچیے اور بچایئے ..... ماحولیاتی آلودگی سے
2. بچیے اور بچایئے ..... آبی آلودگی سے
3. بچیے اور بچایئے ..... لڑائی جھگڑے سے
4. بچیے اور بچایئے ..... رشوت خوری سے وغیرہ

آپ نے اندازہ کیا کہ ذیلی عنوانات کے تحت جن تقریروں کی منصوبہ بندی کی گئی وہ سب کی سب عوامی دلچسپی اور عوامی مفاد سے متعلق تقریریں ہیں۔ اسی طرح سماجی برائیوں سے متعلق بھی تقریریں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ تقریریں سنجیدہ نوعیت کی بھی ہو سکتی ہیں اور مزاحیہ انداز میں بھی۔ مزاحیہ تقریروں میں ہلکے پھلکے انداز سے سماجی برائیوں پر وار کیا جاتا ہے تاکہ لوگ محظوظ بھی ہوں اور اثر بھی قبول کریں۔ مثلاً ایک مزاحیہ سلسلۂ تقاریر کا عنوان ہو سکتا ہے۔

''بڑی مشکل سے سیکھا ہے.....''

اس کے ذیلی عنوانات ہو سکتے ہیں:

i) غیبت کرنا
ii) جھگڑے کرانا
iii) دفتر سے غائب رہنا
iv) پاکٹ ماری کرنا وغیرہ

اس طرح کی سلسلہ وار تقریروں کے علاوہ موقع کے اعتبار سے مخصوص تقریریں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً عید، دیوالی یا دوسرے تہواروں کے موقع پر بھی تقریریں نشر کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ عظیم شخصیتوں کے یومِ پیدائش اور یوم وفات پر بھی ایسی تقریریں پیش جاتی ہیں جن میں ان شخصیتوں کے اوصاف اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ تقریریں دس منٹ کی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ پانچ سے سات منٹ کی بھی ہو سکتی ہیں۔ ان تقریروں کے لیے وقت کی جو پابندی ہوتی ہے اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہوتا ہے کہ طے کردہ وقت کے اندر ہی اندر تقریر پیش کرنے والے (Talker) کو اپنی بات کہنی ہوتی ہے۔ ایک اچھی اور پر اثر تقریر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں غیر ضروری اقتباسات نہ ہوں۔ تقریر

لکھنے والے کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ زبان آسان اور عام فہم ہوتا کہ جس حلقے کو وہ مخاطب کرتا ہے وہ حلقہ اسے سمجھ سکے اور محظوظ بھی ہو سکے۔ ریڈیائی تقریریں عام دلچسپی کے موضوعات کے علاوہ ادبی اور علمی موضوعات پر بھی ہوتی ہیں۔ اگر آل انڈیا ریڈیو اور اردو نشریات کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ بات یقیناً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ ریڈیائی تقریروں کا جب باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا تو رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور جیسے اردو کے ممتاز ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ ممتاز دانشور پروفیسر مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، مرزا محمود بیگ وغیرہ بھی اکثر مدعو کیے جاتے تھے۔

21.3.3 ڈراما

ریڈیو ایک ایسا میڈیم ہے جس میں مخصوص تکنیک استعمال کر کے خیالات، الفاظ اور ایکشن کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے کہ سننے والے کے ذہن میں ایک واضح تصویر ابھرتی ہے۔ اس مخصوص ریڈیائی تکنیک کا بہترین مظاہرہ ڈراموں میں ہوتا ہے۔ ڈرامے کی کہانی ایک ایسا ڈھانچہ پیش کرتی ہے جس میں واقعات کے تعلق سے ساری باتیں سامع کی سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ آئینے میں جب ہم اپنی شکل دیکھتے ہیں تو وہ ہو بہو ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے ہم ہوتے ہیں۔ ہمارا ہر جنبش اور ہر ایکشن بھی آئینے میں منعکس ہوتا ہے۔ ریڈیو ڈرامے کی خصوصیت یہ ہوتی کہ وہ آوازوں کے ذریعے پوری کہانی ہمارے سامنے لاتا ہے۔ کرداروں کے ایکشن اور اندازِ گفتگو سے سامع اپنے ذہن میں تخیل کی مدد سے ان تمام کرداروں کو اپنے سامنے کھڑا پاتا ہے۔ یہ ڈرامے زندگی کے واقعات، دکھ سکھ، تضادات اور دوسرے حقائق کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سامع خود بخود کہانی میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور اس کے اختتامی منظر کا انتظار کرتا ہے۔

بصری (Visual) آرٹ میں مناظر براہ راست پیش کیے جاتے ہیں۔ یعنی ہر چیز ہماری نظروں کے سامنے ہوتی ہے لیکن ریڈیو کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ سامع نشر ہونے والے مواد کی بنیاد پر اپنے تخیل کے سہارے تصویریں بناتا ہے۔ اس لیے ریڈیو ڈرامے میں کچھ حد بندیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ حد بندیاں سائز، حقائق، مقامات اور موڈ وغیرہ کے حوالے سے ہوتی ہیں۔ اگر واقعات، مقامات اور کرداروں کی بھرمار ہوگی تو سامع کی دلچسپی کم ہو جائے گی اور اس کے لیے کہانی کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا ڈرامے کی کہانی لکھنے والے کو اپنے سامعین کے تئیں حساس ہونا چاہیے۔ دراصل سامع ڈرامے سے اس طرح جڑ جاتا ہے کہ ڈرامے میں پیش کیے گئے واقعات کی، وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کوئی تصویر وضع کرتا ہے۔ ڈرامہ نگار کو کہانی کا تانا بانا اس طور پر تیار کرنا چاہیے کہ وہ سامع کی گرفت میں آسانی سے آ جائے۔ ڈرامہ لکھنے والے کو ریڈیو کی ضروریات اور سامعین سے اس کے رشتے کا پورا ادراک ہونا چاہیے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہیں کہیں ڈرامہ نگار خود پروڈیوسر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں اس کی ذمہ داریاں دہری ہوتی ہیں۔ ایک طرف ریڈیو کے سامعین کے لیے ڈرامہ لکھنے کا اسے پورا تجربہ ہونا چاہیے تو دوسری طرف ڈرامہ پروڈکشن سے متعلق خصوصی تکنیک کا بھی علم ہونا چاہیے۔ لیکن جہاں پروڈیوسر اور ڈراما نگار دو مختلف شخصیتیں ہوں تو ان دونوں کے درمیان بھرپور تال میل اور مفاہمت ہونی چاہیے۔ دونوں کو مل کر مکالمے، موسیقی، صوتی مناظر اور خاموشی کے توسط سے ایک ایسا ماحول بنانا پڑتا ہے کہ سامع خود بخود اپنے تخیل کے سہارے تصویریں بنا سکے۔

برطانیہ کے ریڈیائی تحریروں کے ایک بہت بڑے ماہر بارٹ گیوگین نے کہا ہے کہ ڈرامہ کی کہانی لکھنے والے کے سامنے سامع کے نقطہ نظر سے تین سوال ہونے چاہئیں:

1. ہیرو یا ہیروئن کون ہے؟
2. وہ کیا چاہتا/ چاہتی ہے؟
3. مجھے اس سے کیا غرض؟

تیسرا یعنی آخری سوال بہت اہم ہے اور ڈرامہ نگار کی ذہانت کا اصل امتحان یہی ہے کہ وہ ایسی صورتحال (situation) اور ایسا کردار تخلیق کرے کہ سامع کو اس سے اس کے کاز سے دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہے تو پھر اس کا لکھا ہوا ڈراما ایک بے معنی سی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ ریڈیو ڈراما پیش کرتے وقت اس بات کو بھی ذہن میں رکھا جاتا ہے کہ کرداروں کے نام میں کوئی کنفیوژن نہ ہو۔ لہٰذا ابتدائی منظر میں مکالموں کے توسط سے ناموں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ مثلاً

جمیل ..... ''ارے وجے تم یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو؟ کیا کسی کا انتظار ہے''؟

وجے ..... ''ہائے جمیل !یار دراصل میں آٹو رکشہ کے انتظار میں ہوں۔کالج ذرا جلدی پہنچنا ہے۔''

ان مکالموں کے ذریعے کرداروں کے ناموں کی نشان دہی ہوگئی۔اب سامع ان کی آوازوں سے انہیں پہچان لیں گے اور اپنے ذہن میں ان کی کوئی تصویر بھی بنالیں گے۔

غم اور خوشی کے ماحول کو مناسب موسیقی کے ذریعے ابھارا جاتا ہے۔مثلاً اگر ماحول خوشی کا ہوگا تو وہاں شوخ موسیقی ہوگی۔اسی طرح غم کا ماحول ظاہر کرنے کے لیے ایسی موسیقی استعمال کی جائے گی جس میں غم کا عنصر ہو۔منظر بدلتے وقت چند سکنڈ کی ہلکی سی موسیقی استعمال کی جاتی ہے جسے Change over music کہا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. خبر (News) کیسی ہونی چاہئے؟
2. براڈ کاسٹر کے فرائض کیا ہیں؟
3. ریڈیو ڈرامے کی خصوصیات واضح کیجیے۔
4. ریڈیو تقریروں (Talks) کا کیا مقصد ہوتا ہے؟

21.3.4 ڈاکومنٹری اور فیچر پروگرام

ڈاکومنٹری اور فیچر پروگراموں میں اکثر کنفیوژن پیدا ہو جاتا ہے اور کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ دونوں میں کوئی خاص یا واضح فرق نہیں ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے۔ڈاکومنٹری کو ہم اردو میں دستاویزی فیچر کہہ سکتے ہیں۔ڈاکومنٹری یعنی دستاویزی فیچر پورے طور پر حقائق پر مبنی ہوتا ہے جس میں دستاویز کے طور پر مناسب مواد شامل کیے جاتے ہیں۔یہ مواد تحریری طور پر رکارڈ میں موجود ہوتے ہیں۔پھر ایسے ذرائع کا سہارا لیا جاتا ہے جو مستند اور معتبر ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ کچھ انٹرویو بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ڈاکومنٹری فیچر کا خاص مقصد سامعین کو کسی خاص موضوع یا مسئلے کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔اس طرح کے پروگرام میں عصری مسائل یعنی اپنے زمانے کے اہم مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے۔مثلاً ماحولیات کے مسائل، شہری ترقیات، طبی تحقیق یا روزگار کے مسائل۔ڈاکومنٹری پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سامعین پیش کردہ ڈاکومنٹری کے توسط سے اس موضوع کے بارے میں یا کسی خاص پہلو کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرسکیں۔مثال کے طور پر ماحولیات اور فضائی آلودگی کے بارے میں اگر کوئی دستاویزی فیچر پیش کیا جارہا ہے تو پہلے تو ماحولیاتی آلودگی کے نقصانات اور انسانی صحت پر مرتب ہونے والے مضر اثرات کے بارے میں معلومات مہیا کرائی جائیں گی۔اس کے بعد مستند حوالوں سے یہ بتایا جائے گا کہ کس طرح اور کن حالات میں ماحولیات کا توازن بگڑتا ہے۔متعلقہ محکمے سے وابستہ اہم شخصیتوں کا انٹرویو کیا جاتا ہے اور ان سے یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس سمت میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور یہ کہ متعلقہ محکمہ مستقبل کے لیے کس طرح کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ساتھ ہی کچھ عام آدمیوں کے انٹرویو بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔اس طرح دستاویزی فیچر واقعی دستاویز بن جاتا ہے جو پورے طور پر حقائق پر مبنی ہوتا ہے۔البتہ عام فیچر پیش کرنے والے کو سب کچھ توازن اور غیر جانبداری کے ساتھ پیش کرنا چاہیے تاکہ سامعین کے سامنے کسی مسئلہ کی اہمیت کو پوری طرح اجاگر کیا جاسکے۔

فرض کیجیے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بارے میں ایک دستاویزی فیچر پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔اس صورت میں اس یونیورسٹی کے قیام کا اصل مقصد بتانا ہوگا۔اور پھر یہ بتانا ہوگا کہ 1998ء میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے ایک قومی یونیورسٹی کے طور پر اس کی تشکیل عمل میں آئی۔یونیورسٹی کی موجودہ کارکردگی کے بارے میں تفصیلات فراہم کی جائیں گی اور مختلف کورسز اور شعبوں کی کارکردگی کے بارے میں تفصیل پیش کی جائے گی۔تفصیلات فراہم کرنے کے لیے وائس چانسلر اور مختلف شعبوں کے سربراہوں کے انٹرویو شامل کیے جائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ طلبا اور طالبات سے بھی بات چیت کی جائے گی۔ان میں ان طلبا/طالبات کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جو اس ادارے سے فارغ اور فیض یاب ہو چکے ہیں۔اس طرح یہ فیچر پورے طور پر ڈاکومنٹری یا دستاویزی فیچر بن جائے گی۔عام فیچر پروگرام بھی ڈاکومنٹری کی طرح حقائق ہی پر مبنی ہوتے ہیں لیکن واضح فرق یہ ہے کہ اس میں

دستاویزی ثبوت پیش کرنا ضروری نہیں ہوتا۔فیچر پیش کرنے والا اپنے تخیل اور ذہانت کے سہارے اسے دلچسپ بنا دیتا ہے۔وہ حقائق کو اس طور پر تو نہیں پیش کرتا جس طور پر دستاویزی فیچر میں پیش کیے جاتے ہیں لیکن وہ ان حقائق کو اس طور پر اجاگر کرتا ہے کہ عام سامع کو بے ساختہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔فیچر کو دلچسپ بنانے کے لیے خوبصورت الفاظ'لوک گیتوں'شاعری اور ڈرامائی عناصر کا بھی سہارا لیا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر کولمبس کے سفر اور نئی دنیا کی تلاش کے بارے میں اگر فیچر پیش کیا جا رہا ہے تو اس میں ظاہر ہے کہ کولمبس کی آواز شامل نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس زمانے کی دوسری شخصیتوں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔اس صورت میں کولمبس کی ڈائری اور اس زمانے کے جو رکارڈ موجود ہیں'انہیں کے اقتباسات پیش کیے جائیں گے۔عام فیچر میں موضوع کو تخیل کے سہارے دلچسپ بنایا جاتا ہے۔دستاویزی ثبوت کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ریڈیو نشریات کے ایک بہت بڑے ماہر لارنس گیلیم کا خیال ہے کہ اچھا فیچر وہ ہوتا ہے جس میں کسی موضوع کی صداقت کو ڈرامائی طاقت کے سہارے پیش کیا جائے۔ دراصل عام فیچر حقائق اور تخیل کی آمیزش سے ہی بنتا ہے۔اگر تخیل کا سہارا نہ لیا جائے تو دستاویزی مواد کی دستیابی کے باوجود فیچر میں جان نہیں ڈالی جا سکتی۔ امید ہے ڈاکومنٹری (دستاویزی فیچر) اور عام فیچر پروگرام کا فرق آپ نے محسوس کر لیا ہوگا۔

21.3.5 موسیقی پروگرام

موسیقی اور ریڈیو کا رشتہ کافی مضبوط ہے اور یہ رشتہ کچھ اتنا تو انا ہے کہ پوری دنیا کے ریڈیو اسٹیشنوں سے موسیقی کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔چونکہ ڈسک اور رکارڈیڈ (صدا بند) موسیقی کے ٹیپ آسانی سے دستیاب ہیں اس لیے براڈ کاسٹروں کے لیے ایک آسانی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ہر طرح کی موسیقی کے ٹیپ یا ڈسک اس کے پاس موجود ہوتے ہیں۔پروگرام کو دن رات کئی کئی گھنٹے چلایا جاتا ہے۔ان میں تسلسل پیدا کرنے کی غرض سے موسیقی کا سہارا لیا جاتا ہے۔اس بات سے آپ واقف ہی ہوں گے کہ ریڈیو نے موسیقی کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔پھر موسیقی کی مختلف اقسام کا تحفظ بھی ریڈیو نے بہت اچھے ڈھنگ سے کیا ہے۔یہ اسی لیے ممکن ہے کہ صدا بند مواد (Recorded Material) کو سنبھال کر رکھنے اور ایک مواد کو دوسرے ٹیپ پر منتقل کرنے کی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ آسانیاں کافی پہلے ہی پیدا ہو گئی تھیں۔بہر حال مختلف پروگراموں کے درمیان موسیقی پیش کرنے سے جہاں ایک طرف تبدیلی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف نشریات کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے۔موسیقی کے ٹیپ یا ڈسک ریڈیو اسٹیشنوں کے لیے نسبتاً کم قیمت پر اور آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ہر وقت موسیقی کے پروگرام براہ راست (Live) نشر کرنا ممکن نہیں ہوتا کیوں کہ اس میں بہت سے لوازمات درکار ہوتے ہیں۔اس لیے رکارڈیڈ موسیقی کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ موسیقی کے پروگرام براہ راست (Live) نشر ہی نہیں ہوتے۔پہلے جب رکارڈنگ کی تکنیک زیادہ فروغ یافتہ نہیں تھی تو عموماً موسیقی کے پروگرام بھی براہ راست ہی نشر کیے جاتے تھے۔لیکن رکارڈنگ کی بہترین تکنیک ایجاد ہونے کے بعد بڑی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔جو رکارڈیڈ موسیقی سامعین کو سنوائی جاتی ہے اس میں کاپی رائٹ سے متعلق قانون کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے تاکہ مغنی'نغمہ نگار'سازندوں اور دوسرے متعلقہ افراد کا حق محفوظ رہے۔لہٰذا ریڈیو اسٹیشن جب کسی کی موسیقی کو نشر کرتے ہیں تو مناسب اور طے شدہ رائلٹی پابندی سے ادا کرتا ہے۔پروڈیوسر کو اس بات کا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس معاملے میں کوئی بے ضابطگی نہ ہونے پائے۔

رکارڈیڈ موسیقی نشر کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے براڈ کاسٹنگ محکمے کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ کبھی کبھی براہ راست (Live) بھی موسیقی نشر کرتے رہیں۔نئے فن کاروں کو تلاش کرنا اور انہیں موقع دینا بھی ان کے فرائض میں شامل ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرنے اور ان کے فن کو مقبول بنانے میں ریڈیو نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔یہ روایت باقی رہنی چاہیے۔موسیقی میں دلچسپی لینے والوں کے مذاق جدا جدا ہو سکتے ہیں۔کسی کو لوک گیت زیادہ پسند آتے ہیں تو کوئی جدید موسیقی کا شیدائی ہوتا ہے۔کسی کو کلاسیکی موسیقی سے لگاؤ ہوتا ہے تو کوئی فلمی نغمے زیادہ پسند کرتا ہے۔ براڈ کاسٹر کو سب کے ذوق اور دلچسپی کے مطابق پروگرام پیش کرنا ہوتا ہے۔بعض اسٹیشنوں پر مختلف نوعیت کی موسیقی کے لیے مختلف اوقات بھی مخصوص کیے جاتے ہیں تاکہ مقررہ وقت پر موسیقی کے شائقین اپنی پسند کی چیزیں سن سکیں۔

موسیقی کے فرمائشی پروگرام بھی ہوتے ہیں اور سامعین کے خطوط میں جن چیزوں کی فرمائش کی جاتی ہے۔انہیں براڈ کاسٹر بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور اسی کے مطابق موسیقی کا انتخاب کرتے ہیں۔سامعین کے خطوط سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کس چیز کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ظاہر ہے جس چیز کی

فرمائش زیادہ لوگ کرتے ہیں۔اس کے بارے میں یہی تصور کیا جاتا ہے کہ وہ سامعین کے بہت بڑے حلقے میں مقبول ہے۔ریڈیو اسٹیشنوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً مدعو سامعین (Invited Audience) کے سامنے بھی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔انہیں کنسرٹ (Concert) کہا جاتا ہے۔اس کے ذریعے عوام کے بہت بڑے حلقے سے براہ راست رابطہ بھی قائم ہوتا ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر موسیقی کے حوالے سے ہندوستانی موسیقی اور آل انڈیا ریڈیو کے روابط کی بات کی جائے۔ہندستان میں موسیقی کی روایت بہت قدیم ہے اور یہاں کلاسیکی موسیقی کے دو اسکول ہیں۔ان میں سے ایک تو ''ہندستانی'' یعنی شمالی ہند کی موسیقی کا اسکول ہے اور دوسرا کرناٹک یا جنوبی ہند کا اسکول ہے۔آزادی سے قبل رجواڑے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے جس کے نتیجے میں کلاسیکی موسیقی کو زبردست فروغ حاصل ہوا لیکن آزادی کے بعد ریاستوں کا خاتمہ ہوگیا اس لیے صورت حال بدل گئی۔اس خلا کو آل انڈیا ریڈیو نے پورا کیا۔کلاسیکی موسیقی کو مقبول بنانے میں موسیقی کے ہفتہ وار قومی پروگرام اور سالانہ سنگیت سمیلن نے بہت نمایاں رول ادا کیا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو سے جن فنکاروں کی موسیقی سنوائی جاتی ہے ان کی آوازوں کا آڈیشن کیا جاتا ہے اور یہ کام غیر سرکاری کمیٹیاں انجام دیتی ہیں۔ابتدائی طور پر علاقائی اسٹیشنوں پر ان فنکاروں کی آوازوں کی جانچ ہوتی ہے جن کا تعلق ان علاقوں سے ہوتا ہے۔جو لوگ اس مرحلہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی آواز میں ان کی گائی ہوئی چیز رکارڈ کر لی جاتی ہے جس کی جانچ بعد ازاں مرکزی کمیٹی کرتی ہے۔اسے ''میوزک آڈیشن بورڈ'' کہا جاتا ہے۔یہ بورڈ چار زمروں کے فنکاروں کا انتخاب کرتا ہے۔ٹاپ (Top)' گریڈ اے' گریڈ بی (ہائی) اور گریڈ بی۔مرکزی کمیٹی کے قیام کا جواز یہ ہے کہ کلاسیکی موسیقی کے فن کاروں کو قومی معیار پر پورا اترنا چاہیے کیوں کہ یہ ایک ایسا فن ہے جو پورے ملک میں مقبول ہے اور اس کی اہمیت مسلم ہے۔

21.3.6 ''فون ان'' پروگرام (Phone-in Programme)

یہ نسبتاً ایک نیا سلسلہ ہے۔اسٹوڈیو سے فون کے ذریعے سامعین رابطہ قائم کرتے ہیں۔پروڈیوسر بھی براہ راست سامع سے مخاطب ہوتا ہے۔بعض حلقے ''فون ان'' پروگرام کی شدید تنقید کرتے ہیں اور اسے تضیع اوقات کا ذریعہ اور خانہ پری کی کارروائی بتاتے ہیں۔بلاشبہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔پروگرام کا معیار اور اس کی منصوبہ بندی ہی اس بات کو ثابت کرسکتی ہے کہ آیا یہ پروگرام افادیت کا حامل ہے یا نہیں۔بی بی سی میں فون ان پروگرام کافی مقبول ہوا ہے۔اس کے ذریعے براہ راست دنیا کی ممتاز شخصیتوں سے رابطہ قائم کر کے مختلف موضوعات پر ان کی رائے حاصل کی جاتی ہے اور سامع براہ راست ان کی آواز اپنے ریڈیو سیٹ پر سنتا ہے۔اس میں سامعین کافی دلچسپی لیتے ہیں۔مختلف اسٹیشنوں پر مختلف قسم کے فون ان پروگرام ہوتے ہیں۔ان میں سامع کی براہ راست شمولیت ہوتی ہے۔مثال کے طور پر بعض اسٹیشنوں پر انسانی صحت پر عمومی گفتگو کے لیے یا کسی خاص بیماری کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے لیے کسی معروف ڈاکٹر یا اس مرض کے کسی ماہر کو اسٹوڈیو میں مدعو کیا جاتا ہے۔سامعین گھر بیٹھے ہوئے اپنے فون کے ذریعے اسٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرتے ہیں اور اس سے اس بیماری کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرتے ہیں۔لیکن اس طرح کی گفتگو کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔صحت سے متعلق پروگرام کے علاوہ حالات حاضرہ کے کسی موضوع یا کسی بھی قومی یا بین الاقوامی مسئلہ پر فون ان پروگرام کے توسط سے بات چیت ہوسکتی ہے۔اس بات کا انحصار فون ان پروگرام کے پروڈیوسر پر ہے کہ اس کی منصوبہ بندی کس طور پر ہوتی ہے۔اسی کو یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ پروگرام کا خاص مقصد کیا ہے اور اسے کس طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔فون لائن کو محض سامعین کے لیے کھول دینا ہی کافی نہیں ہے۔

فون ان پروگرام کو مجموعی طور پر چار زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1. اوپن لائن.....اس کے ذریعے اسٹوڈیو میں پروگرام پیش کرنے والی شخصیت سے براہ راست گفتگو کی جاسکتی ہے۔
2. کسی خاص موضوع کے لیے اس موضوع کے کسی ماہر کو مدعو کیا جاسکتا ہے جس سے مشورے لیے جائیں۔
3. صارفین کے معاملات پر بحث کی جاسکتی ہے اور ان کے مسائل سے نمٹنے کے بہتر طریقوں پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔
4. ذاتی نوعیت کے مسائل پر گفتگو ہوسکتی ہے۔

فون ان پروگرام میں میزبان کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔ چوں کہ اس طرح کا پروگرام ''جمہوری'' نوعیت کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں حصہ لینے والے سامع کو اس کا موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنی بات کہہ سکے۔ دراصل اس پروگرام کی حیثیت اس کالم جیسی ہوتی ہے جو اخباروں میں ''ایڈیٹر کی ڈاک'' یا ''قارئین کے خطوط'' کے نام سے شائع ہوتے ہیں اور جن میں قارئین کسی بھی موضوع پر اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ میزبان کو کسی بھی معاملے میں جانبدار نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ ریڈیو اسٹیشن مثبت نوعیت کی کوئی ادارتی پالیسی وضع کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں میزبان پریزنٹر (Presenter) کو ذہنی طور پر چاق وچوبند اور وضع کردہ ضابطوں اور ان کی حد بندیوں سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ اگر کوئی سامع اوٹ پٹانگ باتیں کرنا چاہتا ہے یا ایسی کوئی بات کہنا چاہتا ہے جو وضع کردہ پالیسی سے میل نہیں کھاتی تو میزبان اسے ایسا کرنے سے باز رکھنے کا مجاز ہوتا ہے۔

اس پروگرام کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار میزبان یا پریزنٹر کی ذاتی صلاحیت پر ہوتا ہے۔ اگر وہ حاضر دماغ نہیں ہے اور معلومات عامہ اور حالات حاضرہ پر اس کی گہری نظر نہیں ہے تو وہ فون ان پروگرام میں جان نہیں ڈال سکتا۔ فون ان پروگرام کے لیے ضروری ہے کہ اسٹوڈیو میں ایک خصوصی فون موجود ہو اور اس نمبر کے فون کو نارمل فون کی طرح استعمال نہ کیا جائے۔ اگر ریڈیو اسیشن کے عام فون کے ذریعہ بات کی جائے گی تو قدم قدم پر رکاوٹ پیدا ہوگی۔

اس پروگرام کے تعلق سے ایک بات کھٹکتی ہے۔ یعنی اس میں وہی لوگ حصہ لے سکتے ہیں جن کے گھر میں ٹیلی فون ہے۔ عام طور سے ٹیلی فون کی سہولیات شہروں میں زیادہ دستیاب ہے جب کہ دیہی علاقوں کی صورت حال مختلف ہے۔ پھر شہروں میں بھی سب کے پاس فون نہیں ہوتا۔ ایسی کوئی صورت نکالی جانی چاہیے جس کے تحت سامعین کے بڑے حلقے کو اس سے جوڑا جا سکے۔

21.3.7 کمرشیل پروگرام

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ کمرشیل پروگرام کا مقصد تجارتی اداروں کے اشتہارات نشر کرنا ہے۔ مختلف نشریاتی ادارے مختلف انداز سے کمرشیل پروگرام کی منصوبہ بندی کرتے ہیں لیکن ان سب کا بنیادی مقصد اشتہارات کے ذریعہ تجارت کو فروغ دینا ہے۔ چونکہ ریڈیو ابلاغ عامہ کا ایک موثر وسیلہ ہے اس لیے تجارتی ادارے اس کا سہارا ضرور لیتے ہیں۔ کمرشیل براڈ کاسٹنگ میں اس بات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ تفریحی پروگراموں کے ساتھ ساتھ اشتہارات دیے جائیں تاکہ سامع کی دلچسپی برقرار رہے۔ مثلاً فلمی گانوں کی جھلکیوں، مزاحیہ پروگرام اور مختصر ڈراموں کو بھی نشر کیا جاتا ہے اور بیچ بیچ میں اشتہارات کے مواد نشر کیے جاتے ہیں تاکہ سامعین کی دلچسپی برقرار رہے۔

ریڈیو کے ذریعہ اشتہار دینے کے لیے تجارتی کمپنیاں چند سکنڈ یا چند منٹ کے لیے ایسے مختصر مواد تیار کراتی ہیں جو آسانی سے سامع کے ذہن میں محفوظ ہو جائیں۔ تجارتی کمپنیوں کا اصل مقصد سامان بیچنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اشتہار کا مواد کچھ ایسا ہو کہ ان کے شوروم کے سامان باہر آئیں اور گاہک ان میں دلچسپی لیں۔ کمرشیل پروگرام کے لیے اشتہاری ایجنسیاں خصوصی پروڈکشن کے اداروں کی خدمات حاصل کرتی ہیں اور ان کے تعاون سے تجارتی پروگرام تیار کرتی ہیں۔ وہ اپنی سی ڈی یا ٹیپ ریڈیو اسٹیشن کو مہیا کرتی ہیں۔ لیکن مقامی نوعیت کے اشتہاروں کے لیے متعلقہ اسٹیشن کا پروڈیوسر بھی اپنے طور پر منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ البتہ اسے ان تمام ضابطوں کی اچھی طرح واقفیت ہونی چاہیے جو کمرشیل براڈ کاسٹ کے لیے نشریاتی ادارے طے کرتے ہیں۔ یہ وہ ضوابط ہوتے ہیں جنہیں بڑی سختی سے نافذ کیا جاتا ہے۔ تجارتی اداروں کو چند سکنڈ کے اشتہار کے عوض اچھی خاصی رقم چکانی پڑتی ہے کیوں کہ ریڈیو بہت ہی طاقتور میڈیم ہے اور اس کے توسط سے عوام کے بہت بڑے حلقے کو اشتہار میں دیے گئے تجارتی سامانوں کا علم ہوتا ہے۔

پروڈیوسر یا اشتہاری ایجنسیوں کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ سامعین کے کس حلقے تک اشتہار پہنچانا ہے۔ پھر یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مخصوص تجارتی سامان کی کس خصوصیت کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعے سامعین کے بڑے حلقے کو متاثر کیا جا سکے۔ اشتہار کو دلچسپ بنانے کے لیے مناسب الفاظ اور اسٹائل کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ پھر اشتہار کے ساتھ اگر ضرورت پڑی تو کچھ صوتی منظر بھی شامل کیے جاتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ کسی اشتہار کے لیے 30 سکنڈ کا وقت مخصوص کیا گیا۔ ظاہر ہے 30 سکنڈ کی مختصر سی مدت میں کسی بھی تجارتی سامان کے بارے میں ساری تفصیلات نہیں فراہم کی جا سکتیں۔ لہٰذا ایک یا زیادہ سے زیادہ دو خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ سننے میں

پر کشش لگیں۔ جن خصوصیات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ان میں یہ بتایا جاتا ہے کہ سامان کی افادیت کیا ہے، وہ کتنا پائیدار ہے اور اس کی قیمت کتنی کم ہے۔ ہم ریڈیو کی کمرشیل سروس کے پروگراموں میں دلچسپ اور نت نئے انداز کے اشتہار سنتے ہیں۔ بعض تو اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں اور لوگ ان کی نقل کرنے لگتے ہیں۔ تجارتی سامان کی افادیت کو واضح کرنے کے لیے ایسا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے جس سے یہ تاثر ملے کہ اس کے استعمال سے بے شمار فائدے ہو سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کسی کمپنی نے ایک ایسا پاؤڈر تیار کیا ہے جسے باتھ روم میں چھڑک کر اگر اس کی صفائی کی جائے تو باتھ روم چمکنے لگتا ہے اور بیماری پھیلانے والے کیڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کا مختصر اشتہار یوں ہو سکتا ہے۔ ''باتھ روم کی صفائی آپ کی صحت کی ضامن ہے اس لیے پاؤڈر ..... استعمال کیجیے۔'' دوسرا اشتہار یوں ہو سکتا ہے۔ ''کیا آپ کو صحت عزیز ہے؟ کیا آپ نے ..... پاؤڈر ابھی تک نہیں خریدا؟'' ایک اور انداز یہ ہو سکتا ہے۔ ''ارے اتنی کم قیمت میں پورے گھر کی صحت ..... واہ ..... پاؤڈر وغیرہ وغیرہ۔

21.3.8 متفرقات

ابھی تک ریڈیو سے نشر ہونے والے کچھ خاص خاص پروگراموں کا ذکر کیا گیا جو سامعین عام طور سے ریڈیو پر سنتے ہیں اور ان سے اچھی طرح واقف بھی ہیں۔ لیکن کچھ اور بھی پروگرام ہوتے ہیں جو اکثر یا کبھی کبھی سننے کو ملتے ہیں۔ اس کا دارومدار متعلقہ اسٹیشن پر ہوتا ہے کہ وہ اپنی نشریات کے مخصوص اوقات میں کتنے اور کس طرح کے پروگرام پیش کر سکتا ہے۔ مثلاً مختلف اسٹیشنوں سے مباحثے اور انٹرویو بھی نشر ہوتے ہیں۔ یہ مباحثے (Discussions) حالاتِ حاضرہ پر بھی ہو سکتے ہیں اور اہم سماجی مسائل پر بھی۔ خبروں کے شعبے کی طرف سے اکثر حالاتِ حاضرہ خصوصاً سیاسی موضوعات پر مباحثے نشر کیے جاتے ہیں۔ دوسرے شعبے بھی اپنے سامعین کی دلچسپی کے موضوعات پر مباحثے پیش کرتے ہیں۔ ہنگامی اور عارضی نوعیت کے موضوعات پر خصوصی مباحثوں کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔

چونکہ ہمارا سماج مختلف حلقوں پر مبنی ہے اس لیے عمومی نوعیت کے پروگراموں کے علاوہ مختلف حلقوں کے لیے مختلف نوعیت کے پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً خواتین اور بچوں کے پروگرام ہوتے ہیں جن میں ان کی صحت اور غذائیت سے متعلق باتیں بتائی جاتی ہیں نیز سماج میں ان کی حیثیت اور حقوق و فرائض کے بارے میں بھی مفید قسم کی باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں اس طرح کے پروگرام ہفتہ میں ایک یا دو بار ہو سکتے ہیں اور کہیں پندرہ دن میں ایک بار۔ اس کا انحصار بہر حال متعلقہ ریڈیو اسٹیشن کے اوقات پر ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کے پروگرام کے لیے کتنا وقت مخصوص کر سکتا ہے۔

تعلیمی پروگرام کو بھی ریڈیو میں اب ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ عام طور سے ہائر سکنڈری درجات کے طلبہ / طالبات کے لیے ایسے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جنہیں ''اسکول براڈ کاسٹ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لیکن اب اس میں وسعت پیدا کر کے اعلیٰ درجات اور یونیورسٹی سطح کے طلبا/ طالبات کے لیے بھی تعلیمی پروگرام نشر کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ دیہی ترقیات اور مفادِ عامہ کے پروگراموں کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس طرح اگر غور کیا جائے تو سماج کے ہر طبقہ کے لوگوں کی دلچسپی اور مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور اسی کے مطابق پروگرام کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ مقصد سماج کے وسیع تر حلقے تک پہنچنا اور ان میں بیداری لانا ہے۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مختلف علاقوں کے اپنے مسائل اور ضروریات ہوتی ہیں۔ پھر زبان اور کلچر بھی مختلف علاقوں کا مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے علاقائی ریڈیو اسٹیشن متعلقہ زبانوں اور بولیوں میں پروگرام نشر کرتے ہیں۔ پسماندہ اور آدی باسی علاقوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ایسے پروگراموں کی منصوبہ بندی کی جائے جو وہاں کے عام لوگوں میں بیداری کا باعث بنے۔ علاقائی اسٹیشنوں کے ذریعے زبان و کلچر کو بھی فروغ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ضرورت کے مطابق، نشریات کی نئی نئی قسمیں بھی ایجاد کی جا سکتی ہیں اور کی جاتی ہیں۔ مقصد پروگرام میں تنوع اور دلچسپی پیدا کرنا ہوتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ریڈیائی نشریات کی چار قسمیں بتائیے۔
2. محکمہ براڈ کاسٹنگ کی ذمہ داری کیا ہے؟

3. ''فون ان'' پروگرام سے کیا مراد ہے؟
4. ''فون ان پروگرام'' کو کتنے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟
6. کمرشیل پروگرام کا مقصد کیا ہے؟

21.4 خلاصہ

ریڈیو، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ایک انتہائی طاقتور میڈیم ہے۔ ریڈیو کی ایجاد سے پہلے خبریں اور معلومات تحریری شکل میں لوگوں تک پہنچتے تھے۔ لیکن تحریری ذرائع ابلاغ (Print Media) سے صرف وہی لوگ فیض یاب ہوتے تھے جو خواندہ یا تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور پھر تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی کئی سطحیں ہوتی تھیں اور ہوتی ہیں لیکن ریڈیو کے ذریعے جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں، ان سے ہر شخص مستفید ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خبروں کی حد تک، ریڈیو، اخبارات کے مقابلے میں بہت جلد عوام کو صورت حال سے باخبر کر دیتا ہے۔ یعنی آج اگر دلی میں کہیں بم پھٹا تو اس کی آگاہی، واقعے کے تھوڑی دیر بعد ہی پورے ملک بلکہ پوری دنیا کو ریڈیو کے ذریعہ ہو جاتی ہے۔ جب کہ اخباروں میں یہ خبر دوسرے دن شائع ہوگی۔ پھر ریڈیو کے ذریعے عوامی مسائل کو بڑے بھرپور انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے اور اس طرح عوام میں بیداری لائی جاسکتی ہے۔ ہم اس بات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ خاندانی بہبود، صحت عامہ، ماحولیات کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور اس طرح کے دوسرے مسائل کے بارے میں ریڈیو عوام میں بیداری لانے کا بہت بڑا وسیلہ بنا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عام آدمی ریڈیو سے بہت زیادہ جڑ گیا ہے۔ گھر کے علاوہ کھیت کھلیان میں بھی ریڈیو انسان کا رفیق بن گیا ہے۔ سامع اپنا کام کرنے کے ساتھ ساتھ ریڈیو پروگرام بھی سنتا رہتا ہے۔ جب کہ ٹیلی ویژن میں یہ ممکن نہیں ہے۔ خبروں کے علاوہ دلچسپی کی دوسری چیزیں بھی سننے کو ملتی ہیں جن میں تفریحی پروگرام بھی شامل ہیں۔

21.5 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. تحریری ذرائع ابلاغ اور ریڈیو کا موازنہ کرتے ہوئے ریڈیو کی اہمیت اور افادیت اجاگر کیجیے۔
2. نشریات کی قسموں تقریر، ڈرامہ اور فون ان پروگرام پر نوٹ تحریر کیجیے۔
3. ریڈیو پر نشر ہونے والے متفرق پروگراموں بشمول کمرشیل پروگرام کا احاطہ کیجیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. کیا ڈاکومنٹری اور فیچر ایک ہی چیز ہے؟ اگر نہیں تو ان کا فرق واضح کرتے ہوئے ڈاکومنٹری کے لوازمات پر روشنی ڈالیے۔
2. ریڈیو کے ذریعے نشر کی جانے والی خبروں کے سلسلے میں متعلقہ حکام کو کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟
3. ''موسیقی اور ریڈیو کا رشتہ کافی مضبوط ہے۔'' روشنی ڈالیے۔

21.6 فرہنگ

پریزنٹر (Presenter) — پروگرام پیش کرنے والا

لائیو پروگرام — جو پروگرام براہ راست نشر کیے جاتے ہیں یعنی جو کچھ آپ ریڈیو سے سن رہے ہیں وہ اسی وقت سیدھے آپ تک پہنچتا ہے

رکارڈیڈ پروگرام	وہ پروگرام جن کی صدابندی اور ایڈیٹنگ پہلے سے کرلی جاتی ہے
ڈاکومنٹری	دستاویزی فیچر
فون ان پروگرام	ایسے پروگرام جن میں براہ راست ریڈیو کے اسٹوڈیو اور سامعین سے رابطہ قائم ہوجاتا ہے
لسنر (Listener)	سامع
ڈِس کشن (Discussion)	مباحثہ
تقریر (Talk)	ریڈیائی تقریر
اسکول براڈکاسٹ	اسکولی بچوں کے لیے تعلیمی پروگرام
بلیٹن (Bulletin)	خبرنامہ
نیوز ریڈر	خبر پڑھنے والا

21.7 سفارش کردہ کتابیں

1. Radio Production by Robert Meleish
2. This is All India Radio by U.L. Barua
3. Broadcasting in India by P.C. Chatterji

اکائی 22 : ٹیلی ویژن: آغاز وارتقا اور نجی کاری

ساخت

22.1 تمہید

22.2 عوامی ترسیل

22.2.1 ترسیل وابلاغ کے لیے ضروری باتیں

22.3 ہندستان میں ٹیلی ویژن کی مختصر تاریخ

22.3.1 ٹیلی کاسٹ کا آغاز

22.3.2 ٹیلی کاسٹ میں ایک قدم اور آگے

22.3.3 نشریات کے وقت میں اضافہ

22.3.4 ٹیلی ویژن کا دوسرا اہم مرکز

22.3.5 پہلا ریلے سنٹر

22.4 سٹیلائٹ کے استعمال کا آغاز

22.4.1 سٹیلائٹ کے ذریعے قومی نشریات کا آغاز

22.4.2 رنگین نشریات کا آغاز

22.4.3 براہ راست ٹیلی کاسٹ کا آغاز

22.5 دوسرے چینل کا آغاز

22.5.1 مزید چینلز

22.6 ٹیلی ویژن کی نجی کاری

22.6.1 ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے اثرات

22.6.2 نجی چینلز کی ذمہ داری

22.7 نجی چینلز اور اُردو

22.7.1 زبان اور تکنیک

22.8 خلاصہ

22.9 نمونہ امتحانی سوالات

22.10 فرہنگ

22.11 سفارش کردہ کتابیں

22.1 تمہید

موجودہ دور میں ٹیلی ویژن عوامی ترسیل وابلاغ کا سب سے مقبول ذریعہ ہے۔ اب فرد کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کا کوئی بھی گوشہ اس کی زد سے باہر نہیں ہے۔ سٹیلائٹ کے ذریعے نشریات کے آغاز کے بعد بہت سے نجی چینلز شروع کیے گئے جو آج بھی عوام میں بے حد مقبول ہیں۔

اس اکائی میں ٹیلی ویژن کی مختصر تاریخ اور اس کے متعلقات کے علاوہ سٹیلائٹ چینلز کی نجی کاری سے متعلق بات چیت کی گئی ہے۔

22.2 عوامی ترسیل

ترسیل ایک باقاعدہ سماجی عمل ہے اور اس کے بغیر ہم زندگی کے بیشتر تقاضے پورا نہیں کر سکتے۔

ریڈیو یا ٹی وی کا براڈ کاسٹر یا ٹیلی کاسٹر ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنی بات آپ تک پہنچاتا ہے' آپ اس کو سنتے' دیکھتے ہیں۔ یہی عوامی ترسیل ہے۔ تصویر' لفظ' حرکات' اشارے یا کسی عمل کے ذریعے صرف اپنی بات کہہ دینے سے ہی ترسیل نہیں ہو جاتی بلکہ جس سے بات کی جا رہی ہے اُس تک بات کا پہنچنا بھی ضروری ہے۔ جہاں بات دوسرے تک نہیں پہنچ پاتی ہے وہاں ترسیل نہیں ہوتی' گویا ترسیل یک طرفہ عمل نہیں بلکہ یہ ایک مشترکہ عمل ہے۔ ترسیل اپنے مکمل معنی میں دراصل متاثر کرنے اور متاثر ہونے کا عمل ہے۔

ترسیل کی تکمیل متاثر ہوئے اور متاثر کیے بغیر نہیں ہو سکتی۔ آمنے سامنے بات کرنے سے متاثر ہونے کا فوری علم ہو جاتا ہے۔ مگر نشریاتی صورت حال میں ردعمل معلوم کرنے کے لیے مختلف ذرائع اپنانے پڑتے ہیں۔ نشریاتی اداروں کو ناظرین کا ردعمل معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے جس کے لیے ان اداروں نے دیگر ذرائع مثلاً فون' ایس ایم ایس وغیرہ کے فوری ردعمل جاننے کے طریقوں کے علاوہ ایک طریقہ آڈینس ریسرچ یونٹس (Audience Research Units) کو بھی اپنا رکھا ہے۔ نشریاتی ادارے اپنے ان شعبوں کے ذریعے ناظرین کی رائے جان کر اپنا لائحہ عمل طے کرتے ہیں' گویا آپ سے متاثر ہوتے ہیں۔

نشریاتی دنیا کے کمرشیل ہونے کی وجہ سے پسند ناپسند اشتہاروں کی تعداد' قیمت اور معیار سے بھی جانچی جانے لگی ہے۔ کب' کہاں' کس نے' کیا' کس ذریعے سے کہا اور اس کا کیا اثر ہوا یہ ایسے سوالات ہیں جو عوامی ذریعہ ابلاغ میں توجہ کا مرکز ہیں۔ ان سوالات کو ترسیل کے دائرے کے بنیادی اجزا کنٹرول کرتے ہیں۔

22.2.1 ترسیل و ابلاغ کے لیے ضروری باتیں

پراثر طور پر بات کو پہنچانے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کا جاننا ضروری ہے:

- ..... آڈینس کے مزاج' رسم و رواج' اعتقادات' تہذیب و ثقافت' ماحول' ضروریات' معاشی و معاشرتی صورت حال کے بارے میں معلومات۔
- ..... مرسل کا اپنی قابلیت کے بارے میں جاننا' مرسل الیہ کی نفسیات کو پہچاننا اور وقت و حالات کے تقاضوں کے اعتبار سے اپنے ترسیلی رویے میں تبدیلی لانے پر قادر ہونا۔

ایک مثالی کمیونی کیٹر (Communicator) کے لیے حالات سے باخبری کے ساتھ آڈینس (سامعین یا ناظرین) کی سماجی تہذیبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی اچھی بات بھی متاثر کن طریقے سے نہیں کہی جا رہی ہے تو وہ رد کر دی جاتی ہے۔ (یعنی سوئچ آف کر دیا جاتا ہے' چینل بدل دیا جاتا ہے) اور ترسیل کا عمل ادھورا رہ جاتا ہے اور مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہی کہا جائے جو لوگ چاہتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ وہ سب کو اپنا سا لگے اور وہ اس سے متاثر ہوں۔

عوامی ترسیل کے ذرائع بہت وسیع ہونے کی وجہ سے موجودہ دور میں اس کے اثرات بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس لیے نشریاتی اداروں اور ان سے وابستہ افراد کی ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہاں جو بات زبان سے نکلتی ہے صرف کوٹھوں ہی نہیں چڑھتی بلکہ فضاؤں میں رچ بس جاتی ہے جو پورے ماحول کو متاثر کرتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ذرائع کا استعمال مثبت قدروں کے فروغ اور انسانی بھلائی کے لیے کیا جائے تاکہ یہ ترقی رحمت ثابت ہو زحمت نہ بن جائے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- عوامی ترسیل سے کیا مراد ہے؟

2- پراثر ترسیل کے لیے کن بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے؟

22.3 ہندستان میں ٹیلی ویژن کی مختصر تاریخ

ہندستان میں ٹیلی ویژن کی عمر اب چار دہائیوں سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ان برسوں میں ترسیل و ابلاغ کے اس جدید ذریعے نے ہمارے ملک میں کئی ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی کی ہے۔ یہ ترقی تکنیک اور مواد دونوں اعتبار سے ہوئی ہے۔ ٹیلی ویژن سیٹس مہنگے اور عام آدمی کی پہنچ سے دور ہونے کی وجہ سے گرچہ شروع میں اس کی ترقی کی رفتار کم تھی مگر بہت جلد منظر نامہ بدلا اور ہندستانی ٹیلی ویژن نے اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا۔ اب ہندستانی ٹیلی ویژن دنیا کے بہترین اور وسیع نیٹ ورک کے طور پر اپنی پہچان اور مقام بنا چکا ہے۔

22.3.1 ٹیلی کاسٹ کا آغاز

15/ستمبر 1959 کو یونیسکو (UNESCO) کی مدد سے تجرباتی طور پر دہلی میں ٹیلی ویژن کی نشریات شروع کی گئیں۔ اس وقت اس کی حد دہلی شہر کے کچھ علاقوں تک تھی اور ہفتے میں صرف ایک گھنٹے کے لیے پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں تعلیمی، معلوماتی اور تفریحی پروگرام پیش کیے جاتے تھے اور یہ پروگرام صرف دہلی میں چند جگہوں پر کمیونٹی ویونگ سیٹس (Community viewing sets) کے ذریعے دیکھے جا سکتے تھے اور یہ سیٹس چند کلبوں میں ہی مہیا تھے۔

22.3.2 ٹیلی کاسٹ میں ایک قدم اور آگے

1961 میں تجرباتی طور پر اسکول ٹیلی ویژن شروع کیا گیا جس سے طلبہ اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ٹیلی ویژن کے قریب آ گئی۔

اسکول ٹی وی اس وقت بھی مقامی اسکولوں کے نصاب کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر چلایا جاتا تھا اور اُمید کی جاتی تھی کہ اس کے ذریعے تربیت یافتہ اساتذہ اور خاص طور پر اسکولوں میں سائنس کی تجربہ گاہوں کی کمی کو کسی حد تک پورا کیا جا سکے گا۔ اسکول ٹی وی سے ٹیلی ویژن کی ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں۔

22.3.3 نشریات کے وقت میں اضافہ

1959 'یعنی ہندستان میں ٹیلی ویژن کے آغاز سے 1965 تک نشریات کا وقت ہفتے میں ایک گھنٹہ رہا مگر 15/اگست 1965 سے نشریات روزانہ ایک گھنٹے ہونے لگیں۔

22.3.4 ٹیلی ویژن کا دوسرا اہم مرکز

دہلی کے بعد 1972ء میں ممبئی میں ٹیلی ویژن کا دوسرا مرکز قائم کیا گیا۔ ممبئی میں ٹیلی ویژن سنٹر کا قیام ہندستان میں ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ ٹیلی ویژن کا ممبئی سنٹر ہندستان میں پیشہ ورانہ مہارت کا پہلا سنٹر ہے۔

ممبئی سنٹر کا لگ بھگ سارا ساز و سامان مغربی جرمنی نے ہندستان کو تحفے میں دیا تھا۔ شروع میں اس کی نشریات روزانہ ڈیڑھ گھنٹے کے لیے تھیں لیکن کچھ عرصے بعد اس میں اضافہ کر دیا گیا اور پروگراموں کی نوعیت میں کچھ تبدیلی کر کے اسے مزید وسعت دی گئی۔

22.3.5 پہلا ریلے سنٹر

ممبئی میں ٹی وی سنٹر کے قائم ہونے کے بعد ایک سال کے اندر ہی پونے میں پہلا ریلے سنٹر قائم کیا گیا جس سے ممبئی ٹی وی کے پروگرام ریلے کیے جانے لگے اور اس کی وجہ سے ممبئی سنٹر کے پروگرام مہاراشٹر کے دیہی علاقوں تک پہنچ گئے۔ اس ریلے سنٹر کے قیام سے پہلے ممبئی ٹی وی کی نشریات ممبئی شہر تک محدود تھیں اس لیے بیشتر پروگرام شہری مسائل، ضروریات اور دلچسپیوں کو دھیان میں رکھ کر ترتیب دیے جاتے تھے لیکن جب پروگرام دیہی علاقوں تک

پہنچنے لگے تو پروگراموں میں گاؤں کی ضروریات' ماحول اور مسائل کا خاص خیال رکھا جانے لگا۔ پروگراموں کی اس توسیع وترمیم سے ٹی وی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1- ہندستانی ٹیلی ویژن کا پہلا نشریہ کہاں سے ہوا؟

2- ٹی وی کا دوسرا مرکز کہاں بنا؟

3- پہلا ریلے سنٹر کس شہر میں قائم ہوا؟

22.4 سٹیلائٹ کے استعمال کا آغاز

دلّی اور ممبئی میں ٹی وی سنٹر کے قیام اور پونے سے ریلے سنٹر شروع کرنے کے بعد ہندستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں وہ اہم موڑ آیا جس نے اس ذریعہ ابلاغ کی حدوں کو وسیع تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1975ء میں ہندستانی ٹیلی ویژن کے لیے سٹیلائٹ کے استعمال کا آغاز ہوا۔

امریکہ کے سٹیلائٹ ٹی وی پروگرام کی مدد سے ہندستان کی چھ ریاستوں کے تقریباً دو ہزار دیہات بیک وقت ٹی وی کی حدود میں آگئے۔ ان مقامات پر اجتماعی طور پر دیکھے جانے والے سیٹس (Community Viewing Sets) مہیا کرائے گئے اور گاؤں کی چوپال داستانوں' کہاوتوں اور سوانگوں کی دنیا سے نکل کر ٹیلی ویژن کی متحرک دنیا میں داخل ہوگئی۔ اس ترقی کا مقصد گاؤں کے باشندوں تک تعلیم اور صحت مند تفریح کے ساتھ ان پروگراموں کے ذریعے اُن کے کام میں مدد کرنا تھا۔ اس لیے ان نشریات کو عام طور پر دیہات کی ضروریات' مسائل اور مزاج کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ سب کچھ اس وقت تجرباتی طور پر شروع کیا گیا تھا مگر یہی کامیاب تجربہ آگے چل کر ہندستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا اور یہیں سے اس منزل کی راہ نکلی جس کا ایک روپ آج ہمارے سامنے ٹیلی ویژن کی بے پناہ مقبولیت کی صورت میں سامنے ہے۔

22.4.1 سٹیلائٹ کے ذریعے قومی نشریات کا آغاز

15/اگست 1982 کو ہندستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ کا ایک اہم دن مانا جانا چاہئے اس لیے کہ اس دن انسیٹ (1) کے ذریعے پورے ملک کی نشریات کو ایک لڑی میں پرو دیا گیا اور دہلی سے نیشنل پروگرام کا آغاز ہوا۔ اس کے نتیجے کے طور پر پورے ملک میں بیک وقت ایک ہی پروگرام دیکھا جانا ممکن ہوسکا جس سے ملک کی مشترکہ تہذیب کو فروغ ملا۔

22.4.2 رنگین نشریات کا آغاز

15/اگست 1982ء ہی کو قومی نشریات کے ساتھ ہندستان میں رنگین نشریات (Colour transmission) بھی شروع ہوئیں اور بلیک اینڈ وہائٹ کی جگہ رنگین ٹی وی نے لے لی۔

22.4.3 براہ راست ٹیلی کاسٹ کا آغاز

نومبر 1982 میں نویں ایشیائی کھیلوں کو براہ راست نشر (Live Telecast) کرنے کے ساتھ ہندستان کی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ نویں ایشیائی کھیلوں کو نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ بیرونی ممالک میں براہ راست دکھایا جاسکا۔ اس انتظام کے لیے چلتے پھرتے اسٹوڈیوز (O.B.Van) اور بہت سے رنگین ویڈیو کیمرے منگائے گئے تاکہ اسٹوڈیو کے باہر بھی مہارت کے ساتھ کام کیا جاسکے۔

اس موقع پر 100 واٹ والے کم قوت ٹرانسمیٹر (L.P.T) بھی نصب کیے گئے تاکہ کھیلوں کی اختتامی تقریبات سارے ملک میں بیک وقت دکھائی جاسکیں۔

انسیٹ (1) کے بعد 15/اکتوبر 1983ء کو انسیٹ (بی) نصب کیا گیا تا کہ سارے ملک میں بیک وقت نشریات کی سہولت کو اس سٹیلائٹ کے استعمال کے ذریعے مزید مضبوط و مستحکم بنایا جا سکے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1- ہندستان میں سٹیلائٹ کا استعمال کس ملک کی مدد سے ہوا؟
2- نیشنل پروگرام کب اور کہاں سے شروع ہوا؟
3- رنگین نشریات کب شروع ہوئیں؟
4- براہ راست نشریہ کب شروع ہوا؟

22.5 دوسرے چینل کا آغاز

اب تک ہندستان میں صرف ایک چینل کا استعمال ہو رہا تھا اور دیکھنے والوں کے لیے انتخاب کی کوئی گنجائش نہ تھی مگر ستمبر 1984ء میں دہلی میں دوسرے چینل کی سہولیت مہیا کی گئی جس سے دیکھنے والوں کو دو مختلف چینلز میں سے انتخاب کی سہولت میسّر آئی۔ کچھ ہی دنوں بعد ممبئی، کلکتہ، مدراس اور دوسرے شہروں میں بھی دوسرے چینل کی سہولت میسر آئی۔

22.5.1 مزید چینلز

کچھ دن بعد مزید چینلز شروع کیے گئے۔ ان چینلز کا مقصد علاقائی زبانوں میں پروگرام تیار کرنا اور اُنہیں پیش کرنا ہے۔ یہ چینلز اُس مخصوص علاقے کی تہذیب، سماجی ضرورت اور وہاں کے مزاج کے اعتبار سے پروگراموں کو ترتیب دیتے ہیں۔ ان چینلز کو ریجنل لینگویج سٹیلائٹ سروسز (RLSS) کہا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1- دوسرا چینل کب اور کہاں سے شروع ہوا؟
2- RLSS کس کا مخفف ہے؟

22.6 ٹیلی ویژن کی نجی کاری

موجودہ دور میں ہمارے ملک میں کئی سطحوں پر ٹی وی چینلز جاری ہیں۔ ان میں تین سطحیں عام ہیں:

1- ٹرسٹیل (Terrestial)
2- کیبل (Cable)
3- سیٹلائٹ (Satellite)

ٹرسٹیل چینلز کے اختیارات ابھی صرف دور درشن کے پاس ہیں۔ دور درشن فی الحال دو ٹرسٹیل چینل چلا رہا ہے۔ ان میں ایک نیشنل چینل ہے اور دوسرا خبروں کا چینل ہے۔

ٹرسٹیل سطح پر چونکہ کیبل یا ڈائریکٹ ٹو ہوم (D.T.H) کی ضرورت نہیں پڑتی اور اسے ڈائریکٹ ٹی وی انٹینا سے دیکھا جا سکتا ہے اس لیے دور درشن کی پہنچ وہاں بھی ہے جہاں کیبل نہیں ہے۔

دوسری سطح کیبل کی ہے۔ یہ صرف کیبل کے ذریعے مقامی سطح پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا سٹیلائٹ یا پروفیشنل ٹیلی کاسٹنگ (Professional

(telecasting کے طریقے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جہاں تک کیبل کا تار ہوتا ہے یہ وہیں تک محدود ہوتا ہے اور عام طور پر چند کلومیٹر کے دائرے میں ہی رہتا ہے۔ تیسری سطح سٹیلائٹ چینلز کی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کے لیے سٹیلائٹ اَپ لنکنگ (Up linking) کے بعد کیبل نیٹ ورک یا D.T.H کی ڈاؤن لنکنگ کے ذریعہ ٹی وی سیٹس تک پہنچا جاسکتا ہے۔ فی الحال پورے ملک میں ڈیڑھ سو سے زائد سٹیلائٹ چینلز چلائے جارہے ہیں۔ ان میں دوردرشن کے سٹیلائٹ چینلز بھی شامل ہیں۔

ہندستان میں ٹی وی نیٹ ورک میں نجی زمروں کی شرکت کا آغاز دوردرشن پر اسپانسر اور کمیشن پروگرامز سے ہوا۔ گویا چینلز کی نجی کاری سے پہلے جزوی نجی کاری ہونا شروع ہوگئی تھی۔ ہندستان میں سٹیلائٹ پرائیویٹ چینلز کو اپ لنکنگ کی سہولت کے بعد نجی کاری کا عمل فروغ پذیر ہوا۔

ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے بعد نہ صرف روز نئے نئے چینلز آتے اور بند ہوتے رہتے ہیں بلکہ اب الگ الگ زمروں کے منفرد چینلز عام ہیں۔ اب کھیل، کامیڈی، تعلیم، صحت، ماحولیات وغیرہ کے منفرد چینل عام ہیں۔ نیوز اور تفریح کے چینلز تو ٹی وی کی نجی کاری کی ابتدا سے ہی تھے۔ نجی چینلز کو سٹیلائٹ کے ذریعے اپنی سرزمین سے اَپ لنکنگ کی آسانی نے ٹیلی ویژن کی نجی کاری میں اہم کردار ادا کیا اور دھیرے دھیرے نجی چینلز نے نہ صرف عوام میں اپنی جگہ بنالی بلکہ شہروں اور قصباتی زندگی کی حد تک جہاں جہاں کیبل کی سہولیت مہیا ہے وہاں وہاں ایک بڑے حصے پر اپنا اثر قائم کرلیا۔ آج ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ پرائیویٹ چینلز کا عادی ہو چکا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے بعد ہندستان میں ٹیلی کاسٹنگ کے معیار اور مقبولیت دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ٹیلی ویژن کی نجی کاری سے صرف دیکھنے والوں کو ہی فائدہ نہیں ہوا بلکہ ایک خاص تعداد کو روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوئے ہیں۔ آج ملک میں سیکڑوں پروڈکشن ہاؤسز ہیں، نجی چینلز ہیں اور ان سے متعلق ضمنی کمپنیاں ہیں جن میں لاکھوں لوگ مختلف سطحوں پر کام کررہے ہیں۔

22.6.1 ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے اثرات

سماج پر مدتوں سے ماس میڈیا کے سبھی ذرائع کے اور خاص طور پر ٹیلی ویژن کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں لیکن ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے بعد اس کے پھیلاؤ نے سماج کے ہر طبقہ، ہر فرد اور تمام تر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا ہے۔ اب ٹیلی ویژن فرد کی نجی زندگی میں اس طرح دخیل ہے کہ اس کے اثر سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔

نجی کاری کے بعد ٹیلی ویژن اب زبردست صارفیاتی صنعت اور منڈی کی شکل اختیار کرچکا ہے اور اب سماج کا کوئی شعبہ اس کے اثر سے باہر نہیں ہے۔ ہمارے روزمرہ کے استعمال کی اشیا سے لے کر ہمارے رسم ورواج، ہماری تہذیب وثقافت، ہماری تعلیم اور ہمارا رویہ سب کچھ متاثر ہو رہا ہے۔ بعض صورتوں میں ارادتاً متاثر کیا جارہا ہے۔

ٹیلی ویژن پرائیویٹ ہوکر اتنا چھا گیا ہے کہ ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گیا ہے۔

22.6.2 نجی چینلز کی ذمہ داری

ماس میڈیا کے بنیادی مقاصد اطلاع (Information) تعلیم (Education) اور تفریح (Excursion) ہیں۔

نجی چینلز بھی ان مقاصد کو پورا کررہے ہیں مگر ان میں توازن کی کمی ہے۔ مقصد کے حصول میں اگر توازن نہ ہو تو اطلاع حادثہ میں، واقعہ سانحہ میں، علم جہل میں اور تفریح مصیبت میں بدل سکتی ہے۔ ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے بعد سے اس پر میڈیا والوں سے زیادہ تاجروں کا تسلط ہوگیا ہے۔ اب یہ صنعت تجارت کے زمرے میں داخل ہو چکی ہے۔ اب اچھے برے کے بجائے نفع ونقصان کی اصطلاح میں سوچا جارہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اپنے بنیادی مقاصد سے دور جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

نجی زمرے کے ٹیلی ویژن نے ہی عوامی ترسیل کے اس دودھاری ذریعے کو وسعت دی ہے اس لیے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ سماج کو اس کے مضر اثرات سے بچائیں اور اس کو صحیح معنوں میں اس کے بنیادی مقاصد اطلاع، علم اور تفریح سے وابستہ صحت مند طریقوں کو فروغ دیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1- ٹیلی کاسٹ کی تین سطحیں کیا ہیں؟

2- ٹرسٹیل چینل کیا ہے؟

3- ٹیلی ویژن کی نجی کاری کی تکنیکی وجہ کیا ہے؟

22.7 نجی چینلز اور اُردو

ذرائع ابلاغ میں کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس میں اُردو زبان کی ضرورت اور اہمیت مسلم نہ ہو۔ اخبار ہو یا ریڈیو، فلم ہو یا ٹیلی ویژن، اُردو زبان کی قوت اس کی ہمہ گیری، گیرائی و گہرائی، بلاغت و اشاریت، شیرینی و حسن ہر جگہ کام آتے ہیں۔ خاص طور پر الکٹرانک میڈیا میں اس کی اہمیت اور ضرورت میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ ٹی وی کی نجی کاری کے بعد اُردو زبان کا چلن اور بھی بڑھا ہے اس لیے کہ ٹی وی چینلز کو عوامی ربط کے لیے اس زبان کی ضرورت ہے۔ اُردو تاریخی اعتبار سے اپنی پیدائش سے ہی عوامی رابطے کی زبان ہے اور اثر پذیری اس کی خصوصیت ہے، اس لیے میڈیا کو یہ راس آتی ہے۔

یہ زمانہ تخصیص اور اختصار کا ہے۔ انسان کے پاس فرصت کے لمحات کم اور ضروریات زیادہ ہیں اور اُردو اپنی جامعیت کی وجہ سے اختصار کے ساتھ موثر ہونے پر قادر ہے۔ ٹیلی ویژن کی مقبولیت کے موجودہ دور میں اشتہارات کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے ٹی وی کے لیے اشتہار تیار کرنے اور پھر اسے ٹیلی کاسٹ کرنے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ کبھی کبھی تو سکنڈوں میں دکھایا جانے والا اشتہار لمبے لمبے پروگراموں سے کہیں زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں کم وقت میں ضروری مواد کھپا دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس جامعیت اور اختصار کے لیے اُردو زبان موزوں ترین زبان ہے۔ کسی بھی وقت ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے اشتہارات کو غور سے سن لیجیے، ممکن ہو تو ان میں بولے جانے والے الفاظ کو کاغذ پر لکھ لیجیے۔ آپ پائیں گے کہ استعمال کیے جانے والے لفظوں میں غالب عنصر اُردو کا ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ٹی وی کے لیے اشتہار لکھنا ایک پروفیشنل معاملہ ہے اور کسی حد تک تکنیکی بھی۔ لیکن ایسے لوگوں کے لیے جو خیال کو لفظوں میں ڈھالنے کے ہنر سے واقف ہیں، یہ کوئی بہت بڑی رکاوٹ نہیں ہے۔ بس ذرا سی مشق اور معلومات سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ تو صرف ٹی وی میڈیم میں اُردو کی اہمیت کی ایک مثال تھی ورنہ ٹیلی ویژن کے زیادہ تر پروگراموں میں اُردو کا استعمال ناگزیر ہے اور ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے بعد اس میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

ٹیلی ویژن نے صرف اُردو زبان سے ہی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اُردو زبان کے ادب اور شاعری سے بھی خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ کون سا ایسا مقبول سیریل ہے جس میں اُردو کے مکالمے کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔ شاید ہی کوئی مقبول سیریل ایسا ہو جس کا ٹائٹل سونگ (Title song) اُردو شاعری کا مرہون منّت نہ ہو۔ میڈیا سے وابستہ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ ترسیل کے لیے کیا ضروری ہے۔ اسی لیے اُردو کا استعمال نہ صرف بڑھ رہا ہے بلکہ ٹی وی جیسے مقبول میڈیم کو مزید مقبول بنانے میں اُردو زبان اپنا مثبت کردار ادا کر رہی ہے۔

ٹیلی ویژن کی نجی کاری سے جہاں اس میڈیم کو (یعنی ٹیلی ویژن کو) وسعت کے مواقع میسر آئے وہیں اُردو زبان اور اس سے وابستہ ثقافت کو بھی زبان کے توسط سے دور دور تک اپنا اثر بڑھانے کا موقع ملا۔

22.7.1 زبان اور تکنیک

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ Visual medium میں تکنیکی ضرورتوں کے لیے زبان جاننے اور نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ کہ تصویر نے لفظ کی اہمیت اور ضرورت کو کم کر دیا ہے۔ یہ نہ صرف غلط فہمی ہے بلکہ عدم واقفیت کا نتیجہ بھی ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی پروگرام ہو، زبان کی واقفیت بلکہ مہارت کے بغیر اثر انگیز نہیں ہو سکتا۔

اب رہا خالص تکنیکی افراد کا معاملہ تو اس میں بھی زبان کا جاننا بہت مفید ہے۔ اگر ویڈیو ایڈیٹر زبان جانتا ہے تو اسے ایڈٹ کرنے میں آسانی ہوگی۔ اگر کیمرہ مین زبان سے واقف ہے تو اسے اس زبان سے وابستہ تہذیب سے مطابقت رکھنے والے زاویوں کو چننے میں آسانی ہوگی' کیونکہ ٹی وی میں بیشتر تکنیکی کام تخلیقی قوتوں سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ انہیں صرف مشین آپریٹر نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ مشین کا تخلیقی استعمال ہی تکنیکی لوگوں کو ممتاز' ماہر اور مکمل بناتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1- کسی سیریل کے شروع میں جو اشعار ہوتے ہیں ان کا تکنیکی نام کیا ہے؟

2-ٹی وی اشتہارات میں اُردو کا کیا رول ہے؟

22.8 خلاصہ

ترسیل ایک باقاعدہ سماجی عمل ہے اور اس کے بغیر ہم زندگی کے بیشتر تقاضے پورا نہیں کر سکتے۔ ریڈیو یا ٹی وی کا براڈ کاسٹر یا ٹیلی کاسٹر ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنی بات آپ تک پہنچاتا ہے' آپ اس کو سنتے' دیکھتے ہیں۔ یہی عوامی ترسیل ہے۔ ہندستان میں ٹیلی ویژن کی عمر اب چار دہائیوں سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ان برسوں میں ترسیل و ابلاغ کے اس جدید ذریعے نے ہمارے ملک میں کئی ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی کی ہے۔ یہ ترقی تکنیک اور مواد دونوں اعتبار سے ہوئی ہے۔ 15/ستمبر 1959 کو یونیسکو (UNESCO) کی مدد سے تجرباتی طور پر دہلی میں ٹیلی ویژن کی نشریات شروع کی گئیں۔ اس وقت اس کی حد دہلی شہر کے کچھ علاقوں تک تھی اور ہفتے میں صرف ایک گھنٹے کے لیے پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ 1961ء میں تجرباتی طور پر اسکول ٹیلی ویژن شروع کیا گیا جس سے طلبہ اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد ٹیلی ویژن کے قریب آ گئی۔ دہلی کے بعد 1972ء میں ممبئی میں ٹیلی ویژن کا دوسرا مرکز قائم کیا گیا۔ 1975ء میں ہندستانی ٹیلی ویژن کے لیے سٹیلائٹ کے استعمال کا آغاز ہوا۔ 15/اگست 1982 کو ہندستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ کا ایک اہم دن مانا جانا چاہئے اس لیے کہ اس دن انسیٹ (1) کے ذریعے پورے ملک کی نشریات کو ایک لڑی میں پرو دیا گیا اور دہلی سے نیشنل پروگرام کا آغاز ہوا۔ 15/اگست 1982ء ہی کو ہندستان میں رنگین نشریات بھی شروع ہوئیں۔ نومبر 1982 میں نویں ایشیائی کھیلوں کو براہ راست نشر (Live Telecast) کرنے کے ساتھ ہندستان کی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ نویں ایشیائی کھیلوں کو نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ بیرونی ممالک میں براہ راست دکھایا جا سکا۔ ستمبر 1984ء میں دہلی میں دوسرے چینل کی سہولیت مہیا کی گئی جس سے دیکھنے والوں کو دو مختلف چینلز میں سے انتخاب کی سہولت میسّر آئی۔ موجودہ دور میں ہمارے ملک میں کئی سطحوں پر ٹی وی چینلز جاری ہیں۔ ان میں تین سطحیں عام ہیں: ٹرسٹیل (Terrestial)' کیبل (Cable) اور سیٹلائٹ (Satellite)۔

ہندستان میں ٹی وی نیٹ ورک میں نجی زمروں کی شرکت کا آغاز دوردرشن پر اسپانسر اور کمیشن پروگرامز سے ہوا۔ گویا چینلز کی نجی کاری سے پہلے جزوی نجی کاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے بعد ہندستان میں ٹیلی کاسٹنگ کے معیار اور مقبولیت دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ٹیلی ویژن کی نجی کاری کے بعد ہندستان میں ٹیلی کاسٹنگ کے معیار اور مقبولیت دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ٹیلی ویژن کی نجی کاری سے صرف دیکھنے والوں کو ہی فائدہ نہیں ہوا بلکہ ایک خاص تعداد کو روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوئے ہیں۔ نجی کاری کے بعد ٹیلی ویژن اب زبردست صارفیاتی صنعت اور منڈی کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اب سماج کا کوئی شعبہ اس کے اثر سے باہر نہیں ہے۔

ذرائع ابلاغ میں کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس میں اُردو زبان کی ضرورت اور اہمیت مسلم نہ ہو۔ اخبار ہو یا ریڈیو' فلم ہو یا ٹیلی ویژن' اُردو زبان کی قوت اس کی ہمہ گیری' گیرائی و گہرائی' بلاغت و اشاریت' شیرینی و حسن ہر جگہ کام آتے ہیں۔ انسان کے پاس فرصت کے لمحات کم اور ضروریات زیادہ ہیں اور اُردو اپنی جامعیت کی وجہ سے اختصار کے ساتھ موثر ہونے پر قادر ہے۔ ٹیلی ویژن نے صرف اُردو زبان سے ہی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس سے آگے بڑھ

کر اُردو زبان کے ادب اور شاعری سے بھی خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ Visual medium میں تکنیکی ضرورتوں کے لیے زبان جاننے اور نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ کہ تصویر نے لفظ کی اہمیت اور ضرورت کو کم کر دیا ہے۔ یہ نہ صرف غلط فہمی ہے بلکہ عدم واقفیت کا نتیجہ بھی ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی پروگرام زبان کی واقفیت بلکہ مہارت کے بغیر اثر انگیز نہیں ہو سکتا۔

22.9 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ہندستان میں ٹیلی ویژن کے آغاز وارتقا پر ایک مضمون لکھیے۔
2. عوامی ترسیل سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا ٹیلی ویژن کے نجی چینلز اپنی ذمہ داری بخوبی انجام دے رہے ہیں؟ تبصرہ کیجیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ٹی وی کی نجی کاری کے مضمرات قلم بند کیجیے۔
2. سٹیلائٹ کے استعمال سے ہندستانی ٹی وی اور اس کے ناظرین کو کس طرح فائدہ پہنچا؟
3. ٹی وی میں اُردو زبان کے استعمال پر اپنی رائے لکھیے۔

22.10 فرہنگ

ترسیل	پہنچانا۔ بات کا مخاطب تک پہنچ جانا۔ کمیونی کیشن
براڈ کاسٹر	ریڈیو کی اصطلاح ہے۔ ریڈیو کے ذریعے بات کہنے والا
ٹیلی کاسٹر	ٹی وی کے ذریعے بات کہنے والا
ذرائع	ذریعہ کی جمع۔ کئی ذریعے
کمیونٹی ویونگ سیٹس	اجتماعی طور پر دیکھے جانے والے ٹی وی سیٹس
نشریات	نشریہ کی جمع
ٹرسٹیل چینلز	ایسے چینلز جو بنا کیبل کے صرف ٹی وی انٹینا کے ذریعے دیکھے جا سکیں۔
ڈی۔ٹی۔ایچ (D.T.H)	ڈائریکٹ ٹو ہوم (Direct to Home) کا مخفف۔ D.T.H کے ذریعے بنا کیبل کے ٹی وی دیکھا جا سکتا ہے اور یہ اب عام ملتا ہے۔
پروڈکشن ہاؤس	وہ کمپنی جو پروگرام بناتی ہے۔

22.11 سفارش کردہ کتابیں

1-انجم عثمانی	ٹیلی ویژن نشریات۔ تاریخ، تحریر، تکنیک
2-محمد امتیاز علی	الکٹرانک میڈیا ریڈیو۔ ٹیلی ویژن
3-اشفاق محمد خاں	عوامی ذرائع ترسیل
4- کمال احمد صدیقی	اُردو۔ ریڈیو ٹی وی میں ترسیل وابلاغ

اکائی 23: ٹیلی ویژن کی مختلف نشریات

ساخت

23.1 تمہید

23.2 خبریں

23.3 حالاتِ حاضرہ پر مباحثے

23.4 دستاویزی فلمیں (Documentary Films)

23.5 ماحولیاتی پروگرام

23.6 تعلیمی پروگرام

23.7 بچوں کے پروگرام

23.7.1 کارٹون پر مبنی پروگرام 23.7.2 بچوں کی دلچسپی کے سیریل 23.7.3 کھیل کود کے پروگرام

23.8 خواتین کے پروگرام

23.9 ٹیلی ڈراما ٹیلی فلم اور ٹی وی سیریلز

23.9.1 ٹیلی ڈراما 23.9.2 ٹیلی فلم 23.9.3 ٹی وی سیریلز

23.10 فلمی پروگرام

23.10.1 فیچر فلمیں 23.10.2 فلمی نغمے

23.10.3 چھوٹی یا دستاویزی (Short or Documentary) فلمیں

23.11 تہذیبی پروگرام

23.11.1 زبان و ادب کے پروگرام 23.11.2 موسیقی 23.11.3 گائکی 23.11.4 رقص

23.12 مذہبی پروگرام

23.13 مقابلے یا انعام کے پروگرام

23.14 فیشن پر مبنی پروگرام

23.15 کھیل کود کے پروگرام

23.16 اشتہار

23.17 خلاصہ

23.18 نمونہ امتحانی سوالات

23.19 فرہنگ

23.20 سفارش کردہ کتابیں

23.1 تمہید

آج ٹیلی ویژن ہماری زندگی کا ایک ناگزیر حصہ بن چکا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اب ہم ٹیلی ویژن کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں کر سکتے لیکن اب سے کچھ برس پہلے تک ہماری زندگی ٹیلی ویژن سے بہت کم متاثر تھی۔ ٹیلی ویژن انٹرنیٹ کو چھوڑ کر ابلاغیات کے تمام ذرائع خصوصاً اخبار، فلم اور ریڈیو کے مقابلے میں جدید ترین ہے۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد تو کافی بعد میں ہوئی لیکن اس کا فروغ بہت ہی تیز رفتاری سے ہوا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ آج ٹیلی ویژن سب سے موثر اور طاقت ور ذرائع ابلاغ ہے۔

ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز سب سے پہلے 1920 میں امریکہ میں ہوا تھا۔ یہ نشریات تجرباتی طور پر کی گئی تھی، اس وقت تصویروں کے بدلنے کی رفتار کافی کم تھی اس لیے وہ آج کی طرح زندہ جاوید اور چلتی پھرتی تصویریں نہیں محسوس ہوتی تھیں۔ لیکن اس تجربے میں بڑے امکان نظر آئے اور بہت تیزی سے اس سمت میں کام کیا جانے لگا۔ 1923 آتے آتے تکنیکی طور پر کافی سدھار ہو گیا اور اب یہ تصویریں زندگی سے زیادہ بھرپور تھیں۔ اگلے کئی برسوں تک سائنسدانوں نے کڑی محنت کی اور ان کے کافی بہتر نتائج حاصل ہوئے۔ ٹیلی ویژن نشریات کا وہ معیار ہو گیا کہ اس سے مستقل پروگرام نشر کیے جانے لگے۔ 1930 میں نیویارک میں این. بی. سی. (NBC) اور لندن میں بی. بی. سی. (BBC) نام کے ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کا قیام عمل میں آیا اور یہ دونوں چینل مستقل طور پر اپنے پروگرام نشر کرنے لگے۔ دوسری عالمی جنگ (1939-1945) کے دوران اس سلسلے میں کوئی خاص ترقی نہ ہو سکی۔ لیکن جنگ کے خاتمے کے بعد ٹیلی ویژن نشریات میں کافی تیزی سے ترقی ہوئی۔ اگلے 10/15 برسوں میں ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکہ، جاپان، کناڈا اور یوروپی ممالک میں ٹیلی ویژن زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکا تھا۔

ہندستان میں نئی دلی سے 15 ستمبر 1959 میں جب پہلی بار تجرباتی طور پر ٹیلی ویژن نشریات عمل میں آئی تو اس میں یونیسکو (UNESCO) کا مالی تعاون اور امریکہ و فلپس (ہندستان) (Philips India) کا تکنیکی تعاون شامل تھا۔ اس نشریات کا مقصد تھا کہ ٹیلی ویژن نشریات کے ذریعے رسمی تعلیم اور قوم کی ترقی کے امکانات تلاش کیے جائیں۔ یہ تجرباتی نشریات ٹیلی کلب کے 180 مخصوص ممبران کے لیے تھی جنھیں یونیسکو (UNESCO) نے مفت میں ٹیلی ویژن سیٹ دستیاب کرائے تھے اور یہ پروگرام صرف 40 کلومیٹر کے دائرے میں دیکھے جا سکتے تھے۔ 1961ء سے اسکول ٹی. وی. (S.TV) کا آغاز ہوا اور مستقل طور پر پروگرام نشر کیے جانے لگے یہ پروگرام تعلیمی ہوتے تھے خاص طور سے سائنس کے اساتذہ اور طالب علموں کو نظر میں رکھ کر تیار کیے جاتے تھے۔ 1959ء سے 1965ء تک ہفتہ میں صرف ایک دن ایک گھنٹے تک پروگرام دکھائے جاتے تھے 1965ء سے روزانہ ایک گھنٹہ پروگرام دکھایا جانے لگا۔ 1965ء میں پہلی بار کچھ تفریحی پروگرموں کا بھی آغاز ہوا لیکن تعلیم، صحت، دیہی مسائل اور مختلف ترقیاتی پروگرام ابھی بھی ان کی ترجیحات میں تھے۔ یہ سلسلہ 1976ء تک چلتا رہا، اسی برس ٹیلی ویژن سے کاروباری نشریات کا آغاز ہوا۔ اب تک ٹیلی ویژن اور ریڈیو ایک ہی شعبے کی دو شاخیں تھیں اور ایک ہی ڈائرکٹوریٹ کے تحت تھے۔ اسی برس ٹیلی ویژن کو الگ مستقل ادارہ بنایا گیا جسے ''دوردرشن'' نام دیا گیا۔

اس کے بعد 1982ء میں ٹیلی ویژن میں انقلابی تبدیلیاں آئیں جب کہ سیٹ لائٹ کے ذریعے قومی جال (National Network) قائم کیا گیا جس کے ذریعے قومی نشریات کا آغاز ہوا جسے بیک وقت پورے ہندستان میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس قومی نشریات کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ ہندستان میں پہلی بار رنگین نشریات عمل میں آئیں۔ اسی سال ٹیلی ویژن پر پہلی بار براہ راست (Live Telecast) نشریات کا آغاز ہوا۔ ایشیائی کھیلوں اور ناوابستہ ممالک کی کانفرنس کو دوردرشن پر سیدھا دکھایا گیا۔ 1984 میں ہندستان کا پہلا ٹی. وی. سیریل ''ہم لوگ'' دکھایا گیا۔

جس امر نے ٹیلی ویژن نشریات کی پوری تاریخ بدل دی وہ 1992 میں واقع ہوا، اسی سال سے کیبل ٹی. وی. کا آغاز ہوا اور دوردرشن کے علاوہ پرائیویٹ چینلوں کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلا پرائیوٹ چینل زی. ٹی. وی. تھا۔ جس نے ہندستان میں پرائیویٹ چینلوں کی ایک مستحکم روایت کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے بعد ٹیلی ویژن نشریات کی رفتار اتنی تیزی سے بدلی اور ایسی ترقی کی کہ نہ صرف ٹیلی ویژن بلکہ پورے معاشرے کی تاریخ پر بہت گہرے نقوش ثبت ہوئے۔ ان نجی چینلوں نے پروگراموں میں اس قدر تبدیلی کی کہ ان کا حساب لگانا ایک مشکل امر ہے۔

یہ تھے ہندستان میں ٹیلی ویژن کے ارتقا کے چند اہم موڑ۔ اب موجودہ دور میں یا اب سے کچھ پہلے تک جو پروگرام ٹیلی ویژن پر نشر ہو رہے تھے ان کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

23.2 خبریں

خبریں ٹیلی ویژن کے مقبول ترین پروگراموں میں سے ایک ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلے کچھ برسوں سے ہر سال کچھ نئے چینل کھل جاتے ہیں اور جن میں سے بیشتر بہت کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ کچھ چینل مکمل طور پر خبروں کے نہیں ہیں لیکن وہ بھی ایک مستقل وقفے پر خبریں نشر کرتے ہیں۔ این. ڈی. ٹی. وی، دور درشن، سہارا ٹی. وی، زی. نیوز، آج تک، اسٹار نیوز، ای. ٹی. وی، وغیرہ ہندستانی اور بی. بی. سی، سی. این. این، سی. این. بی. سی جیسے غیر ملکی چینل ہیں جو ہندستان میں 24 گھنٹے خبریں نشر کرتے ہیں۔ چینلوں کی اتنی بڑی تعداد کسی بھی اور قسم کے پروگرام کی نہیں ہے۔

اپنے اردگرد اور سماجی و سیاسی حالات سے باخبر رہنا انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسان کی تاریخ۔ جب انسان جنگل میں رہتا تھا تو شام کو قبیلے کے سارے لوگ ایک جگہ پر جمع ہوتے تھے اور ایک دوسرے کو دن بھر کی اپنی اپنی روداد سناتے تھے۔ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا خبروں کے ذرائع بدلتے گئے لیکن خبروں سے اس کی دلچسپی میں کبھی کمی نہیں آئی اور آج بھی اسی طرح سے برقرار ہے۔ اب خبروں کا سب سے موثر ذریعہ ٹیلی ویژن ہی ہے۔

ٹیلی ویژن کی خبروں کا ارتقا دراصل اخبار اور ریڈیو کی خبروں سے ہوا ہے۔ اسی لیے پہلے ٹی. وی. پر بھی ریڈیو کی طرح خبریں سنائی جاتی تھیں لیکن اب جائے واردات پر جا کر وہاں سے براہ راست رپورٹنگ نے ٹیلی ویژن کی خبروں میں ایک بڑا اضافہ ہے۔ ٹیلی ویژن خبروں میں ایک انقلابی تبدیلی اس وقت آئی جب سے بالکل چھوٹا کیمرا آ گیا ہے جسے صحافی چھپا کر آرام سے کہیں بھی لے جا سکتا ہے اور سامنے والے کو خبر بھی نہیں ہو پاتی ہے کہ وہ جس سے بات کر رہا ہے وہ صحافی ہے اور اس کی گفتگو ریکارڈ کی جا رہی ہے۔ اس قسم کے کیمرے سے کئی بہت بڑے بڑے اسکینڈل سامنے آئے۔ تہلکہ نے تو دفاعی خرید میں ہو رہی دھاندلی کو اس طرح سے دکھایا کہ حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد ان کیمروں کی بدولت ایک سے ایک اسکینڈل سامنے آئے۔ ٹیلی ویژن صحافت ایک طرف جہاں اچھے کام کر رہی ہے وہیں اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ 24 گھنٹے نئی سے نئی اور سب سے پہلے خبریں پیش کرنے کی ہوڑ نے انسان کی ذاتی زندگی میں غیر اخلاقی دخل دینا شروع کر دیا ہے۔ یہ چینل خبروں کو ڈرامٹائز کر رہے ہیں اور توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح ٹیلی ویژن کی خبریں ایک نئے دور میں داخل ہو گئی ہیں۔

23.3 حالات حاضرہ پر مباحثے

ٹیلی ویژن پر مختلف موضوعات پر مباحثے بھی بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان مباحثوں کا کوئی متعین موضوع نہیں ہوتا ہے۔ وہ سیاسی، سماجی، تہذیبی، ماحولیاتی، سائنسی وغیرہ کسی بھی سنجیدہ موضوع پر ہو سکتے ہیں۔ لیکن مباحثے اس وقت کے ہم عصر موضوعات پر خاص طور سے ہوتے ہیں۔ پارلیامینٹ میں جن موضوعات پر بحث چل رہی ہو یا کوئی سیاسی پارٹی یا حکومت جن موضوعات پر گفتگو کرتی ہے ان موضوعات پر زیادہ مباحثے ہوتے ہیں۔ دستاویزی فلموں میں اس موضوع پر مختلف رائے رکھنے والے افراد کے ساتھ ساتھ دستاویزی فلم کار کا بھی نظریہ سامنے آتا ہے اور فلم کار کے نظریے کی اہمیت اکثر دوسرے افراد سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن مباحثے میں عام طور پر پروگرام بنانے والے کا نظریہ سامنے نہیں آتا ہے۔

حالات حاضرہ پر مباحثوں میں اکثر سیاسی، سماجی و تہذیبی کارکن، اس موضوع کے ماہر پروفیسر اور سینئر صحافی یا مدیر حصہ لیتے ہیں اور اس موضوع پر عوامی رائے بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے مباحثوں میں یہ امر بہت ضروری ہے کہ اس موضوع پر مختلف رائے رکھنے والوں کو بلایا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی رائے سامنے آ پائے ورنہ مباحثے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

23.4 دستاویزی فلمیں (Documentary Films)

دستاویزی فلمیں وہ فلمیں ہوتی ہیں جن میں کسی ایک موضوع پر پوری تفصیل کے ساتھ تحقیق کر کے تمام دستاویز جمع کر کے ان پر فلم تیار کی جاتی ہے۔ دستاویزی فلمیں اکثر کسی سیاسی، سماجی، تاریخی، تہذیبی، ماحولیاتی یا سائنسی وغیرہ کسی بھی سنجیدہ موضوع پر ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی ایسی بڑی شخصیتوں پر بھی ہو سکتی ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کے کسی بھی شعبۂ حیات پر گہرا اثر ڈالا ہو۔ دستاویزی فلم کے لیے ایک شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی مفروضے یا بیان پر مبنی نہیں ہوتی ہیں بلکہ تمام مستند حقائق کی تلاش کر کے انھیں تخلیقی اور فکر انگیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ دستاویزی فلمیں ایسے موضوعات پر اور اس سنجیدگی سے بنائی جاتی ہیں کہ ان کی اہمیت وقتی نہیں بلکہ دیرپا قائم رہتی ہے۔ ان کی اسکرپٹ ایک تحقیقی مقالے کی طرح تحقیق شدہ دستاویزات پر مبنی ہوتی ہے۔ دستاویزی فلموں میں پس پردہ بیانیہ (Background Commentary) کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کو اس وقت نہیں شوٹ کر پاتے جب وہ ہو رہی ہوں تو انھیں اداکاروں کی مدد سے اس واقعے کی تخلیق کرتے ہیں۔ دستاویزی فلم میں اس طرح کی تخلیق کو ''ڈاکیوڈراما'' کہتے ہیں۔ ڈاکیوڈراما میں اکثر ماضی کے واقعات کو ہی دکھاتے ہیں۔ ڈاکیوڈراما سے دستاویزی فلمیں تھوڑی دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ دستاویزی فلموں میں اگرچہ ڈاکیوڈراما کا کبھی غیر معمولی صورتحال میں استعمال کر لیتے ہیں لیکن دستاویزی فلموں میں ڈاکیوڈراما بہت مستحسن امر نہیں ہے۔

ہندستان میں دستاویزی فلم کاروں میں آنند پٹوردھن کا نام سرِفہرست ہے۔ انھوں نے ہندستان کے سلگتے ہوئے موضوعات پر فکر انگیز فلمیں بنائی ہیں۔ ''رام کے نام'' ''پتا پُتر اور دھرم یودھ'' ''جنگ اور امن'' وغیرہ ان کی عالمی شہرت کی دستاویزی فلمیں ہیں۔ گجرات فسادات پر مبنی رمیش شرما کی دستاویزی فلم ''Final Solution" (آخری حل) بھی عالمی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ان کے علاوہ بہت سارے فیچر فلم بنانے والے فلم کاروں نے بھی بہت اہم دستاویزی فلمیں بنائی ہیں۔ موجودہ دور میں انور جمال، شاہد جمال، سجو سنگھ، صابدیوان، سنجے کاک اور راہل رائے نے بھی بہت اہم دستاویزی فلمیں بنائی ہیں۔

چونکہ دستاویزی فلموں کا کوئی ایک مخصوص موضوع نہیں ہوتا ہے اسی لیے دستاویزی فلموں کا کوئی ایک چینل بھی نہیں ہے کہ وہ اسی مخصوص چینل پر دکھائی جاتی ہوں۔ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے مختلف چینلوں پر دکھائی جاتی ہیں۔ خبروں کے تمام چینل کچھ دستاویزی فلمیں دکھاتے ہیں، دوردرشن، ڈسکوری (Discovery) اور نیشنل جیوگرافیکل چینل (National Geographical Channel) وغیرہ پر خاص طور سے دستاویزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔

23.5 ماحولیاتی پروگرام

ماحولیاتی پروگرام سے مراد خصوصاً ان پروگراموں سے ہے جو National Geographical Channel اور Discovery Channel پر نشر ہوتے ہیں۔ ان دونوں چینلوں پر قدرت کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی مخلوق کی زندگی، ان کے رہن سہن، ان کے کھانے پینے کے طریقے، ان کی وہ خصوصی صفات جس کی وجہ سے وہ مخلوق دوسری مخلوقات سے مختلف ہیں وغیرہ کی تفصیل بہت تحقیق سے تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ قدرت میں ہو رہی تبدیلیاں، اس کے ماحول میں آنے والی تبدیلیوں کے اثرات جو مختلف مخلوقات پر پڑ رہے ہیں، ان سب حالات کو ان پروگراموں میں خاص طور سے دکھایا جاتا ہے۔ ان چینلوں پر انسانوں کے بڑے کارناموں پر بھی پروگرام ہوتے ہیں۔ دراصل یہ دستاویزی فلمیں ہی ہوتی ہیں جو بہت ہی تحقیق اور تخلیقی انداز سے پیش کی جاتی ہیں۔

ان پروگراموں کی ایک بہت اہم صفت یہ ہوتی ہے کہ ان کی شوٹنگ بہت ہی عمدہ قسم کے کیمروں سے اور جدید سے جدید ٹکنالوجی کے ذریعے ہوتی ہے۔ ان کے کیمرے اتنے طاقت ور ہوتے ہیں کہ کیمرامین ان اشیا (Object) سے بہت دور ہونے کے باوجود اتنی باریکی سے شوٹ کرتا ہے کہ انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ایسی اعلیٰ قسم کی شوٹنگ عام کیمرامین ایک عام کیمرے سے ان کے پاس کھڑا ہو کر شوٹ کرے تو بھی اس معیار تک نہ پہنچ سکے۔ اسی لیے یہ پروگرام خشک موضوع پر ہونے کے باوجود بہت مقبول ہیں کیونکہ یہ پروگرام بہت ہی اعلیٰ درجے کے بنائے جاتے ہیں۔ ان چینلوں کے

پروگراموں کو ماڈل بنا کر پیش کیا جاسکتا ہے۔

23.6 تعلیمی پروگرام

1959ء میں ہندستان میں جب ٹیلی ویژن نشریات کا آغاز ہوا تو تعلیمی پروگرام سے ہی ہوا تھا' جسے یونیسکو نے خاص طور سے اپنے مالی تعاون سے شروع کرایا تھا۔ اس طرح ہندستان میں ٹیلی ویژن نشریات کی سب سے قدیم روایت تعلیمی پروگراموں کی ہی ہے۔ 1959ء میں تجرباتی نشریات کے بعد 1961ء سے 1965ء تک محض تعلیمی پروگرام ہی نشر کیے جاتے تھے جن میں کچھ ترقیاتی پروگرام بھی ہوتے تھے۔ ان میں سائنسی تعلیم پر خاص طور سے توجہ دی جاتی تھی۔

1965ء میں پہلی بار تفریحی پروگرام کا آغاز ہوا۔ جب سے تفریحی پروگرام کا سلسلہ بڑھتا ہی جارہا ہے اور آج یہ حالت ہے کہ تعلیمی پروگراموں کی سنجیدہ آواز تفریحی پروگراموں کے شور میں کہیں دب سی گئی ہے۔ اگر چہ تعلیمی پروگراموں میں اب بہت اضافہ ہو چکا ہے اور ان کا معیار بھی بہتر ہوا ہے۔ دور درشن کا گیان بھارتی' یو۔جی۔سی۔ (UGC) کے اعلیٰ تعلیم کے خصوصی پروگرام اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) کے بھی پروگرام معیاری ہوتے ہیں اور اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ لیکن اس صارفی سماج میں تعلیمی پروگراموں کے لیے کوئی پرائیویٹ کمپنی انھیں اشتہار نہیں دیتی اس لیے ان کے پاس وسائل کی بہت کمی رہتی ہے۔ مالیے کی کمی کی وجہ سے اکثر اتنے معیاری پروگرام نہیں بن پاتے جتنے بن سکتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز سب سے پہلے کب اور کہاں ہوا؟
2. ہندستان میں پہلی بار ٹیلی ویژن پروگرام کہاں سے پیش کیا گیا؟
3. قومی جال (National Network) کب قائم کیا گیا؟
4. پہلے ہندستانی ٹی۔وی سیریل کا نام بتایئے۔

23.7 بچوں کے پروگرام

ٹیلی ویژن پر بچوں کے پروگراموں کی بہت اہمیت ہوتی ہے بچوں کے پروگراموں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے پروگرام کے الگ سے پورے چینل کھلے ہوئے ہیں۔ کارٹون نیٹ ورک (Cartoon Network) اور پوگو (Pogo) ایسے چینل ہیں جن پر صرف بچوں کے ہی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ مختلف چینلوں پر بچوں کے لیے کئی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جن میں سے کچھ ایسے پروگرام ہوتے ہیں جو خاص طور سے بچوں کے لیے ہی تیار کیے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ بڑے لوگ بھی انھیں دیکھتے ہوں لیکن وہ تیار بچوں کے لیے ہی کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کچھ ایسے پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں جو بچوں کے لیے خاص طور سے نہیں تیار کیے جاتے لیکن بچے بھی کافی دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

بچوں کے پروگراموں کی کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں جو دیگر پروگراموں میں نہیں ہوتی ہیں۔ ان صفات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کی نفسیات کو اچھی طرح سے سمجھا جائے اور بچوں سے متعلق پروگرام بناتے وقت ان کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ بچے منطق سے زیادہ تخیل پسند کرتے ہیں' اس لیے بچوں کے اکثر وہی پروگرام کامیاب ہوتے ہیں جن میں تخیل سے بھرپور کام لیا گیا ہو۔ جادو' طلسم' اور نئی نئی مہموں سے دو چار ہونا انھیں بہت پسند ہے۔ پروگرام میں تجسس یوں تو سبھی لوگ پسند کرتے ہیں لیکن بچے خاص طور سے ایسے پروگرام دیکھنا چاہتے ہیں جن میں ہر لمحے ایک نیا سوال پیدا ہو کہ اب کیا ہوگا؟

بچوں کے پروگراموں میں ایک بہت اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پروگراموں میں تعلیم یا نصیحت کتنی ہو؟ اور کیسے ہو؟ بچے کو ہر کوئی نصیحت اور تعلیم دینا چاہتے ہے لیکن بچے پہلے ہی اسکول میں نصیحتوں اور تعلیمی بوجھ سے اتنے دبے ہوتے ہیں کہ وہ اور نصیحت دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ ٹیلی ویژن تو تفریح کے لیے ہی دیکھتے ہیں' اس میں نصیحت کو وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے بچوں کے پروگرام بہت دلچسپ ہونے ضروری ہیں۔ ہاں اگر دلچسپی کے ساتھ

ساتھ اس میں تھوڑی بہت نصیحت چھپی ہو تو اسے وہ بہت پسند کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل قسم کے پروگرام بچوں کے لیے ہوتے ہیں۔

23.7.1 کارٹون پر مبنی پروگرام

بچوں کا سب سے پسندیدہ پروگرام کارٹون ہوتا ہے جنھیں دیکھنے میں بچوں کو سب سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کارٹون نیٹ ورک کا ایک پورا چینل ہے جو ہر وقت صرف کارٹون سے متعلق پروگرام پیش کرتا ہے۔ ان کارٹونوں کی اپنے آپ میں ایک دنیا ہوتی ہے جو اس جیتی جاگتی دنیا سے کچھ معاملوں میں یکساں بھی ہوتی ہے اور کچھ معاملوں میں مختلف بھی۔ کارٹون کے بصری پیکر (Visuals) گرافکس اور اینی میشن سے تیار کیے جاتے ہیں اور آوازیں ایک مخصوص تکنیک سے کچھ مختلف نکلتی ہیں۔ جنھیں سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روبوٹ یعنی کمپیوٹر سے تیار کی گئی ہیں۔ نئے نئے قسم کی مخلوق دیکھنا ان کی گفتگو سننا' یہ سب بچوں کا ایک پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔ بچوں کی نفسیات کے مطابق کارٹون ان کی اکثر خواہشات کو پر کرتے ہیں۔ اس لیے بچے کارٹون دیکھنا بہت پسند کرتے ہیں۔

23.7.2 بچوں کی دلچسپی کے سیریل

بچوں کی دلچسپی کے سیریل دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول وہ جو خاص طور سے بچوں کے لیے تیار کیے جاتے ہیں' دوم وہ جو بڑوں کے لیے تیار کیے جاتے ہیں لیکن ان میں کچھ عناصر ایسے ہوتے ہیں جس سے وہ بچوں میں بھی مقبول ہو جاتے ہیں۔ بچے ایسے سیریل زیادہ پسند کرتے ہیں' جو تخیل سے بھر پور ہوں' جن و پری کے ذکر والے' طلسم اور جادو والے سیریل بچوں کو بہت پسند آتے ہیں۔ بچوں میں ایک قسم کی عینیت ہوتی ہے اس لیے وہ ایسے پروگرام دیکھنا بہت زیادہ پسند نہیں کرتے جن میں بہت زیادہ قتل و غارت ہو' البتہ ڈھشم ڈھشم والی ہلکی مار پیٹ انھیں اچھی لگتی ہے۔ بچے مزاحیہ سیریل بھی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہنسنا ہنسانا ان کا بہترین مشغلہ ہوتا ہے۔

23.7.3 کھیل کود کے پروگرام

کھیل کود کے پروگرام اگر چہ محض بچوں کے لیے ہی نہیں تیار کیے جاتے ہیں بڑے ان میں بہت دلچسپی لیتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بنیادی طور پر بالغ ناظرین کے لیے ہی تیار کیے جاتے ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا لیکن اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ بچے کھیل کود کے پروگرام دیکھنا بہت پسند کرتے ہیں۔ کھیلوں کے دوران بچوں سے متعلق اشیا کے آنے والے اشتہاروں سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کھیل کود خاص طور سے کرکٹ میچ دیکھنا بچے بہت پسند کرتے ہیں۔ دراصل کھیل کود کا تعلق بچپن سے ہی ہوتا ہے بڑے تو صرف ناسٹیل جیا کے طور پر دیکھتے ہیں۔ بچے نہ صرف تفریح کے طور پر کھیل دیکھتے ہیں بلکہ وہ ان سے کھیلنا بھی سیکھتے ہیں۔

23.8 خواتین کے پروگرام

مرد اور خواتین زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جب تک دونوں پہیے ایک ساتھ نہ چلیں گاڑی نہیں چلتی۔ خواتین سے الگ مردوں کی دنیا ممکن ہی نہیں ہے۔ خواتین اور مرد دونوں انسان ہیں ان میں بے شمار باتیں مشترک ہوتی ہیں۔ اس لیے ٹیلی ویژن کے تمام پروگراموں میں خواتین برابر کی شریک ہوتی ہیں ان کے لیے الگ ڈبے (Compartment) کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے سماج میں آج بھی ایک بڑی تعداد ایسی خواتین کی ہے جو محض گھریلو کام کرتی ہیں اور ان کا باہر جانا بہت کم ہو پاتا ہے۔ ایسی خواتین میں ان خواتین کی تعداد زیادہ ہے جو یا تو تعلیم سے بالکل محروم ہیں یا انھیں بیچ میں ہی تعلیم روکنا پڑتی ہے۔ ایسی خواتین کی ایک مخصوص نفسیات ہوتی ہے اور ان کی فکر کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے۔ ان خواتین کو دھیان میں رکھ کر کچھ خصوصی پروگرام تیار کیے جاتے ہیں۔ انھیں خواتین کے پروگرام کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ آج کل بڑی تعداد میں اس قسم کے ٹی وی سیریل نشر کیے جا رہے ہیں۔ خاص طور سے ایکتا کپور نے ایسی عورتوں کی نفسیات کو بہت خوبی سے سمجھا ہے اور ان کے کئی سیریل مثلاً ''کیونکہ ساس بھی کبھی بہو تھی'' ''کہانی گھر گھر کی'' وغیرہ ٹیلی ویژن پر کئی برسوں سے نشر کیے جا رہے ہیں۔ اگر چہ ان سیریلوں کو خالص خواتین کے سیریل کہنا بہت مناسب نہیں ہوگا لیکن

یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے سیریل خواتین خاص طور سے دیکھتی ہیں اور انھیں کو دھیان میں رکھ کر یہ سیریل بنائے جاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر کچھ پروگرام کھانا پکانا سکھانے کے بھی آتے ہیں جنھیں خواتین خاص طور سے دلچسپی کے ساتھ دیکھتی ہیں۔ لیکن انھیں بھی محض خواتین کے پروگرام نہیں کہا جا سکتا کیونکہ خاص طور سے شہری سماج میں کھانا پکانا اب محض خواتین کا کام نہیں رہ گیا ہے۔ ویسے بھی ان پروگرام میں جو کھانا پکانا سکھاتے ہیں وہ اکثر پانچ ستارہ ہوٹلوں کے باورچی ہوتے ہیں جو اکثر مرد ہی ہوتے ہیں۔ بس یہی کچھ پروگرام ہوتے ہیں جنھیں خواتین کے پروگرام کہا جا سکتا ہے۔

23.9 ٹیلی ڈراما، ٹیلی فلم اور ٹی۔وی۔ سیریلز

1984ء میں ہندستان کا پہلا ٹی۔وی۔ سیریل ''ہم لوگ'' دکھایا گیا۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن پر سیریلوں کا دور شروع ہو گیا اور بے شمار سیریل دکھائے گئے۔ بہت سی مشہور و معروف فلمی شخصیتوں نے ان سیریلز میں کام کیا اور بہت سی سیریلز کے فن کاروں نے بعد میں فلموں میں بہت نام کمایا۔ جس کی سب سے روشن مثال شاہ رخ خان کی ہے جو شروع میں ٹی۔وی۔ سیریلز میں ہی کام کرتے تھے۔

23.9.1 ٹیلی ڈراما

ٹیلی ڈراما ایک ایسا ڈراما ہے جو ناظرین کے سامنے نہ پیش کر کے کیمرے کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ٹیلی ڈراما بھی اسٹیج ڈرامے کی طرح ہی فکشن ہوتا ہے جس میں ایک فرضی کہانی دلچسپ انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ ٹیلی ڈراما میں یوں تو ٹیلی ویژن کی تمام تکنیکیں استعمال کی جاتی ہیں لیکن یہ پورا ڈراما اسٹوڈیو میں ہی سیٹ بنا کر شوٹ کیا جاتا ہے۔ ٹیلی ڈراما ایک طرح سے ریڈیو اور اسٹیج ڈراما کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

23.9.2 ٹیلی فلم

ٹیلی فلم اور ٹیلی ڈراما کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ٹیلی فلم اسٹوڈیو میں نہیں شوٹ کی جاتی ہے بلکہ اس میں بیشتر شوٹنگ آؤٹ ڈور (Out Door) ہوتی ہے۔ اگر ان ڈور (In Door) شوٹنگ ہوتی ہے تو بھی نقلی سیٹ بنا کر شوٹ کرنے کی بجائے اصل مکان یا جس کسی بھی جگہ کی شوٹنگ ہو اس جگہ پر جا کر شوٹ کرتے ہیں۔ ٹیلی فلم میں نقلی سیٹ کا استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔

23.9.3 ٹی۔وی۔ سیریلز

ٹی۔وی۔ سیریلز تکنیکی اعتبار سے ایک طرح سے ٹیلی فلم اور ٹیلی ڈراما کا مجموعہ ہوتے ہیں جن میں حسب ضرورت آؤٹ ڈور (Out Door) شوٹنگ کے ساتھ ساتھ ان ڈور (In Door) شوٹنگ بھی ہوتی ہے اور اصلی مقام یا اسٹوڈیو کے نقلی سیٹ کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ ٹی۔وی۔ سیریلز کی کہانی اس طرح کی ہوتی ہے کہ وہ لمبے عرصے تک چلتی رہے۔ کئی ہفتے، کئی مہینے اور کبھی کبھی تو کئی سال تک ایک سیریل چلتا رہتا ہے اور نئے نئے واقعے آتے چلے جاتے ہیں۔ ہماری قدیم داستانوں کی طرح ٹی۔وی۔ سیریلز کی کہانیوں کا بھی کوئی حد و حساب نہیں ہوتا ہے۔ ان میں نئے نئے واقعے اور کردار آتے رہتے ہیں اور کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ ٹی۔وی۔ سیریلز میں پورے سیریل کی کہانی کو مربوط ہونا ضروری نہیں ہوتا ہے۔ اس میں تجسس بنائے رکھنے کے لیے کہانی کا پلاٹ بہت مربوط ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ہر اپی سوڈ کی کہانی کا پلاٹ کسا ہونا چاہیے۔ اس میں تجسس برقرار رہنا چاہیے اور ہر اپی سوڈ اس مقام پر ختم ہونا چاہیے کہ قاری اگلے اپی سوڈ دیکھنے کے لیے بیقرار رہے۔ لیکن ٹی۔وی۔ سیریلز کی کہانی اتنی تیزی سے بھی نہیں بڑھنی چاہیے کہ اگر کوئی ایک یا دو اپی سوڈ نہ دیکھ سکے تو آگے اس کی کچھ سمجھ میں ہی نہ آئے۔

ٹی۔وی۔ سیریلز ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے چند مقبول ترین پروگراموں میں سے ایک ہے۔ اکثر ٹیلی ویژن کے مقبول ترین پروگراموں کی جب درجہ بندی (Rating) آتی ہے تو کوئی سیریل ہی سرفہرست ہوتا ہے اور مقبول ترین دس پروگراموں میں اکثر آدھے یا آدھے سے زیادہ پروگرام ٹی۔وی۔ سیریلز ہی ہوتے ہیں۔ ٹی۔وی۔ سیریلز تقریباً تمام تفریحی چینلوں پر نشر ہوتے ہیں۔ کچھ چینلز کے گروپ جن کے کئی کئی چینل ہیں مثلاً اسٹار ٹی۔وی۔

زی.ٹی.وی، سونی ٹی.وی. ان سب چینلوں کے ٹی.وی. سیریلز کے الگ چینل ہیں جن پر تقریباً چوبیس گھنٹے ٹی.وی. سیریلز نشر ہوتے رہتے ہیں۔ بڑی تعداد میں ٹی.وی. سیریلز کے اداکار اور دوسرے فن کار بعد میں فلموں میں کام کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح فلموں کے بہت سے فن کار یا ہدایت کار وغیرہ ٹی.وی. سیریلز میں کام کرنے لگتے ہیں۔ اس سے بھی ٹی.وی. سیریلز کی وقعت اور مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ راماین اور مہابھارت کے تو کئی اداکار بعد میں سیاست میں آکر انتخاب میں کامیاب ہوئے اور ممبر پارلیمنٹ بھی بنے۔

ٹی۔وی۔ سیریلز میں فلموں کی طرح انسانی زندگی کے تمام دکھ درد اور تمام رنگا رنگی موجود ہوتی ہے۔ ٹی.وی. سیریلز کے کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات و جذبات کو انسان اپنے غموں اور خوشیوں کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھتا ہے۔ ٹی.وی. سیریلز میں فلموں کے مقابلے زندگی زیادہ قریب سے نظر آتی ہے کیونکہ ٹی.وی. سیریلز میں زندگی کو زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور فلموں کی طرح ٹی.وی. سیریلز میں ہیرو پرستی نہیں ہوتی ہے جس کا ہیرو تمام صفات سے پر ہوتا ہے۔ البتہ اس میں انسانی کمزوریاں کم نظر آتی ہیں۔ ٹی.وی. سیریلز میں زندگی زیادہ حقیقی ہوتی ہے۔ فلموں کے مقابلے میں ٹی.وی. سیریلز میں عام طور پر اس طرح کے واقعے اور مناظر نہیں ہوتے ہیں کہ جن کو گھر والوں کے ساتھ دیکھنے میں شرمندگی محسوس ہو۔ یہی سب وجوہات ہیں کہ ٹی.وی. سیریلز ٹیلی ویژن کے مقبول ترین پروگراموں میں سے ایک ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. بچوں کا سب سے پسندیدہ پروگرام کون سا ہے؟
2. بچوں کے چینل کا نام کیا ہے؟
3. خواتین کے بعض سیریلس کے نام بتایئے۔
4. ٹیلی ڈراما کسے کہتے ہیں؟

23.10 فلمی پروگرام

فلمی پروگرام ٹیلی ویژن کے مقبول ترین پروگراموں میں سے ایک ہے۔ کئی ایسے چینل ہیں جو صرف فلمی پروگرام ہی پیش کرتے ہیں۔ تکنیکی طور پر فلم ٹیلی ویژن سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ فلم اور ٹیلی ویژن کی ریل مختلف ہوتی ہے۔ فلم کی ریل بڑے پردے کے لیے ہوتی ہے اسے فلمی ریل یا ٹیپ بولتے ہیں۔ جب کہ ٹیلی ویژن کا پردہ چھوٹا ہوتا ہے اس کی ریل یا ٹیپ کو ویڈیو ٹیپ کہتے ہیں۔ فلم کی ریل پہلے نگیٹو تیار ہوتے ہیں پھر لیب میں اس کے نگیٹو سے پازیٹو تیار کیے جاتے ہیں۔ جب کہ ویڈیو ٹیپ براہ راست پازیٹو ہی تیار ہوتے ہیں۔ فلم میں ٹیلی ویژن کے مقابلے میں لمبے شاٹ (Long Shot) کے لیے زیادہ گنجائش رہتی ہے کیونکہ ٹیلی ویژن کا پردہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے لمبے شاٹ میں صاف نظر نہیں آتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر جو فلمی پروگرام نشر ہوتے ہیں وہ شوٹ تو فلم پر ہی ہوتے ہیں ٹیلی ویژن پر دکھانے کے لے انھیں بعد میں ویڈیو ٹیپ پر منتقل کیا جاتا ہے تبھی وہ ٹیلی ویژن پر نشر کیے جاسکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر فلمی پروگرام دکھانے کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ انھیں ٹی.وی. پر دکھانے کے لیے صرف فلم سے ویڈیو ٹیپ پر منتقل کرنا پڑتا ہے اور کچھ نہیں۔ اس لیے اس کے بنانے کی قیمت (Production Cost) تقریباً نہیں کے برابر ہوتی ہے۔ ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے فلمی پروگراموں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

23.10.1 فیچر فلمیں

فیچر فلمیں ایک پورا الگ موضوع ہے جس کی تفصیل میں جانا یہاں بے محل ہوگا۔ یہاں ان فلموں کا ذکر محض ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے کے حوالے سے ہے۔ ٹیلی ویژن پر دکھانے کے لیے فلم میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی ہے بس اس فلمی ریل کو ویڈیو ٹیپ پر منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر فلم دیکھتے وقت حالات بہت تبدیل ہو جاتے ہیں اس لیے ٹیلی ویژن پر فلم دیکھنے میں وہ تاثیر باقی نہیں رہتی ہے جو تھیٹر میں جا کر فلم دیکھنے میں ہوتی ہے۔ ٹیلی ویژن پر فلم کے دوران بار بار اشتہار آتے ہیں جس سے ناظرین کو بہت اُلجھن ہوتی ہے اور وہ انہماک باقی نہیں رہتا ہے جو تھیٹر میں دیکھنے سے قائم ہوتا ہے۔ ٹیلی

ویژن چونکہ گھر میں بیٹھ کر دیکھتے ہیں تو اکثر کسی نہ کسی گھریلو کام کی وجہ سے بھی توجہ ہٹانی پڑتی ہے۔

23.10.2 فلمی نغمے

فلموں کی طرح ان کے نغمے بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ بعد میں انھیں ویڈیو ٹیپ پر منتقل کر کے انھیں دکھایا جاتا ہے۔ فلمی نغموں کو ٹیلی ویژن پر دکھانے کا ایک اچھا پہلو یہ ہے کہ فلمی نغمے تقریباً 4/5 منٹ کے ہوتے ہیں اور فلم کی کہانی جانے بغیر بھی انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے نغموں میں انہماک ٹوٹنے کا مسئلہ نہیں آتا ہے۔ فلمی نغمے فلموں کے ساتھ تو آتے ہی ہیں مگر بے شمار ایسے پروگرام بھی ہیں جن میں صرف فلمی نغمے ہی نشر ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ کئی ایسے چینل ہیں جن پر 24 گھنٹے صرف فلمی نغمے ہی آتے رہتے ہیں۔ فلمی نغموں کا تصور خالص ہندستانی ہے باقی ملکوں کی فلموں میں نغمے نہیں ہوتے ہیں۔ البتہ پاکستانی فلموں میں، جن کا ہندستانی فلموں سے گہرا تعلق رہا ہے، بھی نغمے ہوتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے فلمی نغموں میں ایک وبا ادھر کچھ برسوں سے پھیلی ہوئی ہے کہ پرانے فلمی نغموں کو Remix کر کے پھر سے تیار کیا جا رہا ہے۔ اس Remix میں اکثر نغموں کے گیت کو جوں کا توں رہنے دیا جاتا ہے، موسیقی کی دھن بنیادی طور پر وہی رہتی ہے البتہ ان میں کچھ آلات کم یا زیادہ کر دیے جاتے ہیں، اس Remix میں جو بڑی تبدیلی کی جاتی ہے وہ ان کے بصری پیکر (Visuals) میں کی جاتی ہے۔ بصری پیکر کو یکسر تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ ان تبدیلیوں میں ایک یہ ہے کہ نئے بصری پیکر اب نہایت بے ہودہ اور نفسیاتی خواہشات کو بھڑکانے والے ہوتے ہیں۔ موسیقی میں جو تبدیلی کی جاتی ہے اس میں بھی اسی امر کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اگر ان نغموں کا اصل خالق ان نئے Remix کو دیکھ لے تو تبدیلیوں کی وجہ سے حیران رہ جائے۔

23.10.3 چھوٹی یا دستاویزی (Short or Documentary) فلمیں

کچھ فکشن اور غیر فکشن فلمیں بہت کم وقفے کی ہوتی ہیں انھیں چھوٹی فلم کہتے ہیں۔ غیر فکشن فلمیں دستاویزی فلمیں ہی ہوتی ہیں۔ دستاویزی فلموں کا اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ فلمیں فلمی ٹیپ اور ویڈیو ٹیپ دونوں پر شوٹ کی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ جو اسے فلم کی ریل پر شوٹ کرتے ہیں وہ بھی اکثر بعد میں اسے ویڈیو ٹیپ پر منتقل کروا کے ٹیلی ویژن پر نشر کراتے ہیں۔

23.11 تہذیبی پروگرام

ہر ملک یا قوم اپنی تہذیب کو فروغ دینے کی کوشش کرتی ہے۔ عوامی ذرائع ترسیل اس سلسلے میں بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن اس سلسلے میں بہت موثر ذرائع ترسیل کا کام انجام دے سکتا ہے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس صارفی سماج میں اب ہماری تہذیب کے بہت کم پروگرام ہوتے ہیں اور ٹیلی ویژن پر مغربی تہذیب کے پروگرام بہت نشر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم کاری کے نتیجے میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لیے ہندستان کی روایتی تہذیب راس نہیں آتی ہے۔ اس تہذیب میں اپنی بنائی ہوئی اشیا کے بکنے کے اتنے امکان نہیں ہیں جتنا مغربی تہذیب میں۔ اسی لیے مغربی کمپنیاں ایسے پروگراموں کے لیے اشتہار دیتی ہیں جن سے مغربی تہذیب یہاں وسعت اختیار کر لے۔ خود ہندستانی کمپنیوں کے لیے بھی یہی صورت حال معاون ہے اور وہ بھی ہندستانی تہذیب کے فروغ سے زیادہ مغربی تہذیب کے فروغ کو پسند کرتی ہیں۔ ایسے میں ہندستانی تہذیب سے متعلق بہت کم پروگرام ٹیلی ویژن پر نشر ہوتے ہیں۔ لے دے کر ایک دوردرشن ہی ہے جسے ہندستانی تہذیب کے فروغ کی تھوڑی بہت فکر رہتی ہے، بہت کم سہی لیکن ہندستانی تہذیب کے کچھ پروگرام ابھی بھی دوردرشن پر نشر ہوتے ہیں۔ نشر ہونے والے ان تہذیبی پروگراموں کو مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

23.11.1 زبان وادب کے پروگرام

آج کے صارفی سماج میں ادب کے لیے بہت کم گنجائش ہے۔ کیونکہ ادب ہمیشہ سے اپنی فطرت میں صارفی سماج کا مخالف رہا ہے اسی لیے ادبی پروگراموں کے لیے اشتہار کا ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ دوردرشن ابھی بھی پورے طور پر کاروباری چینل نہیں ہے اس لیے اس پر کچھ ادبی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ لیکن ان پروگراموں کی مقدار بہت کم ہے بلکہ نہیں کے برابر ہے۔ ہفتے میں محض کچھ گھنٹے کے پروگرام ہوتے ہیں۔ البتہ کچھ عوامی مذاق کے مشاعرے

اور اسی قسم کے کچھ دوسرے پروگرام کچھ دوسرے چینلوں پر بھی آتے ہیں جیسے E-tv اُردو، سب ٹی.وی. اور جین ٹی.وی. وغیرہ پر بھی کچھ ادبی پروگرام آتے ہیں لیکن وہ سب زیادہ تر عوامی مذاق کے پروگرام ہوتے ہیں۔ سنجیدہ پروگرام بہت کم ہوتے ہیں۔

23.11.2 موسیقی

موسیقی یوں تو ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے تقریباً ہر پروگرام کا ایک ضروری جز ہوتی ہے لیکن وہاں موسیقی کا استعمال پردے کے پیچھے سے ان پروگراموں کے تاثر میں اضافہ کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ خود موسیقی پر ان کی توجہ نہیں ہوتی ہے۔ اس موسیقی کا تعلق فن اور تہذیب سے نہیں کے برابر ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر موسیقی کے چار قسم کے پروگرام نشر ہوتے ہیں 1۔ کلاسیکل 2۔ لائٹ موسیقی 3۔ فوک موسیقی اور 4۔ میوزیکل ورائٹی۔ موسیقی کے تمام پروگراموں کی ایک مشکل یہ ہے کہ موسیقی کا تعلق بنیادی طور پر سننے سے ہے جب کہ ٹیلی ویژن پر بصری پیکر (Visual) ضروری ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ موسیقی کو مصور (Illustrate) کیا جائے اس کے لیے بہت مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

23.11.3 گائکی

کلاسیکی موسیقی میں گائکی کو موسیقی کا ہی ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ گائکی کو Vocal Music یعنی زبانی موسیقی اور آلات کے ذریعے پیش کی جانے والی موسیقی کو Instrumental Music کہا جاتا ہے۔ موسیقی کی طرح گائکی بھی 1۔ کلاسیکل گائکی 2۔ لائٹ گائکی 3۔ فلمی گائکی 4۔ لوک گائکی 5۔ مغربی گائکی وغیرہ مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ گائکی کا کوئی بھی پروگرام بغیر موسیقی کے نہیں ہوتا ہے۔ موسیقی کی طرح گائکی کے پروگراموں کا تعلق بھی سننے سے ہوتا ہے اور ٹیلی ویژن ایک Audio-Visual میڈیا ہے اس لیے گائکی کے پروگراموں میں بھی یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ جب گلوکار گائکی کا مظاہرہ کر رہا ہے اس وقت کیا دکھایا جائے؟ اس لیے موسیقی اور جو چیز گائی جا رہی ہے اس کی مناسبت سے گائکی کو بھی مصور (Illustrate) کرنا ہوتا ہے۔ یہ کام بڑی مہارت سے کرنے کا ہوتا ہے۔ ورنہ گائیکی کا اثر کم ہو جاتا ہے۔

ہندستان میں ٹیلی ویژن کے ارتقائی زمانے سے ہی مختلف قسم کی گائکی کے پروگرام آتے رہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ مقبول عام گائکی کے کچھ مسابقتی پروگرام بھی آتے رہے ہیں۔ جن میں کئی راؤنڈ ہوتے ہیں اور آخر میں کسی ایک کو بہترین گائک (گلوکار) کا انعام ملتا تھا۔ یہ پروگرام بھی بہت مقبول رہے ہیں۔ انڈین اڈول (Indian Idol)، فیم گروکل (Fame Gurukul) اور انتاکشری بھی کچھ اسی سے ملتے جلتے پروگرام ہیں جس میں اصل مقابلہ تو گائکی کا ہوتا ہے لیکن دوسری چیزیں بھی اہم ہوتی ہیں۔

23.11.4 رقص

موسیقی کی طرح رقص بھی ایک ایسا فن ہے جس کا استعمال بہت سارے پروگراموں میں کیا جاتا ہے لیکن رقص کے ایسے پروگرام بہت کم ہیں جن کا تعلق ہماری تہذیب و فن سے ہو۔ مغربی رقص کا فحاشی پھیلانے میں اب جم کر استعمال ہو رہا ہے جس کا ہندستانی تہذیب پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ لیکن ان سب صورت حال کے باوجود رقص کے کچھ بہت عمدہ پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں جن میں کلاسیکی رقص سرِ فہرست ہے۔ اس کے علاوہ لوک رقص اور قبائلی رقص کا بھی تعلق ہماری تہذیب سے ہے۔ بیلے اور اوپیرا اگرچہ غیر ملکی رقص ہیں لیکن ان کا استعمال اس طرح سے نہیں ہوتا ہے جن کا مقصد فحاشی پھیلانا ہو۔ بیلے ہندستانی تہذیب میں اب رچ بس گئے ہیں۔

فلمی نغموں پر رقص کے پروگرام ٹیلی ویژن پر بہت مقبول رہے ہیں جو مختلف اوقات پر پیش کیے جاتے رہتے ہیں، بڑے بڑے فلمی ستارے سے لے کر نوخیز رقاص رقص کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ سونی چینل پر ''بوگی ووگی'' کے نام سے ایک پروگرام آتا ہے جس میں بچے اور نوجوان رقص کے مقابلے میں شامل ہوتے ہیں اور مختلف فلمی نغموں پر رقص پیش کرتے ہیں۔ کچھ خاص پارٹیوں کے موقعے پر بھی فلمی نغموں پر رقص بہت مقبول رہا ہے۔ مثال کے طور پر جب نئے سال کے پروگرام نشر ہوتے ہیں تو ان میں فلمی نغموں پر بہت سے معروف و مشہور رقاص/رقاصائیں رقص پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح فلم فیئر انعام کے پروگرام کے دوران بھی فلمی نغموں پر رقص کے کئی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے فلمی پروگراموں کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟
2. Remix سے کیا مراد ہے؟
3. تہذیبی پروگراموں کو کن چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

23.12 مذہبی پروگرام

کسی بھی تہذیب میں مذہب کا کردار مرکزی ہوتا ہے' کیونکہ مذہب محض ذوق وشوق کا نام نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے۔اس لیے انسان کی زندگی ہر لمحے کسی نہ کسی طور پر مذہب سے متاثر ہوتی ہے۔ مذہب کی مناسبت سے ہی اس کے رسم ورواج بنتے ہیں' جشن وغم منائے جاتے ہیں' شادیانے بجتے ہیں۔لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تہذیب مکمل طور پر مذہب پر مبنی ہوتی ہے۔کسی قوم کی تہذیب مذہب کے علاوہ وہاں کے رسم و رواج' جغرافیہ رہن سہن اور لباس وغیرہ سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ ہندستانی سماج میں چونکہ مذہب کی جڑیں بہت مستحکم ہیں اس لیے مذہبی پروگراموں کو دیکھنے کے لیے بہت سے ناظرین ہیں۔اسی لیے کمپنیاں انھیں اشتہار بھی دیتی ہیں۔اس وقت کئی مذہبی چینل ہندستان میں چل رہے ہیں۔''آستھا'' اور ''سنسکار'' جہاں ہندو مذہب کے ہیں وہیں مسلمانوں کا Q-TV ہے جو نشر تو پاکستان سے ہوتا ہے لیکن بڑے پیمانے پر ہندستان میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح پنجابی اور جین ٹی.وی بھی ہیں جو پورے طور پر مذہبی چینل نہ سہی لیکن ان پر بھی بڑی تعداد میں مذہبی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

23.13 مقابلے یا انعام کے پروگرام

ٹیلی ویژن پر اس قسم کے بہت سے پروگرام نشر ہو رہے ہیں جن میں کچھ عام معلومات (General knowledge) کے سوال پوچھے جاتے ہیں اور ان سوالوں کے صحیح جواب دینے پر بڑی بڑی رقمیں انعام کے طور پر ملتی ہیں۔اس قسم کے پروگراموں کا آغاز اسکولی بچوں میں عام معلومات کے مقابلے سے ہوا تھا۔اس قسم کے پروگراموں سے طالب علموں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی' ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا اور وہ پڑھنے کی طرف راغب ہوتے تھے۔بعد میں امریکی ٹیلی ویژن کی نقل میں ہندستان میں بھی بہت سے اس قسم کے پروگرام نشر ہونے لگے۔اس قسم کے پروگراموں میں انقلاب اس وقت آ گیا جب 2000 میں امیتابھ بچن اسی قسم کے ایک پروگرام ''کون بنے گا کروڑ پتی'' کے میزبان (Host) بن کر آئے۔کون بنے گا کروڑ پتی نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔اسی سے متاثر ہو کر مختلف چینلوں نے کچھ اور ٹیلی ویژن پروگرام شروع کیے۔جیسے:''سوال دس کروڑ کے'' ''چھپر پھاڑ کے'' وغیرہ۔ان پروگراموں نے پورے معاشرے میں ایک عجیب قسم کی ہلچل پیدا کر دی اور لوگ راتوں رات کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھنے لگے۔

23.14 فیشن پر مبنی پروگرام

فیشن کے پروگراموں کے لیے F-TV نام کا ایک الگ چینل ہے جو ہر وقت فیشن شو دکھاتا رہتا ہے۔کبھی کبھی کچھ اور چینل بھی فیشن شو دکھاتے ہیں۔فیشن کے پروگرام میں نئی نئی ڈزائنوں کے کپڑوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ یہ ڈزائنیں خواتین و مرد ماڈل پہنتے ہیں اور اسٹیج پر مارچ کرتے ہوئے یا مٹکتے ہوئے آتے ہیں اور پھر اسی طرح واپس چلے جاتے ہیں۔اس کے جانے کے بعد دوسرا ماڈل نئے کپڑوں میں آتا ہے اور اسی طرح ایک ادا کے ساتھ واپس چلا جاتا ہے۔فیشن کے نمائشی پروگرام میں باقی کچھ خاص نہیں ہوتا۔

23.15 کھیل کود کے پروگرام

کھیل کود ہماری زندگی کا ایک لازمی حصہ ہیں۔کھیل کود کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ وہ صحت کے لیے مفید ہوتے ہیں۔بدن میں چستی

پھرتی بنی رہتی ہے۔انسان قاعدے قانون میں رہ کر کام کرنا سیکھتا ہے۔لیکن یہ سارے فائدے خود کھیلنے سے ہیں ٹیلی ویژن پر میچ دیکھنے سے نہیں، پھر آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگ دیوانگی کی حد تک میچ دیکھنے کے لیے بے چین رہتے ہیں؟ اس وقت کئی چینل تو محض میچ دکھاتے ہیں اور کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر ٹین اسپورٹس (Ten Sports) اسٹار اسپورٹس (Star Sports) اور دوردرشن اسپورٹس (DD-Sports) وغیرہ۔

اپنی برتری کو ثابت کرنا انسانی فطرت میں شامل ہے، کھیل کود میں کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔لوگ اپنی زندگی کی بے شمار ناکامیوں کو کھیل میں جیت دیکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اپنے درد و غم بھول جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کھیل کود میں اتنی دلچسپی ہونے میں میڈیا نے بھی بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

23.16 اشتہار

اشتہار کا الگ سے کوئی پروگرام نہیں ہوتا ہے لیکن اشتہار ٹیلی ویژن کے تقریباً تمام پروگراموں کا ایک لازمی جز ہوتے ہیں جو کسی پروگرام سے پہلے، بعد اور پروگرام کے درمیان نشر ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن چونکہ عوامی ذرائع ترسیل کا سب سے طاقت ور ذریعہ ہے اس لیے ہر کوئی چاہے وہ پرائیویٹ کمپنی ہو، کوئی حکومت ہو، کوئی ادارہ ہو، یا فرد ہو اپنی بات کو ایک وسیع عوام تک پہنچانے کے لیے ٹیلی ویژن پر اشتہار کا سہارا لیتا ہے۔ ٹیلی ویژن ایک مہنگا میڈیم ہے۔اس کے لیے کافی مالیہ درکار ہوتا ہے جبکہ ٹیلی ویژن چینل کی آمدنی کا واحد ذریعہ اشتہار ہی ہوتے ہیں۔ یہ اشتہار پرائیویٹ کمپنیوں کے ہی نہیں ہوتے ہیں سرکاری پالیسی اور سماجی ترقی کے بھی ہوتے ہیں۔ ایسے اشتہارات اکثر حکومت کی طرف سے جاری کیے جاتے ہیں۔

اشتہار کا سب سے بڑا ذریعہ نجی کمپنیاں ہی ہیں جو اپنی اشیا کو سب سے بہترین ہونے کا دعویٰ پیش کرتی ہیں۔ اشتہار اس خوبصورتی سے تیار کیے جاتے ہیں کہ ان کے بیشتر دعوے اگر غلط بھی ہوں تو وہ اشیا لوگوں کے ذہنوں میں دھیرے دھیرے گھر کر لیتی ہیں۔ اشتہار کا وقت بہت کم ہوتا ہے اکثر 10, 20 یا 30 سیکنڈ کے ہوتے ہیں اور اتنے کم وقت کے اشتہار کی نشریات کے کئی کئی لاکھ روپے پڑتے ہیں۔ اس لیے سب سے بہترین تخلیقی ذہن اشتہار بنانے میں کارفرما ہوتے ہیں اور ہر شعبے کے ماہرین ان اشتہاروں میں کام کرتے ہیں۔ اشتہاروں کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی ضروریات کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ انسان ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی جائز یا ناجائز طریقے کو اپنا رہا ہے جس سے سماج میں بہت سی برائیاں پھیل رہی ہیں۔

ٹیلی ویژن پر اشتہار کی حیثیت کو ایک لطیفہ کے ذریعہ بہت بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ دو دوست بہت دنوں بعد ملتے ہیں۔ ایک دوست دوسرے سے اس کے بیٹوں کے بارے میں پوچھتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ میرا ایک بیٹا ایم۔اے۔ پاس ہے اور دوسرے نے بی۔ایس۔سی۔ کی ہے لیکن تیسرے کا پڑھائی میں دل نہیں لگا اور وہ ایک نائی کی دکان چلاتا ہے۔ یہ سن کر دوست کہتا ہے کہ تمھارا تیسرا لڑکا تو بہت نالائق نکل گیا ایسے لڑکے کو تو گھر سے نکال دینا چاہیے۔اس پر دوست نے کہا آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں لیکن کیا کروں وہ پڑھے لکھے تو بے روزگار ہیں گھر کا خرچ تو نائی کی دکان والا لڑکا چلاتا ہے۔ ایسے میں اس کو گھر سے کیسے نکال سکتا ہوں؟ کچھ یہی صورت حال اشتہاروں کی ہے۔ اشتہار ٹیلی ویژن کا سب سے نالائق بیٹا ہے لیکن ٹیلی ویژن کی آمدنی اشتہاروں سے ہی ہوتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دو ایسے چینل کے نام بتائیے جن پر مذہبی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔
2. فیشن شو کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

23.17 خلاصہ

ٹیلی ویژن پروگراموں کی نوعیت میں بہت انفرادیت اور رنگا رنگی ہے۔ لیکن اس جائزے سے ایک بات واضح ہے کہ ٹیلی ویژن پر بنیادی طور پر چار قسم کے پروگرام ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو معلوماتی اور فکری ہوتے ہیں۔ اس نوعیت کے پروگراموں میں خبریں، حالات حاضرہ پر مباحثے، دستاویزی

فلمیں، ماحولیاتی پروگرام، تعلیمی پروگرام، بچوں کے پروگرام اور خواتین کے پروگرام شامل ہیں۔ یہ پروگرام جہاں ایک طرف ناظرین کے علم میں اضافہ کرتے ہیں وہیں دوسری طرف ان کی فکری گرہیں بھی کھلتی ہیں اور ان کی فکر کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ دوسری قسم ان پروگراموں کی ہے جو بنیادی طور پر تفریح اور تہذیب کے ہیں۔ اس نوعیت کے پروگراموں میں ٹیلی ڈراما، ٹیلی فلم، ٹی وی سیریلز، فلمی پروگرام، تہذیبی پروگرام، مذہبی پروگرام، مقابلے اور انعام کے پروگرام اور فیشن پر مبنی پروگرام شامل ہیں۔ تیسری قسم کھیل کود کے پروگراموں کی ہے جو مختلف میچوں کی live Commentary پر مبنی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ان سے فکر و علم میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا ہے اور نہ تو تہذیب سے کچھ خاص تعلق ہے۔ البتہ تفریح ہی ان پروگراموں کا مقصد ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں کی چوتھی قسم اشتہاروں کی ہے ظاہر ہے اشتہاروں کی نوعیت ٹیلی ویژن پر باقی پروگراموں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اشتہار کا اپنا کوئی پروگرام نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ تمام پروگراموں کے دوران نشر ہوتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر خبریں، فلمی پروگرام، کھیل کود اور ٹی۔ وی۔ سیریلز سب سے زیادہ دیکھے جاتے ہیں۔ ان چاروں میں مقبولیت کی درجہ بندی کا کام آسان نہیں ہے اور حتمی فیصلہ کرنا تو تقریباً ناممکن ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ چاروں پروگرام دوسرے پروگراموں کے مقابلے میں زیادہ دیکھے جاتے ہیں۔

23.18 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ہندستان میں ٹیلی ویژن کے ارتقا پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. بچے کس قسم کے پروگرام دیکھنا پسند کرتے ہیں؟ تفصیل کے ساتھ لکھیے۔
3. ٹی۔ وی۔ سیریلس سے آپ کیا سمجھتے ہیں۔ ٹی وی پر دکھائے جانے والے فلمی پروگراموں کا احاطہ کیجیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ٹیلی ویژن پر آنے والے اشتہاروں کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
2. خبریں ٹیلی ویژن کے مقبول ترین پروگراموں میں سے ایک ہیں؟ اپنی رائے لکھیے۔
3. دستاویزی فلموں سے کیا مراد ہے؟ مثال کے ساتھ واضح کیجیے۔
4. ٹیلی ویژن پر کون کون سے تہذیبی پروگرام دکھائے جاتے ہیں؟ ان کے بارے میں لکھیے۔

23.19 فرہنگ

ابلاغ	پہنچانا، بھیجنا	نشریات	ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام
ارتقا	اوپر چڑھنا، بتدریج ترقی	اسکینڈل	شرمناک واقعہ
مفروضہ	فرض کیا گیا	تخیل	تصور، خیال
انہماک	مصروفیت	ترسیل	روانہ کرنا، ارسال کرنا
روداد	وہ تحریر جس میں کارروائی درج ہو	بصری پیکر	جو نظر آتا ہے مراد Visuals
منطق	وہ علم جو عقلی دلائل سے حق اور ناحق میں تمیز کر دیتا ہے، علم دلائل		
اپی سوڈ	قسط، سلسلۂ واقعہ		

23.20 سفارش کردہ کتابیں

اُردو کتابیں:

1. انجم عثمانی — ٹیلی ویژن نشریات (تاریخ-تحریر-تکنیک)'557 لکشمی بائی نگر'دہلی
2. شکیل حسن شمسی — ٹیلی ویژن کی صحافت'405 ٹیگور ہاسٹل'منٹو روڈ'نئی دہلی۔02
3. طارق اقبال صدیقی — الیکٹرانک میڈیا کے نئے رجحانات'نئی دہلی۔
4. آر۔کے۔چیٹر جی — عوامی ترسیل'(مترجم عرفان صدیقی) نیشنل بک ٹرسٹ'انڈیا' نئی دہلی۔
5. ڈاکٹر شاہد حسین — ابلاغیات'ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس'دہلی۔02
6. دیوندر اسّر — عوامی ذرائع ابلاغ'ترسیل اور تعمیر و ترقی'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'نئی دہلی۔66
7. ڈاکٹر کمال احمد صدیقی — ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'نئی دہلی۔66

ہندی کتابیں:

1. اصغر وجاہت — ٹیلی ویژن لیکھن'راج کمل پرکاشن'نئی دہلی۔02
2. متو بھنڈاری — کتھا پٹکتھا'وانی پرکاشن'دریا نئی گنج'نئی دہلی۔02
3. ڈاکٹر جوری مل پارکھ — جن سنچار مادھیموں کا سماجک چرتر'انامکا پبلشرس'دہلی52
4. سدیش بچوری — میڈیا اور ساہتیہ'راج سوریہ پرکاشن'دہلی-53

English Book:

1. Keval J. Kumar, Mass Communication in India,Jaico Publishing House, Bombay-23

اکائی 24 : ٹیلی ویژن اور اُس کی اہمیت

ساخت

24.1	تمہید
24.2	ٹیلی ویژن کا آغاز
24.3	ہر درجے کے لوگوں کا میڈیم
24.4	نظر آنے والا میڈیم
24.5	پبلسٹی کا میڈیم
24.6	جمہوری میڈیم
24.7	عوام کا میڈیم
24.8	گھر کا میڈیم
24.9	نئے فن کاروں کا میڈیم
24.10	تفریح کا میڈیم
24.11	ردعمل کا میڈیم
24.12	کلوزاپ کا میڈیم
24.13	قربت بڑھانے کا میڈیم
24.14	مزید چند نکات
24.15	خلاصہ
24.16	نمونہ امتحانی سوالات
24.17	فرہنگ
24.18	سفارش کردہ کتابیں

24.1 تمہید

ٹیلی ویژن ترسیل کا ایسا ذریعہ ہے جس میں ہم تک پہنچائی جانے والی تمام چیزیں چلتی پھرتی ہوئی شکل میں نظر آتی ہیں۔ ریڈیو سے ہم کسی بھی پیغام یا پروگرام کو صرف سن سکتے ہیں لیکن ٹیلی ویژن پر ہم سن بھی سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں۔ ریڈیو میں صرف ایک حس یعنی سماعت کام کرتی ہے۔ جبکہ ٹیلی ویژن میں سماعت کے ساتھ ساتھ بصارت کا بھی رول ہوتا ہے۔ چونکہ ٹیلی ویژن میں سنا بھی جاسکتا ہے اور دیکھا بھی جاسکتا ہے اس لیے یہاں ترسیل کے ذریعے دیا جانے والا پیغام موثر طریقے سے مرسل الیہ تک پہنچتا ہے اور یہاں ترسیل کے کامیاب ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ٹیلیویژن کو بہتر میڈیم اس لیے بھی مانا جاتا ہے کیونکہ ماہر نفسیات کے مطابق دیکھی جانے والی چیز سنی جانے والی چیز کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک ذہن میں محفوظ رہتی ہے۔

پہلے اپنی باتوں کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ صرف الفاظ تھے۔ ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن کے آجانے کے بعد اپنی باتوں کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ان ذرائع کا استعمال کیا جانے لگا۔ اب ایک نیا عہد تھا جب الفاظ کتابوں کے اوراق سے نکل کر کھلی ہوا میں سانس لینے لگے تھے۔ اب کسی طرح کی

جانکاری یا علم کو حاصل کرنے کے لیے کتابوں تک محدود رہنے کی مجبوری ختم ہوگئی تھی۔ جان۔ایل بیرڈ (John. L. Baird) کے ذریعہ ٹیلی ویژن کے ایجاد ہونے کے بعد کتاب کے علاوہ دنیا بھر کی معلومات حاصل کرنے کا ایک اور موثر ذریعہ دنیا کے سامنے آ گیا تھا اور ساری دنیا نے اس میڈیم کا پوری گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ امریکہ اور یورپ میں یکے بعد دیگر ٹیلی ویژن اسٹیشنس قائم کیے گئے اور پھر تقریباً پوری دنیا میں ٹیلی ویژن کی دھوم مچ گئی۔

24.2 ٹیلی ویژن کا آغاز

ٹیلی ویژن کی ابتدا سب سے پہلے امریکہ میں ہوئی، جہاں تیسری دہائی میں باقاعدہ طور پر ٹی۔ وی اسٹیشن قائم ہوا اور پروگرامس نشر ہونے شروع ہوئے۔ اس کے بعد لندن میں ٹی۔ وی اسٹیشن قائم ہوا اور وہاں بھی ٹی۔ وی پروگرام دکھائے جانے لگے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگر امریکہ اور یورپی ممالک کے کئی شہروں اور کناڈا اور جاپان میں بھی ٹی۔ وی اسٹیشن قائم کیے گئے اور یہ رواج کچھ اس طرح بڑھا کہ چند ہی برسوں میں دنیا کے کئی ملکوں میں ہزاروں ٹی۔ وی اسٹیشن قائم ہوگئے۔ اور اسی تناسب سے لوگوں کے گھروں میں ٹی۔ وی سیٹ خرید لیے گئے۔

ہندستان میں ٹی۔ وی دوسرے ممالک کے مقابلے میں دیر سے آیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے لوگوں کو یہ خوف تھا کہ کہیں ٹیلی ویژن ہندستان کے مہذب لوگوں کو ان کی تہذیب اور سماجی قدروں سے دور نہ کردے۔ لیکن بہر حال ٹیلی ویژن کی کچھ افادیت بھی تھی، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ یہ سوچ کر ٹی۔ وی اسٹیشن قائم کر دیا گیا کہ یہ لوگوں تک تعلیم پہنچانے کا موثر اور معتبر ذریعہ ہوگا۔

24.3 ہر درجے کے لوگوں کا میڈیم

ہندستان میں جب ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم ہوگیا تو ایک ایک کر کے لوگوں کے گھروں میں ٹی۔ وی بھی خریدے جانے لگے۔ پہلے کسی امیر آدمی کے یہاں یا کسی کالج یا یونیورسٹی میں ایک ٹیلی ویژن ہوتا تھا اور آس پاس کے لوگ وہاں اکٹھا ہو کر ٹی۔ وی دیکھتے تھے۔ مقبولیت کچھ یوں بڑھی کہ جو انسان بھی ٹیلی ویژن خریدنے کی استطاعت رکھتا تھا اُس نے ٹیلی ویژن ضرور خریدا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ جھگی جھونپڑی بستیوں تک میں ٹیلی ویژن کے انٹینا اور کیبل کا جال نظر آتا ہے۔ یعنی اب ٹیلی ویژن ہر درجے کی تفریح، معلومات اور شوق کا میڈیم بن گیا ہے۔

ٹیلی ویژن کی آمد اور اس کی کامیابی کی تین بڑی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ اس کے ذریعے بھیجے جانے والے پیغام کو پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ بغیر پڑھے لکھے لوگوں تک بھی پہنچایا جانا ممکن ہوگیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے ذریعہ کسی خبر یا کسی جانکاری کو فوری طور پر ناظرین تک پہنچایا جاسکتا تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ٹیلی ویژن میں کمپیوٹر گرافکس، چارٹ، اینی میشن اور مختلف کیمرہ کے استعمال سے دی جانے والی جانکاری کو بہت ہی دلچسپ بنایا جاسکتا تھا۔ یہ وہ تمام وجہیں تھیں جن کی وجہ سے ٹیلی ویژن نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی اور آج پوری دنیا میں ٹیلی ویژن کے چاہنے والے موجود ہیں۔

ٹیلی ویژن ایک نیا میڈیم ہے جو اسٹیج، ریڈیو اور فلم کے بعد وجود میں آیا۔ چنانچہ اس نے ان تینوں میڈیم سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا۔ اس نے اسٹیج سے نقل و حرکت۔ فلم سے کیمرہ اور ریڈیو سے مائیکروفون کے استعمال کو اخذ کیا اور پھر ایک بھرپور اور توانا شکل میں ہمارے سامنے آیا۔

ٹیلی ویژن کی پہنچ آج ملک کے کونے کونے میں ہے۔ سٹیلائیٹ کی مدد سے ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے پروگرام یا خبروں کو دور دراز کے علاقوں تک پہنچایا جانا ممکن ہوگیا ہے۔ کسی ایک خبر کو محض چند منٹوں میں ملک کے کونے کونے میں پہنچایا جاسکتا ہے۔ ایک طرح سے ٹیلی ویژن نے پیغام پہنچائے جانے کے معاملے میں دوری اور وقت کے تصور کو مٹا دیا ہے اور اب پوری دنیا ایک گاؤں کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اب کوئی بھی انسان خواہ وہ ملک کے کسی حصے میں ہو، ملک میں ہونے والی کسی بھی نقل و حرکت سے بے خبر نہیں ہے۔ ٹیلی ویژن کے ذریعہ معلومات حاصل کرنے کے لیے تعلیم یافتہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ یہاں کوئی جانکاری حاصل کرنے کے لیے صرف آنکھ اور کان کی ضرورت پڑتی ہے۔ کتاب میں چھپے ہوئے الفاظ کی نہیں۔

ٹیلی ویژن پر وہ چیزیں دیکھنا بھی ممکن ہوگیا ہے جو عام طور سے ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ جیسے ماڈرن تکنیک والے کیمرہ کے استعمال سے ہم چاند، ستاروں، سمندر کی تہوں اور زمین کے اندر ہونے والی نقل و حرکت کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن نے معلومات کی دنیا میں ایک انقلاب سا

لا دیا ہے۔اور ہمارا سماج ایک مکمل علمی سماج بن گیا ہے۔اب انسان کی حیثیت کسی خطے یا ملک کے شہری کی نہیں بلکہ دُنیا کے ایک شہری کی ہوگئی ہے اور پوری دنیا اس کا شہر ہوگیا ہے۔

24.4 نظر آنے والا میڈیم

ٹیلی ویژن کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہاں چیزیں نظر آتی ہیں اور نظر آنے والی چیزیں پڑھی یا سنی جانے والی چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ پراثر ہوتی ہیں اور زیادہ سچی معلوم پڑتی ہیں۔مثال کے طور پر کسی بڑی تقریب' کسی بڑے قدرتی حادثے یا دو گروہوں یا ملکوں کے درمیان ہونے والے تصادم کے بارے میں اخباروں یا رسالوں میں پڑھنے سے اتنا زیادہ اثر نہیں پڑے گا جتنا ان حادثوں سے متعلق چلتی پھرتی تصویروں کو ٹیلی ویژن پر دیکھنے سے ہوگا۔ٹیلی ویژن دیکھے جانے والا میڈیم ہونے کی وجہ سے اتنا زیادہ موثر ہوگیا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے ذہن کو ایک خاص سمت میں موڑنا آسان ہوگیا ہے۔ٹیلی ویژن ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے انقلاب بھی لایا جاسکتا ہے اور حکومتیں بھی بدلی جاسکتی ہیں۔اس کے ذریعے کسی سماج کی تشکیل بھی کی جاسکتی ہے اور کسی سماج کو تہس نہس بھی کیا جاسکتا ہے۔آج پوری دنیا میں انتخابات کے دنوں میں اپنے نظریات اور خیالات و افکار کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے اور عوام کے ذہن کو اپنی طرف موڑنے کے لیے ٹیلی ویژن کا استعمال ہو رہا ہے۔خواہ انگلستان کا الیکشن ہو یا ایران اور عراق' امریکہ اور ویتنام کی جنگ ہو' خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے سب نے ٹیلی ویژن کا استعمال کیا ہے۔

24.5 پبلسٹی کا میڈیم

کسی بھی طرح کی پبلسٹی کے لیے بھی ٹیلی ویژن اہم رول ادا کرتا ہے۔آج کل تو کسی فلم کی کامیابی کا دارومدار اس کی پبلسٹی پر ہوتا ہے۔فلم بہت اچھی نہ بھی ہو تو محض پبلسٹی کی بنا پر کبھی کبھی فلم کامیاب ہو جاتی ہے۔کسی بھی پیداوار (Product) کو عوام سے متعارف کرانے اور اُس کی فروخت میں اضافہ کرنے کے لیے اشتہارات کی مدد لی جاتی ہے۔اور آج اشتہارات کا سب سے موثر ذریعہ ٹیلی ویژن ہے۔کسی سیاسی رہنما' فلم اسٹار یا سماجی کارکن کی امیج کو بنانے میں بھی ٹیلی ویژن بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔یہ راتوں رات کسی کو مقبول بھی کر سکتا ہے اور اس شخص کے خراب پہلو کو اجاگر کر کے اس کی امیج کو گرا بھی سکتا ہے۔

ٹیلی ویژن تاجروں کے لیے بھی بہت ہی مفید میڈیم ہے۔اس کے ذریعے اپنی کمپنی کے ذریعے تیار کی گئی چیزوں کا اشتہار دے کر ملک کے کروڑوں لوگوں کو اس کی افادیت کے بارے میں جانکاری دے دی جاتی ہے اور ملک کے کونے کونے میں لوگ اس چیز کو خرید کر اس کا استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

24.6 جمہوری میڈیم

ٹیلی ویژن معلومات کے علاوہ تفریح کے بھی بے پناہ لوازمات فراہم کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر درجہ' ہر سوچ اور ہر ذوق کے لوگ ٹی وی دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اپنی پسند سے متعلق پروگرام کے بھرپور مزے اٹھاتے ہیں۔اسپورٹس سے جڑے ہوئے لوگ اپنی پسند کے کھیل دیکھتے ہیں۔تیج تہوار اور کلچر میں دلچسپی لینے والے لوگ ایسے ہی پروگرام دیکھتے ہیں' سیر و تفریح کرنے والے لوگ ٹریول شوز دیکھتے ہیں۔فیشن کا ذوق رکھنے والے لوگ فیشن سے متعلق پروگرام دیکھتے ہیں اور عام جانکاری حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے لوگ کوئز پروگرام دیکھتے ہیں' طرح طرح کے کھانے بنانے کے طریقے سیکھنے میں دلچسپی رکھنے والے لوگ کوکری شوز دیکھتے ہیں اور سماج میں ہونے والے جرائم کی معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے لوگ ''سنسنی'' اور ''جاگتے رہو'' جیسے جرائم پر مبنی پروگرامس دیکھتے ہیں۔غرض یہ کہ ہر طرح کا شوق رکھنے والے لوگوں کے لیے ٹی وی پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔اس طرح کے پروگرام ناظرین کو جانکاری دینے کے ساتھ ساتھ انہیں سماج میں ہونے والی برائیوں سے دور رہنے کی تلقین بھی کرتے ہیں اور مجرموں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی ترکیبیں بھی بتاتے ہیں۔یہی سب وجہیں ہیں جن کی وجہ سے ٹیلی ویژن کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے اور ٹیلی ویژن پروگرام دیکھنے والے

لوگوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔لہٰذا ہر سطح پر مقبولیت کے پیش نظر اسے ایک جمہوری میڈیم بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

24.7 عوام کا میڈیم

ٹیلی ویژن پر کچھ ایسے پروگرام بھی آنے لگے ہیں جن میں پریزنٹر (Presenter) براہ راست ناظرین سے مخاطب ہوتا ہے۔وہ ناظرین کو اس پروگرام کا حصہ بنالیتا ہے۔اس طرح کے پروگرام معلومات عامہ' سوال و جواب کے مقابلے اور جرائم سے تعلق رکھتے ہیں۔پریزنٹر ایسے پروگرام کے ذریعے مجرم کو پکڑنے میں ان کی مدد بھی لیتا ہے۔یہ بات ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کو بہت اچھی لگتی ہے اور ان کا رتبہ خود ان کی اپنی نظروں میں بڑھ جاتا ہے۔ نتیجتاً ٹیلی ویژن پروگرام دیکھنے میں ان کی دلچسپی بھی بڑھتی جاتی ہے۔اس طرح کے پروگراموں میں انڈیا موسٹ وانٹیڈ اور ریڈ الرٹ کا نام لیا جاسکتا ہے جہاں پریزنٹر نے اپنے آپ کو عوام سے جوڑ دیا ہے۔لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ ٹیلی ویژن کے اہم ہونے اور مقبول ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے عوام سے ایک رشتہ قائم کیا ہے اور عوام کو اہمیت دی ہے۔اس ضمن میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے پروگرام کو دکھا کر ٹیلی ویژن سماج میں بڑھتے ہوئے جرم کو روکنے اور عوام میں معلومات عامہ کے تئیں دلچسپی پیدا کرنے میں اہم رول ادا کررہا ہے۔

ٹیلی ویژن پر کچھ اس طرح کے پروگرام بھی دکھائے جارہے ہیں۔جن میں شروع میں تو ویلن نما کردار اپنی من مانی کرتے ہیں اور خوب مزے اٹھاتے ہیں لیکن جلد ہی ان کو برے انجام تک پہنچتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔اس سے ناظرین کے اندر ''برے کام کا برا انجام'' جیسا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ برے کاموں مثلاً کسی کو تکلیف دینے' کسی کی دولت ہڑپ لینے' کسی کو دھوکا دینے یا پیسے کا زعم دکھانے اور غرور کرنے جیسی برائیوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ٹیلی ویژن کس کی ایجاد ہے؟
2. ہندستان میں ٹی وی دیر سے کیوں آیا؟
3. ٹی وی کس درجے کے لوگوں میں مقبول ہے؟
4. انتخابات کے دوران ٹیلی ویژن کا کیا استعمال ہوتا ہے؟
5. ٹیلی ویژن کی اہمیت اور مقبولیت کیوں بڑھتی جارہی ہے؟

24.8 گھر کا میڈیم

ٹیلی ویژن کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس پر چل رہے پروگرام کو دیکھنے کے لیے فلم کی طرح تھیٹر میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ گھر بیٹھے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پروگرام دیکھا جاسکتا ہے۔ٹیلی ویژن کی ایک بڑی خاصیت یہ بھی ہے کہ ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے اگر کوئی روزمرہ کا گھریلو کام کرنا ہو تو وہ بھی کیا جاسکتا ہے۔جیسے بہت سے لوگ پروگرام دیکھتے ہوئے ناشتہ یا کھانے کا کام نبٹا لیتے ہیں۔گھر کی عورتیں کئی دفعہ اگر وقت کی کمی ہوئی تو ٹیلی ویژن پر چل رہے اپنے پسندیدہ پروگرام کے ساتھ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتی جاتی ہیں۔جیسے سبزی چھیلنا یا کاٹنا' استری کرنا یا سوئیٹر کی بنائی کرنا وغیرہ۔ٹیلی ویژن پروگرام دیکھنے کے معاملے میں وقت کی پابندی بھی نہیں ہوتی۔کسی بھی وقت ہم ٹیلی ویژن کھول کر پروگرام دیکھ سکتے ہیں۔کسی نہ کسی چینل پر اپنا کوئی نہ کوئی پسندیدہ پروگرام مل ہی جاتا ہے۔

24.9 نئے فن کاروں کا میڈیم

ٹیلی ویژن ایک ایسا میڈیم ہے جو نئے فنکاروں کو ڈھونڈھ نکالنے کا بھی کام کرتا ہے۔ٹیلی ویژن میں نئے فنکاروں کو پروگرام میں حصہ لینے کا

موقع ملتا ہے اوران پروگراموں کے ذریعے ان کی پہچان بنتی ہے اوران کو کام بھی ملنے لگتا ہے۔ ٹیلی ویژن ایک طرح سے فلم تک پہنچنے کی سیڑھی بھی بن گیا ہے۔ اگر کسی اداکار کے اندر قابلیت ہے تو ٹیلی ویژن پروگراموں میں اداکاری کے ذریعے اس کی صلاحیتوں کا مظاہرہ ہوتا ہے' اسے مقبولیت حاصل ہوتی ہے' اُس کی ایک شناخت بنتی ہے اوراس طرح اس کے لیے فلم کی منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

24.10 تفریح کا میڈیم

ٹیلی ویژن تفریح کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ دن بھر باہر سے تھک ہار کر جب انسان شام کو گھر آتا ہے تو دن بھر کی تھکن دور کرنے' ذہن کو آرام دینے اور دل کو بہلانے میں بھی ٹیلی ویژن کا اہم رول ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر تک اپنی پسند کا پروگرام دیکھنے کے بعد انسان کے ذہن کو تھوڑا سا سکون مل جاتا ہے۔ کئی دفعہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر اپنی پسند کا کوئی پروگرام نہیں آرہا ہو تو چینل بدل کر اسکرین پر چلتی پھرتی تصویروں کو دیکھ کر بھی دل بہلا لیا جاتا ہے۔

24.11 ردعمل کا میڈیم

ٹیلی ویژن کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس پر دکھائے جانے والے پروگرام خاص طور پر انٹرویو' لکچر' مباحثہ اور کوئز پر مبنی پروگرام میں عمل کے ساتھ ساتھ ردعمل بھی اسی وقت حاصل کرلیا جاتا ہے اور کیمرہ اس ردعمل کو کلوز اپ میں کیمرہ بند کرتا جاتا ہے۔ اس ردعمل سے یہ جاننے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ مرسل الیہ کو مرسل کی باتیں سمجھ میں آرہی ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ یہ باتیں اسے پسند بھی آرہی ہیں یا نہیں۔ بعض اوقات کسی خبر' کسی سانحے' کسی واقعے کے تعلق سے بھی ٹیلی ویژن رپورٹر براہ راست عوام یا متعلقہ ماہرین کا ردعمل معلوم کرتا رہتا ہے اور ناظرین اُس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

24.12 کلوز اپ کا میڈیم

ٹیلی ویژن میں اسکرین کافی چھوٹا ہوتا ہے اور ٹیلی ویژن پر دکھائے جارہے کیریکٹر اور دوسری اشیا چھوٹی چھوٹی نظر آتی ہیں اس لیے اس میں کلوز اپ اور کلوز شاٹ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے تاکہ دکھائی جانے والی چیزیں آسانی سے نظر آسکیں اور ذہن میں نقش ہو سکیں۔ دور تک پھیلے ہوئے کسی منظر کو کلوز اپ میں دکھانا ممکن نہیں ہوتا اس لیے اس طرح کے منظر کو دکھانے کے لیے لانگ شاٹ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس منظر میں موجود اگر کوئی ایسی چیز ہے جس کو نمایاں کر کے دکھانا ضروری ہے تو پھر اس صورت میں اس چیز کو الگ سے کلوز شاٹ میں دکھایا جاتا ہے تاکہ اس کی اہمیت اجاگر ہو جائے۔

24.13 قربت بڑھانے کا میڈیم

ٹیلی ویژن ترسیل کا ایسا ذریعہ ہے جو گھر اور خاندان کے لوگوں کو ایک ساتھ بیٹھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ زیادہ تر گھروں میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو ٹی۔ وی ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن پر ایسے کئی پروگرام آتے ہیں جو گھر کے ایک سے زائد لوگوں کو پسند ہوتے ہیں۔ اس صورت حال میں عموماً گھر کے سبھی لوگ ساتھ بیٹھ کر اُس پروگرام کو دیکھتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ اس دوران کچھ نہ کچھ بات چیت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح گھر کے لوگوں کو ساتھ بیٹھنے کی عادت بھی پڑ جاتی ہے اور ایک دوسرے سے انسیت بھی بڑھتی ہے۔ ٹیلی ویژن نے گھر کے لوگوں کے درمیان ایک دوسرے کے تئیں دوستی اور رفاقت پیدا کرنے کا بھی کام کیا ہے۔ اب گھر کا کوئی فرد جہاں بھی ہوتا ہے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ پروگرام کو دیکھنے کے لیے وقت پر گھر پہنچ جائے۔ اس بہانے اسے اس بات کا بھی انتظار رہتا ہے کہ گھر کے دیگر لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ ٹیلی ویژن پر آرہے پروگرام کو گھر کے جو لوگ بیٹھ کر دیکھتے ہیں اس میں بھائی' بہنوں کے علاوہ باپ' دادا' دادی اور دوسرے بزرگ بھی ہوتے ہیں اور وہ پروگرام کے دوران یا پروگرام ختم ہونے کے بعد اس پروگرام کے بارے میں اپنی اپنی رائے بھی ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ اس دوران گھریلو باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح ٹیلی ویژن آپس میں قربتوں میں اضافہ کا ایک ذریعہ بن گیا ہے۔

ٹیلی ویژن پر چل رہا پروگرام اگر غیر سماجی موضوع پر ہوتا ہے یا اس میں اخلاق سے گرا ہوا کوئی منظر آجاتا ہے تو اس صورت میں پروگرام کے

بارے میں گھر والوں کا آپس میں مباحثہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ لوگ خود بخود ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھر والے چینل بدل کر دوسرے چینل پر پروگرام دیکھنے لگتے ہیں۔ اس لیے پروگرام کی تیاری کے وقت ہی مخرب اخلاق مناظر کی شمولیت سے احتراز کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور اگر کوئی گندی تصویر دکھانا پروگرام کے موضوع کے لحاظ سے ضروری ہو تو اس صورت میں اس تصویر کو کمپیوٹر پر اس طرح کے گرافک بنا کر دکھانا چاہیے جو گندی بھی نہ لگے اور مقصد بھی پورا ہو جائے۔ ایسے مناظر علامتوں کے ذریعے بھی ظاہر کیے جاتے ہیں۔

24.14 مزید چند نکات

ٹیلی ویژن پروگرام بناتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ جو پیغام مرسل الیہ تک پہنچایا جا رہا ہے' اس کا معیار مرسل الیہ کی سوچ اور اس کے ذہنی معیار سے بہت زیادہ مختلف نہ ہو بلکہ کسی حد تک دونوں کے خیالوں میں مناسبت ضرور ہو۔ اگر ایسا ہو گا تو ترسیل کے کامیاب ہونے کی گنجائش بڑھ جائے گی۔ کسی پیغام یا کسی سبق آموز بات کو براہ راست کہہ دینا بھی کئی دفعہ بے اثر ہو جاتا ہے۔ جیسے اگر کسی سگریٹ پینے والے شخص کو آپ ٹیلی ویژن کے ذریعے براہ راست یہ کہیں کہ آپ سگریٹ پینا چھوڑ دیں تو وہ آپ کی بات نہیں مانے گا لیکن اگر اس بات کو آپ دھیرے دھیرے اس تک پہنچائیں تو شاید وہ آپ کی بات مان سکتا ہے۔ مثلاً پہلے یہ دکھائیں کہ ایک شخص جو سگریٹ کا عادی تھا اس کو سگریٹ پینے سے کوئی بیماری ہو گئی ہے اور وہ بہت تکلیف میں ہے۔ پھر دکھائیں کہ اس کی بیماری بڑھتی جا رہی ہے اور ڈاکٹر نے اس کی بیماری کو لاعلاج بتا کر اس کا علاج کرنا بند کر دیا ہے۔ پھر اس کی موت دکھائیں اور پھر اس کے گھر والوں کو روتے اور بلکتے ہوئے دکھائیں۔ اور اگر یہ سب دکھانے کے بعد آپ مرسلہ الیہ سے یہ کہیں گے کہ سگریٹ پینا بری بات ہے تو شاید وہ آپ کی بات مان سکتا ہے..... ترسیل کی کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی پیغام یا کسی نصیحت کو آپ بار بار دکھائیں۔ تاکہ یہ بات مرسل الیہ کے ذہن نشین ہو جائے۔ انسان کی نفسیات کچھ اس طرح کی ہے کہ اگر ایک ہی بات بار بار یا ایک ہی تصویر بار بار اسے دکھائی جائے تو اس کا اثر اُس پر ضرور پڑتا ہے۔

ٹیلی ویژن کے ذریعہ کسی خبر کو ملک کے کونے کونے میں پہنچایا جا سکتا ہے جبکہ اخبار کی پہنچ اتنی زیادہ نہیں ہے۔ ایک تو گاؤں میں پڑھے لکھے لوگ نہیں ہوتے اور اگر کوئی فرد پڑھنا لکھنا جانتا بھی ہے تو وہاں اخبار دستیاب نہیں ہوتے۔ اسے پاس کے شہر یا قصبہ میں جا کر اخبار لانا ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے ذریعہ کسی خبر کو چند منٹوں میں مرسل الیہ تک پہنچا دیا جاتا ہے جبکہ اخبار کے ذریعے وہ خبر دوسرے دن لوگوں کو ملتی ہے۔

ٹیلی ویژن کے لیے بنائے جانے والے پروگرام کے موضوع کے انتخاب میں بھی کافی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ ایسے کسی موضوع پر پروگرام بنانے سے گریز کرنا چاہیے جس سے گھر کے افراد کے بیچ تنازعہ' دو فرقوں یا دو گروہوں کے درمیان تصادم یا دو ممالک کے درمیان جنگ کی گنجائش بن جائے۔ پروگرام تیار کرنے والے کو ایسے موضوعات ڈھونڈھنے چاہئیں اور اپنی بات کو کچھ ایسے انداز میں پیش کرنی چاہیے جس سے نفرت نہیں بلکہ محبت کا ماحول پیدا ہو' تشدد کا خاتمہ ہو اور لوگوں کے درمیان دوستی اور ہم آہنگی پیدا ہو۔

ٹیلی ویژن عوامی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ یعنی اس کے ذریعہ ہم سماج میں رہنے والے ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں کے لیے پروگرام تیار کرتے ہیں چنانچہ ٹیلی ویژن کے لیے پروگرام بناتے وقت مرسل کے لیے اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ سماج میں رہنے والے ہر طرح کے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل پر ان کی بھرپور نظر ہو۔

سماج میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کتابوں اور رسالوں کے ذریعے جو باتیں پہنچائی جاتی ہیں وہ تعلیم یافتہ لوگوں تک تو پہنچ جاتی ہیں لیکن غیر تعلیم یافتہ لوگ اس تعلیم سے روشناس نہیں ہو پاتے۔ کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں یا نصیحتوں کو عوام تک پہنچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کتابی الفاظ کو عام بول چال کی زبان میں ڈھال دیا جائے اور اگر اس میں کوئی گہری اور فلسفیانہ باتیں کہی گئی ہوں تو اس کو بھی عام فہم بنا دیا جائے اور ایک نئی ٹیلی اسکرپٹ تیار کر کے اس پر ٹیلی ویژن پروگرام تیار کیا جائے۔ اس طرح سے جو باتیں کتابوں کے ذریعہ غیر تعلیم یافتہ لوگوں تک نہیں

پہنچ پاتی ہیں وہ آسانی سے اُن تک پہنچ جائیں گی۔ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آج کے زمانے میں لوگ کتابوں کے مقابلے میں ٹیلی ویژن کے ذریعہ معلومات حاصل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ ٹیلی ویژن میں کوئی بھی معلومات دلچسپی کے سامان کے ساتھ فراہم کرائی جاتی ہے۔جبکہ کتابوں میں صرف کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ ہوتے ہیں اور بس۔

ٹیلی ویژن پروگرام میں دلچسپی کا سامان پیدا کرنے کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔کمپیوٹر گرافکس، چارٹ اور اینی میشن وغیرہ کے استعمال سے پروگرام کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور پر اثر بنایا جاسکتا ہے۔لیکن اس بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ پروگرام میں اتنے زیادہ تفریحی لوازمات نہ پیدا کردیے جائیں جس سے پروگرام کا اصل مقصد ختم ہوجائے اور پروگرام کے ذریعے دیا جانے والا پیغام کہیں کھو جائے۔کیونکہ جو بات مرسل الیہ تک پہنچائی جانے والی ہوتی ہے وہ اہم ہوتی ہے۔

ٹیلی ویژن پروڈیوسر کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کا ہونا لازم ہے تاکہ پروگرام کو دلچسپ، پر اثر اور رنگارنگ بنایا جاسکے۔ایک ہی طرح کا پروگرام دیکھنے سے ناظرین کے اندر اکتاہٹ پیدا ہوسکتی ہے چنانچہ یہ ضروری ہے کہ الگ الگ موضوع پر پروگرام بنایا جائے اور ہر پروگرام کو الگ الگ ترتیب سے بنایا جائے تاکہ پروگرام دیکھنے کے بعد نیا پن اور تازگی کا احساس ہو۔پروڈیوسر کو کوئی ایسی چیز دکھانے سے پرہیز کرنا چاہیے جس کے بارے میں لوگوں کی متضاد رائے ہو یا جس کے بارے میں سب کے متفق ہونے کے امکانات بہت کم ہوں۔کوئی ایسی بات کہنے یا ایسا منظر دکھانے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے جس سے سماج میں بدامنی پھیلنے یا سنسنی پیدا ہونے کا خدشہ ہو۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ٹیلی ویژن نئے فنکاروں کے لیے کس طرح معاون ہے؟
2. ٹیلی ویژن افراد خانہ کو کس طرح ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے؟
3. کمپوٹر گرافکس اور اینی میشن کی ٹی وی پروگراموں کی تیاری میں کیا اہمیت ہے؟

24.15 خلاصہ

اگر ٹیلی ویژن کا استعمال صحیح طریقہ سے کیا جائے تو یہ بے شک ایک دلچسپ اور پر اثر میڈیم بن سکتا ہے اور اپنی باتوں کو لاکھوں، کروڑوں لوگوں تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے اور اس سے تفریح بھی لی جاسکتی ہے۔کسی کی امیج کو بنایا بھی جاسکتا ہے اور بگاڑا بھی جاسکتا ہے۔لوگوں خاص طور سے نوجوانوں کے ذہن کو اچھے سمت میں بھی موڑا جاسکتا ہے اور برے سمت میں بھی۔اس لیے ٹیلی ویژن کی پیش کش سے جڑے لوگوں کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔انہیں ایسی کوئی بھی چیز ٹیلی ویژن پر نہیں دکھانی چاہیے جس سے نوجوانوں کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہو۔ایسی کوئی چیز بھی نہیں دکھانی چاہیے جس سے ملک کی تہذیب، تمدن، سماجی قدریں، رواداری اور ہمارے سماج کی روایتوں پر کوئی آنچ آئے بلکہ ایسی چیزیں دکھانی چاہئیں جن سے ہمارے ملک کی روایتیں مضبوط ہوں اور ہمارا ملک صحیح سمت میں آگے بڑھے۔

24.16 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ٹیلی ویژن کی اہمیت پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔
2. ٹیلی ویژن کی آمد اور ترقی، عام زندگی پر کس کس طرح سے اثر انداز ہوئی ہے؟ مختلف پروگراموں کی روشنی میں بحث کیجیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ٹیلی ویژن کو ہر درجے کے لوگوں کا میڈیم کیوں کہا جاتا ہے؟
2. ٹیلی ویژن پروگرام بناتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے؟
3. کیا ٹیلی ویژن صرف ''تفریح کا میڈیم'' ہے؟ بحث کیجیے۔

24.17 فرہنگ

ترسیل	اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا	سماعت	سننا
حس	محسوس کرنے کی صلاحیت	بصارت	دیکھنا
مرسل	پیغام دینے والا	مرسل الیہ	جس تک پیغام پہنچایا جارہا ہے
ماہرنفسیات	جس نے انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا ہو	موثر	اثرانداز ہونا
افادیت	فائدہ	معتبر	جس پر اعتبار کیا جاسکے
اینی میشن	کمپیوٹر پر تصویروں کو بنا کر ان کو چلتے ہوئے دکھانا	ناظرین	دیکھنے والے

24.18 سفارش کردہ کتابیں

1. Ciaran McCullagh, Media Power
2. Jan R. Hakemulder Fay Acde Jonge P.P. Singh, Mass Media

اکائی 25 : ہندستان میں تعلیمی ٹیلی ویژن

ساخت

25.1		تمہید
25.2		ٹیلی ویژن: آغاز اور مقاصد
	25.2.1	سائٹ (SITE) کی شروعات
	25.2.2	انسیٹ (INSAT) پروگرام
	25.2.3	اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU)
	25.2.4	تعلیمی چینل کی طرف بڑھتے قدم
	25.2.5	گیان درشن پروگرام
	25.2.6	نیا دور
25.3		خلاصہ
25.4		نمونہ امتحانی سوالات
25.5		فرہنگ
25.6		سفارش کردہ کتابیں

25.1 تمہید

فاصلاتی طرزِ تعلیم کے مقبول ہونے اور اس کی ضرورت، اہمیت و افادیت کے پیش نظر تعلیمی ٹیلی ویژن کی اہمیت کافی بڑھ گئی ہے۔ اس شعبے میں وہ ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ آگے مزید امکانات ہیں۔ تعلیمی ٹیلی ویژن اس لیے بھی اہم ہے کہ ایک چھوٹے سے وقفے میں ایک ساتھ بے شمار طلبہ اس سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ روایتی طرزِ تعلیم ہی کی طرح ٹیلی ویژن کے ذریعے دی جانے والی تعلیم میں بھی بہت سے تجربات دکھائے جاسکتے ہیں اور کچھ معاملات میں اور بہتر طریقے سے ان تجربات کو دکھایا جاسکتا ہے۔ کاغذ پر لکھی گئی تحریر کے توسط سے تعلیم کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ناخواندگی رہی ہے۔ ٹیلی ویژن نے اس رکاوٹ کو بڑی حد تک دور کیا ہے اور ہر طبقے، ہر زمرے، نیز ہر عمر کے افراد اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس اکائی میں تعلیمی ٹیلی ویژن کے آغاز، اس کی اہمیت و افادیت اور اس کی موجودہ صورتِ حال کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اپنی معلومات کی جانچ کے لیے سوالات دیے گئے ہیں۔ فرہنگ کے ذریعہ مشکل الفاظ کے معنی کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح آخر میں کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے آپ اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

25.2 ٹیلی ویژن: آغاز اور مقاصد

جان بیئرڈ (John Baird) نے 1924ء میں جب پہلی بار کچھ فٹ کی دوری تک ٹیلی ویژن کے پردے پر متحرک تصویروں کی ترسیل میں کامیابی حاصل کی تبھی سے دنیا بھر میں ٹیلی ویژن کی نشریات نے تین اہم کام کیے ——— یعنی تعلیم، اطلاعات کی فراہمی اور لوگوں کی تفریح۔ مختلف ممالک میں اس کے اطلاق کی نوعیت وہاں کے سماجی، معاشی اور عوام کے ثقافتی معیارات کے مطابق الگ الگ رہی ہے۔ ہندستان میں ٹیلی ویژن کی آمد 15 ستمبر 1959ء کو ہوئی جب ملک کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے نئی دلی میں آل انڈیا ریڈیو دفتر میں ٹیلی ویژن کے پہلے تجرباتی مرکز کا افتتاح کیا۔

اس تجرباتی مرکز کو یونیسکو (UNESCO) کی مالی اعانت حاصل تھی۔ اس کا مقصد تعلیم کے حصول اور اجتماعی ترقی کے ایک وسیلے کے طور پر ٹیلی ویژن کے استعمال سے متعلق امکانات کا پتہ لگانا تھا۔ تجرباتی طور پر دیہی علاقوں میں اس وقت 21 ٹیلی ویژن سیٹ لگائے گئے تھے اور ٹیلی کلب کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس طرح اجتماعی ناظرین کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ لہٰذا تجرباتی ٹیلی ویژن نے ہندستان میں ٹیلی ویژن کے بنیادی کردار کا تعین کیا۔ یعنی عوام کو تعلیم اور اطلاعات کی فراہمی اس کا مقصد ٹھہرا۔

عام دلچسپی کے پروگراموں کی پیش کشی کے کچھ تجربات کرنے کے بعد مئی 1961ء میں آل انڈیا ریڈیو نے فورڈ فاؤنڈیشن کے اشتراک سے ثانوی اسکول کے طلبہ کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ ٹیلی ویژن پروگرام کا آغاز کیا۔ مختلف تعلیمی موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے ''دہلی اسکول ٹیلی ویژن پروجیکٹ'' یا ایس ٹی وی (STV) کے نام سے بیس منٹ کا پروگرام روزانہ دوبار ٹیلی کاسٹ کیا جاتا تھا۔ دہلی کے 150 اسکولوں میں 360 ٹیلی ویژن سیٹ لگائے گئے۔ تقریباً 20 ہزار طلبہ ٹیلی ویژن نشریے سے مستفید ہوتے تھے۔ اس چھوٹے سے تجرباتی اقدام کے ساتھ ہی دلی میں ایک دہائی سے زائد عرصے تک ٹیلی ویژن اپنے ترقیاتی مراحل سے گزرتا رہا۔ 1967ء میں کسانوں کے لیے ''کرشی درشن'' جیسے پروگراموں کا آغاز کرنے کے بعد ناظرین کے ایک خاص زمرے تک ٹیلی ویژن کو تھوڑی اور وسعت حاصل ہوئی۔ اب بھی عوام کو اطلاعات اور تعلیم کی فراہمی ہی پر زور دیا جاتا رہا۔ حالانکہ ٹیلی ویژن کی توسیع کی رفتار ذرا سست رہی۔ 1972ء میں دوسرا ٹیلی ویژن سنٹر ممبئی میں' 1973ء میں سری نگر اور امرتسر میں اور 1975ء میں کولکتہ اور چینائی میں قائم کیا گیا۔

25.2.1 سائٹ (SITE) کی شروعات

ہندستان میں تعلیمی نشریات کی تاریخ میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب یہاں ''سٹیلائٹ انسٹرکشنل ٹیلی ویژن ایکسپیریمنٹ'' (Satellite Instructional Television Experiment - SITE) کا تجربہ کیا گیا۔ جس کا اہتمام یکم اگست 1975ء اور 31 جولائی 1976ء کے درمیان کیا گیا۔ حکومت ہند اور ''نیشنل ایرونا ٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن'' (NASA) امریکہ کے مابین ہوئے ایک معاہدے کے بعد ''اپلی کیشن ٹکنالوجی سٹیلائٹ (Application Technology Satellite - ATS-6) کا استعمال براہ راست 2400 ٹیلی ویژن ریسیوروں کو ٹیلی ویژن سگنل فراہم کرنے کے واسطے کیا جانے لگا۔ ان ٹیلی ویژن ریسیوروں کو ملک کی چھ ریاستوں میں نصب کیا گیا اور ہر ریاست یا اس کے مجموعے میں تقریباً چار سو ٹیلی ویژن سیٹ لگائے گئے۔ ہندستانی خلائی تحقیقی ادارے' انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن (Indian Space Research Organisation - ISRO) کو دیگر باتوں کے علاوہ ان ٹی وی ریسیوروں کو لگانے اور اس کی نگہداشت کی ذمے داری سونپی گئی۔ ہندستانی ٹیلی ویژن یا دور درشن' جو اس وقت آل انڈیا ریڈیو ہی کا ایک حصہ تھا' پروگراموں کے مواد کے لیے بنیادی طور پر ذمے دار تھا۔ یہ پروگرام صبح اور شام مجموعی طور پر چار گھنٹے ٹیلی کاسٹ کیے جاتے تھے۔ اہم تعلیمی موضوعات' زرعی اطلاعات' صحت اور خاندانی منصوبہ بندی' پرائمری تعلیم وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ تفریحی پروگرام مثلاً ڈرامہ' رقص و موسیقی' خصوصی طور پر لوک اور دیہی طرز کے فنون جو ان علاقوں یا باہر سے لیے جاتے تھے' ٹیلی کاسٹ ہوتے تھے۔

25.2.2 انسیٹ (INSAT) پروگرام

''سٹیلائٹ انسٹرکشنل ٹیلی ویژن ایکسپیریمنٹ'' (Satellite Instructional Television Experiment - SITE) کے تجربے کے دوران بہت حد تک توجہ ہارڈ ویر کو ٹسٹ کرنے کی جانب مرکوز رہی۔ اس طبقے کے واسطے جس کے لیے یہ پروگرام تیار کیے جا رہے تھے' ان کی معاشی ترقی اور سماجی تبدیلیوں پر توجہ پوری طرح سے نہیں دی گئی۔ 'سائٹ' (SITE) کے تجربات کے جو بھی نتیجے سامنے آئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوانوں اور بچوں' دونوں میں بیداری پیدا کرنے اور انہیں زیور علم سے آراستہ کرنے میں ٹیلی ویژن کو ایک موثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سیارچہ کو موقوف کر دینے کی وجہ سے ہوئی تھوڑی تاخیر کے باوجود حکومت ہند نے تعلیمی ٹیلی ویژن کو عوام تک پہنچانے کی سمت میں اپنا تعاون اور کوششیں جاری رکھیں۔

1975ء میں ملک کی آبادی 60 کروڑ سے زائد تھی اور اس شرح سے بڑھ رہی تھی کہ صدی کے اختتام تک اس کے ایک ارب تک پہنچ جانے کا

اندازہ لگایا گیا۔اس کے ساتھ ہی، ہندستان ایک کثیر النسل اور ملے جلے معاشرے والا ملک ہے جس کی تین چوتھائی آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔لہٰذا یہ محسوس کیا گیا کہ ملک کی کثیر آبادی کی ضروریات کے مطابق پروگرام پیش کرنا آسان نہیں ہے۔پھر بھی، ہندستان نے اس چیلنج کو قبول کیا۔15 اگست 1982ء ایک یادگار دن تھا جب آنجہانی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے یوم آزادی کے اپنے خطاب میں 'انڈین نیشنل سٹیلائٹ۔ایک اے (Indian National Satellite - INSAT -IA) کے آغاز کا اعلان کیا۔اس طرح ملک گیر قومی نشریاتی خدمات کا افتتاح کیا گیا، جسے نیشنل پروگرام کہا جاتا ہے۔ملک بھر میں ٹیلی ویژن مراکز کو مائیکرو ویو سے مربوط کر دیا گیا۔ایک اور اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ اسی دوران بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن نشریات سے رنگین ٹیلی ویژن نشریات کا آغاز ہوا۔اسی سال ہندستان نے ایشیائی کھیلوں کو براہ راست (Live) ٹیلی کاسٹ کر کے بین الاقوامی نشریاتی معیارات کی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ترسیل کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے بڑے پیمانے پر پہل کی گئی۔1982ء میں 25 فیصد آبادی کا احاطہ کرتے ہوئے ٹرانسمیٹروں کی تنصیب کی رفتار کم از کم روزانہ ایک رہی۔انسیٹ۔ایک بی (INSAT-1B) کو کامیابی کے ساتھ خلا میں چھوڑنے کے بعد ملک کے بنیادی ترسیلی ڈھانچے کو مزید تقویت ملی۔1984ء میں ہندستان نے نشریاتی ذرائع ابلاغ کی تجارت کاری کی ابتدا کی۔اسپانسر اور کمیشن کیے گئے پروگراموں کا آغاز ہوا۔اس سے تفریحی پروگراموں مثلاً رقص و موسیقی، سیریل وغیرہ کے ایک دور کی شروعات ہوئی جس کو اشتہاری محصولات نے تقویت بخشی۔اس رجحان کو فروغ ملنے کے ساتھ ساتھ اسی درمیان تعلیمی ٹیلی ویژن کا مطالبہ بھی برقرار رہا۔15 اگست 1984ء کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ملک گیر کلاس روم (Countrywide Classroom - CWCR) کے ٹیلی کاسٹ کا آغاز کیا جس کے توسط سے یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے معیاری تعلیمی پروگرام فراہم کیا جانے لگا۔ملک بھر کی منتخبہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں میڈیا سنٹر کا قیام عمل میں آیا۔یہ میڈیا سنٹر ایک اعلیٰ اختیاراتی ادارہ کنسورشیم آف ایجوکیشنل کمیونی کیشن (CEC) کے تحت کام کرتے ہیں اور پروگرام کی تیاری کرتے ہیں۔

25.2.3 اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU)

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (IGNOU) 1985ء میں قائم ہوئی جس کا مقصد دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے لوگوں اور مراعات سے محروم افراد کو فاصلاتی طرز پر تعلیم فراہم کرنا ہے۔یونائیٹڈ کنگ ڈم اوپن یونیورسٹی (UKOU) کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نے نصاب پر مبنی پروگرام شروع کیا۔ان پروگراموں میں میڈیا کے مختلف وسائل مثلاً طباعت (Print)، مشاورت (Counselling)، آڈیو (Audio) اور ویڈیو (Video) کا استعمال کیا گیا۔ان پروگراموں کے کیسٹ علاقائی مراکز اور اسٹڈی سنٹر کے نٹ ورک پر بھیجے جاتے ہیں۔اس یونیورسٹی نے 1986ء میں نصاب پر مبنی اپنا خصوصی پروگرام دوردرشن پر ٹیلی کاسٹ کرنا شروع کیا۔

دنیا بھر میں تعلیمی ٹیلی ویژن کے تجربات کی بنیاد پر یہ رائے قائم ہوئی کہ بہتر آواز اور تصاویر کے ذریعے تعلیمی پروگراموں کی فراہمی کے لیے ٹیلی ویژن ایک طاقتور ذریعہ ہے۔یہ ذریعہ ایک جہان کو طلبہ کے مطالعہ میں لاتا ہے اور انہیں زبردست تجرباتی شعور کا احساس دلاتا ہے۔مختلف طریقوں مثلاً گرافکس، زوم، پان، مونتاژ وغیرہ کے استعمال سے وہ اپنے تجربات میں کئی گنا اضافہ کرتا ہے۔ان سب کے باوجود اس پُر اثر وسیلے کے زورِ بیان کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا۔اس میں رکاوٹ یہ ہے کہ طلبہ اطلاعات و معلومات کو آسانی سے بھول سکتے ہیں کیونکہ یہ میڈیم اپنے کنٹرول میں نہیں ہوتا اور ویسے بھی بہت زیادہ اطلاعات اس ذریعے سے نہیں دی جاسکتی۔ٹیلی ویژن کے لیے فیڈ بیک حاصل کرنے اور باہمی ارتباط میں حائل رکاوٹ کو دور کرنے میں ٹیلی کانفرنسنگ مددگار رہی ہے۔مئی 1991ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ہندستانی خلائی تحقیقی ادارے (ISRO) کے اشتراک سے ''نیشنل ٹاک بیک ایکسپریمنٹ'' (National Talkback Experiment) کا اہتمام کیا۔اس پروگرام کے دوران دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے طلبا نے ٹیلی فون کے توسط سے ٹیلی ویژن اسٹوڈیو میں موجود اپنے اپنے موضوعات کے ماہرین سے بات چیت کی۔یہ تجربہ حوصلہ افزا رہا۔لہٰذا اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نے 1993ء میں ملک گیر پیمانے پر اپنے طلبا کے ساتھ ٹیلی کانفرنسنگ کی شروعات کی۔تحقیقی نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ باہمی ارتباط کا طریقہ مفید اور لائق ستائش ہے۔پھر بھی ٹیلی کانفرنسنگ انتہائی غیر لچک دار ذریعہ ہے جس کی کامیابی کے لیے بہت بہتر منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔اب جب کہ اطلاعاتی سپر ہائی وے لچک دار تعلیمی ماحول کے ساتھ ترقی یافتہ کمپیوٹر کے ذریعے آموزشی نظام فراہم کر رہا ہے اور تیار شدہ تعلیمی ویڈیو طلب پر

دستیاب ہے' ایسے عہد میں ایک وسیلے کے طور پر ٹیلی ویژن بڑی تبدیلیوں سے گزر رہا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ٹیلی ویژن کا پہلا کامیاب تجربہ کب کیا گیا؟
2. ٹیلی ویژن کے تین اہم مقاصد کون کون سے ہیں؟
3. ہندستان میں ٹیلی ویژن کی شروعات کب ہوئی؟
4. 'سائٹ' (SITE) کا تجربہ کب کیا گیا ہے؟
5. 'ناسا' سے معاہدے کے بعد تعلیمی ٹیلی ویژن کے شعبے میں کیا فائدے ہوئے؟
6. 'انسیٹ' کے آغاز کا اعلان کب کیا گیا؟
7. 'انسیٹ' کی کامیابی سے ملک کے تر سیلی ڈھانچے کو کس طرح تقویت حاصل ہوئی؟
8. 'ملک گیر کلاس روم' کب شروع ہوا؟
9. اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کب قائم ہوئی؟
10. اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں ٹیلی کانفرنسنگ کی شروعات کب ہوئی؟

25.2.4 تعلیمی چینل کی طرف بڑھتے قدم

ہندستان میں تعلیمی چینل کا مکمل پھیلاؤ ابھی کوسوں دور ہے۔ ایک ارب سے زائد آبادی والے اس ملک میں صرف پندرہ سے پچیس سال کے درمیان کی عمر کے ناخواندہ افراد کی تعداد تقریباً بیس کروڑ ہے۔ تعلیم پر جو خرچ کیا جارہا ہے وہ بہت عرصے تک مجموعی قومی پیداوار کے چار فیصد پر رکا رہا۔ نوے کی دہائی کے شروع میں کمپیوٹروں کا استعمال صرف صفر اعشاریہ صفر ایک فیصد (0.01%) تھا اور انٹرنٹ استعمال کرنے والے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ اب اس صورت حال میں تیزی سے تبدیلی آئی ہے اور فی الحال سات فیصد لوگوں کے پاس ٹیلی فون ہے اور کمپیوٹر بھی صفر اعشاریہ ایک فیصد (0.1%) لوگوں تک پہنچ گیا ہے۔ انٹرنٹ استعمال کرنے والے لوگوں کی تعداد بھی کئی گنا بڑھی ہے۔ ٹیلی ویژن ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی پہنچ آبادی کے ایک بڑے حصے تک' خاص طور پر ناخواندہ افراد تک ہے۔ اور یہ پہنچ تکنیکی لحاظ سے بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔

اس دوران سٹیلائٹ چینلوں میں اضافے کا رجحان بھی قائم رہا۔ کیبل آپریٹر انہیں ڈش انٹینا سے جوڑ دیتے ہیں اور اس کے ذریعے کہیں کہیں دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے گھروں میں پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔ فی الحال ملکی اور غیر ملکی سٹیلائٹ ہندستان میں 30 سے زائد چینل دکھاتے ہیں۔ شہری علاقوں میں ٹیلی ویژن دیکھنے والے پہلے ہی سے مختلف چینلوں کو بدلنے کے لیے ریموٹ کنٹرول کا استعمال کرتے آرہے ہیں۔ پھر بھی بے حد تجارت کاری کا مطلب سستی تفریحات پیش کرنا ہے اور تعلیم پیچھے چلی جاتی ہے۔ اگرچہ نیشنل جیوگرافک' ہسٹری اور ڈسکوری تین ایسے چینل ہیں جو تعلیمی پروگرام فراہم کرتے ہیں لیکن وہ قدرتی مناظر کی عکاسی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ جو لوگوں کی خصوصی تعلیمی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے۔ البتہ 'کون بنے گا کروڑ پتی' جیسے تعلیمی تفریحی پروگرام زیادہ مقبول ہوئے۔ پھر بھی صرف تجارتی اغراض کے حامل پروجیکٹ ہونے کی وجہ سے نصاب پر مبنی تعلیمی پروگرام کی ضرورت کو کوئی چینل پورا نہیں کر پا رہا ہے۔

اسی طرح نشریاتی اوقات کا بھی ایک مسئلہ رہا ہے۔ ناموافق نشریاتی اوقات کی وجہ سے دوردرشن اپنے پروگراموں کی رسائی کو وسعت دینے میں معذور ہو کر رہ گیا ہے۔ چونکہ بہت سے پرائم ٹائم پروگراموں میں تفریحی پروگراموں کو ترجیح دی جاتی ہے لہٰذا تعلیمی نشریات کو علی الصباح یا پھر دوپہر میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بہت سے ان طلبہ کے لیے انتہائی ناموزوں وقت ہوتا ہے جو فاصلاتی طرز پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اسی لیے یہ سوچا گیا کہ ایک خاص تعلیمی چینل شروع کیا جائے جو صرف اور صرف تعلیمی پروگراموں کے لیے ہی وقف رہے۔ لہٰذا 2000ء میں ''گیان درشن'' چینل کا آغاز کیا گیا۔

25.2.5 گیان درشن پروگرام

26 جنوری 2000ء کو ''گیان درشن'' پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کو ایک نوڈل ایجنسی بناتے ہوئے فروغ انسانی وسائل کی وزارت اور پرسار بھارتی نے اس پروگرام کی شروعات کی۔ شروع میں 8 گھنٹے کے پروگرام دکھائے جاتے تھے جن کو تین بار دہرایا جاتا تھا اس طرح یہ چوبیس گھنٹے ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ صحیح معنوں میں گیان درشن ہندستان کا پہلا تعلیمی چینل تھا۔ 26 جنوری 2004ء کو جب ''گیان درشن'' پروگرام کے چار سال مکمل ہوئے تو اسے پوری طرح سے ڈیجیٹل کر دیا گیا۔ اسی طرح اس میں وسعت دیتے ہوئے اسے چھ چینلوں کا ایک تعلیمی گلدستہ بنا دیا گیا۔ یہ چھ چینل ہیں گیان درشن (جی۔ڈی) ایک' جی ڈی۔دو' جی ڈی۔ تین (ایکلویہ)' جی ڈی۔چار (ویاس)' جی ڈی۔پانچ اور جی ڈی۔چھ۔

گیان درشن۔ایک

یہ چینل سب سے پہلے 26 جنوری 2000ء کو شروع کیا گیا تھا۔ مختلف ایجنسیوں کے اشتراک عمل سے اس کا آغاز ہوا۔ گیان درشن کے ذریعے خصوصی زمروں مثلاً پری۔اسکولی بچوں' پرائمری اور ثانوی اسکول کے بچوں' کالج اور یونیورسٹی کے طلبا' کیریئر سے وابستہ مواقع کے متلاشی نوجوانوں' گھریلو خواتین وغیرہ کے لیے عصری اہمیت کے حامل اور اقدار پر مبنی دلچسپ اور اطلاعات سے پُر پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ ملک کے اہم تعلیمی اداروں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی' یونیورسٹی گرانٹس کمیشن' سنٹر فار ایجوکیشنل کنسورشیم' نیشنل سنٹر فار ایجوکیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ (این سی ای آر ٹی) سنٹر فار انفارمیشن اینڈ ایجوکیشنل ٹکنالوجی' ڈائرکٹوریٹ آف اڈلٹ ایجوکیشن' انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی' ٹکنیکل ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور دیگر تعلیمی ترقیاتی تنظیموں سے پروگراموں کی تیاری میں تعاون حاصل کیا جاتا ہے۔

گیان درشن۔دو

یہ گیان درشن کا دوسرا چینل ہے۔ سٹیلائٹ کے توسط سے اس چینل کے ذریعے باہمی ربط قائم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی بھی شخص اسٹوڈیو میں موجود ماہرین سے سوال کر سکتا ہے اور اس کا جواب حاصل کر سکتا ہے۔ اس چینل پر یک طرفہ ویڈیو اور دو طرفہ آڈیو (آواز) کی سہولت دستیاب ہے۔ یعنی وہ پروگرام کے دوران اسٹوڈیو میں بیٹھے ماہرین کی آواز سن سکتے ہیں اور ان کی تصویر بھی ساتھ ساتھ دیکھ سکتے ہیں لیکن سوال کرنے والے کی آواز سن تو سکتے ہیں لیکن اس کی تصویر نہیں دیکھ سکتے۔

گیان درشن۔تین 'ایکلویہ'

یہ تیسرا چینل جنوری 2003ء میں شروع کیا گیا۔ یہ خصوصی طور پر انجینئرنگ کے طلبہ کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ ملک بھر میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو اس چینل کے ذریعہ اعلیٰ معیاری تعلیم فراہم کی جاتی ہے۔ ملک بھر کے سات اہم انجینئرنگ کالجوں کھڑگ پور' ممبئی' کانپور' دلی' گوہاٹی' رُڑکی اور چینئی میں پیش کیے جانے والے نصابی لکچرس کو بھی گیان درشن تین کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ چوبیس گھنٹے کا چینل ہے اور آٹھ متوازی کورسیز اس پر چلائے جاتے ہیں۔

گیان درشن۔چار 'ویاس'

یہ گیان درشن کا چوتھا چینل ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے اس چینل کے ذریعے اعلیٰ معیار کے تعلیمی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ اس چینل کا مقصد اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں معلومات اور اطلاعات کے خلا کو پُر کرنا ہے۔ اور ان لوگوں کو اطلاعات فراہم کرنا ہے جو اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے پیش نظر وہ طلبہ ہیں جو یونیورسٹی اور کالجوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں' خاص طور پر وہ طلبہ جو فاصلاتی طرز پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

گیان درشن ۔ پانچ

گیان درشن کا یہ پانچواں چینل زراعت اور ترقیات سے وابستہ پروگراموں کے لیے مخصوص ہے۔ اس چینل کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تجربہ گاہ' میدانوں میں کام کرنے والے سائنس دانوں اور کاشت کاروں کے درمیان خلا کو پر کیا جائے۔

گیان درشن کا چھٹا چینل عام طور پر ایک معاون کا کام انجام دیتا ہے اور دوسرے پروگراموں کے ٹرانسمیشن میں مدد کرتا ہے۔ اس طرح گیان درشن فاصلاتی تعلیمی پروگراموں کی انجام دہی میں پیش پیش ہے اور تقریباً ہر زمرے کے طلبہ کے لیے تعلیمی پروگرام پیش کرتا ہے۔

دشواریاں

چونکہ پروگرام توسیعی (Extended) ''سی'' بینڈ ٹرانسپونڈر سے ریلے ہوتے ہیں اس لیے اسے دیکھنے کے لیے ایک بڑے ڈش اور ''لونوائز بلاک کنورٹر'' (Low Noise Block Converter) کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا کیبل آپریٹر کئی بار مانگ کے باوجود اس چینل کو عام لوگوں تک نہیں پہنچاتے ہیں۔ اسی لیے ''گیان درشن'' اور اس کے باقی تمام چینل کہیں کہیں ہی دکھائی پڑتے ہیں لیکن امید کی جارہی ہے کہ آنے والے دور میں یہ دشواریاں دور ہو جائیں گی۔

25.2.6 نیا دور

شہروں میں تیس سے زائد چینل دکھانے کی بات پہلے ہی کی جا چکی ہے لیکن اب ڈائرکٹ ٹو ہوم (Direct-to-Home - DTH) 18 انچ کے انٹینا کے ساتھ دستیاب ہے۔ ابھی یہ بہت عام نہیں ہوا ہے لیکن توقع ہے کہ جلد ہی اس کی مقبولیت ہو جائے گی۔ اس سے 150 چینل ملنے لگیں گے۔ ڈائرکٹ ٹو ہوم کا مطلب یہ ہے کہ دور دراز کے علاقوں میں اور گاؤں میں بھی ایک سستی اور چھوٹی ڈش کے ذریعے یہ تمام چینل دستیاب ہوں گے۔

حکومت کا سوچنا ہے کہ تمام 150 چینلوں میں ''گیان درشن ۔ ایک'' کو دکھانا لازمی کر دیا جائے۔ لہٰذا گیان درشن ایک ایسا چینل ہوگا جسے کیبل آپریٹر کو دکھانا قانوناً ضروری ہوگا۔ اس طرح ڈی ٹی ایچ (DTH) کے ذریعہ تعلیمی ٹیلی ویژن کو دور دراز کے علاقوں اور گاؤں تک پہنچانے میں مدد ملے گی۔ ساتھ ساتھ شہروں میں بھی فائبر آپٹکس کے آجانے سے کیبل آپریٹر کو گیان درشن دکھانے میں آسانی ہوگی۔ لہٰذا تعلیمی ٹیلی ویژن کی پہنچ ملک کے دور دراز علاقوں تک ہو جائے گی۔

تعلیمی ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کی تعداد جب بڑھے گی تو معیاری تعلیمی پروگرام دکھانا بھی ضروری ہو جائے گا۔ ڈی ٹی ایچ ہی کی وجہ سے یہ دباؤ بنے گا کہ معیاری پروگرام تیار کیے جائیں۔ چونکہ یہ پروگرام صحیح ڈھنگ سے لوگوں تک نہیں پہنچ پاتے اس لیے اس کی کوالٹی پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ حالانکہ ابھی بھی بہت سے اچھے تعلیمی پروگرام دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن لوگوں کی ضروریات کے حساب سے کوالٹی پروگرام دستیاب کرانا ضروری ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ملک کے تعلیمی اداروں کو بھی کوالٹی سافٹ ویر کی فراہمی کے لیے اب ہاتھ ملانا ہوگا۔ سی ای سی (CEC) محکمہ خلائی ٹکنالوجی (Dept. of Space Technology) تعلیمی تحقیق اور تربیت کی قومی کونسل (NCERT) جیسے اداروں کو اپنے تعلیمی پروگراموں کے معیار کو مزید بہتر کرنا ہوگا اور بیرون ممالک سے بھی اچھے اور معیاری پروگرام خریدتے رہنا ہوگا۔ اس کے علاوہ پرائیوٹ سیکٹر سے بھی امید کی جاتی ہے کہ وہ کوالٹی پروگرام بنانے میں مزید مضبوطی کے ساتھ شامل ہوگا۔ ایسے معیاری پروگرام بنانے کے لیے پرائیویٹ پروڈیوسروں کے پینل کو مخصوص کرنا پڑے گا۔

لہٰذا اب چیلنج پروگراموں کے معیار کا ہے۔ خود روزگار' دیہی ترقیات' قابل بقا زراعتی ترقیات' خطرناک بیماریوں کے بارے میں خصوصی پروگرام ملک کے تعلیمی منظرنامے کو بدل سکتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تعلیم ایک بار پھر آگے آئے گی اور لوگوں کے مسائل کو دور کرنے میں معاون ہوگی۔ رفتہ رفتہ تعلیمی چینل سے آزادانہ چینل کی جانب یہ سفر اوپن اور فاصلاتی تعلیم کے ذریعے تعلیم سے محروم افراد تک پہنچ کر علم کی روشنی پھیلائے گا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندستان میں ناخواندہ افراد کے لیے ٹیلی ویژن موثر طریقے سے پہنچ سکتا ہے۔ ابھی بھی کمپیوٹر اور انٹرنٹ کی پہنچ معاشرے میں کم ہے اور اس میں مالی دشواریاں بھی حائل ہیں۔ لہٰذا ٹیلی ویژن ہی تعلیم کا اہم اور موثر ذریعہ ہے۔ اصل چیلنج تو یہ ہے کہ جب ہم بامعنی طریقے سے عام لوگوں تک پہنچیں گے

تبھی اس خواب کی سچی تعبیر حاصل ہوگی۔ ہمیں ہر طبقے کے لیے پروگرام بنانے ہوں گے اور ہر کورس کے لیے پروگرام تیار کرنے ہوں گے۔ ساتھ ہی انہیں مناسب وقت پر دستیاب کرانا ہوگا۔ طلبہ کو ٹیلی کانفرنسنگ یا دوسرے ذریعے سے سوالات کرنے کا موقع دینا ہوگا۔

اس سمت میں قدم بڑھاتے ہوئے ستمبر 2005ء میں ایجوکیشنل سٹیلائٹ کو خلا میں چھوڑا گیا۔ ایجوکیشنل سٹیلائٹ ایک تعلیمی چینل کی طرح نہیں ہے۔ اس میں ملک بھر میں سیکڑوں تفاعلی نوڈز (Interactive Nodes) اور کئی سو ریسیو اونلی نوڈز (Receive Only Nodes) ہیں۔ ہر نوڈز پر تقریباً ڈھائی سو ٹرمنلس (Terminals) ہیں۔ ان ٹرمنلس کے ذریعہ طلبہ اپنے سوالات ماہرین سے کر سکتے ہیں اور نالج ڈیٹا بیس (Knowledge Database) میں جا کر اپنے سوالات کا جواب حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں تحریری مواد (Text) اور ویڈیو دونوں شامل ہیں۔ اس طرح تعلیمی چینل ایک الگ شکل اختیار کر سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی تعلیمی چینل اور ایجوکیشنل سٹیلائٹ کے اشتراک سے تعلیم گھر گھر پہنچے گی اور ہر فرد کو یا پھر چھوٹے چھوٹے گروپ کو ان کی ضرورت کے عین مطابق دستیاب ہوگی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. پرائیویٹ چینل نصاب پر مبنی پروگرام کیوں نہیں دکھاتے؟
2. تعلیمی پروگراموں کے نشریاتی اوقات کا کیا مسئلہ ہے؟
3. گیان درشن چینل کس طرح کا تعلیمی پروگرام فراہم کرتا ہے؟
4. ''ایکلویہ'' چینل کیا ہے؟

25.3 خلاصہ

دنیا بھر میں فاصلاتی طرز تعلیم کے مقبول ہونے کی وجہ سے تعلیمی ٹیلی ویژن آج ایک اہم ضرورت بن گئی ہے۔ تعلیم کے حصول میں ٹیلی ویژن ایک اہم وسیلہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ 1924ء میں جب پہلی بار ٹیلی ویژن کے پردے پر محرک تصویروں کی ترسیل میں کامیابی حاصل ہوئی تھی تبھی سے دنیا بھر میں ٹیلی ویژن کے تین اہم مقاصد رہے ہیں: (1) تعلیم کا حصول (2) اطلاعات کی فراہمی اور (3) لوگوں کی تفریح۔ اس سمت میں ٹیلی ویژن نے اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔

ہندستان میں اگرچہ ٹیلی ویژن کی شروعات 15 ستمبر 1959ء کو ہوئی لیکن اس وقت سے اب تک ٹیلی ویژن نے مسلسل ترقی کی ہے۔ تعلیمی ٹیلی ویژن کے شعبے میں بھی خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات بھی ہے کہ ہندستان میں ٹیلی ویژن کی شروعات ہی تعلیم کی فراہمی کے مقاصد کے ساتھ ہوئی۔ ہندستان میں تعلیمی ٹیلی ویژن کی ترقی کے اس پورے مرحلے کو آپ درج ذیل نکات کے تحت دیکھ سکتے ہیں:

1) ملک کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے 15 ستمبر 1959ء کو نئی دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کے دفتر میں ٹیلی ویژن کے پہلے تجرباتی مرکز کا افتتاح کیا۔ ٹیلی ویژن پہلے آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ ہی منسلک رہا۔ اس تجرباتی مرکز کو یونیسکو نے مالی امداد فراہم کی تھی اور تجرباتی طور پر شروع میں 21 ٹیلی ویژن سیٹ لگائے گئے تھے۔

2) مئی 1961ء میں فورڈ فاؤنڈیشن کے ساتھ مل کر آل انڈیا ریڈیو نے ثانوی اسکول کے طلبہ کے لیے خاص طور پر تیار کیے گئے ٹیلی ویژن پروگرام کا آغاز کیا۔ اس کے تحت مختلف تعلیمی موضوعات کا احاطہ کیا گیا۔ ''دہلی اسکول ٹیلی ویژن پروجیکٹ'' کے نام سے 20 منٹ کا پروگرام روزانہ دو بار پیش کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ دہلی کے 150 اسکولوں میں 360 ٹیلی ویژن سیٹ لگائے گئے اور شروع میں تقریباً 20 ہزار طلبہ اس سے استفادہ کرتے تھے۔

3) 1967ء میں کسانوں کے لیے ''کرشی درشن'' پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ اس پروگرام کے تحت کسانوں کو زراعت سے متعلق مفید معلومات فراہم کی جاتی تھی۔

4) 1975ء اور 1976ء کے درمیان 'سائٹ' کی شروعات ہوئی۔ تعلیمی نشریات کے سلسلے میں یہ تجربہ ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس تجربے کے تحت ہندستان اور امریکہ کی خلائی ایجنسی 'ناسا' کے درمیان ایک معاہدہ عمل میں آیا جس سے ''اپلی کیشن ٹکنالوجی سٹیلائٹ'' کا استعمال کیا جانے لگا۔ اس سے 2400 ٹیلی ویژن ریسیوروں کو ٹیلی ویژن سگنل فراہم ہونے لگا۔ ملک کی چھ ریاستوں میں تقریباً چار سو ٹیلی ویژن سیٹ لگائے گئے۔

5) بھارتی خلائی تحقیقی ادارے 'اسرو' (ISRO) نے بھی ٹیلی ویژن کے شعبے میں اہم خدمات انجام دیں۔ ٹی وی ریسیوروں کو لگانے اور ان کی نگہداشت کی ذمے داری 'اسرو' کو دی گئی۔ پروگرام صبح اور شام تقریباً چار گھنٹے نشر کیے جانے لگا۔ تعلیم، زرعی اطلاعات، صحت اور خاندانی بہبود نیز پرائمری تعلیم اہم موضوعات ہوا کرتے تھے۔

6) 15 اگست 1982ء سے 'انسیٹ' پروگراموں کا آغاز ہوا۔ اس سے ملک گیر قومی نشریاتی خدمات کی شروعات ہوئی جسے نیشنل پروگرام کہا جاتا ہے۔ 'انسیٹ' کے تجربات بہت کامیاب رہے۔ اسی سال ایشیائی کھیلوں کو براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ اس سے ہندستانی ٹیلی ویژن کو بین الاقوامی معیار حاصل ہوا۔ اسی سال ٹیلی ویژن کی نشریات میں ایک اور اہم تبدیلی یہ واقع ہوئی کہ اب بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن نشریات کی جگہ رنگین ٹیلی ویژن نشریات نے لے لی۔

7) 15 اگست 1984ء سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ملک گیر کلاس روم کے ٹیلی کاسٹ کا آغاز کیا جس کے توسط سے یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے معیاری تعلیمی پروگرام فراہم کیا جانے لگا اور ملک بھر کی منتخبہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں میڈیا سنٹر کا قیام عمل میں آیا۔

8) 1985ء میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اس یونیورسٹی نے ''یونائٹیڈ کنگ ڈم اوپن یونیورسٹی'' کے تجربات سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے نصاب پر مبنی پروگرام شروع کیا۔ یونیورسٹی نے میڈیا کے مختلف وسائل طباعت، مشاورت کے ساتھ ساتھ آڈیو اور ویڈیو کا بھرپور استعمال کیا۔ یونیورسٹی مختلف علاقائی مراکز اور اسٹڈی سنٹر کے توسط سے اپنے پروگراموں کو طلبہ تک پہنچاتی ہے۔ 1986ء میں اس یونیورسٹی نے نصاب پر مبنی اپنا خصوصی پروگرام دوردرشن پر ٹیلی کاسٹ کرنا شروع کیا۔ 1993ء میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نے اپنے طلبہ کے ساتھ ملک گیر پیمانے پر ٹیلی کانفرنسنگ کا آغاز کیا۔

9) فروغِ انسانی وسائل کی مرکزی وزارت نے 26 جنوری 2000ء کو تعلیمی چینل ''گیان درشن'' کی شروعات کی۔ یہ صحیح معنوں میں ہندستان کا پہلا تعلیمی چینل تھا۔ رفتہ رفتہ گیان درشن پروگراموں میں توسیع کی گئی اور اسے چھ چینلوں کا ایک گلدستہ بنا دیا گیا۔

10) سٹیلائٹ چینلوں میں اضافے کا رجحان بھی اس درمیان قائم رہا۔ ملکی اور غیر ملکی سٹیلائٹ ہندستان میں 30 سے زائد چینل دکھاتے ہیں۔ ''نیشنل جیوگرافک''، ''ہسٹری'' اور ''ڈسکوری'' تین ایسے چینل ہیں جو تعلیمی پروگرام فراہم کرتے ہیں پھر بھی وہ خصوصی تعلیمی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے۔ البتہ ''کون بنے گا کروڑ پتی'' جیسے تعلیمی اور تفریحی پروگرام بہت مقبول ہوئے۔ لیکن یہ سبھی پروجیکٹ تجارتی اغراض کے حامل ہونے کی وجہ سے نصاب پر مبنی تعلیمی پروگرام کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے۔ پھر بھی تعلیمی چینل کا یہ سفر ابھی جاری ہے اور امید ہے کہ آئندہ اور زیادہ بامعنی طریقے سے یہ عام لوگوں تک پہنچے گا۔

25.4 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ٹیلی ویژن کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم کے شعبے میں اس کی پیش رفت کا جائزہ لیجیے۔
2. تعلیمی چینل کے آغاز سے اب تک اس میں کیا تکنیکی ترقیاں ہوئیں؟
3. ''گیان درشن چینل'' کے آغاز و ارتقا اور اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالیے۔
4. تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لیے ٹیلی ویژن کس طرح سے مفید ثابت ہو سکتا ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

ان سوالوں کے جوابات 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. ہندستان میں ٹیلی ویژن کے ابتدائی مراحل پر تبصرہ کیجیے۔
2. 'انسیٹ' (INSAT) کیا ہے؟ تعلیمی ٹیلی ویژن کے لیے یہ کس طرح مفید ثابت ہوا ہے؟
3. تعلیمی ٹیلی ویژن کے معاملے میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کی کوششوں کا ذکر کیجیے۔
4. DTH کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

25.5 فرہنگ

فیڈ بیک (Feedback) = پروگرام کا نتیجہ یا ردعمل معلوم کرنا

ٹیلی کانفرنسنگ (Tele conferencing) = ٹیلی ویژن کے ذریعے ایک ساتھ کئی مراکز سے وابستہ افراد سے بات چیت کرنا

اطلاعاتی سپر ہائی وے (Information Super Highway) = اطلاعاتی شاہراہ اعظم: یہ انٹرنٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اپ لنک (Uplink) = جوڑنا

مہم جو تاجر = مختلف قسم کے کاروبار سے وابستہ افراد

انسیٹ ایک ۔اے (INSAT - 1A) = ہندستان میں چھوڑے جانے والے مصنوعی سیاروں کی سیریز کا پہلا مصنوعی سیارہ

ملک گیر کلاس روم (Countrywide Classroom) = ٹیلی ویژن کی مدد سے کلاس روم کی طرح ملک بھر میں تعلیمی پروگرام پہنچانا

ڈی ٹی ایچ (Direct-to-home - DTH) = ڈائرکٹ ٹو ہوم: گھر میں براہ راست پروگرام پہنچانا

باہمی ارتباط	آپس میں ربط قائم کرنا
گیان درشن	ایک تعلیمی چینل
اشتراکِ عمل	کئی افراد یا ایجنسیوں کے ذریعہ مل کر کام کرنا
خلا	خالی جگہ
زمرہ	طبقہ
سٹیلائٹ	مصنوعی سیارہ
خانگی	پرائیویٹ، نجی
متوازی	برابر۔ساتھ ساتھ

25.6 سفارش کردہ کتابیں

1. ارام اورل، آئی — ٹیلی ویژن ان ایجوکیشن (1993ء) اورینٹ لانگ مین لمیٹڈ، چینئی
2. بیٹس، اے ڈبلیو — دی رول آف ٹکنالوجی ان ڈسٹنس ایجوکیشن (1984ء)
3. چندر شیکھر — دوردرشن، کیبل اینڈ سٹیلائٹ ٹیلی ویژن (1992ء)
4. سکسینہ، جی — ٹیلی ویژن ان انڈیا (1996ء)

اکائی 26 : اشتہارات

ساخت

26.1 تمہید

26.2 اشتہارات ۔تاریخی جائزہ

26.3 جدید اشتہارات

26.4 اشتہارات کی ایجنسیاں

26.5 ہندستان میں اشتہارات

26.6 اشتہارات کے ذرائع

26.6.1 اخبارات 26.6.2 ٹیلی ویژن

26.6.3 راست خطوط 26.6.4 ریڈیو

26.6.5 رسائل 26.6.6 بیرون در تشہیری بورڈس

26.6.7 آن لائن اشتہارات

26.7 اشتہارات کی اقسام

26.7.1 مصنوعات یا پیداوار کے اشتہارات 26.7.2 زمرہ بند اشتہارات

26.7.3 عوامی خدمات کے لیے اشتہارات 26.7.4 صنعتی اشتہارات

26.7.5 ادارہ جاتی اشتہارات

26.8 اشتہارات کی پلاننگ

26.9 خلاصہ

26.10 نمونہ امتحانی سوالات

26.11 فرہنگ

26.12 سفارش کردہ کتابیں

26.1 تمہید

اس اکائی میں طالب علموں کو اشتہار اور اشتہارات کی اقسام سے واقف کرایا جائے گا ۔اشتہارات کا ایک تاریخی جائزہ لیتے ہوئے جدید اشتہارات کی صورتحال سے بھی آگاہی حاصل کی جائے گی ۔ترسیل عامہ میں اشتہارات (advertisements) کے رول اور ہمارے ملک میں اشتہارات کی ابتدا اور ارتقا کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

اشتہار (advertisement) عوام کے لیے ایک مخصوص پیغام کی مانند ہوتا ہے ۔اس پیغام کے ذریعہ کسی پیداوار (product)، روزمرہ استعمال کی اشیا، خدمات (services) یا کسی تصور کے متعلق تفصیلات عوام الناس تک پہنچائی جاتی ہے ۔مختلف ممالک میں مختلف طریقوں سے تشہیر کی جاتی ہے ۔تشہیر کے لیے شائع ہونے والے اشتہارات، اخبارات و رسائل میں بہت سی جگہ لے لیتے ہیں ۔جب کہ پوسٹرس (posters) وغیرہ کے ذریعہ گاڑیوں، بسوں، دکانوں اور عام مقامات کی عمارتوں پر بھی اشتہارات پیش کیے جاتے ہیں ۔

اشتہارات کا سب سے اہم مقصد اشیا و مصنوعات کی فروخت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خدمات کی فراہمی اور نظریات کی ترسیل بھی اس کے مقاصد میں شامل ہوتی ہیں۔ مختلف اشیا تیار کرنے والی کمپنیاں اور ادارے اپنی اشیا کو بیچنے کے لیے اشتہارات کا سہارا لیتے ہیں۔ مقامی کاروباری ادارے نئے گاہک بنانے اور اپنی اشیا کی فروخت کو بڑھانے کے لیے مقامی اخبارات و رسائل میں اشتہار شائع کرواتے ہیں اور مختلف پوسٹرس لگواتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی طرح کی اشیا فروخت کرنے والی کمپنیوں کے مابین اشتہارات کے ذریعہ ایک مقابلہ آرائی بھی ہوتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اشتہارات کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ دراصل اشتہار ایک ایسا ارزاں ذریعہ ہوتا ہے جس کی مدد سے تیز رفتاری کے ساتھ تاجر اور ادارے عوام تک پہنچ کر اپنی اشیا یا خدمات وغیرہ کا تفصیلی تعارف کراتے ہیں۔ ورنہ آج کے پھیلے ہوئے شہروں اور دیہاتوں میں انفرادی طور پر گھر گھر جا کر کسی پیداوار یا فراہم کی جانے والی خدمت کا تعارف کرانا ایک مشکل اور وقت طلب کام ہے۔ اگر کسی کام کو انجام دینے میں وقت اور توانائی کی بچت ہوتی ہو اور کام بھی سلیقہ سے بروقت انجام پاتا ہو تو اس سے بڑھ کر کیا سہولت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اشیا و خدمات کی خریداری کے لیے صارفین کو راغب کرنے کے لیے اشتہارات ایک زبردست رول ادا کرتے ہیں۔ آج کے دور میں بے شمار کاروباری ادارے اپنی اشیا کی بڑے پیمانے پر فروخت کے لیے راست طور پر اشتہارات پر انحصار کرتے ہیں۔

کاروباری اداروں سے ہٹ کر مختلف افراد، سیاسی پارٹیاں اور ان کے امیدوار، سماجی تعلیمی ادارے، مخصوص دلچسپیوں کے حامل گروہ بلکہ حکومتی ادارے تک اپنی تشہیر کے لیے اشتہارات کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے اشتہارات زیادہ تر اخبارات میں دیے جاتے ہیں۔ چونکہ لوگ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں لہٰذا ان کو عموماً فوری گاہک مل جاتے ہیں۔ خصوصی دلچسپیوں کے حامل گروہ اپنے کسی مقصد یا تصور کے فروغ کے لیے اشتہارات دیتے ہیں۔ ان میں بعض اشتہارات مخصوص عوام کی خدمت کی غرض سے بھی دیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض ممالک میں لوگوں کو شراب نوشی اور تمباکو نوشی کے نقصانات سے بچانے کے لیے ان اشیا کی خرابیوں کو ظاہر کرنے والے اشتہارات چھاپے جاتے ہیں۔

اشتہارات کے لیے مختلف سہولت بخش ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے۔ لہٰذا ٹیلی ویژن پروگراموں کے وقت کی بہ نسبت وہاں اشتہارات کا وقت زیادہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے سارے اشتہارات سے بہت سی آمدنی ہوتی ہے۔ اس لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو چلانے کے لیے جو اخراجات آتے ہیں ان کی پابجائی اسی آمدنی سے کی جاتی ہے۔ امریکہ کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک جہاں اشتہارات کی بڑی صنعتیں کام کر رہی ہیں ان میں فرانس، جرمنی، جاپان اور برطانیہ شامل ہیں۔

اشتہارات کی صنعت دنیا کے تقریباً ہر ملک میں قائم ہے۔ تاہم بعض ممالک میں تشہیر پر بعض پابندیاں بھی عائد ہیں۔ مثال کے طور پر مغربی یورپی ممالک میں ٹیلی ویژن پر اشتہارات پیش کرنے پر بعض پابندیاں اور حد بندیاں عائد ہیں۔ اسی طرح بعض اقسام کی اشیا کو مشتہر کرنے پر بھی پابندی ہوتی ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ناروے اور سویڈن میں ٹیلی ویژن پر اشتہارات کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے۔

26.2 اشتہارات ۔ تاریخی جائزہ

مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دکانوں پر لگائے جانے والے بورڈ اولین قسم کے اشتہارات تھے۔ آج سے 3000 سال قبل اہل بابل (حالیہ عراق) نے اپنی دکانوں پر ایسے بورڈ آویزاں کرنے کا طریقہ رائج کیا جو دکان میں فروخت ہونے والی اشیا کی طرف رہنمائی کرتے تھے۔ اسی طرح قدیم زمانے میں یونانی اور رومی لوگ بھی اپنی دکانوں کے باہر بیچی جانے والی اشیا سے متعلق تفصیلات لکھ کر لگایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں زیادہ تر لوگ ان پڑھ ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا تاجر ین پتھر، چکنی مٹی یا لکڑی پر اشیا کی علامتیں بنا کر آویزاں کرتے تھے۔ مثلاً جھاڑیوں کی علامت ظاہر کرتی تھی کہ اس دکان میں شراب فروخت کی جاتی ہے۔ اسی طرح جوتے کی علامت موچی کی دکان کو ظاہر کرتی تھی۔ بعض دکاندار ایسے افراد کو مامور کرتے تھے جو پکار پکار کر یا نقارہ بجا کر لوگوں کی توجہ راغب کرتے اور بیچی جانے والی اشیا کے متعلق لوگوں کو بتاتے تھے۔ ان افراد کو منادی یا ڈھنڈورچی کہا جاتا تھا۔ ڈھنڈورچی حکومت کے اقدامات و احکامات کے علاوہ بازار کے ان دکانداروں کی اشیائے فروخت کے متعلق عوام کو واقف کراتے تھے۔

1440ء میں جرمنی کے جوہانس گٹن برگ نے جب دھاتی ٹائپوں کی مدد سے کاغذ پر چھاپنے کا طریقہ ایجاد کیا تو اس سے تشہیر عامہ (mass

(advertising کی راہیں کھلیں۔اس کے بعد ولیم کیکسٹن نے جب انگلستان میں پہلا چھاپہ خانہ قائم کیا تو اس نے 1472ء میں وہاں پہلا اشتہار شائع کیا۔ یہ اشتہار دراصل ایک پوسٹر تھا جس کے ذریعہ کسی کتاب کی فروخت کو مشتہر کیا گیا تھا۔ یہ پوسٹر گرجا کے دروازوں پر چسپاں کیا گیا تھا۔ سترہویں صدی کی ابتدا میں انگلستان میں پہلا باضابطہ اخبار چھاپا گیا۔ جس کے بعد مزید اخبارات نکالے گئے اور ان میں باقاعدگی سے اشتہارات کی اشاعت عمل میں لائی جانے لگی۔ ابتدائی زمانہ میں انگلستان اور امریکہ میں چھپنے والے اشتہارات کی صداقت پر وہاں کی حکومت کی جانب سے بہت کم توجہ دی گئی۔ تاہم بعد میں اس بات کو سنجیدگی سے لیا گیا تا کہ عوام کو دھوکہ کھانے سے بچایا جائے۔

26.3 جدید اشتہارات

چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد نوٹسیں، پوسٹر اور ہینڈ بل وغیرہ چھاپے جانے لگے تو جدید انداز کے اشتہارات کی داغ بیل پڑی۔ اس کے بعد یورپ کے صنعتی انقلاب اور بڑے پیمانے پر شہروں کے پھیلاؤ کے باعث بڑی مقدار میں اشیا کی تیاری عمل میں آنے لگی۔ ان اشیا کے لیے ان کی تشہیر ضروری ہوگئی۔ اس طرح اخبارات میں مسابقتی انداز میں اشتہارات کی اشاعت عمل میں آنے لگی۔

اشتہارات کی ترقی نے ایک طرف صنعتوں کی ترقی میں اہم رول ادا کیا وہیں اخبارات و رسائل کی اشاعت کے فروغ میں زبردست تعاون بھی کیا۔ اس طرح کے اشتہارات کی اشاعت سے ہونے والی آمدنی کے پیش نظر اخبارات و رسائل نے اپنی قیمتیں کم کرنی شروع کیں جس کے نتیجہ میں اخبارات اور رسائل متمول لوگوں کے علاوہ ایک عام آدمی کی دسترس میں آنے لگے۔ نتیجتاً اخبارات کی اشاعت میں زبردست اضافہ ہونے لگا اور اخبارات کا دائرہ ترسیل وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔ اخبارات کی قیمتوں میں کمی کے باعث ایک طرف جہاں ان کی تعداد اشاعت بڑھنے لگی وہیں دوسری طرف مزید نئے اخبارات جاری ہونے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ 1861 تک امریکہ میں تقریباً 5000 اخبارات و رسائل شائع ہونے لگے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1۔ پہلا چھاپہ خانہ کس نے قائم کیا؟

2۔ پہلا اشتہار کب شائع ہوا؟

3۔ اشتہار کا اہم ترین مقصد کیا ہے؟

4۔ 1861ء تک امریکہ میں کتنے اخبارات و رسائل شائع ہوتے تھے؟

26.4 اشتہارات کی ایجنسیاں

ابتدائی دور کی اشتہارات کی ایجنسیاں ایک طرح سے دلال کا کام کرتی تھیں۔ یعنی وہ اخبار میں اشتہار کے لیے جگہ خریدتیں اور اپنا منافع رکھ کر مشتہرین کو فروخت کرتی تھیں۔ اشتہارات کو خود مشتہرین تیار کرتے یا اشتہار لکھنے والوں کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ 1875ء میں امریکہ کے فلاڈلفیا کی این ڈبلیو آئر اینڈ سن کمپنی غالباً دنیا کی وہ پہلی اشتہارات کی ایجنسی ہے جس نے جدید انداز میں تشہیر کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ کمپنی مشتہرین کے اشتہار خود تیار کرنے کے علاوہ اخبارات سے ربط پیدا کر کے اشتہارات کی اشاعت کا بندوبست کرتی تھی۔ اس کے بعد اشتہارات کی ایجنسیاں پیشہ ورانہ نہج سے کام کرتے ہوئے ایک خدماتی صنعت کے طور پر تیزی سے ابھرتی اور ترقی کرتی گئیں۔ 1917ء میں امریکی اسوسی ایشن آف اڈورٹائزنگ ایجنسیز اور اسوسی ایشن آف برٹش اڈورٹائزنگ ایجنسیز کا قیام عمل میں آیا۔ ان ایجنسیوں نے اخبارات کے علاوہ بیرون در (outdoor) تشہیر اور خطوط کے ذریعہ اشتہارات پہنچانے کی بھی ذمہ داریاں سنبھالنی شروع کیں۔ اس سے اشتہارات کا میدان دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔ اسی دوران صنعتی انقلاب کے باعث جہاں ایک طرف مصنوعات بڑے پیمانے پر تیار کی جانے لگیں وہیں دوسری طرف چھاپے خانے کی تکنیکوں میں ترقی کے سبب اخبارات ان مصنوعات کی تشہیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنے کی سعی کرنے لگے۔

26.5 ہندستان میں اشتہارات

ہندستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ یہاں طباعتی ٹکنالوجی میں ترقی کے باعث جیسے جیسے اخبارات ورسائل کا فروغ ہوتا رہا ویسے ویسے اشتہارات کی صنعت بھی ابھرتی گئی۔ ہمارے ملک میں ''بنگال گزٹ'' کے نام سے جنوری 1780ء میں پہلا اخبار شائع ہوا۔ اس کی پہلی اشاعت ہی میں کچھ اشتہارات شامل تھے جو کافی معلوماتی تھے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر تک بھی اشتہارات کا مطلب عموماً عوام کو اطلاع دینا ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد بنگال جرنل نے حکومت کے اشتہارات مفت شائع کرنے کی پیش کش کی۔ اس زمانے میں زیادہ تر جرائد کے پہلے صفحہ پر صرف اشتہارات شائع کیے جاتے تھے۔ اس کے بعد لوگوں کو اشیائے فروخت کی جانب راغب کرنے کے لیے اشتہارات کی اشاعت عمل میں لائی جانے لگی۔ ان اشتہارات میں ان اشیا کی خوبیوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ دعوے بھی کیے جانے لگے کہ بازار میں اس سے اچھی چیز دستیاب نہیں ہوسکتی۔ مزید یہ کہ فروخت کی جانے والی یہ شئے کتنے عرصہ تک کارکرد رہے گی اس کا بھی تیقن دیا جانے لگا۔

انیسویں صدی کے آغاز سے اشتہارات میں شدت آنے لگی اور تاجرین اپنی اشیا فروخت کرنے کے لیے سارا زور لگانے لگے۔ نئی اشیا اور خدمات کی فروختگی کے لیے اخبارات کا سہارا لیا جانے لگا۔ پھر جیسے جیسے تجارتی میدانوں میں ترقیاں واقع ہوتی گئیں ویسے ویسے اشتہارات کا شعبہ بھی تیز رفتار ترقی کرنے لگا۔ 1830ء تک ملک میں تقریباً ایک درجن انگریزی اخبارات شائع ہوتے تھے۔ اس کے بعد صرف بیس برسوں کے اندر اندر یہ تعداد ایک سو تک پہنچ گئی۔ اشتہارات کے ایجنٹ مشتہرین کو اشتہارات تیار کر کے دینے لگے۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جنگ کے لیے فنڈس جمع کرنے کے لیے اشتہارات کا سہارا لیا گیا۔ اس دوران اشتہارات میں عوامی زبان کا استعمال کیا گیا تاکہ عوام کے زیادہ سے زیادہ حلقے تک ان کی رسائی حاصل ہو سکے۔ اس تجربے نے ہندستان میں تشہیر کے پیشہ وروں کو یہ سبق دیا کہ عوام تک زیادہ سے زیادہ پہنچنے کے لیے کون سا طریقہ کارآمد ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں بمبئی میں الائنس اڈورٹائزنگ اسوسی ایشن لمیٹڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اسی طرح 1942ء میں مدراس میں ماڈرن پبلسٹی کمپنی اور کلکتہ میں کلکتہ پبلسٹی کے علاوہ 1925ء میں بمبئی میں سنٹرل پبلسٹی سروس اور ترچناپلی میں اورینٹل اڈورٹائزنگ ایجنسی قائم کی گئی۔ اسی طرح ملک میں برطانوی تشہیری ایجنسیاں بھی قائم کی گئیں۔ جے والٹر تھامپسن نے 1928ء میں کلکتہ میں اور اس کے بعد بمبئی میں اپنے دفاتر کھولے۔ اسی زمانے میں بیرون در اشتہارات کا بھی آغاز ہوا کیونکہ اخبارات کے ذریعہ ایک محدود آبادی تک ہی تشہیر ہو پا رہی تھی۔ 1926ء میں مسٹر آئی۔ ایس۔ ٹیلر نے پبلسٹی سوسائٹی آف انڈیا قائم کی اور ٹرام' کاروباری ڈبوں (کھوکھوں) اور بیرون در جگہوں پر اشتہارات کے طریقہ کا آغاز کیا۔ اس طرح اشتہارات کی ایجنسیاں قائم ہوتی گئیں۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث اشتہارات کے کاروبار میں آئے دن ترقی بھی ہوتی گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ملک کو آزادی ملی۔ لہٰذا ملک میں برطانوی تشہیری ایجنسیاں ہندستانی تاجروں کو بیچ دی گئیں۔ تاہم ایک عرصہ تک ان میں بعض ایجنسیوں نے اپنا تعلق برطانیہ میں واقع اصل ایجنسی سے قائم رکھا اور اب تک بھی وہ اس سے مستفید ہوتی آرہی ہیں۔ حالانکہ برطانوی ایجنسیوں کی جگہ اب ہمہ قومی امریکی ایجنسیوں نے لے لی ہے۔ رنگین طباعت کے آغاز اور ترقی نے اشتہارات کی صنعت کو مزید ترقی دینی شروع کی اور ایجنسیوں نے اپنے گاہکوں کو مزید خدمات فراہم کرنی شروع کیں جس میں اشتہار کی فنکارانہ انداز میں تیاری' مشتہرین کے اشیائے فروخت کے لیے میلے اور نمائش منعقد کروانا' بازار کی ریسرچ وغیرہ شامل تھے۔ 1951ء میں انڈین سوسائٹی آف اڈورٹائزرس اور 1958ء میں سوسائٹی آف اڈورٹائزنگ پریکٹیشنرس کا قیام عمل میں آیا۔ جب کہ 1948ء میں آڈٹ بیورو آف سرکولیشن (ABC) اور 1952ء میں اڈورٹائزنگ ایجنسیز آف انڈیا قائم کیے گئے۔ پچاس کے دہے کے اواخر میں کمرشیل آرٹسٹس گلڈ قائم کی گئی اور اشتہارات کے معیارات کو بلند کرنے کے لیے کلکتہ اور بمبئی میں تشہیری کلب قائم کیے گئے۔ ملک میں ذرائع ابلاغ جیسے ٹیلی ویژن اور کیبل کے آغاز اور ان کی زبردست ترقی کے باعث اشتہارات کی صنعت کو بے پناہ فروغ حاصل ہونے لگا ہے

اپنی معلومات کی جانچ

1۔ ہندستان میں پہلا اخبار کب شائع ہوا؟ اس کا نام کیا تھا؟

2۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جنگ کے لیے فنڈس جمع کرنے کے لیے کس کا سہارا لیا گیا؟

26.6 اشتہارات کے ذرائع

اشتہارات مختلف ذرائع سے عوام تک پہنچتے ہیں۔ان میں اخبارات، ٹیلی ویژن، راست خطوط، ریڈیو، رسائل اور بیرون دربورڈس وغیرہ اہم ہیں۔

26.6.1 اخبارات

دیگر ذرائع ترسیل کے مقابلے میں اخبارات کے ذریعہ اشتہارات کی اشاعت کے بہت سے فوائد ہیں کیونکہ زیادہ تر بالغ افراد اخبار پڑھتے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ فروخت شدنی اشیا اور فراہم شدنی خدمات وغیرہ سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے خواہشمند بھی ہوتے ہیں۔اخبارات میں ایک دن کے اندر راشتہار تیار ہوکر چھپ کر دوسرے دن لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے۔اس طرح اخبارات میں تشہیر کے بل بوتے پر فروخت شدنی اشیا کی فوری مانگ پیدا ہوسکتی ہے۔

26.6.2 ٹیلی ویژن

ٹیلی ویژن پر اشتہارات کی پیش کشی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ آواز کے علاوہ بصری متحرک تصاویر کے ساتھ اشتہارات کو صارفین کے گھر تک پہنچایا جاسکتا ہے۔مشتہرین صارفین کو اپنی اشیائے فروخت کے بارے میں اس طرح سمجھا سکتے ہیں کہ گویا وہ ان کے سامنے بیٹھے ہوں۔ناظرین اپنا پسندیدہ ٹی وی پروگرام دیکھنے کے دوران پیش کیے جانے والے اشتہارات کے مشاہدے سے بچ نہیں سکتے۔

26.6.3 راست خطوط

اس طریقۂ تشہیر میں ورقیے، بروچرس (Brochures) کیٹلاگ اور دوسرا شائع شدہ مواد پوسٹ کے ذریعہ متوقع صارفین تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور انہیں اشیا خریدنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

26.6.4 ریڈیو

ریڈیو پر تشہیر کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنا کام کرتے ہوئے بھی اس کو سنتے رہتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے مقابلے میں ریڈیو پر اشتہارات کم لاگتی ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے مقابلے میں ریڈیو پر اشتہارات کی ایک اور سہولت یہ ہوتی ہے کہ یہاں حواس خمسہ میں صرف سماعت ہی کو کام میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے اور قوت بصارت کے استعمال کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی۔یعنی ریڈیو پر اشتہارات سننے کے لیے سامع کو ہر لحاظ سے اپنی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ ٹیلی ویژن کی صورت میں ہوتا ہے۔

26.6.5 رسائل

ذریعہ تشہیر کے طور پر رسائل کو اخبارات پر ایک لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔اول تو یہ کہ قارئین، رسائل کو فرصت کے اوقات میں پڑھتے ہیں اور رسائل اخبار کی طرح عموماً دوسرے دن ضائع نہیں کیے جاتے بلکہ ان کو ہفتوں اور برسوں بھی رکھ کر پڑھا جاتا ہے۔اس طرح رسائل میں شائع شدہ اشتہارات کی عمر بھی بڑھ جاتی ہے۔دوم یہ کہ زیادہ تر ایک خاندان کے کئی ارکان رسالہ کا مطالعہ کرتے ہیں جس سے تشہیر شدہ شئے کی خریداری کے لیے خاندان کا کوئی نہ کوئی رکن راغب ہوسکتا ہے۔یہی اشتہار شائع کرنے کا عین مقصد ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اخبارات کے مقابلہ میں رسائل میں عمدگی سے اشتہار کی رنگین طباعت ممکن ہوتی ہے جس میں اشیائے فروخت کو زائد تفصیلات کے ساتھ دکھایا جاسکتا ہے۔

26.6.6 بیرون در تشہیری بورڈس

اس قسم کے تشہیری بورڈس کے سامنے سے بار بار گزرنے والے لوگ بار ہا اس کو دیکھتے ہیں اور بورڈ پر مشتہر اشیا کو خریدنے پر راغب ہو سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہمہ رنگی میں پینٹ کیے گئے بڑے بڑے بورڈس آسانی سے اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

26.6.7 آن لائن اشتہارات

انٹرنیٹ کے آغاز اور اس کی روز افزوں ترقی کے ساتھ ساتھ فی زمانہ انٹرنیٹ پر اشتہارات کے ذریعہ کاروبار میں بھی آئے دن ترقی ہونے لگی ہے۔ انٹرنیٹ پر اشتہارات کی پیش کشی کو آن لائن تشہیر (Online advertising) کہا جاتا ہے۔ انٹرنیٹ ایک ایسا واسطہ ہے جس میں تشہیر سے کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ممکن ہے۔ مغربی ممالک میں اس میدان میں ایک اور جدت یہ ہوئی ہے کہ انٹرنیٹ کے ساتھ دوسرے ذرائع ترسیل جیسے ریڈیو پر تشہیر کا تعاون لے کر کاروبار کو مزید ترقی دی جانے لگی ہے اور ایسے طریقے کافی سودمند ثابت ہونے لگے ہیں۔

آج کل مغربی ممالک میں انٹرنیٹ پر اشتہارات کے کاروبار کافی زور پکڑ چکے ہیں کیونکہ وہاں زیادہ سے زیادہ لوگ انٹرنیٹ کی سہولت سے اپنے گھروں اور دفاتر میں استفادہ کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی انٹرنیٹ کا استعمال روزمرہ زندگی میں ہونے لگے گا تو یہاں بھی آن لائن اشتہارات کی پیش کشی کا کاروبار اشیا اور خدمات وغیرہ کی تشہیر کا ایک طاقتور ذریعہ ثابت ہوگا۔

26.7 اشتہارات کی اقسام

تشہیر کی مختلف طریقوں سے درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ ویسے عمومی درجہ بندی میں ان مصنوعات اور خدمات کو مدنظر رکھا جاتا ہے جن کے لیے تشہیر کی جارہی ہوتی ہے۔ اخبارات میں اس کی درجہ بندی عموماً ڈسپلے (display) اور جماعت بند یا زمرہ بند (classified) اشتہارات کے طور پر کی جاتی ہے۔ جبکہ سنیما اور ٹیلی ویژن پر ساکن (still) اور متحرک (live) کے طور پر کی جاتی ہے۔ اشتہارات کے ذرائع کو مدنظر رکھتے ہوئے اشتہارات کی درجہ بندی چھپے ہوئے، الکٹرانک، بیرون دریا دوران سفر (transit) اشتہارات کے طور پر کی جاتی ہے۔

26.7.1 مصنوعات یا پیداوار کے اشتہارات

یہ تشہیر کی سب سے عام قسم ہے۔ اس میں روزمرہ صارفین اشیا کی تشہیر کی جاتی ہے۔ اس میں تیار کرنے والی کمپنی سے زیادہ اس کی مصنوعات پر توجہ دی جاتی ہے۔ اس میں مصنوع کی خوبیوں کو گنا کر اسے سب سے عمدہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ گاہک اسے خریدنے پر آمادہ ہو جائے۔ ایسے اشتہارات مصنوعات یا پیداوار کے متعلق زیادہ گہرائی سے تفصیلات مہیا نہیں کرتے تاہم اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ صارفین کے لیے پیش کیے جانے والے یہ اشتہارات عموماً عوام کے جذبات سے کھیلتے ہیں اور صارفین کو خریداری پر آمادہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔

26.7.2 زمرہ بند اشتہارات

ڈسپلے اشتہارات کے مقابلے میں اس قسم کے اشتہار میں کم سے کم الفاظ میں اور سیدھے سادے انداز میں اشیائے فروخت وغیرہ سے متعلق معلومات دی جاتی ہیں۔ ایک ہی قسم کے اشتہارات کو ایک مشترکہ عنوان کے تحت شائع کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ان کو زمرہ بند یا جماعت بند (Classified) اشتہارات کہتے ہیں۔ اس سے قارئین کو بڑی سہولت ہوتی ہے کیونکہ ایک ہی جگہ ان کی مطلوبہ اشیا یا خدمات وغیرہ کے اشتہارات مل جاتے ہیں۔ مکانات کی فروخت، مکانات کرایہ پر، پرانی اشیا کی فروخت، ملازمت کے لیے اسامیوں کی موجودگی، شادی کے رشتے وغیرہ جیسے بہت سے عنوانات کے تحت زمرہ بند اشتہارات شائع ہوتے ہیں۔ خدمات کے ضمن میں تعلیمی کوچنگ، تعلیمی اداروں میں داخلے، ہوٹل، ہاسٹل وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت اشتہارات چھاپے جاتے ہیں۔

26.7.3 عوامی خدمات کے لیے اشتہارات

ایسے اشتہارات عموماً سماجی خدمات کی فراہمی کے لیے دیے جاتے ہیں۔ان کو اشتہارات برائے فروغ بھی کہا جاتا ہے۔اس قسم کے اشتہارات میں سماجی خدمات جیسے قومی یکجہتی' مذہبی بھائی چارگی' خاندانی منصوبہ بندی' آلودگی سے نجات کے طریقے' معذور افراد کی امداد وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت اشتہارات آتے ہیں۔ایسی تشہیر کا بنیادی مقصد کسی قسم کی اشیا کی فروخت نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ عوام کو مخصوص پیغام دے کر ان میں قوم وسماج کے تئیں مثبت تصورات اور تعمیری خیالات کو فروغ دیا جاتا ہے۔

26.7.4 صنعتی اشتہارات

اس قسم کے اشتہارات میں عموماً مشینوں اور تکنیکی آلات وغیرہ کی تفصیلات دی جاتی ہیں۔ان میں حقائق کو راست طور پر پیش کیا جاتا ہے کیونکہ ایسے اشتہارات کے مخاطب عموماً تکنیکی طور پر خواندہ ہوتے ہیں۔ان میں زیادہ تر صنعتی اداروں سے متعلق تکنیکی عملے کے افراد ہوتے ہیں۔

26.7.5 ادارہ جاتی اشتہارات

ایسے اشتہارات کا مقصد عوام میں کسی ادارے کے مجموعی تاثر کو ابھارنا ہوتا ہے۔اس میں ادارے کے جن امور پر توجہ دی جاتی ہے وہ ہیں ادارے کی جانب سے انجام دی گئی تحقیق' ادارے کی پیش رفت اور معیار کے حصول کے ضمن میں کاوشیں' تعلیمی' کلچرل اور کھیل کود کے میدان میں ادارے کی سرپرستی وغیرہ۔یہاں ادارے سے متعلق معلومات عوام کو فراہم کی جاتی ہیں۔ریاستی حکومت کے اقدامات سے متعلق ایک بہت بڑا ڈسپلے بورڈ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔کسی اخبار میں ریاستی وزیر اعلیٰ کی تصویر کے ساتھ ریاست کی ترقی کی تفصیلات کا اشتہار جو عموماً اخبار کے پورے صفحہ پر شائع کیا جاتا ہے اس قسم کے ادارہ جاتی اشتہارات کے دائرے میں آتا ہے۔

مذکورہ بالا اقسام کے علاوہ اور بھی اقسام کے اشتہارات ہوتے ہیں۔جیسے ٹنڈرس' قانونی نوٹسیں' شیرس (Shares) اور بانڈس (bonds) وغیرہ کے اشتہارات۔ایسے سبھی اشتہارات اخبارات کی ترقی میں بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔

26.8 اشتہارات کی پلاننگ

حالیہ زمانہ میں تشہیر ایک مہنگی صنعت بن گئی ہے۔لہٰذا مصنوعات' اشیا' خدمات یا اداروں کے اشتہارات کی تیاری سے قبل ان کی پلاننگ ضروری ہوتی ہے۔ملک کے معیاری اخبارات ورسائل میں اشتہارات کی شرحیں کافی بلند ہیں۔مثلاً فی زمانہ کسی قومی اخبار کے ایک مکمل صفحہ پر اشتہار کی شرح تین تا چار لاکھ روپے تک ہوسکتی ہے۔ٹیلی ویژن پر مصروف اوقات میں 10 سکینڈ کے اشتہار کے لیے ایک لاکھ روپے تک لگ سکتے ہیں۔اس میں اشتہار کی تیاری کی لاگت شامل نہیں ہے۔لہٰذا اشتہار دینے سے قبل اس کی باضابطہ پلاننگ لازمی ہوتی ہے۔اس پلاننگ میں یہ مدنظر رکھا جاتا ہے کہ اشتہار کا مقصد کیا ہے اور اس میں عوام کو کیا پیام دینا مقصود ہے۔اشتہار کی تیاری اور میڈیا میں اس کی پیش کش پر کتنی لاگت آئے گی' اشتہار خصوصاً کس کے لیے دیا جارہا ہے جیسے بچوں کے لیے' خواتین کے لیے' نوجوانوں کے لیے' معمر افراد کے لیے وغیرہ۔ان تمام امور کو پہلے ہی طے کرلیا جاتا ہے۔اسی لحاظ سے میڈیا اور اس کے پروگراموں کا انتخاب کیا جاتا ہے جس میں کہ اشتہار کو پیش کیا جانا ہوتا ہے۔مزید یہ کہ اشتہار کی زبان' اس کی نمائش اور اس کا وقت وغیرہ بھی پلاننگ میں شامل ہوتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1۔ اشتہارات کے کسی چار ذرائع کے نام لکھیے۔

2۔ سمعی' بصری اور متحرک تصاویر کے ساتھ اشتہارات صارفین کے گھر تک کس ذریعہ ترسیل سے پہنچایا جاتا ہے؟

3۔ انٹرنیٹ پر اشتہارات کی پیش کشی کو کیا کہا جاتا ہے؟

4۔ فی زمانہ کسی قومی اخبار کے ایک مکمل صفحہ پر اشتہار کی شرح کیا ہو سکتی ہے؟

26.9 خلاصہ

ترسیل عامہ میں اشتہارات کا رول براہ راست اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ بالواسطہ طور پر ذرائع ترسیل کی ترقی میں ان کا رول ہے۔ مشتہرین مختلف ذرائع ترسیل جیسے اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ کے ذریعہ اپنی اشیائے فروخت یا خدمات کی فراہمی کے متعلق تشہیر کرتے ہیں۔ ترسیل عامہ کے ذرائع کے فروغ میں اشتہارات کا زبردست تعاون حاصل رہتا ہے۔ اشتہارات کے بغیر اگر کوئی ناشر اخبار چھاپ کر فروخت کرنا چاہے تو اخبار کی قیمت اتنی زیادہ رہے گی کہ اس کو عام آدمی روزانہ خرید نہیں سکے گا۔ لہٰذا اخبارات کے علاوہ رسائل اور ٹیلی ویژن وغیرہ اپنی آمدنی کے لیے اشتہارات پر راست انحصار کرتے ہیں۔ اشتہارات ہی کی وجہ سے اخبار کی قیمت کو کم سے کم رکھا جا سکتا ہے۔ جس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اخبار کی سرکولیشن بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح ترسیل عامہ میں اشتہارات بالواسطہ طور پر بے حد اہم رول ادا کرتے ہیں۔

اشتہارات کے ذریعہ عوام کو مختلف اشیا، مصنوعات، خدمات وغیرہ سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قدیم زمانوں میں دکانوں میں اشیائے فروخت سے متعلق لگائے جانے والے بورڈ اولین قسم کے اشتہارات کے نمونے تھے۔ تین ہزار سال قبل اہل بابل اس قسم کے بورڈ دکانوں پر آویزاں کرتے تھے۔ 1440ء میں جرمنی میں گٹن برگ نے دھاتی ٹائپوں کی مدد سے چھاپنے کی مشین ایجاد کی تو تشہیر کے طریقوں کو بھی فروغ حاصل ہونے لگا اور محدود قسم کی تشہیر، تشہیر عامہ میں بدلنے لگی۔ صنعتی انقلاب کے بعد جب بڑے پیمانے پر مصنوعات تیار ہونے لگیں تو ان کی فروخت کے لیے اشتہارات کی سخت ضرورت پڑنے لگی۔ لہٰذا اشتہارات نے ایک طرف صنعتوں کی ترقی میں تعاون کرنا شروع کیا تو دوسری طرف ذرائع ابلاغ کی ترقی میں بھی معاون کردار ادا کرنا شروع کیا۔

اشتہارات کی ایجنسیاں ذرائع ابلاغ مثلاً اخبارات اور رسائل میں جگہ اور ریڈیو ٹیلی ویژن میں وقت حاصل کر کے مشتہرین کو اپنے منافع کے ساتھ فروخت کرتی ہیں۔ وہ مشتہرین کو اشتہارات کی تیاری میں مدد بھی کرتی ہیں یا پھر خود اشتہار تیار کر کے دیتی ہیں۔ ہندستان میں تشہیر کا آغاز ملک کے پہلے اخبار ''بنگال گزٹ'' کی اشاعت کے ساتھ ہی ہو گیا۔ ابتدائی اخبارات و جرائد کے سارے پہلے صفحہ پر محض اشتہارات ہی شائع کیے جاتے تھے۔ ملک میں طباعتی ٹکنالوجی کی ترقیات کے ساتھ ساتھ تشہیر کا شعبہ بھی فروغ پاتا رہا ہے۔

تشہیر کا عمل ترسیل عامہ کے مختلف ذرائع سے انجام پاتا ہے۔ ان میں اخبارات، ٹیلی ویژن، رسائل، ریڈیو کے علاوہ بیرون در بورڈس اور راست خطوط اہمیت کے حامل ہیں۔ اشتہارات کی مختلف اقسام ہیں جن میں مصنوعات کے اشتہارات، جماعت بند یا زمرہ بند اشتہارات، عوامی خدمات کے اشتہارات، صنعتی اشتہارات اور ادارہ جاتی اشتہارات شامل ہیں۔ اشتہارات پر چونکہ اچھی خاصی لاگت آتی ہے لہٰذا ان کی پلاننگ بہت ضروری ہوتی ہے تاکہ اشتہارات سے مطلوبہ استفادہ کو ممکن بنایا جا سکے۔

26.10 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. اشتہارات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تفصیل سے لکھیے۔
2. اشتہارات کے مختلف ذرائع پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔ ان میں اشتہارات دینے کے کیا کیا فوائد ہیں؟
3. ہندستان میں اشتہارات کے آغاز و ارتقا کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
4. اشتہارات کی اقسام پر ایک نوٹ لکھیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. تشہیر کے شعبہ میں تشہیر کی ایجنسیاں کیا رول ادا کرتی ہیں؟ واضح کیجئے۔
2. ترسیل عامہ میں اشتہارات کے رول کو واضح کیجئے۔
3. اشتہارات کے کاروبار کے فروغ میں چھاپے خانے کے رول پر بحث کیجئے۔
4. آن لائن اشتہارات سے کیا مراد ہے؟ موجودہ دور میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
5. مورخین کے مطابق ابتدائی اشتہارات کون سے تھے؟ اور وہ کہاں اور کس طرح استعمال کیے جاتے تھے؟

26.11 فرہنگ

مشتہر کرنا	شہرت دینا، مشہور کرنا	چسپاں کرنا	چپکانا
ورقیے	پرچیاں	داغ بیل ڈالنا	کسی کام کی ابتدا کرنا
متمول	مالدار	دسترس	پہنچ
ترسیل	بھیجنا، روانہ کرنا	بیڑا اٹھانا	ذمہ لینا، عہد لینا، آمادہ ہونا
نہج	طریقہ، ڈھنگ، قاعدہ	سعی	کوشش
دلال	وہ شخص جو خریدار اور بیچنے والے کو ملائے	خواندہ	پڑھا لکھا
بیرون در	گھر یا کسی عمارت کے باہر	طباعت	چھپائی
ترغیب	رغبت دلانا، کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرنا	فوقیت	ترجیح، سبقت
عین مقصد	اصل مقصد	دقیقہ اٹھا نہ رکھنا	کسر نہ چھوڑنا، سخت کوشش کرنا
ہمہ رنگی	کئی رنگوں پر مشتمل	درجہ بندی	خاص درجہ یا مقام متعین کرنا
مشترک	شریک کیا گیا	اسامی	عہدہ، نوکری
لاگت	اصل خرچ	امور	(امر کی جمع) بہت سے کام

26.12 سفارش کردہ کتابیں

1. Text Book of Mass Communication & Media — by: Uma Joshi (2001)
2. The Indian Media Business — by: Vanita Kohli (2003)
3. Mass Communication in India — by: Keval J. Kumar (2002)

اکائی 27 : نئی ترسیلی تکنالوجی

New Communication Technology

ساخت

27.1 تمہید

27.2 ترسیل کی تعریف اور نظریے

27.3 ترسیل اور تکنالوجی

27.4 نئی ترسیلی تکنالوجی کی قسمیں

27.4.1 مائیکرو پروسیسر (Micro Processor)

27.4.2 ویڈیو ڈسک (Video Disc)

27.4.3 ویڈیو ٹیکس (Video Tex)

27.5 ملٹی میڈیا (Multi Media)

27.5.1 ملٹی میڈیا کمپیوٹر کا ہارڈ ویر (Hardware for Multimedia Computer)

27.5.2 سی۔پی۔یو (C.P.U)

27.5.3 مانٹیر (Monitor)

27.5.4 سی۔ڈی روم (CD.ROM)

27.5.5 ساونڈ کارڈ (Sound Card)

27.5.6 لیزر ڈسک (Laser Disc)

27.6 ملٹی میڈیا کے اجزا

27.6.1 متنی اطلاعات (Textual Information)

27.6.2 امیجز (Images)

27.6.3 اینی میشن (Animation)

27.6.4 ڈیجیٹل آڈیو (Digital Audio)

27.6.5 ڈیجیٹل ویڈیو (Digital Video)

27.7 انٹرنٹ (Internet)

27.7.1 ای میل (Electronic mail or E-mail)

27.7.2 گوفر (Gopher)

27.7.3 ورلڈ وائڈ ویب (World Wide Web)

27.8 خلاصہ

27.9 نمونہ امتحانی سوالات

27.10 فرہنگ

27.11 سفارش کردہ کتابیں

27.1 تمہید

تجسس اور ترسیل فطرت انسانی کا اہم ترین جزو ہیں یعنی دوسروں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنا اور اپنے کوائف سے دوسروں کو آگاہ کرنا ایک لازمی انسانی سرگرمی ہے۔ اس لحاظ سے ہر شخص ترسیل کے عمل سے تقریباً ہر وقت وابستہ رہتا ہے۔ ترسیل کی ازلی خواہش معاشرہ کی تشکیل کی صورت میں نمودار ہوئی اور اب یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ کسی بھی معاشرے یا ملک کی ترقی کا بنیادی حوالہ ترسیل ہے۔ ذرائع ترسیل کا بہتر استعمال ہمہ جہت ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ جمہوری طرز حکومت کی اساس ترسیل پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ترسیل کے مفہوم' نوعیت' دائرہ کار اور مقاصد پر ایک نظر ڈالی جائے۔

اس اکائی میں ترسیل کے مفہوم' ترسیل اور تکنالوجی کے باہمی تعلق' نئی ترسیلی تکنالوجی کے اقسام اور ہمارے موجودہ معاشرے کے سب سے مقبول ذریعہ ترسیل انٹرنٹ اور ملٹی میڈیا کے مفہوم' اقسام اور ان کے استعمال کی صورتوں کی نشان دہی کی جائے گی۔ یہ بھی بتایا جائے گا کہ بصری ذریعہ ترسیل (اخبار' جرائد وغیرہ) اور سمعی ذریعہ ترسیل (ریڈیو' آڈیو کیسٹ وغیرہ) اور سمعی و بصری ذریعہ ترسیل (ٹیلی ویژن' فلم' ویڈیو کیسٹ وغیرہ) میں نئی تکنالوجی کو کس طرح استعمال کیا جارہا ہے اور اس سے ترسیل کا عمل کس قدر متاثر ہوا ہے۔

27.2 ترسیل کی تعریف اور نظریے

گزشتہ صدی میں تکنالوجی کو بہت فروغ حاصل ہوا اور اس کا سب سے زیادہ اثر ترسیل کے عمل نے قبول کیا۔ ہماری معاشرتی اور اقتصادی ترقی کا انحصار بڑی حد تک اطلاعات کی ترسیل پر ہے اور مختلف لوگ اطلاعات کے نہ صرف منتظر رہتے ہیں بلکہ وہ ان کا استعمال کر کے اپنی مختلف ضروریات کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔ اسی باعث ترسیل کو ایک اہم قوت' اقتصادی وسیلہ اور معاشرے کی ترقی کا سب سے موثر ہتھیار بھی کہا جاتا ہے۔ ترسیل کا بنیادی مقصد پیغام رسانی ہے جو زبان یا میڈیم کے حوالے سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ ترسیل بین شخصی' بین گروہی اور عوامی ہوسکتی ہے۔ ترسیل کا سب سے مقبول نظریہ شانن اور ویور (Shanon and Weaver) نے وضع کیا ہے۔

یہ ترسیل کا آسان اور قابل تفہیم نظریہ ہے جس کا تعلق ترسیل' پیغام اور میڈیم سے ہے۔ یہ ماڈل درج ذیل ہے:

منبع (Source) ⟸ پیغام (Message) ⟸ چینل (Channel) ⟸ وصول کنندہ (Receiver)

ترسیل کا عمل مندرجہ بالا چار نکات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ترسیل کے عمل کا آغاز منبع یا ماخذ (Source) سے ہوتا ہے۔ وہ کوئی پیغام یا اطلاع دینا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ کسی ذریعے یا چینل کا استعمال کرتا ہے۔ چینل سے مراد مطبوعہ لفظ' سمعی اور سمعی و بصری کوئی بھی ذریعہ ہے اور پھر وصول کنندہ یعنی جس کی طرف یہ پیغام راجع ہوتا ہے' آتا ہے۔ ترسیل کا یہ عمل مختلف ترسیلی نظام میں نظر آتا ہے۔ ورسگ اور نین لنگ (Versig and Nenling) نے ترسیل کے عمل کو بڑی گہرائی سے مطالعہ کا مرکز بنایا اور اُنہوں نے ترسیل سے متعلق چار مختلف نظریات پیش کیے:

1) ترسیل کا ساختیاتی نظریہ (The Structural Approach)

اس نظریے کے تحت ترسیل کے مواد یعنی پیغام یا اطلاع (Information) کو دنیا کا ساختیہ متصور کیا جاتا ہے یا پھر اسے طبعی اشیا کے مابین جامد تعلقات کا ضامن سمجھا جاتا ہے جس کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔

2) نظریۂ علوم (The Knowledge Approach)

اس نظریہ کے مطابق دنیا کی ساخت کے ادراک کی بنیاد پر ترسیل کا انحصار ہوتا ہے اور اطلاع اور علم ہم معنی الفاظ ہیں۔ اطلاع یا پیغام رسانی ترسیل

کالازمی جزو ہے مگر اسے علم کا مترادف نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔لہٰذا اس نظریے کو عموماً قبول نہیں کیا جاتا ہے۔

3) نظریۂ پیغام (The Message Approach)

اس نظریہ کے مطابق اطلاع یا پیغام کی ترسیل طبعی علامتوں یا نشانات کے حوالے سے کی جاتی ہے۔طبعی ذرائع پر اصرار اس نظریہ کا خاص وصف ہے اور اسی وجہ سے اس کا استعمال ترسیل کے نظریہ ریاضی میں زیادہ کیا جاتا ہے۔

4) نظریۂ معنی (The Meaning Approach)

ترسیل کا یہ نظریہ پیغام کے معنیاتی مواد کو اطلاع متصور کرتا ہے۔ترسیل کا بڑا گہرا تعلق معنی سے ہوتا ہے لہٰذا یہاں توجہ کا مرکز مفہوم ہوتا ہے۔

5) نظریۂ اثر (The Effect Approach)

اس نظریہ کے مطابق ترسیل کے عمل کے خاص اثرات کی وجہ سے پیغام یا اطلاع رسانی کا فریضہ انجام پاتا ہے۔

6) نظریۂ عمل (The Process Approach)

اس نظریہ کے مطابق اطلاع یا پیغام بذات خود ایک عمل (Process) ہے جس کا آغاز انسانی ذہن سے اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی مسئلہ یا مفید اعداد و شمار یا تفصیلات سامنے آتی ہیں۔

مختصراً ان تمام نظریوں کے تحت ترسیل کو عمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترسیل کی کامیابی کا انحصار رشتوں کے باہمی ادراک پر ہوتا ہے۔دراصل کسی بھی پیغام یا اعداد و شمار کا مختلف ذرائع سے ترسیل کا دوسرا نام اطلاع (Information) ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

صحیح یا غلط پر نشان لگائیے:

1. ترسیل کے بنیادی اجزا پیغام، میڈیم اور وصول کنندہ ہیں۔ صحیح یا غلط
2. ٹیلی ویژن اور فلم سمعی و بصری ذریعہ ترسیل ہیں۔ صحیح یا غلط
3. اطلاع اور علم ہم معنی ہیں۔ صحیح یا غلط

27.3 ترسیل اور تکنالوجی

آج کے عہد میں دنیا کے تمام علوم سے صرف ایک بٹن دبا کر آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے اور پوری دنیا عالمی گاؤں کے طور پر ہمارے سامنے آچکی ہے۔مواصلاتی سیاروں کے ذریعے پوری دنیا میں کوئی بھی اطلاع چند سکنڈوں میں پھیلائی جاسکتی ہے۔ترسیل کا تعلق صرف ہمارے موجودہ معاشرے سے نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے کہ جتنی خود انسان کی۔ پہلے ترسیل صرف براہ راست طور پر ہوتی تھی جسے Face to Face Communication کہا جاتا تھا۔دو لوگوں کے مابین ترسیل کو بین سمعی ترسیل یعنی Itner Personal Communication کہا جاتا تھا۔ معاشرہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ترسیل غیر شخصی ہوتی گئی اور مختلف لوگوں سے براہ راست اور بیک وقت رابطہ قائم کرنے کی ضرورت نے ترسیل کو تکنالوجی کی مدد لینے پر مجبور کیا۔میڈیم یا چینل کا انتخاب اصلاً تکنالوجی کے فروغ کا رہین منت ہے۔لاؤڈ اسپیکر سے لے کر انٹرنٹ تک کا سفر اصلاً تکنالوجی کے استعمال کا اشاریہ ہے۔تکنالوجی دراصل ترسیل کے عمل کو تیز تر اور زیادہ موثر بنانے میں بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔

ہمارا موجودہ معاشرہ ترسیل اور تکنالوجی کے باہمی اشتراک کا ایک نیا اور حیرت انگیز منظر نامہ پیش کرتا ہے۔دنیا کے کسی بھی دور افتادہ خطے میں رونما ہونے والے حادثے کی اطلاع چند ثانیوں میں ہمیں مل جاتی ہے اور اب کمپیوٹر کی ایک چھوٹی سی چپ (Chip) پر دنیا کی بڑی سے بڑی لائبریری کو منتقل کیا جاسکتا ہے

27.4 نئی ترسیلی تکنالوجی کی قسمیں

متعدد ماہرین مواصلات ٹرانسسٹر کی ایجاد کو اس صدی کی سب سے اہم دریافت سمجھتے ہیں۔ ٹرانسسٹر 1947ء میں نیوجرسی (امریکہ) میں بیل ٹیلی فون لیبارٹریز میں ایجاد کیا گیا۔ ٹرانسسٹر کی ایجاد اس وجہ سے بہت اہم تھی کہ اس سے الکٹرانک آلات کو چھوٹے سے چھوٹے بنانے کے عمل کا آغاز ہوا جس کا استعمال بعد میں کمپیوٹر میں کیا جاسکا۔ ٹرانسسٹر کی ایجاد کے باعث ترسیلی تکنالوجی میں انقلاب آ گیا کہ اس سے کمپیوٹر کی ایجاد کی راہ ہموار ہوئی جو نئی ترسیلی تکنالوجی کا دوسرا نام ہے۔ کمپیوٹر کا استعمال بصری، سمعی اور سمعی و بصری ذرائع ترسیل میں کثرت سے ہوتا ہے۔

27.4.1 مائیکرو پروسیسر (Micro Processor)

مائیکرو پروسیسر کمپیوٹر کا بنیادی جزو ہوتا ہے۔ یہ اصلاً سیمی کنڈکٹر چپ (Semi Conductor Chip) ہوتا ہے۔ جسے کمپیوٹر کے دماغ (Brain) سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مائیکرو پروسیسر کی ایجاد ڈاکٹر ٹیڈ ہوف (Ted Hoff) نے 1971ء میں کی اور اس ایجاد سے کمپیوٹروں کے چھوٹے ہونے کا آغاز ہوا۔ مائیکرو پروسیسر کو اطلاعاتی انقلاب کا نقطۂ آغاز مانا جاتا ہے۔ مائیکرو پروسیسر کی بنیاد پر پہلا پرسنل کمپیوٹر (PC)، 1974ء میں بنا جس کے باعث ترسیل کی دنیا میں حیرت انگیز انقلاب آ گیا۔ مائیکرو پروسیسر ایک چھوٹے سے سیمی کنڈکٹر چپ کی مدد لیتا ہے۔ مائیکرو پروسیسر اور میموری چپ (Memory Chip) کمپیوٹر کے لازمی اجزا ہیں۔

اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلوں میں ویڈیو ڈسپلے ٹرمنل (V.D.T) استعمال کیے جاتے ہیں جس پر ادارت (Editing) اور تزئین کا کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ وی۔ڈی۔ٹی میں مائیکرو پروسیسر کو استعمال کیا جاتا ہے اور یہ اصلاً پرسنل کمپیوٹر ہی ہوتے ہیں۔ وی۔ڈی۔ٹی اسکرین پر خبروں کی ادارت کی جاسکتی ہے۔ انہیں محفوظ کیا جاسکتا ہے اور اخبارات کے صفحات کی تزئین کاری بھی کی جاسکتی ہے۔

27.4.2 ویڈیو ڈسک (Video Disc)

ویڈیو ڈسک ویڈیو ٹیپ ریکارڈنگ کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ ویڈیو ڈسک ویڈیو اور آڈیو سگنلوں کو ایک سگنل میں تبدیل کرتا ہے اور پھر فاصلہ کی لہروں کی فی ثانیہ تعداد کو ڈسک کے مائیکرو ویٹ میں منتقل کرتا ہے۔ پھر ان سگنلوں کو ایک آلۂ قرأت (Read Device) مجوزہ امیج میں آواز کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ویڈیو ڈسک روایتی ویڈیو ریکارڈنگ کے مقابلے میں زیادہ صاف اور واضح ترسیل کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ ویڈیو ڈسک کو زیادہ دنوں تک محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ ویڈیو ڈسک کا استعمال ٹیلی ویژن میں کیا جاتا ہے۔

27.4.3 ویڈیو ٹکس (Video Tex)

ویڈیو ٹکس سے مراد متن اور بصری مواد (Graphic and Visual Images) کی وسیع ترپیمانے پر ترسیل ہے۔ یہ ترسیل کم قیمت پر ملنے والے ٹرمنلوں (Terminals) پر الکٹرانک وسیلوں سے کی جاتی ہے تاہم اس پر وصول کنندہ کا انتخابی کنٹرول رہتا ہے اور اس کے کنٹرول کا عمل بہت آسان ہوتا ہے تاکہ غیر تربیت یافتہ صارف بھی اس کا استعمال کر سکے۔

ویڈیو ٹکس کی دو قسمیں ہیں۔ براڈ کاسٹ ویڈیو ٹکس جسے ٹیلی ٹکسٹ (Tele Text) بھی کہا جاتا ہے اور دوسرا تعاملی ویڈیو ٹکسٹ (Interactive Videotext) ہے۔ ٹیلی ٹکسٹ میں اطلاع کی ترسیل یک طرفہ ہوتی ہے اور یہ ویڈیو براڈ کاسٹ فریکوینسی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ ویڈیو ٹکسٹ (Video Text) دوطرفہ ذریعہ ترسیل ہے جس میں ٹیلی فون کے ذریعے موڈم اور ٹیلی ویژن اسکرین کو جوڑا جاتا ہے اور پھر اسے کمپیوٹر ڈاٹا بیس سے منسلک کیا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

صحیح یا غلط پر نشان لگائیے:

.1	اس عہد کی سب سے اہم ایجاد ٹرانسسٹر ہے۔	صحیح	یا	غلط
.2	مائیکرو پروسیسر کمپیوٹر کا غیر اہم جزو ہوتا ہے۔	صحیح	یا	غلط
.3	ٹیڈ ہوف اطلاعاتی انقلاب کا بانی ہے۔	صحیح	یا	غلط
.4	خبروں کی ادارت کے لیے وی۔ڈی۔ٹی (V.D.T) کا استعمال کیا جاتا ہے۔	صحیح	یا	غلط
.5	ویڈیو ڈسک ویڈیو رکارڈنگ کی اعلیٰ ترشکل ہے۔	صحیح	یا	غلط

27.5 ملٹی میڈیا (Multi Media)

ہماری معاصر دنیا کمپیوٹر کے حوالے سے صورت پذیر ہو رہی ہے اور کمپیوٹر کی دنیا میں روز تبدیلی آ رہی ہے۔ ملٹی میڈیا ہمارے عہد کی مقبول ترین تکنالوجی ہے۔ گزشتہ کچھ برسوں سے اطلاعاتی تکنالوجی کا بنیادی حوالہ ملٹی میڈیا ہے۔ ملٹی میڈیا کا استعمال نہ صرف اطلاعاتی تکنالوجی میں کیا جاتا ہے بلکہ اشتہارات، بڑی بڑی صنعتی کمپنیوں، سنیما، فیشن ڈیزائن اور تعلیم کے میدان میں بھی اس کا تواتر کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ آواز، متن اور اینی میشن (Animation) کے حیرت انگیز ادغام کا دوسرا نام ملٹی میڈیا ہے۔ کمپیوٹر سے ناواقف لوگ بھی ملٹی میڈیا سے کسب فیض کر سکتے ہیں۔

ملٹی میڈیا کی تعریف میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ ماہرین اسے فی نفسہ کمپیوٹر اور کچھ اسے کمپیوٹر سافٹ ویر قرار دیتے ہیں۔ اس کا تعلق انفارمیشن سپر ہائی وے (Information Super Highway) یا تعاملی ٹیلی ویژن (Interactive Television) سے ہے جو ضرورت پڑنے پر ویڈیو امیج دکھا سکے یا پھر اسے ہائپر میڈیا (Hyper Media) سے جوڑا جاتا ہے۔ ملٹی میڈیا اصلاً متن، گرافکس، امیجز، ویڈیو اور آڈیو کے بیک وقت استعمال سے عبارت ہے۔ یہ تمام چیزیں کمپیوٹر میں موجود ہوتی ہیں اور ملٹی میڈیا ان کو بروئے کار لاتا ہے۔ ملٹی میڈیا میں سب سے اہم وصف اس کی تعامل پذیری (Interactivity) ہے۔ یعنی ملٹی میڈیا کا استعمال کر کے کوئی بھی شخص ٹی۔وی نیوز چینل کو یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کس قسم کی خبروں کا خواہاں ہے۔

27.5.1 ملٹی میڈیا کمپیوٹر کا ہارڈ ویر (Hardware for Multimedia Computer)

ملٹی میڈیا مختلف میڈیا استعمال کرتا ہے اور کمپیوٹر بنانے والوں نے ملٹی میڈیا یا تکنالوجی کو فروغ دیا ہے اور اس کے لیے کمپیوٹر بھی بنایا ہے۔ ملٹی میڈیا کمپیوٹر بھی مائیکرو پروسیسر پر استوار ہوتا ہے۔ ملٹی میڈیا کمپیوٹر میں سی۔ڈی روم (CD-ROM) پلیئر، ساونڈ کارڈ مثلاً ساونڈ بلاسٹر، ماسٹر بلاسٹر اور مائیکروفون اور ملٹی میڈیا کے بہت سے سافٹ ویر پروگرام شامل ہوتے ہیں۔ ملٹی میڈیا کمپیوٹر زیادہ تر ایم۔آئی۔ڈی۔آئی (Musical Instrument Digital Instrument) کو بروئے کار لاتے ہیں۔

ملٹی میڈیا کمپیوٹر کے درج ذیل اجزا ہوتے ہیں:

27.5.2 سی۔پی۔یو (C.P.U)

ملٹی میڈیا کمپیوٹر کی مرکزی کنٹرول اکائی (Central Processor Unit) پینٹیم پروسیسر (Pentium Processor) پر استوار ہوتی ہے۔ اور اس کی میموری کم از کم آٹھ MB ہونا چاہیے۔ مرکزی کنٹرول اکائی ملٹی میڈیا میں استعمال کیے جانے والے سافٹ ویر کو کنٹرول کرتی ہے اور یہی Command بھی دیتی ہے۔

27.5.3 مانٹیر (Monitor)

ملٹی میڈیا کمپیوٹر میں سپر ویڈیو گرافکس اریز (SVGA) ضرور ہونا چاہیے کہ اس سے گرافکس اور تصاویر اچھی آتی ہیں۔

27.5.4 سی۔ڈی روم (CD.ROM)

ملٹی میڈیا کمپیوٹر آڈیو اور ویڈیو کے ڈیجیٹل سگنل استعمال کرتا ہے جس کے لیے ہائی اسپیڈ اسٹوریج میڈیا کی ضرورت ہوتی ہے۔سی ڈی روم ملٹی میڈیا اسٹوریج کا کام کرتی ہے اور ایک سی ڈی روم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے ڈیجیٹل آڈیو سگنل کا ذخیرہ کرسکتا ہے۔سی۔ڈی روم اصلاً ایک ڈرائیو (Drive) ہے اور یہ ملٹی میڈیا کمپیوٹر کے لیے ضروری ہے۔

27.5.5 ساونڈ کارڈ (Sound Card)

کمپیوٹروں کو گیمز اور غلطی والے پیغامات کی ترسیل کے دوران انتباہ کے طور پر ساؤنڈ آؤٹ پٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔کمپیوٹر میں اس مقصد کے لیے آواز کے کارڈ (Sound Card) داخل کیے جاتے ہیں۔آڈیو ریکارڈنگ کو دوبارہ سننے کے لیے ساونڈ کارڈ ضروری ہوتا ہے۔

27.5.6 لیزر ڈسک (Laser Disc)

ریکارڈنگ کے لیے سی۔ڈی روم کی طرح لیزر ڈسک کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔لیزر ڈسک بڑی تیزی سے ڈیجیٹل آڈیو فائلوں کی ریکارڈنگ کرسکتا ہے اور پھر انہیں سنا سکتا ہے۔سی ڈی روم کے برخلاف لیزر ڈسک چار چینلوں کا بیک وقت استعمال کرسکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

صحیح یا غلط پر نشان لگائیے:

1. ملٹی میڈیا کے زمرے میں تعاملی ویڈیو (Interactive Video) شامل نہیں ہے۔ صحیح یا غلط
2. سی۔وی۔جے۔اے ڈیجیٹل ڈسپلے تکنالوجی ہے۔ صحیح یا غلط
3. لیزر ڈسک سی۔ڈی روم سے زیادہ بہتر ہے۔ صحیح یا غلط

27.6 ملٹی میڈیا کے اجزا

ملٹی میڈیا سافٹ ویر کے لازمی اجزا فلم، آواز، متن، تصاویر، گرافکس اور اینی میشن (Animation) ہیں۔ملٹی میڈیا کے ان اجزا کو بروئے کار لانے کے لیے بہت سے سافٹ ویر پروگرام مثلاً پینٹ برش، فوٹوفنش، اینی میٹر، فوٹو شاپ، 3-D اسٹوڈیو، کورل ڈرا، ساونڈ بلاسٹر اور ماسٹر بلاسٹر وغیرہ ہیں۔کمپیوٹر میں ملٹی میڈیا استعمال کیسے کیا جاتا ہے اور اس کے اجزا کیا ہیں، اس سوال پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔یہ اجزا درج ذیل ہیں:

27.6.1 متنی اطلاعات (Textual Information)

ملٹی میڈیا متنی اطلاعات بھی فراہم کرتے ہیں اور ان میں Textual Information بھی ہوتی ہیں۔متن مختلف سائز اور فونٹ (Font) میں پیش کیا جاسکتا ہے اور صارف کے لیے ہر طرح کا سائز اور ٹائپ موجود ہوتا ہے۔ملٹی میڈیا کے تمام سافٹ ویر میں ونڈو انٹرفیس ہوتا ہے جس کے باعث ہر

طرح کے ٹائپ سائز کا ذخیرہ کیا جاسکتا ہے۔

27.6.2 امیجز (Images)

ملٹی میڈیا کا دوسرا اہم جزو گرافکس ہے۔عوام کی اکثریت زیادہ دیر تک کمپیوٹر اسکرین پر مواد کو پڑھنا نہیں چاہتی اور وہ مواد کو تصویری شکل میں دیکھنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ملٹی میڈیا متن کو زیادہ قابل قبول بنانے کے لیے انہیں گرافکس میں منتقل کرتا ہے۔نقشہ' تصاویر' خاکہ اور دیگر تصویری مواد سے متن کو زیادہ قابل قبول بنایا جاتا ہے۔

27.6.3 اینی میشن (Animation)

ملٹی میڈیا پروگرام میں اینی میشن کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔اینی میشن اصلاً جامد تصویروں یا پیکروں کی ایک مسلسل سیریز ہوتی ہے جسے سلسلہ وار پیش کر کے متحرک بنایا جاتا ہے۔ملٹی میڈیا میں اینی میشن کی دو قسمیں 2-D اور 3-D استعمال کی جاتی ہیں۔2-D اینی میشن کو سی ای ایل (Pixel Based) کہا جاتا ہے اور یہ اینی میشن کا سب سے مقبول طریقہ ہے۔اس کے تحت جامد امیجز کو مقررہ وقت میں ایک فریم میں پیش کیا جاتا ہے۔اگرچہ اس میں وقت زیادہ لگتا ہے مگر یہ بہت متاثر کن ہوتی ہے۔اینی میشن کے ساتھ خصوصی اثرات پیش کرنے کے لیے دو پروگرام مارفنگ (Morphing) اور ریپنگ (Wraping) استعمال کیے جاتے ہیں۔

3-D اینی میشن میں گہرائی کو دکھانے کی خاطر معروض کے ریاضی ماڈل کو پیش کیا جاتا ہے۔3-D اینی میشن کے تین مرحلے ماڈلنگ (Modelling)' اینی میشن اور رنڈرنگ (Rendering) ہیں۔ماڈلنگ کا تعلق ڈیزائن سے ہے۔اس کے بعد 3-D امیج کو ایک متحرک راستے پر دکھایا جاتا ہے۔اینی میشن ترتیب کو برقرار رکھنے کے لیے مختلف فریموں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

27.6.4 ڈیجیٹل آڈیو (Digital Audio)

ملٹی میڈیا کے استعمال کے لیے ڈیجیٹل آڈیو ضروری ہے۔رواں تبصرے کے لیے لفظ ضروری ہے اور ہر امیج یا دستاویز کی پیش کش کا انحصار اس کے سمعی تعارف پر ہوتا ہے۔جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہوا پر مسلسل دباؤ پڑنے سے آواز پیدا ہوتی ہے اور آواز کی لہر کو مائیکروفون برقی لہر میں بدل دیتا ہے۔ آواز کو ڈیجیٹل سگنلوں کی صورت میں ریکارڈ کیا جاسکتا ہے اور پھر انہیں دوبارہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ڈیجیٹل آڈیو میں خرابی کا بہت کم امکان رہتا ہے۔

ملٹی میڈیا کمپیوٹر میں ڈیجیٹل سگنل پروسیسر موجود ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ڈیجیٹل ساونڈ فائل کے مختلف سافٹ ویر پروگرام بھی موجود ہیں۔

27.6.5 ڈیجیٹل ویڈیو (Digital Video)

تعاملی ملٹی میڈیا (Interactive Multimedia) میں متعدد نئی تکنالوجی استعمال کی جاتی ہے۔ڈیجیٹل ویڈیو ان میں سے ایک ہے جس کو استعمال کر کے ملٹی میڈیا پروگرام میں ویڈیو ریکارڈنگ کی جاسکتی ہے اور پھر اسے دیکھا جاسکتا ہے۔روایتی ویڈیو سگنل کے مقابلے میں یہ نئی تکنیک زیادہ دیرپا اور لچکدار ہوتی ہے۔عام ویڈیو ریکارڈنگ میں ایک کاپی سے دوسری کاپی کرنے پر امیج خراب ہوجاتی ہے جبکہ ڈیجیٹل ویڈیو میں تصویریں ڈیجیٹل کوڈ میں منقلب ہوجاتی ہیں اور کمپیوٹر کے اندر ایک ویڈیو ڈیجیٹائزر کارڈ (Video Digitiser Card) ہوتا ہے جو کیمرے' ٹی۔وی یا وی۔سی۔آر سے براہ راست سگنل حاصل کرتا ہے۔

27.7 انٹرنٹ (Internet)

انٹرنٹ کا مفہوم کمپیوٹروں کا عالمی طور پر انسلاک ہے۔یہ رابطہ کیبل یا ٹیلی فون لائن کے ذریعے قائم کیا جاتا ہے اور تمام کمپیوٹر ایک ہی زبان استعمال

کرتے ہیں۔تاہم انٹرنٹ کی جامع تعریف اس سے ذرا مختلف ہے۔دراصل انٹرنٹ مختلف نٹ ورکوں کے باہمی ارتباط کے عالمی اجتماع کا دوسرا نام ہے۔ نٹ ورک کمپیوٹر صارف کو کمپیوٹر' اس کے پروگرام' پیغامات اور اطلاعات کے استعمال کا موقع فراہم کرتا ہے تاہم ان کا تعلق کسی ایک سائٹ سے ہونا چاہیے۔نٹ ورک کے دو اقسام ہیں:

1) مقامی نٹ ورک (Local Area Network)

2) وسیع نٹ ورک (Wide Area Network)

انٹرنٹ متعدد نٹ ورکوں کا مجموعہ ہے جس میں اہم ارپنٹ (ARPANET)' این ایس ایف نٹ (NSFNET)' ناسا (NASA)' بٹ نٹ (BITNET)' ڈی ای سی نٹ (DECNET) ہیں۔

کمپیوٹر نٹ ورک موجود وسائل کے استعمال میں شرکت کو یقینی بناتا ہے۔کمپیوٹر میں سافٹ ویر ڈاٹا فائل کی صورت میں موجود رہتے ہیں لہٰذا نٹ ورک کا بنیادی مقصد دو مخصوص کمپیوٹروں میں ڈاٹا منتقلی کی صورت پیدا کرنا ہوتا ہے۔اس نوع کی ترسیل کے لیے دو امور کی پابندی ضروری ہوتی ہے:

1) وصول کنندہ کا پتہ

2) الکٹرانک سگنلوں کی صورت میں ڈاٹا کی منتقلی کا محفوظ طریقہ

جہاں تک ڈاٹا منتقلی کا سوال ہے انٹرنٹ پر اسے بھیجنے اور وصول کرنے کے لیے ضوابط مقرر ہیں۔انہیں ٹرانسمیشن کنٹرول پروٹوکول (Transmission Control Protocol) اور انٹرنٹ پروٹوکول (Internet Protocol) کہتے ہیں۔ٹی۔سی۔پی ڈاٹا کو چھوٹے چھوٹے ڈاٹا پیکٹوں میں منقسم کرتا ہے اور پھر پیکٹ کے اندراج اور غلطیوں کی اصلاح کے لیے کوڈ مقرر کرتا ہے تاکہ وصول کنندہ انہیں دوبارہ جمع کرے۔آئی۔پی کا بنیادی کام ان اطلاعاتی پیکٹوں کی درجہ بندی کرنا ہوتا ہے۔پتہ (Address) انٹرنٹ پر بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔آئی۔پی انٹرنٹ پر کمپیوٹروں کو پتہ یا منزل (Destination) فراہم کرنے کی تکنیک ہے۔انٹرنٹ شناخت یا پتہ (Internet Address) میں متعلقہ شخص کا مخفف لکھا جاتا ہے' پھر نٹ ورک کا نام ہوتا ہے۔انٹرنٹ کے استعمال کے لیے اس نوع کی شناخت ضروری ہے اور اس کے بعد کمپیوٹر سے کسب فیض کیا جاتا ہے۔اس کمپیوٹر کے صارف متعدد ہوتے ہیں۔

انٹرنٹ کا استعمال ہر طرح کی اطلاع کے حصول یا پیغام کی ترسیل کی خاطر کیا جاسکتا ہے۔اس کے اہم اجزا ہیں:

27.7.1 ای میل (Electronic mail or E-mail)

انٹرنٹ کا سب سے مفید پہلو یہ ہے کہ اس سے الکٹرانک پیغام کی انتہائی برق رفتاری کے ساتھ ترسیل ہو جاتی ہے۔یہ پیغام دنیا کے کسی بھی خطے میں پلک جھپکتے پہنچایا جاسکتا ہے۔ای میل ترسیل کا سب سے مقبول ذریعہ ہو گیا ہے۔انٹرنٹ پر کھاتہ کھولتے ہی الکٹرانک میل باکس مل جاتا ہے جس کے توسط سے پیغام کو بھیجا جاتا ہے اور وصول کیا جاسکتا ہے۔یہ ترسیل کا سب سے ارزاں وسیلہ ہے۔

27.7.2 گوفر (Gopher)

انٹرنٹ کے استعمال سے قبل اس کی بعض اصطلاحوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ان میں سب سے زیادہ اہم گوفر ہے۔گوفر اصلاً انٹرنٹ پر موجود وسائل یا موضوعات کی مرتب فہرست ہے۔گوفر فہرست (Menus) پیش کرتا ہے اور انٹرنٹ صارف اس فہرست کی مدد سے اپنی پسند کے موضوع کا انتخاب کرسکتا ہے۔اس کے لیے پتہ یا کمانڈ (Command) جاننے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔بس اپنی پسند کا موضوع چن کر اسے کمپیوٹر اسکرین پر دیکھا جاسکتا ہے۔صارف اور خدمات فراہم کرنے والی ایجنسی کے مابین سرگرم رابطہ گوفر کے توسط سے قائم ہوتا ہے۔انٹرنٹ پر متعدد گوفر سرور (Gopher

(Servers ہوتے ہیں۔

27.7.3 ورلڈوائڈ ویب (World Wide Web)

ورلڈ وائڈ ویب دراصل عالمی سطح پر کمپیوٹروں کے باہمی انسلاک کا دوسرا نام ہے۔ اگر اس کا استعمال کیا جائے تو کمانڈ سیکھنے کی بھی زیادہ ضرورت نہیں ہے کہ کوئی بھی شخص اسکرین پر موجود متن میں سے اپنے پسندیدہ موضوع کا انتخاب کرسکتا ہے۔ اس طرح اطلاع کی مختلف نشانیوں (Trails) کے توسط سے انٹرنٹ پر موجود مطلوبہ اطلاعات تک رسائی کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ سافٹ ویر استعمال کرنے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔

ورلڈ وائڈ ویب کو عالمی سطح پر اطلاعات' پیغامات اور دیگر متن تک رسائی کا بنیادی وسیلہ متصور کیا جاتا ہے اور اسے وائڈ ایریا ہائپر میڈیا (Wide Area Hyper Media) کہا جاتا ہے۔ ورلڈ وائڈ ویب کمپیوٹر صارف کو بہت آسانی سے مختلف نٹ ورکوں پر موجود اطلاعات سے واقف کرادیتا ہے۔ ویب ہائپر ٹکسٹ پر مبنی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے متن کا رابطہ دوسرے متون سے قائم ہے۔ ہائپر ٹکسٹ بھی عام متن ہی کی طرح ہوتا ہے جسے لکھا جاسکتا ہے' پڑھا جاسکتا ہے' اس کی ادارت کی جاسکتی ہے اور اسے تلاش بھی کیا جاسکتا ہے۔ مگر فرق صرف یہ ہے کہ یہ متن دوسرے متون سے سرگرم طور پر منسلک رہتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

صحیح یا غلط پر نشان لگائیے:

1. انٹرنٹ پر کھاتہ کھولتے ہی الکٹرانک میل باکس مل جاتا ہے۔ صحیح یا غلط
2. ٹی۔سی پی کا کام پیغام کو پیکٹوں میں تبدیل کرنا اور انہیں منزل تک پہچانا ہوتا ہے۔ صحیح یا غلط
3. www عالمی سطح پر کمپیوٹروں کے باہمی انسلاک کا دوسرا نام ہے۔ صحیح یا غلط

27.8 خلاصہ

اس اکائی میں ترسیل کے مفہوم' نوعیت اور اس کے نظریوں کو مختصراً واضح کیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ ترسیل کسی چینل کے ذریعے پیغام رسانی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ ترسیل اور تکنالوجی کے باہمی ربط کو بھی واضح کیا گیا ہے اور باور کرایا گیا ہے کہ نئی تکنالوجی ترسیل کا بنیادی حوالہ بن گئی ہے۔ ترسیل اب کمپیوٹر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کمپیوٹر کے اجزا مائیکرو پروسیسر' ویڈیو ٹکس اور پھر ملٹی میڈیا اور انٹرنٹ کے استعمال اور ان کی نوعیت کی مختلف صورتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ سے ترسیل میں استعمال کی جانے والی نئی تکنالوجی سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔

27.9 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. نئی ترسیلی تکنالوجی کے ذیل میں کن نئی ایجادات کو شامل کیا جاسکتا ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔
2. شانن اور پوور کے نظریہ ترسیل کو واضح کرتے ہوئے ترسیل کی تعریف متعین کیجیے۔ ترسیل اور تکنالوجی کے رشتے کو واضح کیجیے۔
3. ملٹی میڈیا سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ اس کے اجزا پر بھی روشنی ڈالیے۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. نئی ترسیلی تکنالوجی کی قسموں کے تحت مائیکرو پروسیسر ویڈیو ڈسک اور ویڈیو ٹکس کا تعارف کرائیے۔

2. انٹرنٹ اوراس کے اجزا کے بارے میں لکھتے ہوئے اس کے فوائد سے واقف کرایئے۔
3. کمپیوٹراوراس سے وابستہ تکنالوجی نے عام زندگی پر کیااثرات مرتب کیے؟ واضح کیجیے۔
4. درج ذیل موضوعات پر مختصر نوٹ لکھیے:

الف۔ ڈیجیٹل ویڈیواور روایتی ویڈیوٹیپ کا فرق

ب۔ اینی میشن

ج۔ ورلڈوائڈ ویب اور ہائپر ٹکسٹ

27.10 فرہنگ

بصری	نظر آنے والا	تعاملی	ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے والا
سمعی	سنا جانے والا	وصول کنندہ	وصول کرنے والا
جامد	ٹھوس، جما ہوا	ادراک	فہم، دریافت کرنا
ضامن	ذمہ دار	عبارت	مدعا، تحریر، مضمون
صارف	استعمال کرنے والا	ادغام	آپس میں ملنا، ضم ہو جانا

27.11 سفارش کردہ کتابیں

1. انجم عثمانی — ٹیلی ویژن نشریات۔تاریخ، تحریر، تکنیک — مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی
2. محمد امتیاز علی تاج — الکٹرانک میڈیا ریڈیو۔ٹیلی ویژن
3. نعیم احسن — ایجوکیشنل کمپیوٹر گائیڈ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
4. Ciaran McCullagh — Media Power

اکائی 28 : تعلقات عامہ

ساخت

28.1 تمہید

28.2 تعلقات عامہ کسے کہتے ہیں؟

28.3 تعلقات عامہ کی ضرورت

28.4 تعلقات عامہ کا آغاز

28.5 تعلقات عامہ کے چار مراحل

28.5.1 حقائق کا پتہ لگانا (Fact finding)

28.5.2 منصوبہ بندی (Planning)

28.5.3 ابلاغ یا ترسیل (Communication)

28.5.4 تجزیہ و محاسبہ (Evaluation)

28.6 تعلقات عامہ عملے کی خصوصیات

28.7 مختلف میڈیا کے لیے موزوں تحریریں

28.8 پریس کانفرنس، پریس ٹور وغیرہ

28.9 اشاعتی مواد

28.10 تعلقات عامہ کے سرکاری محکمے

28.11 خلاصہ

28.12 نمونہ امتحانی سوالات

28.13 فرہنگ

28.14 سفارش کردہ کتابیں

28.1 تمہید

بیسویں صدی کی آخری ربع صدی میں تعلقات عامہ کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے۔ جن سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں تعلقات عامہ کے دفاتر یا افسران موجود تھے وہاں اُنہیں مزید مستحکم کیا گیا ہے اور جہاں شعبہ تعلقات عامہ یا افسر تعلقات عامہ کا وجود نہیں تھا وہاں تقررات عمل میں لائی گئی ہیں۔ بعض ملٹی نیشنل کمپنیوں اور مختلف صارف اشیا تیار کرنے والی بیشتر کمپنیوں کی تجارت کا دارومدار ہی اشتہارات (Advertisements) اور تشہیر (Publicity) پر ہوتا ہے۔ اور اشتہارات و تشہیر کی ذمہ داری کمپنی کے شعبہ تعلقات عامہ پر ہوتی ہے۔ یہ شعبہ ترسیل کے مختلف ذرائع کے توسط سے کمپنی کی تشہیر کرتا ہے۔ تشہیر کے علاوہ بھی تعلقات عامہ کی کئی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔

تعلقات عامہ کے مطالعے میں اشتہارات' اخبارات' ریڈیو' ٹیلی ویژن' فلم اور طباعت کی ابتدا وارتقا اور اُن کی موجودہ صورتحال بھی شامل ہوتی ہے۔لیکن ان عنوانات پر آپ گزشتہ اکائیوں میں مفصل مطالعہ کر چکے ہیں۔لہٰذا زیرِنظر اکائی میں تعلقات عامہ کے دیگر مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

28.2 تعلقات عامہ کسے کہتے ہیں؟

تعلقات عامہ وضاحتی مواد کی تقسیم یا دیگر مختلف طریقوں سے فرم' ادارے یا تنظیم اور عوام کے درمیان راہ و رسم اور جذبہ خیر سگالی پیدا کرنے اور پھر اسے برقرار رکھنے کا نام ہے۔تعلقات عامہ کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے کی ہے البتہ اس سے سبھی اتفاق کرتے ہیں کہ تعلقات عامہ کا مقصد منظم طور پر اپنے ادارے اور اندرونی و بیرونی عوام کے درمیان باہمی اتفاق پیدا کرنا' عوام میں ادارے کی امیج بنانا' غلط فہمیوں کو دور کرنے کی تدابیر کرنا' تشہیر و اشتہار اور مختلف ذرائع ابلاغ کے توسط سے ادارے کا پیغام عوام تک پہنچانا' ادارے اور عوام کے درمیان ربط ضبط کو وسیع تر کرنا وغیرہ ہے۔

تعلقات عامہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس میں کام کی انجام دہی یا اپنے ادارے کی امیج بنانے کے لیے جھوٹ یا گمراہ کن بیانات کا سہارا نہیں لیا جاتا ہے۔کوئی کمزوری یا کمی ہو تو مصلحتاً اس کی پردہ پوشی کی جاسکتی ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں بتائی جاتی ہے جس کا حقائق سے تعلق نہ ہو۔یہی وہ خصوصیت ہے جو تعلقات عامہ کو اشتہار بازی یا پروپیگنڈہ سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔دراصل تعلقات عامہ میں اعتبار اور دیرپا تعلقات کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔تاکہ ادارے اور عوام کے درمیان مضبوط بنیادوں پر تعلقات قائم ہوسکیں۔واضح رہے کہ تعلقات عامہ کے ذیل میں جب عوام (Public) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد صرف وہ عوام ہوتے ہیں جن کا کسی نہ کسی طرح متعلقہ ادارے سے تعلق ہوتا ہے۔غیر متعلق لوگ' عوام کے دائرے میں نہیں آتے ہیں۔'اندرونی عوام' کسی ادارے کے عہدیداران اور ملازمین ہوتے ہیں جبکہ بیرونی عوام کے زمرے میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جن سے ادارے کو کسی نہ کسی طرح کا سروکار ہوتا ہے۔

28.3 تعلقات عامہ کی ضرورت

ہم آج ایسے معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں منافرت' شکوک و شبہات' ٹکراؤ' غم و غصے اور غلط فہمیوں کا دور دورا ہے۔یہ کیفیت نہ صرف نجی زندگیوں اور خاندانوں کے درمیان ہے بلکہ سماجی سطح پر' دفتروں' کمپنیوں اور اداروں کی سطح پر اور حتیٰ کہ ملکوں کے درمیان بھی ایسی ہی صورتحال ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خصوصیات انسانی زندگی کا وطیرہ بن گئی ہیں۔یہی سبب ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ بھی ٹکراؤ' تنازعے' تشدد اور تصادم ہی سے متعلق خبروں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ایسے ماحول میں تعلقات عامہ کی ضرورت اور ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے جس کے دائرہ کار میں شکوک و شبہات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا اور ادارے اور عوام کے درمیان قربت کے سامان پیدا کرنا شامل ہے۔

تعلقات عامہ کی ایک بڑی ذمہ داری ادارے کی مجموعی امیج کو بہتر بنانا ہے۔'مجموعی امیج کو بہتر بنانے' کا مقصد یا پس منظر یہ ہے کہ جب ادارے کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھی ہوگی اور عوام کا ادارے پر بھروسہ قائم رہے گا تو پھر ادارے کے کسی بھی اعلان نامے پر لوگ آسانی سے اعتبار کریں گے۔اگر ادارے کی جانب سے کوئی پیداوار یا اسکیم پیش کی جاتی ہے تو لوگوں کو اس اسکیم کو قبول کرتے ہوئے ہچکچاہٹ نہیں ہوتی ہے۔اس کی مزید وضاحت یوں پیش کی جاسکتی ہے کہ اگر کسی مشہور و معروف کمپنی کی طرف سے کوئی نیا آئٹم بازار میں فروخت کے لیے آتا ہے تو اسے لوگ صرف کمپنی کی ساکھ اور اُس کی نیک نامی کی وجہ سے بہت آسانی سے خریدتے ہیں۔اس کے برعکس کوئی نئی کمپنی اپنا کیسا ہی عمدہ سامان بازار میں لائے تو اسے جگہ بنانے کے لیے بڑی مشقتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔کسی ادارے یا کمپنی کو شہرت دینے کے ساتھ مقبول عام بنانے میں بھی تعلقات عامہ کلیدی کردار ادا کررہا ہے۔اس لیے آج تعلقات عامہ کی ضرورت اور اہمیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

28.4 تعلقات عامہ کا آغاز

تعلقات عامہ کی ابتدا یوں تو اُسی وقت سے تسلیم کی جاسکتی ہے جب دُنیا کے کسی ایک شخص نے کسی دوسرے سے یا دو اشخاص نے ایک دوسرے سے قربت بڑھانے کی ضرورت محسوس کی۔ جیسے جیسے زندگی ارتقائی مراحل طے کرتی گئی اور باہمی ربط وضبط کی ضرورت میں اضافہ ہوتا گیا' انسان تعلقات قائم کرنے اور اسے بہتر کرنے پر توجہ دینے لگا۔ ہماری قدیم تہذیبی اور مذہبی تاریخوں میں بھی تعلقات کو مستحکم بنانے کی تدابیر کے اشارے موجود ہیں۔ تاہم ایک فن اور مخصوص میدان کی حیثیت سے تعلقات عامہ کا نقطہ آغاز 1641ء کے اُس واقعے کو قرار دیا جاتا ہے جب ہارورڈ کالج' امریکا نے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے تین مبلغین کو برطانیہ روانہ کیا۔ وہاں پہنچ کر ان مبلغین نے ایک بروشر کی ضرورت محسوس کی جس میں تعارف اور مقاصد درج ہوں۔ اُنہوں نے ہارورڈ کالج کے پرنسپل کو اپنے خیال سے باخبر کیا لہٰذا پرنسپل نے بروشر کا مواد تیار کیا اور ''جدید برطانیہ کا پہلا پھل'' کے عنوان سے 1943 میں اس بروشر کی برطانیہ میں اشاعت اور تقسیم عمل میں آئی۔ نتیجتاً مبلغین کو کافی فنڈ حاصل ہوا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اُن دنوں بروشر اور اس ''جدید طرز'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج بھی تعلقات عامہ کے میدان میں بروشر ایک اہم ترین ذریعۂ تعارف وتشہیر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

تعلقات عامہ میں پریس ریلیز کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ کسی بھی اطلاع کو میڈیا تک پہنچانے کا آسان اور موثر ترین طریقہ پریس ریلیز کی اجرائی ہے۔ پہلی پریس ریلیز جاری کرنے کا سہرا موجودہ کولمبیا یونیورسٹی اور سابقہ کنگ کالج کو ہے۔ 21 جون 1758ء کو اُس کالج کے قیام کے سلسلے میں جو اعلان نامہ کالج کی جانب سے نیویارک کے مختلف جرائد میں اشاعت کے لیے روانہ کیا گیا تھا' اُسے پہلی پریس ریلیز ہونے کا شرف حاصل ہے۔ پریس ریلیز جاری ہونے کے بعد سبھی جرائد نے اسے ایک ساتھ شائع کیا اور یہیں سے پریس ریلیز کی اجرائی اور اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔

ہندستان میں تعلقات عامہ کے آغاز کے نقوش رامائن اور مہابھارت کے دور سے ہی ملتے ہیں۔ بدھ اور جین مذہب کی تبلیغ کے لیے بالترتیب گوتم بدھ اور مہاویر نے جن تدابیر کو اختیار کیا تھا وہ بھی تعلقات عامہ کے اصولوں پر مبنی تھیں۔ لیکن یہاں تعلقات عامہ کے لیے فضا 1780ء میں ہموار ہوئی جب جیمس آگسٹس ہکی نے کلکتے سے ہندستان کا پہلا اخبار ''ہکی گزٹ'' نکالنا شروع کیا۔ پہلی جنگ عظیم 19-1914ء کے دوران تعلقات عامہ کی باقاعدہ داغ بیل ڈالی گئی جب حکومت ہند نے ایک سنٹرل پبلسٹی بورڈ قائم کیا جس کا مقصد جنگ کی پبلسٹی تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد 1921ء میں اسے سنٹرل بیورو آف انفارمیشن بنا دیا گیا۔ 1923ء میں اسے ڈائرکٹوریٹ آف پبلک انفارمیشن اور 1931ء میں ڈائرکٹوریٹ آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہلی جنگ عظیم تھی جس نے ہندستان میں پبلسٹی کی شکل میں تعلقات عامہ کو جنم دیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. تعلقات عامہ کی مختصر تعریف کیجیے۔
2. مشہور کمپنیوں کا نیا آئٹم کیوں آسانی سے فروخت ہونے لگتا ہے؟
3. پہلی پریس ریلیز کب جاری ہوئی؟
4. ہندستان میں تعلقات عامہ کا باقاعدہ آغاز کب ہوا؟

28.5 تعلقات عامہ کے چار مراحل

تعلقات عامہ کے ذمے عموماً دو قسم کے کام ہوتے ہیں۔ اول تو روزمرہ اور معمول کے کام ہیں جس کے لیے بہت مہارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ روایت اور مثالیں موجود ہوتی ہیں جس کے نہج پر کام انجام دیا جاتا ہے۔ ایسے کام ادارے کے کسی ایسے فرد سے بھی لیے جاسکتے ہیں جس کا تعلق براہ راست تعلقات عامہ سے نہ ہو۔ کام کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جس کا تعلق کسی مہم یا طویل عمل سے ہوتا ہے۔ مثلاً حکومت نے پولیو کے خلاف ایک مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم کو عالمی تائید بھی حاصل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ پورے ہندستان سے پولیو کو جڑ سے اُکھاڑ دیا جائے۔ کسی شہر' کسی قصبے اور کسی گاؤں میں کسی بھی

بچے کو پولیو کی بیماری لاحق نہ ہونے پائے۔اس کے لیے مخصوص وقفے سے کوئی ایک دن طے کر کے پانچ برس تک کی عمر کے ملک کے تمام بچوں کو پولیو سے بچنے کی خوراک پلائی جاتی ہے۔۔۔۔ظاہر ہے کہ یہ ایک طویل سلسلہ ہے۔اس کے لیے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔عوام کو اطلاع دینے کی ضرورت ہے۔اُن میں خوراک کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے اور مقررہ دن ہی کو خوراک پلانے کے تئیں بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ بیداری پیدا کرنے کے لیے اور اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے مختلف مکتبہ فکر کے بااثر لوگوں کی مدد درکار ہے۔تعلقات عامہ کے لیے اس طرح کے کام چیلنج سے بھرے ہوتے ہیں۔لہٰذا ماہرین تعلقات عامہ نے ایسی صورتحال سے نپٹنے کے لیے ''تعلقات عامہ کے چار مراحل'' کی نشاندہی کی ہے۔ یوں تو اگر کسی بھی کام کے وقت ان مراحل کو ملحوظ رکھا جائے تو کام کی انجام دہی بہتر اور آسان ہو جائے گی تاہم کسی نئے کام' کسی مہم یا طویل عمل کے دوران ان مراحل کا بطور خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔یہ مراحل حسب ذیل ہیں:

28.5.1 حقائق کا پتہ لگانا (Fact finding)

پہلے مرحلے میں جس مہم کا آغاز کیا جانے والا ہے اُس کے تعلق سے حقائق کا پتہ لگایا جاتا ہے۔جس قسم کے عوام کے لیے یہ مہم شروع کی جانے والی ہے اُس کی صورتحال اور رویہ کیا ہے۔وہ کس سماجی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔اُن تک رسائی کے لیے کس طرح کے طریقے زیادہ سودمند اور موثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ان پہلوؤں پر غور کیے بغیر مہم کی کامیابی یقینی نہیں ہوگی۔اس مرحلے میں خود سے بھی سوال کرنا پڑتا ہے کہ آخر ہمارا مسئلہ کیا ہے؟ ہم کس مقصد کے تحت مہم چلانا چاہتے ہیں؟ اس انداز سے تحقیق کر لینے اور اعداد و شمار جمع کر لینے سے مہم کو بہتر طور پر سر کیا جا سکتا ہے۔

28.5.2 منصوبہ بندی (Planning)

دوسرا مرحلہ منصوبہ بندی کا ہے۔جب آپ کو حقائق کا پتہ چل جائے گا اور آپ کے پاس ہر طرح کی اطلاع اور اعداد و شمار موجود ہوں گے تو اُس کی بنیاد پر آپ صحیح منصوبہ بندی کر سکتے ہیں۔کسی مہم کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار منصوبہ بندی کے صحیح یا غلط ہونے پر ہوتا ہے۔منصوبہ بندی کے ذریعے آپ بہت اُلجھے اور پھیلے ہوئے کام کو بھی بہ آسانی انجام دے سکتے ہیں اور کسی مسئلے کے سامنے آنے سے پہلے اُس کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں۔منصوبہ بندی کے لیے کاموں کی نشاندہی' اُس کے لیے درکار وقت' اُسے انجام دینے والے افراد کی نشاندہی اور اُن میں ذمہ داریوں کی درست تقسیم کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ منصوبہ بندی کو مختصر مدتی اور طویل مدتی زمرے میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔مہم میں آپ جن ذرائع ابلاغ سے استفادہ کرنے والے ہیں اُن کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔منصوبہ بندی درست ہے یا نہیں اور اس کا نفاذ صحیح طور پر ہو رہا ہے یا نہیں' اس کا اندازہ لگانے کے لیے ایک چیک لسٹ تیار کرنی چاہئے جس پر وقتاً فوقتاً نظر ڈالتے رہنا چاہئے تاکہ کاموں کی پیش رفت' افراد کار رویہ اور عوام کے ردعمل کا اندازہ ہوتا رہے۔

28.5.3 ابلاغ یا ترسیل (Communication)

تعلقات عامہ کی کسی بھی مہم کا اہم ترین مرحلہ ترسیل ہے۔اس مرحلے کو بعض ماہرین نے Communication کی بجائے Action یعنی عمل سے تعبیر کیا ہے۔ظاہر ہے کہ تعلقات عامہ کی مہم بنیادی طور پر کسی پیغام کی ترسیل کے لیے منظم کی جاتی ہے۔لہٰذا یہی مرحلہ کسی پروگرام پر اطلاق کا مرحلہ ہے۔ترسیل کے مرحلے پر سب سے پہلے پیغام (Message)' عوام (Public) اور ذرائع (Media) کا تعین کیا جاتا ہے۔یعنی آپ کو کیا پیغام پہنچانا ہے' کسے پیغام پہنچانا ہے اور کس کے ذریعے پہنچانا ہے۔اس میں عوام یعنی آپ کے target audience کی بہت اہمیت ہے۔آیا وہ عام لوگ ہیں' حکومت ہے' سماج کا دانشور طبقہ ہے یا کسی مخصوص شعبہ حیات مثلاً سائنس' تعلیم' صنعت وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ترسیل کے لیے اخبارات' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے علاوہ بروشر' فولڈر' بینر' ہورڈنگس' ادارے کے میگزین کے خصوصی شمارے' متواتر پریس ریلیز وغیرہ سے مدد لی جا سکتی ہے۔ماہرین کے لکچرس' نمائش کا اہتمام' بیرونی عوام کے ساتھ میٹنگ اور ادارے کے تعلق سے عام تعارفی اشتہارات وغیرہ کی اشاعت بھی ترسیل کو مستحکم اور بامعنی بنانے کے اہم ذرائع ہیں۔متعینہ پروگرام کے دوران اگر ادارے کے ترجمان یا ارباب اعلیٰ کی جانب سے ادارے کے مثبت پہلوؤں اور کارکردگی کو نمایاں کیا جاتا رہے تو اصل پروگرام کو عوام زیادہ سنجیدگی سے قبول کرتے ہیں۔

28.5.4 تجزیہ و محاسبہ (Evaluation)

اس سلسلے کی آخری کڑی پوری مہم کا تجزیہ ہے۔ مہم کی تکمیل کے بعد اس بات کا تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے کہ آپ نے جو مہم چلائی ہے اُس کا عوام نے کیسا اثر قبول کیا۔ اُن کا کیا ردعمل ہے۔ اور پھر یہ کہ آپ نے جس مقصد کے تحت مہم کا اہتمام کیا تھا اُس میں آپ کو کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہ تجزیہ عوام سے تحقیقی انداز میں فیڈ بیک لے کر حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پریس کے تاثرات، سرکاری عملے یا محکمے کے ردعمل اور اہم لوگوں سے بات چیت کے ذریعے بھی تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ تجزیے سے نہ صرف اُس پروگرام یا اُس طرح کے پروگرام کو آئندہ مزید بہتر طریقے سے منظم کیا جاسکتا ہے بلکہ بعض اوقات ادارے کے بارے میں لوگوں کی ایسی رائے بھی سامنے آتی ہے جو اصلاً اُس پروگرام سے متعلق نہیں ہوتی مگر اُس سے ادارے کو مجموعی طور پر بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ جب کسی ادارے کا نمائندہ عوام تک پہنچتا ہے تو عوام ہر وہ بات کرتے ہیں جو اُن کے دلوں میں ہوتی ہے۔ اکثر لوگ ادارے کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کسی مخصوص عملے یا مخصوص شعبے کی خرابیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ اگر ادارہ چاہے تو وہ اس طرح کے ردعمل کو مثبت انداز میں قبول کرتے ہوئے اپنی اصلاح کرسکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. تعلقات عامہ کے چار مراحل کی نشاندہی کیجیے۔
2. تعلقات عامہ کے کس مرحلے کو Action سے تعبیر کیا جاتا ہے؟
3. تجزیے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟

28.6 تعلقات عامہ عملے کی خصوصیات

تعلقات عامہ عملہ عام طور پر اپنے ادارے کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ عوام اور میڈیا کو معلومات فراہم کرتا ہے اور ادارے اور عوام کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔ لہٰذا تعلقات عامہ عملے کے لیے تربیت یافتہ اور دیگر کئی خصوصیات کا حامل ہونا لازمی ہے۔ اسے با اخلاق، نرم مزاج، دور بیں، کشادہ ذہن، وسیع النظر اور غیر متنازعہ شخصیت کا مالک ہونا چاہیے۔ اس میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت، تجزیے و مشاہدے کی قوت، ثقافتی اور دانشورانہ پس منظر، زبان پر قدرت اور لکھنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ کسی اچھے تعلقات عامہ عملے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی ترسیل عامہ کی تمام تر تکنیک اور جدید ترسیلی تکنالوجیوں مثلاً کمپیوٹر اور انٹرنیٹ وغیرہ سے کماحقہ واقفیت بھی لازمی ہے۔ جدید ترسیلی تکنالوجی سے عدم واقفیت اس کے لیے قدم قدم پر رکاوٹ بن سکتی ہے۔ کوئی اچھی شخصیت، کوئی اچھا صحافی یا کوئی اچھا قلم کار ضروری نہیں کہ ایک اچھا تعلقات عامہ عملہ بھی ثابت ہو بلکہ اچھا تعلقات عامہ عملہ وہ ثابت ہوگا جو ان خوبیوں کا مرکب ہوگا اور جس میں ترسیل کی بہترین صلاحیت بھی موجود ہوگی۔

تعلقات عامہ عملے کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اس میں ''کام کی انجام دہی'' کی غیر معمولی صلاحیت ہونی چاہیے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ تعلقات عامہ عملے کو اعلیٰ حکام کی جانب سے کوئی کام سپرد کرکے اسے انتہائی کم وقت میں انجام دینے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں تعلقات عامہ عملے کو انتظامی تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے دستیاب وسائل کے اندر معینہ وقت پر کام کو انجام دینا پڑتا ہے۔ تعلقات عامہ عملے کو کئی مرتبہ متضاد اصول و نظریات کے حامل مختلف اعلیٰ حکام سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ مرحلہ عملے کے لیے انتہائی صبر آزما اور چیلنج سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس مرحلے سے جو کامیابی سے گزر جائے وہ کامیاب تعلقات عامہ عملہ کہلانے کا مستحق ہے۔

ان کے علاوہ بھی تعلقات عامہ عملے میں بعض خصوصیات کی موجودگی اس کی بہتر کارکردگی کی ضامن ہوسکتی ہیں مثلاً اس میں صبر و ضبط کا مادہ ہونا چاہیے۔ اس میں انسانی اقدار کی پاسداری اور احترام کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اسے سادہ مزاج ہونا چاہیے اور سادہ رہن سہن اختیار کرنا چاہیے۔ اسے کسی

تنازعہ میں نہیں پڑنا چاہئے۔ دولت، شراب اور جنس مخالف اس کی کمزوری نہیں ہونی چاہئے۔ اسے ہندستانی تہذیب سے واقفیت ہونی چاہئے اور اس کے لیے جذبہ احترام ہونا چاہئے۔ اس میں اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے کی اخلاقی جرأت ہونی چاہئے۔ ان غلطیوں کی اصلاح کا مزاج ہونا چاہئے اور ہر طرح کے حالات میں کردار کا بہترین نمونہ پیش کرنا چاہئے۔

28.7 مختلف میڈیا کے لیے موزوں تحریریں

مختلف میڈیا کے لیے مختلف قسم کی تحریریں درکار ہوتی ہیں۔ تعلقات عامہ عملے کے لیے مناسب ہے کہ وہ نہ صرف ان تحریروں سے واقف ہو بلکہ اس میں خود بھی لکھنے کی صلاحیت موجود ہو۔ عملے کے لیے بہتر ہے کہ وہ تحریر کی مختلف اقسام، تحریر کی تکنیک، اچھی تحریر کے اصول اور کم از کم دو تین زبانوں بشمول انگریزی اور علاقائی زبان کا واقف کار ہو۔ صحافتی تحریر، ادبی تحریر اور اشتہارات کی تحریر مختلف ہوتی ہے۔ ان تمام قسموں میں ٹارگیٹ گروپ (Target group) کو ذہن میں رکھ کر لہجہ اور اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ لغت، انسائیکلوپیڈیا اور معلومات کی سالانہ کتابوں سے مدد لی جاتی ہے۔ میڈیا کے لیے لکھنے میں ترجمے کی بھی کافی اہمیت ہے۔ ترجمے کے اصول اور فن سے واقفیت علاقائی زبان میں ترسیلی مواد تیار کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ اچھی تحریر کی شناخت اس کی ترسیلی قوت سے قائم ہوتی ہے اور ترسیلی قوت کا راز سلاست و روانی، سادہ اور واضح لب و لہجے میں پنہاں ہے۔ لفظیات، اصطلاحات، قواعد، رموز اوقاف اور املا کی موزوں جانکاری بھی تحریر میں جان پیدا کرتی ہے۔

پرنٹ میڈیا میں خبریں، رپورٹ، فیچرس، مضامین اور اداریے شامل ہوتے ہیں۔ اخبار سے وابستہ افراد جب یہ تحریریں قلم بند کرتے ہیں تو اُن کا اپنا مخصوص انداز ہوتا ہے جبکہ کوئی تعلقات عامہ عملہ اپنے مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھتا ہے۔ اداریے خالصتاً اخبارات کی پالیسی کے ترجمان ہوتے ہیں لیکن کئی بار تعلقات عامہ عملہ اخبار کے اداریے کے ذریعے اپنی بات عوام تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ وہ یا تو خود متعلقہ اخبار کے لب و لہجے کے مطابق اداریہ لکھ کر انہیں فراہم کر دیتا ہے یا اداریہ نویس کو اپنی باتیں لکھنے کے لیے آمادہ کر لیتا ہے۔

ریڈیو ایک سمعی ذریعہ ترسیل ہے جبکہ ٹیلی ویژن سمعی و بصری ذریعہ ترسیل ہے۔ ان دونوں میڈیا کی تحریروں کے اپنے مخصوص انداز اور تقاضے ہیں۔ ریڈیو میں سامعین کے سامنے نہ تو کردار ہوتے ہیں اور نہ مناظر۔ انہیں الفاظ کے ذریعے کرداروں سے متعارف اور مناظر سے واقف کرایا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن میں کردار اور مناظر ناظرین کے سامنے متحرک شکل میں ہوتے ہیں لہٰذا بہت سی باتوں کے لیے ہلکا سا اشارہ کافی ہوتا ہے۔ بعض اوقات الفاظ کے ذریعے اشارے یا وضاحت کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ بدلتے ہوئے مناظر اور کرداروں کے افعال صورتحال کی ترجمانی کرتے رہتے ہیں۔ ان دونوں ذرائع ترسیل میں بھی مختلف قسم کے پروگرام ہوتے ہیں جن کے لیے الگ الگ قسم کی تحریریں درکار ہوتی ہیں۔ تعلقات عامہ عملہ ان تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. تعلقات عامہ عملے کی بعض خصوصیات کی نشاندہی کیجیے۔
2. تعلقات عامہ عملے کے لیے کون سا مرحلہ انتہائی صبر آزما اور چیلنج سے بھرا ہوا ہوتا ہے؟
3. پرنٹ میڈیا میں شامل کی جانے والی تحریروں کی اقسام بتائیے۔

28.8 پریس کانفرنس، پریس ٹور وغیرہ

پریس کانفرنس، پریس ٹور، پریس ریسپشن، پریس بریفنگ، پریس گٹ ٹوگیدر، پریس انٹرویو، میٹ دی پریس وغیرہ کا اہتمام تعلقات عامہ کی اہم میڈیا سرگرمیاں ہیں۔ پریس کانفرنس کا اہتمام عموماً سالانہ یا کسی خاص موقع پر کیا جاتا ہے۔ خاص موقع سے مراد کوئی جلسہ، سمینار، کسی پراڈکٹ کی پیش کش،

کسی ادارے کے سربراہ کی تقرری یا کسی اہم فیصلے کا اعلان وغیرہ ہے۔ پریس کانفرنس میں میڈیا کے نمائندوں کو کسی مخصوص مقام پر مدعو کیا جاتا ہے جس میں انہیں کانفرنس کے موضوع اور کانفرنس سے خطاب کرنے والی شخصیت کے بارے میں اطلاع دے دی جاتی ہے۔ پریس کانفرنس سے ادارے یا محکمے کے سربراہ خطاب کرتے ہیں۔ سالانہ کانفرنس میں ادارے کی ایک سالہ کارکردگی اور پیش رفت بیان کی جاتی ہے جبکہ اگر کسی موقع پر کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا جارہا ہے تو اس بارے میں تفصیلات فراہم کی جاتی ہیں۔ کانفرنس میں موضوع کے تعلق سے پریس نوٹ فراہم کرنے کا بھی رواج ہے۔

پریس ٹور میں میڈیا والوں کو کسی خاص پروجیکٹ یا پروگرام کے مشاہدے کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ پریس بریفنگ میں منتخبہ نمائندوں کو کسی خبر کے پس منظر یا پیش رفت سے مطلع کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر عام طور پر پریس نوٹ نہیں دیا جاتا ہے۔ پریس ریسپشن میں میڈیا والوں کے لیے استقبالیہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس موقع پر غیر رسمی طور پر کوئی خبر بھی بتادی جاتی ہے۔ گٹ ٹوگیدر میں صرف استقبالیہ ہوتا ہے۔ کسی خبر کی بات نہیں کی جاتی ہے۔ اس طرح کی محفلیں پریس کے ساتھ تعلقات کو مستحکم بنائے رکھنے کے لیے منعقد کی جاتی ہیں جن میں رپورٹر یا کرسپانڈنٹس کے علاوہ ایڈیٹر یا میڈیا سے وابستہ دیگر سنیئر شخصیتوں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔

28.9 اشاعتی مواد

اداروں کو اپنے مقاصد کی تکمیل، ذمہ داریوں کی انجام دہی اور عوام تک رسائی کے لیے مختلف قسم کی مطبوعات کی ادارت و اشاعت کرنی ہوتی ہے۔ ان مطبوعات کا تعین یا انتخاب متعلقہ ادارے اور ٹارگیٹ گروپ کی ضرورتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کسی بھی ادارے میں تعارفی کتابچے، سالانہ رپورٹ، سربراہ کی تقریر، ہاؤس جرنلس، نیوز لیٹر، تجارتی جرنلس، فولڈرس، بروشرس، سوویئر، کیلنڈر اور ڈائری وغیرہ اس کی مطبوعات میں شامل ہوتی ہے۔ ان میں سے بیشتر مطبوعات اور بعض اداروں میں تمام تر مطبوعات کی ادارت و اشاعت کی ذمہ داری تعلقات عامہ کے سپرد ہوتی ہے۔ البتہ مختلف کمیٹیاں یا ادارتی بورڈ اشاعتی کاموں کی نگرانی کرتا ہے۔

ہاؤس جرنلس میں عموماً انتظامیہ کی جانب سے ملازمین کی بہبود کے لیے کیے گئے اقدام اور ادارے کی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس میں ملازمین کی صحت اور تحفظ سے متعلق رہنمایانہ تحریروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ہاؤس جرنلس ملازمین اور انتظامیہ کے مابین بہتر تعلقات کے فروغ میں معاون ہوتا ہے۔ اگر جرنل صرف ملازمین کے لیے شائع کیا جاتا ہے تو اسے Internal house journal کہا جاتا ہے اور اگر وہ گاہکوں اور دیگر عوام کے لیے شائع ہوتا ہے تو اسے External house journal کہتے ہیں۔ جن اداروں میں ہاؤس جرنل شائع نہیں ہوتا ہے وہاں نیوز لیٹر طبع کیا جاتا ہے۔ فولڈر، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تہہ کیا ہوا ورق ہوتا ہے۔ لمبوتری شکل کے اس تشہیری مواد میں ادارے کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی طباعت معیاری، پرکشش اور جاذب نظر کی جاتی ہے۔ بروشر بہت مختصر سا کتابچہ ہوتا ہے جس میں عموماً کسی ایک موضوع (Theme) پر مواد اور تصاویر شائع کی جاتی ہیں۔ یادگاری مجلّہ (Souvenir) کسی خاص موقع پر کسی رسالے کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے جس میں اُس موقع کی مناسبت سے مواد اور اشتہارات شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ اشتہارات متعلقہ ادارے کے علاوہ دیگر اداروں سے بھی حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان اشتہارات میں عموماً موقع کے تعلق سے نیک خواہشات پیش کی جاتی ہیں۔

28.10 تعلقات عامہ کے سرکاری محکمے

مختلف سرکاری وزارتوں، محکموں اور اداروں میں تعلقات عامہ کے متعدد شعبے قائم ہیں۔ یہ شعبے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے تحت کام کرتے ہیں اور عام طور پر سرکاری اسکیموں، پروجیکٹوں، فیصلوں، سرکاری تقاریب اور عمومی ترقی کے بارے میں میڈیا اور عوام کو باخبر رکھتے ہیں۔ یہ شعبے دراصل حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا کام کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اخبارات مالکان اور صحافیوں کی اپنی اپنی تنظیمیں بھی ہیں جو اپنے گروپ کے مفادات کے تحفظ کا کام کرتی ہیں۔

ریاستی حکومتوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں مختلف ناموں اور مختلف شکلوں میں محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ قائم ہیں۔ان ڈائرکٹوریٹ یا محکموں کی قیادت ڈائرکٹر یا کمشنر کرتا ہے۔ریاستوں میں تعلقات عامہ کی جزوی ذمہ داری جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ (GAD) کے سپرد بھی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ ہر وزارت، بڑے محکموں اور اضلاع میں تعلقات عامہ کی ذمہ داری انجام دینے کے لیے افسران ہوتے ہیں جنہیں پبلک ریلیشنز آفیسر (PRO)، انفارمیشن آفیسر (IO) یا ڈپٹی یا اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پی آر) کا عہدہ ومرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ریاستوں میں پبلسٹی سیل بھی ہوتے ہیں جو تعلقات عامہ کے خصوصی پروگرام منظم کرتے ہیں۔ان شعبوں، محکموں یا سیلوں کو مطلوبہ عملہ اور حسب ضرورت انفراسٹرکچر فراہم کیا جاتا ہے۔

مرکزی حکومت میں تعلقات عامہ کے مختلف ادارے وزارت اطلاعات ونشریات (Ministry of Information and broadcasting) کے تحت کام کرتے ہیں جنہیں حکومت کی میڈیا اکائیاں (Media Units) کہا جاتا ہے۔اس زمرے میں الکٹرانک میڈیا اکائیاں سرفہرست ہیں جن میں آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن شامل ہیں۔فلم ڈویژن، پریس انفارمیشن بیورو (PIB)، رجسٹرار آف نیوز پیپرس فار انڈیا، فوٹو ڈویژن، پبلی کیشنز ڈویژن، ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ ویژول پبلسٹی (DAVP)، ڈائرکٹوریٹ آف فیلڈ پبلسٹی (DFP)، سانگ اینڈ ڈرامہ ڈویژن اور میڈیا پبلسٹی کو آرڈی نیشن کمیٹی وغیرہ اہم ادارے ہیں جو اپنے اپنے میدانوں میں حکومت ہند کے لیے خدمات انجام دیتے ہیں۔ان محکموں کی ذمہ داریوں میں تمام ریکارڈ کی حفاظت بھی شامل ہے۔خاص طور پر فوٹو ڈویژن، پبلی کیشنز ڈویژن اور DAVP وغیرہ تصاویر، فلمیں اور دیگر متفرق اطلاعاتی دستاویزات کو محفوظ رکھتے ہیں اور بوقت ضرورت وزارتوں یا محکموں کو فراہم کرتے ہیں۔یہ مخصوص مواقع پر نمائش وغیرہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔تعلقات عامہ کی بنیادی اور راست ذمہ داری PIB کے سپرد ہے جہاں حکومت کی پالیسیوں، فیصلوں اور پروگراموں کے تعلق سے پریس ریلیز اور دیگر تشہیری مواد جاری کیا جاتا ہے۔ملک بھر میں PIB کے ریجنل دفاتر اور ذیلی شاخیں قائم ہیں جن کی مدد سے یہ انگریزی، ہندی، اُردو کے ساتھ ملک کی 15 سے زائد زبانوں میں خبریں، فیچرس، تصاویر اور دیگر اشاعتی مواد جاری کرتا ہے۔یہ حکومت کو فیڈ بیک بھی فراہم کرتا ہے۔یہ قومی سطح پر صحافیوں کو مسلمہ حیثیت (Accreditation) بھی دیتا ہے۔ان محکموں کے علاوہ مرکزی حکومت کی مختلف وزارتوں اور اداروں میں انفرادی طور پر بھی تعلقات عامہ کا نظم ہوتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. بعض میڈیا سرگرمیوں کی نشاندہی کیجیے۔
2. پریس کانفرنس اور پریس بریفنگ میں کیا فرق ہے؟
3. کسی ادارے کی مختلف مطبوعات کے نام بتایئے۔
4. PIB اور DAVP کس کے مخفف ہیں؟

28.11 خلاصہ

بیسویں صدی کی آخری ربع صدی میں تعلقات عامہ کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے۔تعلقات عامہ کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے کی ہے تاہم تعلقات عامہ وضاحتی مواد کی تقسیم یا دیگر مختلف طریقوں سے فرم، ادارے یا تنظیم اور عوام کے درمیان راہ ورسم اور جذبہ خیر سگالی پیدا کرنے اور پھر اسے برقرار رکھنے کا نام ہے۔تعلقات عامہ کے ذیل میں جب عوام (Public) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد صرف وہ عوام ہوتے ہیں جن کا کسی نہ کسی طرح متعلقہ ادارے سے تعلق ہوتا ہے۔

آج ہم ایسے معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں منافرت، شکوک وشبہات، ٹکراؤ، غم وغصے اور غلط فہمیوں کا دور دورا ہے۔یہ کیفیت نہ صرف نجی زندگیوں اور خاندانوں کے درمیان ہے بلکہ سماجی سطح پر، دفتروں، کمپنیوں اور اداروں کی سطح پر اور حتیٰ کہ ملکوں کے درمیان بھی ایسی ہی صورتحال ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خصوصیات انسانی زندگی کا وطیرہ بن گئی ہیں۔ایسے ماحول میں تعلقات عامہ کی ضرورت اور ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔

تعلقات عامہ کی ابتدا یوں تو اُسی وقت سے تسلیم کی جاسکتی ہے جب دُنیا کے کسی ایک شخص نے کسی دوسرے سے یا دو اشخاص نے ایک دوسرے سے قربت بڑھانے کی ضرورت محسوس کی۔ تاہم ایک فن اور مخصوص میدان کی حیثیت سے تعلقات عامہ کا نقطۂ آغاز 1641ء کے اُس واقعے کو قرار دیا جاتا ہے جب ہارورڈ کالج، امریکا نے فنڈ جمع کرنے کی غرض سے تین مبلغین کو برطانیہ روانہ کیا۔ ہندستان میں پہلی جنگ عظیم 19-1914ء کے دوران تعلقات عامہ کی باقاعدہ داغ بیل ڈالی گئی جب حکومت ہند نے ایک سنٹرل پبلسٹی بورڈ قائم کیا جس کا مقصد جنگ کی پبلسٹی تھا۔

ماہرین تعلقات عامہ نے کسی مہم یا بڑے پروگرام کی انجام دہی کے لیے ''تعلقات عامہ کے چار مراحل'' کی نشاندہی کی ہے جن میں حقائق کا پتہ لگانا، منصوبہ بندی، ابلاغ یا ترسیل اور تجزیہ و محاسبہ شامل ہے۔ تعلقات عامہ عملہ عام طور پر اپنے ادارے کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ عوام اور میڈیا کو معلومات فراہم کرتا ہے اور ادارے اور عوام کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے تربیت یافتہ اور دیگر کئی خصوصیات کا حامل ہونا لازمی ہے۔

مختلف میڈیا کے لیے مختلف قسم کی تحریریں درکار ہوتی ہیں۔ تعلقات عامہ عملے کے لیے مناسب ہے کہ وہ نہ صرف ان تحریروں سے واقف ہو بلکہ اس میں خود بھی لکھنے کی صلاحیت موجود ہو۔ پرنٹ میڈیا میں خبریں، رپورٹ، فیچرس، مضامین اور اداریے شامل ہوتے ہیں۔ ریڈیو ایک سمعی ذریعہ ترسیل ہے جبکہ ٹیلی ویژن سمعی و بصری ذریعہ ترسیل ہے۔ ان دونوں میڈیا کی تحریروں کے اپنے مخصوص انداز اور تقاضے ہیں۔ تعلقات عامہ عملہ ان تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے۔ پریس کانفرنس، پریس ٹور، پریس ریسپشن، پریس بریفنگ، پریس گٹ ٹوگیدر، پریس انٹرویو، میٹ دی پریس وغیرہ کا اہتمام تعلقات عامہ کی اہم میڈیا سرگرمیاں ہیں۔

اداروں کو اپنے مقاصد کی تکمیل، ذمہ داریوں کی انجام دہی اور عوام تک رسائی کے لیے مختلف قسم کی مطبوعات کی ادارت و اشاعت کرنی ہوتی ہے۔ کسی بھی ادارے میں تعارفی کتابچے، سالانہ رپورٹ، سربراہ کی تقریر، ہاؤس جرنلس، نیوز لیٹر، تجارتی جرنلس، فولڈرس، بروشرس، سووینیئر، کیلنڈر اور ڈائری وغیرہ اس کی مطبوعات میں شامل ہوتی ہیں۔

مختلف سرکاری وزارتوں، محکموں اور اداروں میں تعلقات عامہ کے متعدد شعبے قائم ہیں۔ یہ شعبے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے تحت کام کرتے ہیں اور عام طور پر سرکاری اسکیموں، پروجیکٹوں، فیصلوں، سرکاری تقاریب اور عمومی ترقی کے بارے میں میڈیا اور عوام کو باخبر رکھتے ہیں۔ مرکزی حکومت میں تعلقات عامہ کے مختلف ادارے وزارت اطلاعات و نشریات کے تحت کام کرتے ہیں جن میں آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن، فلم ڈویژن، پریس انفارمیشن بیورو (PIB)، پبلی کیشنز ڈویژن اور ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ ویژول پبلسٹی (DAVP) وغیرہ شامل ہیں۔

28.12 نمونہ امتحانی سوالات

ان سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. تعلقات عامہ کے بارے میں اپنی مجموعی معلومات کا اظہار کیجیے۔
2. تعلقات عامہ کے چار مراحل کیا کیا ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
3. تعلقات عامہ کے سرکاری محکموں کی نشاندہی کیجیے اور بتائیے کہ سرکاری محکمے کس طرح کی پبلسٹی کرتے ہیں۔

ان سوالوں کے جواب 15-15 سطروں میں تحریر کیجیے۔

1. تعلقات عامہ کے آغاز کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ آج ہمارے سماج میں اس کی کیا معنویت ہے؟
2. تعلقات عامہ عملے کی خصوصیات اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالیے۔
3. مختلف میڈیا کے لیے مخصوص تحریریں ہوتی ہیں۔ تعلقات عامہ کی روشنی میں اس بیان پر بحث کیجیے۔
4. کسی ادارے کی مختلف مطبوعات کا تعارف پیش کیجیے۔ تعلقات عامہ کے حوالے سے بتائیے کہ ان کے مقاصد کیا ہوتے ہیں؟

28.13 فرہنگ

ربع صدی	25برس
دارومدار	انحصار
خیرسگالی	نیک خواہشات، بھلائی کا خیال
دوردورا	بول بالا، عروج
وطیرہ	طریقہ، مزاج
مشقت	محنت
مرکب	مجموعہ، مل کر بنا ہوا
کلیدی	بنیادی، اہم ترین
مبلغین	مبلغ کی جمع، تبلیغ کرنے والے
اطلاق	عمل آوری، ایک چیز کا دوسری چیز پر عائد کرنا

28.14 سفارش کردہ کتابیں

1. S. Ganesh : Introduction to Public Relations, Indian Publishers Distributors, Delhi - 7
2. Shrutika Kasor : Public Relations, Mohit Publications, New Delhi - 2
3. R.K. Ravidran : Handbook of Public Relations, Anmol Publications Pvt. Ltd. New Delhi - 02